تصورِ قیادت

اسلامی اور عصری افکار کا تقابلی جائزہ

(تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ)

۲۰۰۸ء

مقالہ نگار

مسز زرین۔ ایس۔ ریاض

نگران تحقیق

پروفیسر ڈاکٹر شبیر احمد منصوری

ادارہ علوم اسلامیہ جامعہ پنجاب لاہور

بسم الله الرحمن الرحيم

تصدیقی سرٹیفکیٹ

میں مسمّیٰ ڈاکٹر شبیر احمد منصوری (چیئرمین ادارہ علومِ اسلامیہ جامعہ پنجاب لاہور) تصدیق کرتا ہوں کہ مقالہ بعنوان **"تصورِ قیادت۔ اسلامی اور عصری افکار کا تقابلی جائزہ"** مقالہ نگار مسز زرین۔ ایس۔ ریاض نے میری نگرانی میں مکمل کیا ہے اور یہ مقالہ کسی اور جامعہ میں حصول سند یا کسی اور مقصد کے لئے پیش نہیں کیا گیا۔

تصدیق و دستخط نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر شبیر احمد منصوری

چیئرمین ادارہ علومِ اسلامیہ

جامعہ پنجاب لاہور

حلف نامہ (Declaration)

میں مسز زرین۔ ایس۔ ریاض حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ!

☆ مقالہ بعنوان **"تصورِ قیادت۔ اسلامی اور عصری افکار کا تقابلی جائزہ"** میں نے از خود تحریر کیا ہے۔

☆ مقالہ امکانی حد تک ماخذ و منابع پر مشتمل ہے۔

☆ مقالہ ہذا نگران کی زیر نگرانی لکھا گیا ہے۔

☆ مقالہ ہذا کسی اور جامعہ یا ادارے میں کسی سند یا کسی اور مقصد کے لئے پیش نہیں کیا گیا۔

مسز زرین۔ ایس۔ ریاض

انتساب

الاء ھداءِالیٰ قوم یتفکرون

ہر غور و فکر کرنے والے

انسان

کے نام

اظہارِ تشکر

مقالہ کی تصنیف وتالیف میں اظہارِ تشکر کی روایت ایک خوشگوار روایت ہے۔لفظی طور پر ہی نہیں بلکہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے میں رب العالمین کا شکر ادا کرتی ہوں کہ جس نے مجھے اس عملی و تحقیقی مقالہ کو تحریر کرنے اور منصۂ شہود پر لانے کی توفیق عطا فرمائی۔ فالحمدللہ کثیراً

اس مقالہ کی تکمیل کے لئے مجھے جن مسائل و مراحل سے گزرنا پڑا وہ میری تحقیق کا اہم حصہ ہیں مجھے اپنے مقالے کے موضوع کی اہمیت و ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہونے کا احساس اس وقت ہوا جب میں نے اس پر کام شروع کیا۔اس کا ایک ایک جزؑ کُل پر بھاری تھا۔بحیثیتِ خانہ دار عورت اگرچہ میرے لئے مواد اکٹھا کرنا ایک امرِ محال تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ حوصلہ ہار بیٹھی ۔مگر میں محترم ڈاکٹر شبیر احمد منصوری، چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ کی ممنون ہوں کہ انہوں نے میری ہمت بندھائی۔ان کے نفیس و نادر مشوروں نے مہمیز کا کام دیا۔اللہ تعالیٰ کے احسان اور ان کی ماہرانہ نگرانی کی بدولت یہ تحقیقی کام مکمل ہوا۔

ناسپاس گزاری ہوگی اگر میں جناب ڈاکٹر عبدالجبار شاکر، ڈائریکٹر دعوۃ اکیڈمی اسلام آباد، ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی ۔اسلام آباد کا شکریہ ادا نہ کروں جنہوں نے اپنے علمی تجربات سے مجھے مستفید ہونے کا موقع دیا۔

میں اس مقالے کے تکمیلی مراحل میں شریک سب معاونین اور ان تمام لائبریری انچارج شخصیات کی انتہائی مشکور ہوں جنہوں نے کتب کی تلاش اور فراہمی میں حتی الامکان میری مدد کی۔

مجھے اپنے شوہر میجر (ریٹائرڈ) ریاض حسین کا خصوصی شکریہ ادا کرنا ہے جن کے بھرپور تعاون نے مجھے اس قابل کیا کہ میں یہ مقالہ سپردِ قلم کرسکوں۔انہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود مقالے کی تکمیل و تشکیل کے لئے معاونت کی۔

اپنی کم علمی، کم مائیگی اور کم فہمی کے باوجود زیرِ نظر مقالہ کے الفاظ نوکِ قلم کو جنبش دیتے ہوئے صفحۂ قرطاس پر بکھیرے ہیں جس میں میرا کوئی کمال نہیں صرف رب ذوالجلال کی کرم نوازی ہے۔اگر کسی ایک انسان کو بھی میری اس کاوش سے فائدہ پہنچا تو میری یہ سعی لاحاصل نہ رہے گی۔اور ہوسکتا ہے خدا کے حضور سرخروئی کا باعث بن جائے۔

"حسبی اللہ و نعم الوکیل"

مسز زرین۔ایس۔ریاض

مئی ۲۰۰۸

مقدمہ

تاریخ اسلام کا ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں نے نہایت محیر العقول طریقہ پر ترقی اور اپنے کارناموں کا نقش صفحۂ تاریخ پر اس طرح ثبت کیا کہ دنیا کی دیگر اقوام ان کی عظمت و برتری کے سامنے سرنگوں ہوگئیں آپ ﷺ کی وفات کے چند سالوں بعد ہی مسلمانوں نے جزیرۃ العرب سے نکل کر دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلنا شروع کیا تو سخت ترین مقابلوں کے باوجود اس انداز سے آگے بڑھے کہ پہلی صدی ہجری کے ختم ہونے سے پہلے پہلے انہوں نے مشرق میں سندھ اور چینی ترکستان تک، مغرب میں اندلس تک اپنی حکومت و مملکت کی حدود وسیع کر لیں اور اپنی سیاسی و علمی قیادت کا لوہا منوایا

حیرت انگیز امر یہ ہے کہ اسلام کا عطا کردہ تصور قیادت اعلیٰ وارفع ہونے کے باوجود عملاً رائج نہیں۔ غیر اسلامی اقوام عالم میں اس کے غیر مقبول ہونے کے اسباب تو سمجھ میں آسکتے ہیں لیکن اسلامی دنیا میں اس کا فقدان یقیناً نا قابل فہم بھی ہے اور باعث تشویش بھی۔ یہی نظام جب جہالت کی تاریکیوں سے ابھرا تو انقلاب آفریں تھا۔ اس کی نورانی کرنوں نے چار دانگ عالم کو روشن کر دیا۔ خدا کا فرمان ہے حکومت خدا کی ہے۔ کوئی اس کی حکومت میں شریک نہیں۔ اس کے بعد کس کو جرأت جو یہ کہتا حکومت میری ہے۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی دنیا کی تمام بڑی سلطنتوں روم، مصر، فارس کے تخت الٹ گئے۔ مصر، یمن، عراق، شام فتح ہو گئے۔ نہ قیصر رہا نہ کسریٰ۔ شہنشاہیت کا خاتمہ ہوا۔ خدا کی حکومت وجود میں آئی اور شاہی کی جگہ امارت عامہ شوریٰ کو عطا ہوئی۔

انسانی تاریخ میں انسان کی یہ سرفرازی بالکل نئی چیز تھی اس لئے مخالفت کی بنیاد بن گئی۔ انسانیت کے دشمن ادھر ادھر سر مارتے رہے مگر ایک قلعہ تھا جو بنتا چلا گیا اور جس کی دیوار آسمان تک اور قلعہ بندیاں مدینہ سے سائبیریا تک پہنچ کر بھی نہ رکیں۔ لیکن صرف چالیس سال کا زمانہ منہاج نبوت ﷺ اور سیاست شوریٰ کے مطابق گزرا قیادت کا انتہائی اعلیٰ معیار اور چناؤ کا عمدہ طریقہ کار ہونے کے باوجود مسلمان ایک صدی بھی اس نظام پر کاربند نہ رہ سکے۔ روشنی تاریکی میں بدل گئی مسلمان غیر قوموں سے اثر پذیر ہو گئے۔ انہی کا انداز حکمرانی اپنا لیا۔ امارتِ شوریٰ کی جگہ مطلق العنان شاہی نے لے لی۔ اسلامی قیادت کے اعلیٰ اصول وضوابط کو نظر انداز کر کے اغیار کا طریقہ کار اپنا لیا جو نسل در نسل چلا۔ تمام پرانے خاندان، اشکالی، پیشدادی، ساسانی، یونانی، رومی مٹ گئے۔ ان کی جگہ اموی، عباسی، فاطمی، غزنوی، خلجی، تغلقی، تیموری، مغل اور تاتاری تخت شاہی پر آ گئے۔ نتیجتاً مسلم اور غیر مسلم بادشاہوں میں عملاً کوئی واضح فرق نہ رہا اور مسلمان حکمرانوں کی اکثریت بھی غیر مسلم حکمرانوں کی طرح خواہش نفس کی غلام بن گئی اور اقتدار کے حصول یا دوام کے لئے عالم اسلام کو کئی ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔

نظام بادشاہت کے تابع مسلمان حکمرانوں میں اگرچہ حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسے درویش صفت بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یزید اور حجاج بن یوسف جیسے لوگ بھی نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے ظلم و بربریت کی ایسی داستانیں چھوڑیں کہ اغیار سے بھی بازی لے گئے۔ جوں جوں نظام بادشاہت دنیا میں غیر مقبول ہوا جمہوریت اور سوشلزم نے اس کی جگہ لینا شروع کر دی، عالم اسلام نے بھی ان نئے نظاموں کو اس طرح قبول کیا جیسے دیگر ممالک اور اقوام نے۔ عملاً عصر حاضر کی مسلم و غیر مسلم قیادت ایک ہی طرح کا نظام قیادت اپنائے ہوئے ہے اور اسلامی طرز قیادت کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

آج نہ صرف عالم اسلام بلکہ پوری دنیا جنگی خطرات سے دوچار ہے افق پر جنگ کے کالے بادل نمایاں ہیں۔ انسانیت مختلف نظریات میں بٹ کر رہ گئی ہے ہر گروہ دوسرے سے سبقت لے جانے کا خواہاں ہے قانون سازی کے اختیارات انسان نے سنبھال کر اپنے ہم جنسوں کے لئے عرصۂ حیات تنگ کر دیا ہے۔ نزول قرآن کے وقت بھی انسانیت ان سے ملتے جلتے مسائل سے دوچار تھی۔ قرآن پاک میں

اللہ تعالیٰ نے فرمایا

کنتم علی شفا حفرة من النار فانقذکم منها[۱]

''تم آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے تم کو اللہ نے اس سے نکالا''

آج بھی انسانیت کو ایسی ہی قیادت کی ضرورت ہے جو اسے ظلم وتعدی کے قعرِ مذلت سے نکالے۔

ایسے حالات میں ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام کی فوقیت اور برتری کا نقش موثر و دلپذیر تعبیر وتشریح اور زبان و ادب کے نئے اسلوب و پیرایۂ میں جدید طبقہ کے دل و دماغ میں قائم کیا جائے۔ اور پھر بھر پور علمی تنقید اور ماہرانہ تحلیل وتجزیہ سے تہذیب جدید کے طلسم کو توڑا جائے۔ امت کے نوجوان اور تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کے اساسات وعقائد اور نظام وحقائق اور رسالت محمدیہ پر وہ اعتماد واپس لایا جائے جس کا رشتہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے۔ اسلام کے اصول ومبادی پورے ایمانی جذبے کے ساتھ ابھارے جائیں اور واضح کیا جائے کہ اسلامی تصور قیادت، آج بھی اتنا ہی اہم اور قابل عمل ہے جتنا آنحضرت ﷺ کے دور میں تھا۔ قرآن وسنت کی اصل تعلیمات سے سرِ موانحراف کئے بغیر ان کو اس انداز سے پیش کیا جائے۔ کہ جدید اذہان کے اندر ان کے لئے قبولیت کا مادہ پیدا ہو۔ اسلامی قیادت کا تصور عصر حاضر میں اپنی اصل روح کے ساتھ پیش کیا جائے کہ مغربی تہذیب وفلسفہ وسائنس سے مرعوب ذہن ان کی حقانیت سے انکار نہ کر سکے۔ بدلتے حالات کے نئے تقاضوں کو اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ کر کے دنیا پر یہ ثابت کیا جائے کہ یہ وہ واحد مذہب ہے جس نے اپنی افادیت کھوئی نہیں اس کے عطا کردہ اصول آج بھی اتنے ہی کار آمد ہیں جس قدر ابتدائے اسلام میں تھے قیادت کا صحیح معیار وہی ہے۔ جو قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دیا۔

''جب ہم اپنے بندوں کو حکومت عطا کرتے ہیں تو وہ نظام عبادت قائم کرتے، زکوٰۃ دیتے،
محاسن وفضائل کی تبلیغ کرتے اور ہر بری بات سے روکتے ہیں''[۲]

گزشتہ چودہ سو برسوں میں اسلام اور اسلامی تعلیمات کے موضوع پر لاکھوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ مسلم مفکرین نے سیاست و قیادت کے موضوع پر بھی معرکتہ الآراء کتب تحریر کیں۔ لیکن ان سب کا اپنا نقطۂ نظر ومکتبِ فکر تھا۔ امام غزالی اخلاق وتصوف کی دنیا سے آگے نہ جا سکے مولانا روم تماشائے ذات میں ڈوبے رہے ابن رشد اور فخر الدین الرازی حقائق کو فلسفہ کی بے نور آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ امام ابن تیمیہ کی ساری زندگی اسلامی فرقوں اور نئے نئے عقائد کے خلاف جہاد میں گزری، گیارہوں صدی عیسوی میں ایک گروہ ایسا تھا جو خالص عربی اور اسلامی طرز حکومت کی تجدید کے لئے کوشاں تھا اس کا سربراہ ماوردی تھا۔

''ماوردی مسلمانوں کا پہلا سیاسی مفکر ہے جس نے سیاسیات کے اصول متعین کئے اور بڑی حد تک اسلامی احکامات اور جدید تقاضوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے بعد ابن خلدون نے سیاسیات کو اخلاق، کلام اور فقہ سے جو اس زمانے تک مخلوط تھا بالکل الگ کر دیا اور اس کو ایک مستقل علم کی حیثیت دی، شاہ ولی اللہ نے سیاسی افکار میں معاشیات کے ساتھ اخلاقیات کو بھی مساوی اہمیت دی ان کا دعویٰ ہے کہ جو اجتماع کردار کے لحاظ سے بلند ہوگا وہی عمدہ حکمران پیدا کر سکتا ہے۔ دور حاضر میں بھی بڑے بڑے مفکرین پیدا ہوئے۔ مثلاً مصر میں علامہ طنطاوی، فرید وجدی اور سید قطب شاہ انڈونیشا میں ڈاکٹر ناصر، ہندو پاکستان میں شاہ ولی اللہ، سرسید احمد خان، جمال الدین افغانی، ابوالکلام آزاد، علامہ محمد اقبال، مولانا مودودی۔ جن کے افکار سے مسلمانان عالم میں حرکت پیدا ہوئی اور لوگ جگہ جگہ اسلامی مسائل پر آزادانہ سوچنے لگے۔ مولانا شبلی، سید سلیمان ندوی، علامہ عنایت اللہ مشرقی اس موضوع کے حوالے سے خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان

[۱] ال عمران، ۳/۱۰۳ [۲] الحج، ۲۲/۴۱

مسلمان مفکرین کا طرہ امتیاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے افکار ونظریات کے پیش کر دینے پر ہی اکتفانہیں کیا بلکہ ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بڑی جدو جہد کی۔قید وبند کی مشکلات خندہ پیشانی سے برداشت کیں اور اسلامی تعلیمات کو زندہ رکھا۔

اس مقالے کا مقصدِ عظیم بھی یہی ہے کہ عصر حاضر کو خیر القرون کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کی جائے۔آج کے دور میں بنیادی مسئلہ نظم ونسق اور احتساب کا ہے۔نیز عمال حکومت اور وہ حضرات جن کے ہاتھ میں عنان حکومت ہے ان کو کس طرح حدود وقیود کا پابند بنایا جائے۔موجودہ نظام اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اسے نہ صرف ہر پہلو سے کھنگالا جائے بلکہ اسے چلانے والی سیاسی وقانونی انتظامیہ کی بھی اصلاح کی جائے۔جس کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی طریق قیادت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جائے اور عمال حکومت کو ان حدود وقیود میں مقید رکھیں جن پر عمل پیرا ہو کر فلاح عوام الناس کی طرف قدم بڑھایا جاسکتا ہے۔اس مقالہ میں اسلامی تہذیب وتعلیمات کی روشنی میں تصور قیادت واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔من حیث القوم ماضی میں جو غلطیاں سرزد ہوئیں اور حال میں جن دشواریوں کا سامنا ہے ان کا تفصیلی وتقابلی جائزہ لیا گیا ہے۔

مقالے کا پہلا باب قیادت کے مفہوم ضرورت اور اہمیت ونوعیت کے لئے مختص کیا ہے۔قرآن وسنت ومسلم وغیر مسلم مفکرین کی قیادت کے بارے میں آراء پر روشنی ڈالی گئی ہے۔قرآن مجید کے سیاسی نظریات میں اہم ترین اقتدار اعلیٰ کا نظریہ ہے اس کی رو سے اقتدار اعلیٰ کسی انسان کے سپرد نہیں کیا گیا۔کیونکہ یہ ظلوم وجہول اتنی بڑی ذمہ داری کا متحمل نہیں ہوسکتا۔مقتدر اعلیٰ اس ذات حقیقی کو قرار دیا گیا ہے۔جو نہ صرف خالق کائنات ہے بلکہ ربوبیت بھی اس ذات کے لئے مسلم ہے۔یہی ذات عقائد واعمال،تدبیر وسیاست دستور وقانون کا سرچشمہ ہے، اقتدار اعلیٰ کے لئے قرآن مجید نے نہایت جامع لفظ ،ملکوت ، استعمال کیا ہے۔جس کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز اللہ ہی کے زیر اقتدار ہے۔فرمایا

من بیدہ ملکوت کل شیءٍ [1]

''وہ کونسی ہستی ہے جس کے زیر اقتدار تمام چیزیں ہیں''

پھر خود ہی فرمایا

فسبحٰن الذی بیدہ ملکوت کل شیءٍ [2]

''پس وہ ذات پاک ہے جس کے زیر اقتدار تمام چیزیں ہیں''

قیادت وحکومت اپنے دائرہ عمل میں کتنی عظیم الشان اور حیرت انگیز چیز ہے۔اس کو ظاہر کرنے کے لئے صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ دنیا کی نظر میں جس قوم کے پاس حکومت ہے اس کے پاس سب کچھ ہے جس کے پاس حکومت نہیں اس کے پاس کچھ نہیں۔جہاں تک انسانی نظریہ کا تعلق ہے پانچویں صدی قبل مسیح کے، یونانی مقننین اور چوتھی صدی قبل مسیح کے رومی علماء قانون کے زمانے سے لے کر آج تک تمام فلاسفر حکومت کے طور طریقوں کے متعلق ہم آہنگ نہیں البتہ حکومت کے اس مفہوم پر سب کا اتفاق ہے کہ وہ ایک ایسی ہئیت حاکمہ کی شکل میں رونما ہوتی ہے جس کی تنظیم انسانی افراد کی اجتماعی تصویر اور تدبیر سے ہوتی ہے یعنی جہاں بانی وجہانداری کا وہ عزم جو زمین کے کسی مخصوص حصہ میں ایک ہیئت حاکمہ اختیار کر لیتا ہے اور اس ہیئت میں اس کا اختیار واقتدار حتمی ہوتا ہے۔

مسلم وغیر مسلم مفکرین نے تصور قیادت کے بارے میں مختلف آراء دی ہیں۔فارابی کا خیال ہے کہ رئیس اول ایسا ہونا چاہیے جسے دوسرے سے کچھ سیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو اس میں مشاہدہ وتبلیغ کی قوت ہو اور مملکت کے تمام امور پر کنٹرول رکھنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔بودین

---

1. المومنون:۲۳/۸۸
2. یٰسین،۳۶/۸۳

کے نزدیک ریاست میں اقتدار ایک شخص کے ہاتھ میں ہونا چاہیے یا ایک جماعت کے ہاتھ میں۔ دو افراد کے ہاتھ میں اقتدار نامناسب ہے کیونکہ اس طرح اقتدار اعلیٰ کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ہیوگو گروٹس نے اقتدار اعلیٰ کو ایک سیاسی قوت سے تعبیر کیا ہے جو ایسے شخص کو دی جاتی ہے جس کے احکام کوئی دوسرا رد نہ کر سکتا ہو۔ اسی طرح مارسگلیو، روسو، ہیگل، نظام الملک طوسی، کیکاؤس، لاک وغیرہ نے اقتدار اعلیٰ کی مختلف تشریحات کی ہیں۔

اس باب میں قیادت کی ضرورت و اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ امت کی اصلاح کے لئے بہترین قیادت کی ضرورت و اہمیت آنحضور ﷺ کے اس فرمان سے واضح ہوتی ہے۔

عن ابن عباسؓ قال النبی ﷺ صنفان من امتی اذا صلحاً صلحت الامة واذاافسدت فسدت الامة، السلطان و العلماء [1]

''میری امت کے دو قسم کے لوگوں کی حالت جب تک درست ہوگی تو امت کی حالت بھی درست اور بہتر ہوگی اور جب ان کی حالت خراب ہو جائے گی تو امت میں بھی بگاڑ اور خرابی پیدا ہو جائے گی۔ ان سے مراد حکمران اور علماء ہیں''

قیادت کی نوعیت کی وضاحت بھی اس باب میں بیان کی گئی ہے۔ یہ قیادت معاشرتی ہو، مذہبی ہو یا سیاسی جب تک قرآن وسنت کے تابع نہ ہوگی صالح نہ ہوگی۔

دوسرا باب قدیم وجدید تصورات قیادت کی وضاحت کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ یونان قدیم میں ارسطو نے قیادت کی تقسیم تین طرح سے کی ہے۔ بادشاہت، اشرافیہ اور دستوریہ

ابن خلدون نے ملوکیت کی فنی اور اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

''استبدادی بادشاہت وہ حکومت ہے جو لوگوں کو بادشاہ کی ذاتی اغراض اور خواہشات پوری کرنے پر مجبور کرتی ہے'' [2]

ملوکیت کے شہنشاہی نظام میں بادشاہ کی منشاء ماخذ قانون ہوتی ہے پوری قوم اور سارا خزانہ اس کی ملکیت ہوتا ہے اور وہ تنقید سے بالاتر سمجھا جاتا ہے تاریخ گواہ ہے کہ جب اقتدار انسانوں کو ملا تو ہوس اقتدار اور خواہش انتفاع نے انسان کو خدائی کا دعویدار بنا دیا کہیں نمرود و فرعون جیسے خدائی دعویدار پیدا ہوئے اور کہیں ظلم و بربریت کی علامت چنگیز و ہلاکو خان منظر عام پر آئے۔

ملوکیت، بادشاہت اور آمریت کا مزاج اور دستور اساسی ہی یہ ہے کہ ظلم و فساد کا بازار گرم کیا جائے عوام کو ذلیل وخوار اور بادشاہ کا غلام بنایا جائے۔ بادشاہ کی بڑائی اور خدائی کو مسلط اور مضبوط کیا جائے اس طرح تھیا کریسی یعنی پاپائیت بھی بادشاہت و آمریت کی دوسری شکل ہے۔ بادشاہ سر پر تاج رکھ کر مظالم کرتا ہے پوپ دلق وقبا پہن کر لوگوں پر اپنی بادشاہی مسلط کرتا ہے۔ تھیا کریسی کی غایت اولیٰ یہی ہے کہ دنیا میں ایک ظالمانہ اور قاہرانہ نظام قائم کیا جائے جن میں لوگوں پر زیادہ سے زیادہ سختیاں کی جاسکیں اور عوام کو باور کرایا جاتا ہے کہ ان سختیوں کو برداشت کرنے سے ہی انسان کی عاقبت درست ہو سکتی ہے۔

بزیر دلق مرصع کمند ہا دارند

درازدستی ایں کوتاہ آستیناں بیں

---

1. ابن عبدالبر: جامع، بیان العلم ۱/۱۸۴
2. مقدمہ ابن خلدون؛ ص ۱۵۱

سوشلزم کا سیاسی نظام تمام تر پرولتاریہ کی آمریت پر قائم ہے جس کی نمائندگی سوشلسٹ پارٹی کرتی ہے اور سوشلسٹ پارٹی کا لیڈر ایسا آمر مطلق ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں مملکت کا سیاہ وسفید ہوتا ہے اسی باب میں جمہوریت پر بھی بحث کی گئی ہے۔

جمہوریت یونانی لفظ ڈیموکریسی سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں عوام کی حکومت' عوام کے ذریعہ، عوام کے لئے۔ اس نظام میں معیار حق اور ماخذ قانون عوام کی مرضی اور منشاء ہوتی ہے۔ جمہور الناس مختار کل اور مقتدر اعلیٰ ہوتے ہیں اور جمہوریت مطلق العنان ہوتی ہے اس نظام کے قومی اور عوامی نمائندوں کے لئے خدا، رسول، دین اور آسمانی کتابوں یا اخلاقی قدروں کی تابعداری ضروری نہیں ہوتی بلکہ عوام کی مرضی اور ان کی پسند کی تابعداری اور وفاداری لازمی ہوتی ہے۔ ڈارون، مارکس، فرائڈ اور اس طرح کے دیگر مغربی مفکرین نے روحانیت سے انکار کر کے مادہ پرستی اور حیوانیت کی تعلیم دی۔ جان لاک، ھیگل وغیرہ سیاسی مفکرین نے لادینی جمہوریت اور عوامی حاکمیت کی آواز بلند کی جبکہ علامہ اقبال جمہوریت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر [1]

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے [2]

تیسرے باب میں قدیم وجدید تصوراتِ قیادت کے اثرات پر بحث کی گئی ہے جن میں بادشاہت، پاپائیت، جمہوریت اور آمریت کے معاشرتی وسماجی اثرات بیان کئے گئے ہیں۔

بادشاہت اس طرز حکومت کا نام ہے جس میں حکومت کے تمام اختیارات فرد واحد کے ہاتھ میں ہوں میکاولی اپنی کتاب 'دی پرنس' میں لکھتے ہیں۔

> ''ایک مطلق العنان بادشاہ جو شر کو دبانے کے لئے شر ہی کا استعمال کرتا ہو، کسی اخلاق کسی مذہب کا پابند نہ ہو، ہر قسم کا مکروفریب جوڑتوڑ کرتا ہو، سازش کرتا ہو اور ہر ممکن طریقے سے اپنے اختیار کو باقی رکھتا ہو۔ وہی بہتر حکمران ہے'' [3]

مغربی مفکر کی اس تعریف سے بادشاہت کی مکمل تصویر واضح ہوگئی۔ اسی طرح قرآن کریم کی آیات اور قصہ موسیٰؑ اور فرعون کے گہرے مطالعے سے ملوکیت وبادشاہت کے جو سیاسی اصول اور لائحہ عمل معلوم ہوتے ہیں وہ دنیا کے ہر شاہی نظام حکومت کا اصول اور طریق کار رہا ہے۔ بادشاہت کے اثرات زمین پر فساد اور انسانوں کی تذلیل کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ان الملوك اذا دخلوا قرية أفسدوها و جعلوا أعزة اهلها أذلة وكذالك يفعلون [4]

''یقیناً بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اس کو خراب کر دیتے ہیں وہاں کے باعزت لوگوں کو بے عزت کر ڈالتے ہیں اور ایسا ہی کرتے رہتے ہیں''

---

1. کلیاتِ اقبال، ص:۶۶۵ 2. کلیاتِ اقبال، ص:۶۳۴
3. D.R. Bhandari, History of European Political Philosophy, P.181 4. النمل: ۳۴/۲۷

اس آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال نے ملوکیت کے معایب کا اس طرح ذکر کیا

آبتاؤں تجھ کو رمز آیہ اِنَّ المُلُوک
سلطنت اقوام عالم کی ہے اک جادو گری

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری [1]

اسی طرح پاپائیت کے باطل نظام میں بھی ملوکیت کی طرح چند افراد خود ہی صاحب امر بن جاتے ہیں۔عوام چارو ناچار ان کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

پاپائیت کی جگہ جمہوریت نے لی جمہوریت اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود برائیوں سے پاک نہیں۔ یہ غیر فطری بے جا اسراف کی حامل طرز حکومت بھی انسانیت کے لئے سودمند ثابت نہ ہوگی۔

جمہوریت یا ڈیموکریسی دراصل بادشاہت اور پاپائیت کے ردعمل میں وجود میں آتی ہے۔ یوں بادشاہ کی سیاسی بربریت اور پوپ کی مذہبی استبداد سے تنگ آئے لوگوں نے بے لگام آزادی کا راستہ اختیار کرلیا۔اور سیکولر جمہوریت کو آزادی کی نیلم پری سمجھ بیٹھے۔آزادی کے شوق میں یہ لوگ بادشاہ اور پوپ کے ساتھ خدا، رسول، مذہب اور اخلاقی قدروں سے بھی آزاد ہو گئے۔عوام کی حاکمیت اور سیکولرازم کا منطقی اثر و نتیجہ بے قید اور مادر پدر آزادی ہی ہوسکتا ہے اور یہ عوام کا جمہوری حق جانا جاتا ہے۔علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری [2]

جمہوری نظام میں اکثریت کی حکومت ہوتی ہے۔اقلیتی گروپ محکوم بن جاتے ہیں اور برسرِ اقتدار گروپ کے مظالم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ عوام کی حکومت نہیں بلکہ ایک مخصوص مراعات یافتہ طبقہ کی حکومت ہوتی ہے اور تمام لوگ ہمیشہ محکوم رہتے ہیں۔

آمریت میں استحکام، مستعدی اور اتحاد کے باوجود اسے ایک اچھی طرز قیادت نہیں سمجھا جاتا۔ یہ بنیادی طور پر انسانی عظمت کے منافی اصولوں پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ طریق قیادت آزادی و مساوات کا دشمن ہے فرد واحد تمام امور پر چھایا ہوتا ہے۔عوام ایسے نظام میں سیاسی دلچسپی سے عاری ہوتے ہیں عوام کی عدم دلچسپی سخت نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ جب عوام حکومت میں کوئی حصہ نہیں لیں گے تو ان کی قوت کار کردگی پر بھی اثر پڑے گا اور جذبہ حب الوطنی بھی کمزور پڑ جائے گا۔

اسی طرح سوشلزم کے حواریوں نے بھی انسانیت کی سخت تذلیل کی ہے۔ان تمام نظام ہائے حکومت میں حکمرانوں کا احتساب نہیں ہو سکتا۔عوام ہمیشہ محکوم وزیرنگیں رہتے ہیں۔ جب کہ دین اسلام میں منصب اور اقتدار خدا کی امانت ہے۔

اس مقالے کا چوتھا باب قرآن وسنت کی روشنی میں تصورِ قیادت کو واضح کرنے کے لئے مختص کیا گیا ہے۔ایک مسلمان قائد مادی و روحانی رہنما ہوتا ہے۔وہ اپنی رعایا کی دنیاوی ضروریات وذمہ داریوں کو کما حقہ پورا کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔اسلام میں قیادت کا تصور حاکمیت کی بجائے خدمت ہے۔قائد کا جذبہ خدمت سید القوم خادمھم، کی تفسیر ہے وہ خدا کے نائب کی حیثیت سے کام کرتا ہے اسلام کا تصور قیادت پاپائیت کے تصور سے جداگانہ ہے۔وہ خدا کا اوتار نہیں نہ ہی لامحدود اختیارات کا مرکز ہے کہ **ان الحکم الا لله** [3] کی رو سے اسلام نے

[1] کلیاتِ اقبال، ص:۳۱۱ [2] کلیاتِ اقبال، ص:۳۱۲ [3] سورۃ یوسف، ۱۲/۴۰

مقتدر اعلیٰ اسی ذات حقیقی کو قرار دیا ہے جو خالق کائنات ہے اور مسلمان قائد کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کے احکام کا اجراء کرنا ہے۔ نیز دینی و دنیوی مصالح کے حصول کے لئے بھرپور سعی کرنا ہے۔ رعایا اس بات کا وعدہ کرتی ہے کہ وہ اس وقت تک مطیع رہے گی جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا اجراء کرتا رہے گا۔ اسلام میں نظام سلطنت چلانے کے لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایسا امیر منتخب کیا جائے جو نہ وراثت کے بل بوتے پر مقتدر اعلیٰ بننے کا حق جتائے اور نہ ہی ایسا شخص جس کو عوام ناپسند کریں۔ اس کا انتخاب اہلیت، صلاحیت، علم و قابلیت کی بنا پر ہوتا ہے نہ کہ جاہ و اقتدار یا مال و دولت کی بنا پر۔ اس کے مفاد عوام الناس کے مفاد سے جدا نہیں ہوتے بلکہ عوام ہی کے فائدہ میں اس کا فائدہ مضمر ہوتا ہے۔ اسلامی قائد کا فرض منصبی اقامت دین اور نفاذ شریعت ہے اور عوام کے حقوق کا تحفظ کرنا ان کے جان و مال و عزت و آبرو کی حفاظت کرنا اور ان کے بنیادی انسانی اور اسلامی حقوق کی پاسداری کی ذمہ داری ہے۔ ارتکاز اختیار کی بجائے احساس مسؤلیت و مواخذہ اس کے دامن گیر رہتا ہے۔

اس باب میں اسلامی تصور قیادت کا عصری تصور قیادت سے موازنہ بھی کیا گیا ہے۔

پانچواں باب قیادت کی صلاحیت اور معیار اخلاق سے متعلق ہے۔

قائد کے لئے ذہنی و جسمانی طور پر صحت مند اور مضبوط ہونا ضروری ہے قرآن مجید نے بھی سربراہِ مملکت کی انہی دو صفات کی طرف اشارہ کیا ہے

وزاده، بسطةً فی العلم و الجسم [1]

''اور اس کو علم اور جسم دونوں میں بڑھا دیا''

یونانی مفکر افلاطون کے نزدیک بھی مقتدر اعلیٰ کو سب سے زیادہ عالم اور سب سے زیادہ قوی ہونا چاہیے۔

نیز مسلمان قائد کے لئے ان خصوصیات کا حامل ہونا لازم ہے مسلمان ہو، عاقل و بالغ ہو جسمانی طور پر بے عیب ہو، سیاست حاضرہ اور جدید تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتا ہو علوم دینیہ کا ماہر ہو۔ تقویٰ، امانت اور عدل کی صفات رکھتا ہو، شجاع ہو صاحب الرائے ہو۔

شاہ ولی اللہ کہتے ہیں کہ قائد کو اعلیٰ نسب ہونا چاہیے۔ متقی اور خداترس ہو' بلند اخلاق ہو' شجاع ہو' محبّ ملک و ملت ہو' رحمدل' اہل تدبرو معاملہ فہم' صحت مند و توانا' منصف اور سخی ہو نیز علم و فن کا قدردان ہو۔

علامہ اقبال قائد کے بارے میں فرماتے ہیں۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے [2]

ماوردی کے نزدیک امام کا مرد ہونا، عاقل و بالغ اور آزاد ہونا ضروری ہے کردار کا بہت بلند ہو، عدالت، سخاوت، شجاعت، تواضع اور اولوالعزمی اور ثابت قدمی کا مالک ہو حواس و اعضا صحیح سلامت ہوں اتنا علم ہو کہ اجتہاد کر سکے اور پیچیدہ سے پیچیدہ مقدمات کا فیصلہ کر سکے۔

امام غزالی نے قائد کے وہی اوصاف گنائے ہیں جو ماوردی نے بیان کئے ہیں تاہم بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر جا بجا ماوردی کے بیان کردہ اوصاف میں تبدیلیاں کی ہیں۔ غزالی علماء سے مشورہ لینے اور ان سے ہدایت حاصل کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ خلیفہ جب تک شرعی علوم سے واقف نہ ہوگا عوام اس کی اطاعت نہیں کریں گے۔ ماوردی کی طرح وہ عدالت، تواضع و سخاوت اور رحمدلی کو فرمانروائی کا جوہر سمجھتے ہیں۔ مگر آج کے دور میں یہ خصوصیات مفقود ہیں اور صرف مال و دولت کو ترجیح

[1] البقرہ:۲/۲۴۷ [2] کلیاتِ اقبال،ص:۳۹۵

حاصل ہے۔علامہ اقبال کہتے ہیں۔

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برق طبعی نہ رہی، شعلہ مقالی نہ رہی

رہ گئی رسم اذاں، روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقین غزالی نہ رہی [1]

اسلام نے اولی الامر کا جامع اور ہمہ گیر تصور پیش کیا ہے۔اس کے پیش نظر قرآن وحدیث اور آئمہ کرام اور فقہائے اسلام کے فرامین کی رو سے اولی الامر کا ان تمام صفات سے متصف ہونا ضروری ہے کیونکہ اس کا ہر عمل دوسروں کے لیے نمونہ اور قابل تقلید ہوتا ہے۔اس اصول کو حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے۔

''لوگ اس وقت تک اپنی سیدھی راہ پر قائم رہیں گے جب تک ان کے حکام اور رہنما سیدھے راستے پر رہیں گے''

چھٹا باب: اسلامی تصور قیادت کے اثرات کی نشاندہی کے لئے ہے اسلامی تصور قیادت معاشرہ کو اسلامی عقائد، اسلامی نظریات، اسلامی جذبات، اسلامی اخلاق، اسلامی رسوم وروایات، اسلامی قوانین کی بالادستی اور سیادت عطا کرتا ہے اور ان کو عزت ووقار سے سرفراز کرتا ہے اسلامی تصور قیادت امت مسلمہ کو ہر طرح کی مشکلات کے عذاب سے نجات دلاتا ہے خواہ یہ مشکلات معاشرتی واقتصادی ہوں' سیاسی یا عسکری ہوں یا فکری واخلاقی' اسلامی نظام ایک ایسا حل پیش کرتا ہے جو امت مسلمہ کو فتنہ وفساد' اضطراب ودرماندگی اور ذلت ورسوائی سے نجات دلاتا ہے اسلام نے اہل ثروت اور فقراء کے درمیان اجتماعی ذمہ داری اور اجتماعی کفالت کو واجب قرار دیا ہے۔جس سے رعیت کے معاشی مسائل حل ہوتے ہیں یہ تصور قیادت لوگوں کو فقراء کی سطح سے بلند کرنے کی پوری پوری جدوجہد کرتا ہے اور اہل دولت لوگوں کی سرکشی کے آگے بند باندھتا ہے۔اسلام کے دائرہ میں آنے کے بعد رنگ ونسل اور علاقائی تعصّبات سے بالاتر ہو کر ہر فردامتِ واحدہ کا حصہ بن جاتا ہے۔

ساتواں باب: اسلامی تصور قیادت کے مفقود ہو جانے کے اسباب واثرات کے لئے متعین کیا گیا ہے۔

آنحضور ﷺ نے جس اسلامی قیادت کی بنیاد رکھی تھی اس میں مقتدر اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات مبارک تھی۔خلفائے راشدین نے اپنے آپ کو اللہ اور رسول ﷺ کا نائب تصور کیا اور اسلامی احکام پر عمل کرتے رہے۔ان کے عہد میں شوریٰ اور اجماع کو اہمیت حاصل تھی۔خلافت موروثی نہ تھی لیکن خلفائے راشدین کے بعد خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر دیا گیا۔اور شخصی حکومت قائم ہوگئی۔شخصی حکومت میں باپ کے مرنے کے بعد بیٹے یا بھائی تخت نشین ہوتے رہے اور یوں غیر شرعی نظام حکومت نافذ ہوگیا۔

سب سے بڑی بات یہ کہ امراء وخلفاء اخلاقی انحطاط کا شکار ہو گئے اور عیش وعشرت میں پڑ گئے ایک علاقے کا حکمران اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگا۔اس احساس تفاخر نے خانہ جنگی کو ہوا دی عرب وعجم کے مسلمانوں کی آپس میں جنگیں چھڑ گئیں۔

عیش پرستی اور مسلسل جنگ وجدل سے اقتصادی کمزوری پیدا ہوئی مسلمان قیادتیں غیر مسلم قیادتوں کے زیر نگیں ہوتی چلی گئیں ان امراء نے شخصی رنجشوں کا بہانہ بنا کر مخلص وصالح لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے سے بھی گریز نہ کیا۔مثلاً موسیٰ بن نصیر جیسا عظیم وفاتح جرنیل سلیمان کے عتاب کا شکار ہوا اور محمد بن قاسم جیسے فاتح سندھ کو حجاج دشمنی کی بنا پر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

ان صاحب اقتدار لوگوں نے اسلامی شریعت کے احیاء کی کوشش نہ کی بلکہ اسلامی عقائد کے علی الرغم یونانی وعجمی اور ہندی افکار اسلامی

[1] کلیاتِ اقبال،ص: ۲۴۷

تعلیمات میں داخل کرائے اور انہیں منوانے کے لئے جبر و تشدد سے کام لیا اس سے بے شمار فرقے اور تحریکیں پیدا ہوئیں بلکہ آج تک یہ سلسلہ جاری ہے اور یہ تحریکیں اور فرقے اپنے عقائد کی تبلیغ و اشاعت کے باب میں جبر و تشدد سے کام لیتے تھے اور لیتے ہیں۔ اس طرح مسلمانوں میں فرقہ پرستی کا دور دورہ ہو گیا اور ملت اسلامیہ کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ مسلمان انتشار اور بدنظمی کا شکار ہو گئے اور ان کے مقابلہ میں غیر مسلم قوتیں متحد ہو گئیں۔

مسلمانوں کے خلاف بلاواسطہ یا بالواسطہ ہر قسم کی مشکلات پیدا کی جا رہی ہیں۔ غیر مسلم اقوام اسلام کو سیاسی خطرہ بھی سمجھتی ہیں انہیں یہ خوف دامن گیر ہے کہ اسلامی قیادت کے تصور میں شامل اسلامی روح کا احیاء مسلمانوں کی خوابیدہ قوتیں بیدار کر دے گا اور انہیں دوبارہ مغرب سے مہم جوئی پر اکسائے گا۔ اس بے جا وہم پر جو غیر مسلم دنیا کو عموماً اور ہمارے غیر مسلم شہریوں کو خصوصاً درپیش ہے قابو پانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اسلام کے معاشرتی و سیاسی منصوبے کی توضیح کر سکیں اور بتا سکیں کہ اس کا مقصد مسلم و غیر مسلم دونوں کے لئے یکساں اور منصفانہ ہے حقیقی اسلامی ریاست کے قیام کے لئے ہمارے محرک صرف اخلاقی مصالح ہیں۔ مختصر یہ کہ ہم پر فرض ہے کہ پوری دنیا پر ثابت کر دیں کہ ہم حقیقتاً قرآن کریم کے ان مقدس الفاظ کا عملی پیکر بن کر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنكر و تومنون بالله[1]

"تم تمام امتوں میں سے بہتر امت ہو جو لوگوں کے لئے ظہور میں آئی ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے روکتے ہو اور اللہ پہ ایمان رکھتے ہو"

طریق تحقیق کے ماخذ میں سب سے زیادہ مستند، سب سے زیادہ صحیح قرآن پاک ہے۔ جس کی صحت اور معتبری میں مسلم کیا غیر مسلم بھی شک نہ کر سکے۔ دوسرا ماخذ احادیث نبویؐ ہیں تیسرا ماخذ تاریخ کی کتب ہیں۔ چوتھا ماخذ سیاست و قیادت سے متعلق کتب ہیں جو قدیم و جدید مفکرین کی محنت و کاوش کا نمونہ ہیں۔ دور حاضر میں اسلام کو ایک انقلابی ضابطۂ زندگی کے طور پر پیش کرنے کے لئے اس دور کے علمی و تحقیقی کام سے پوری طرح استفادہ کیا گیا ہے اور پیش کرنے کا انداز بھی زمانۂ رواں کے تقاضوں کے مطابق بنانے کی سعی کی گئی ہے۔

جن علماء کی کتب سے استفادہ کیا گیا اگر ان کے نام دورانِ بحث آئے تو حوالہ میں صرف کتاب کا نام درج کیا گیا ہے بصورتِ دیگر مصنف و کتاب کا نام لکھ دیا گیا ہے۔ جن مفکرین و محققین کے نظریات و خیالات نے میرے افکار کو زیادہ متاثر کیا لاشعوری طور پر میں انہی کے انداز میں بغیر حوالہ کے لکھ گئی تو اس مماثلت کے لئے معذرت خواہ ہوں تحقیق کے ایک مبتدی کی حیثیت سے اتنے بلند پایہ لوگوں کے خیال سے ذرا سی بھی ہم آہنگی میرے لئے باعثِ فخر ہے۔

میں نے اس موضوع پر کئی سال لگائے ہیں یہ عرصہ مشکلات، الجھنوں اور گوناگوں مصروفیات سے پُر تھا اگر ایک دن کام ہوتا تو حوادثِ زمانہ کئی دن تک کا وقفہ ڈالتے اگر چند ہفتے فرصت ملتی تو کوئی ماہ اس سلسلے کو منقطع کرنا پڑتا۔ اس میں ذرا بھی تعجب نہیں کہ میں جس انداز و اسلوب میں اسے لکھنا چاہتی تھی وہ صورت اسے دے نہ سکی۔ نہ ہی اس میں وہ تیقن ہے جو ہونا چاہیے تھا۔ تاہم یہ میری وسعتِ نفس کی انتہا ہے اور میری کاوش کی حد ہے۔

لا يكلف الله نفسا الا وسعها لها ما كسبت وعليها مااكتسبت ربنا لا تواخذنا ان نسينا او اخطانا ربنا ولا تحمل علينا اصراًكما حملته على الذين من قبلنا ربنا و لا تحملنا مالا طاقة لنابه واعف عنا، واغفرلنا ، وارحمنا ، انت مولٰنا فانصرنا على القوم الكافرين ۝ آمین

وما توفيقي الا بالله عليه توكلت واليه انيب

---

[1] آل عمران: ۳/۱۱۰

فہرست

پہلا باب

قیادت، تعارف،
ضرورت و اہمیت اور نوعیت

فصل اول

الف) قیادت کا مفہوم

انسان فطرتاً ''مدنی الطبع''، یعنی اجتماعیت پسند ہے۔مل جل کر زندگی بسر کرنا اس کی فطرت کا تقاضا ہے اسی فطری تقاضا کی بدولت انسان دوسروں سے سیکھتا ہے ۔جس سے متاثر ہوتا ہے اس کی نقل کرتا ہے ۔ اسی جیسا بننا چاہتا ہے۔ ہر ماں باپ اپنے بچوں کے لئے مثال (Ideal) ہوتے ہیں۔لیکن مشاہدے اور تجربات کے ساتھ محور بدل جاتے ہیں اور عملی زندگی کے تقاضے ان نظریاتی مثالوں کے نقوش جلد مٹا دیتے ہیں اور شعوری طور پر انسان ان لوگوں کو آئیڈیل کی حیثیت دینا شروع کر دیتا ہے جو زندگی کے کسی خاص شعبے سے شہرت رکھتے ہوں اور اسی شعبے سے متعلق دوسرے افراد بھی اس سے متاثر ہوں۔اسی طرح زندگی کے ہر شعبے سے متعلق آئیڈیل مختلف ہوسکتا ہے اور اس صورت میں اگرچہ انسان مختلف شعبہ ہائے حیات میں مختلف لوگوں سے ہدایت لیتا ہے یا ان کی زندگی سے اپنے مطالعے یا مشاہدے کے مطابق ہدایت حاصل کرتا ہے لیکن ان مثالوں (Ideals) کی حیثیت بہرصورت انفرادی رہتی ہے کیونکہ اس عمل کا تعلق انفرادی ذاتی تاثر سے ہے جسے داخلی (Subjective) کہا جاتا ہے۔ان میں اجتماعی قیادت کی نہ صلاحیت ہوتی ہے اور نہ ان کی خصوصیات۔

زندگی کے تمام شعبوں میں صرف سیاست ایسا شعبہ ہے جس میں قیادت کی اجتماعیت موجود ہے۔اس امر کا اصل سبب یہ ہے کہ سیاست میں ایک جغرافیائی حدود کے یکساں مذہبی، تمدنی، معاشی اور معاشرتی مسائل تمام لوگوں کو باہمی طور پر قومیت کے شعور یا اس کے احساس سے منسلک رکھتے ہیں اور قوم پرستی یا وطن پرستی کا یہی جذبہ مرکزیت کے ساتھ اس ذات میں مرتکز ہو جاتا ہے جس کی قیادت کے زیر سایہ بالواسطہ ہر شعبہ زندگی کو فروغ ملتا ہے۔اس لئے مفکرین مغربی ہوں یا مشرقی ، قیادت (Leadership) کو اسی حوالے سے استعمال کرتے ہیں۔البتہ قیادت کے اغراض ومقاصد اور قائد کی خوبیوں، صلاحیتوں اور ذمہ داریوں کے بارے میں مفکرین کے مختلف آراء ہیں جن کا جاننا اور جانچنا ضروری ہے۔

لفظ 'قیادت' ماہرینِ لغت کے تناظر میں

لفظ قیادۃ ، قاد یقود ، قوداً سے مصدر کا صیغہ ہے وقیادۃ الجیش،لشکر کا سردار ہونا مراد ہے القائد اسم فاعل ہے۔[1]

'قاموس مترادفات' میں 'قائد' کے معنی ،سردار، رہنما، سرغنہ، سالار اور رہنما کے ہیں۔[2]

لسان العرب کے مؤلف امام علامہ ابن منظور لکھتے ہیں:

والقائد۔ واحد القواد والقادة ورجل قائد من قوم۔ قوّد وقوّاد وقادة وأقاده خيلاً اعطاه ايا ه يقودها، وأقدتك خيلاً تقودها

قائد قواد کا واحد ہے قوم کے رہنما کے لئے استعمال ہوتا ہے قود سے مراد وہ مخصوص گھوڑے بھی ہیں۔ جو سپاہ اپنے ساتھ بوقت ضرورت استعمال کرنے کے لئے رکھتے ہیں قود کا اسم فاعل قائد ہے جس کی جمع قواد ہے۔ جو کسی بھی ادارہ کے رہنما، نمایاں شخصیت امام، حاکم کے لئے استعمال ہوتا ہے اسی مناسبت سے ''القائد من الجبل'' کی اصطلاح پہاڑ کی چوٹی کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔[3]

---

۱ لوئس معلوف، المنجد، ص: ۶۴۷　　۲ قاموس مترادفات، وارث سرہندی، ص: ۸۴۷　　۳ لسان العرب: ۳۴۱/۱۱

جے۔ملٹن کیون(J.Milton Cawan) القیادہ کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔القیادۃ سے مراد Leadership اور Command کے ہیں۔اس کا اسم فاعل قائد یعنی Leader, High Rank Officer ہے جس کی جمع قوادٗ قادۃ' قادات وغیرہ ہیں۔ ۱

یونیورسٹی آف ٹینیسی (University of Tennessee) کے معروف سکالرز ڈان نمو(Dan Nimmo) اور تھامس انگز (Thamas Ungs) قیادت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"Leadership means mobilizing and coordinating the activities of people in the persuit of collective goals" 2

''قیادت کے معنی مشترکہ مقاصد کے حصول کے لیے لوگوں کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا اور بروئے کار لانا ہے''

قیادت اس شخص یا گروہ کو بھی کہتے ہیں جو قائد کے طور پر کسی گروہ یا جماعت کے آگے چل رہا ہو۔باقی لوگ اس کے پیچھے چل رہے ہوں،قیادت کا لفظ واحد کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور جمع کے لئے بھی۔

قیادت مادہ اوراصل کے بارے میں ماہرین لغت کا اتفاق ہے کہ یہ لفظ '' قـود '' سے ہے،چنانچہ مرتضٰی زبیدی نے قائد اور قیادت وغیرہ کو اسی سے مشتق ذکر کیا ہے۔ان کے نزدیک یہ ''سوق'' کی نقیض ہے،کیونکہ جانور کی نکیل پکڑ کر آگے چلنے کے لئے'' یقود الدابۃ' 'اور پیچھے سے ہانکنے کے لئے'' یسـوقـھـا'' استعمال ہوتا ہے۔گویا 'قودٗ آگے ہو کر راہنمائی کرنا ہے۔نیز اسی سے قیادۃ (ق کے کسرہ کے ساتھ) آتا ہے مرتضٰی زبیدی نے بطور استشہاد حسان بن ثابت کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے۔

واللہ لو لا ما اصاب نسورھا بـجـنـوب سایۃ امـس بالتقـواد ۳

علامہ زبیدی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں قیادۃ،قائد کا مصدر ہے جو زمین پر طویل اور واضح چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے گویا اسی طرح کسی حصۂ زمین پر عظیم مرتبہ وحیثیت والے شخص کو بھی قائد کہتے ہیں اور وہ حیثیت ومرتبہ بھی اس کی ''قیادت'' کہلاتی ہے۔ ۴

مولانا وحید الزمان نے ''القاموس الوحید'' میں قیادت کی وضاحت زبیدی ہی کے انداز میں کی ہے۔ ۵

قرآن حکیم میں سربراہی اور اقتدار اعلیٰ کے لئے لفظ قیادۃ استعمال نہیں کیا گیا۔فرمانروا کے لئے 'ولی' کا لفظ خاص ہے۔قرآن میں جابجا ولی کا لفظ اسی مفہوم کو پیش کرتا ہے ولایت ولی کا فعل ہے جو حکومت کے ہم معنی ہے قرآنی اصطلاحات کے ماہر علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔''ولایت کیا ہے،والی امر ہونا حکومت کا مالک ہونا اور ولایت کی حقیقت کیا ہے،حکومت کی سربراہی'' ۶

علامہ ابو البقاء حنفی اپنی کتاب کلیات میں اس سے بھی زیادہ بہتر الفاظ میں نظریہ ولایت اور حکومت کے ربط کو ظاہر کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔''ولایت کی مراد امداد اور حمایت ہے اور ولایت کا مفہوم سلطنت اور مملکت ہے۔جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ایک شخص انسانی ہیئت کا والی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ منصب ولایت (حکومت) پر متمکن ہے۔ ۷

---

۱ A Dictionary of Modern Written Arabic, P: 795-96

۲ Political Patterns in America, P:161-162

۳ مرتضٰی زبیدی،تاج العروس،۵/۲۰۹

۴ تفصیل کے لئے دیکھئے ''تاج العروس'' ۵/۲۰۹

۵ وحید الزمان،القاموس الوحید،ص:۱۳۶۵

۶ امام راغب اصفہانی،مفردات القرآن،لفظ ولی،ص:۵۵۵

۷ ابو البقاء حنفی،کلیات العلوم،ص:۶۸۱

اسلامی مفکرین نے مختلف شعبوں میں رہنمائی کرنے والوں کے لئے امام کا لفظ استعمال کیا ہے جیسے امام الفقہ ، امام الحدیث، امام التاریخ (ابن خلدون نے مسعودی کو کہا) وغیرہ امام الصلوٰۃ آج بھی پیش نماز کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں قانونی حوالے کے تحت لکھا ہے کہ امام وہ ہستی ہے جو سب کے آگے ہو اور سب کا رہنما۔ امام قافلہ کا وہ رکن ہے جو آگے آگے چلتا ہے۔ امام زعیم امت ہے اور اسلامی نظام کا رئیس اور صدر ہے۔[۱]

ابن رشدؒ نے اپنی کتاب بدایہ المجتہد میں سلطان العلماء امام علاء الدین کا شانی نے بدائع میں اور علامہ احمد نصر مالکی نے المختصر کی تعلیقات میں اسلامی حکومت کے رئیس کو امام اعظم کے خطاب سے یاد کیا ہے۔[۲]

اکثر اسلامی مفکرین نے ''اولوالامر'' بھی اسی ہستی کو تصور کیا ہے جو حکومت پر فائز ہو۔

علامہ ابو بکر جصاص حنفی لکھتے ہیں

''یہ اس شخص کا خطاب ہے جو اجرائے احکام کا منصب رکھتا ہے یعنی وہ ذمہ دار ہستیاں جو حکومت پر فائز ہوتی ہیں۔[۳]

علامہ ابو حیان تصریح کرتے ہیں کہ ''اولوالامر وہی ذمہ دار ہستی ہوسکتی ہے جو امر بالمعروف کی پابند ہو اور نظام امت کو اچھے اصولوں پر چلائے۔[۴]

قیادت کے بارے میں مغربی مفکرین کی آراء: قیادت کے بارے میں مغربی مفکرین نے مختلف نظریات پیش کئے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

مارسگلیو (Marsiglio): مارسگلیو عوام کی حاکمیت اور جمہوریت کی روح پر راسخ عقیدے کا حامل تھا اس کے خیال میں عوام ہی سرچشمہ اقتدار ہیں اسی لئے وہ عوام کی ایک جماعت یا اسمبلی کو اقتدار کا سرچشمہ اور منبع قانون قرار دیتا ہے [۵] مارسگلیو نے ایک منتخب بادشاہ کو ترجیح دی ہے۔اس کے خیال میں بادشاہت بہترین طرز حکومت ہے۔

اہل روم کے خیال میں ریاست چونکہ ایک قانونی حاکمیت کا نام ہے لہذا سیاسی حاکمیت مجموعی اعتبار سے عوام کے قبضے میں رہتی ہے نظریاتی طور پر بادشاہ بھی عوامی نمائندے سمجھے جاتے تھے جن کی اطاعت دراصل قانون کی اطاعت سمجھی جاتی تھی۔ روم میں نہ صرف سیاسی حاکمیت عوام کے ہاتھ میں رہی بلکہ عوامی اسمبلیوں سے مشورہ اور ان کی رضامندی سے قوانین بھی وضع کئے جاتے تھے۔[۶]

جین بودین (Jean Bodin): پندرھویں صدی میں اقتدار اعلیٰ ، برتری حاکمیت یا فوقیت کے لئے سب سے پہلے کچھ فرانسیسی مفکروں نے Sovereignty کا لفظ استعمال کیا۔تاہم بودین پہلا شخص ہے جس نے اس لفظ کے جدید نظریے کو صراحت کے ساتھ بیان کیا اس کی وضاحت اس نے اپنی کتاب Republica میں کی ہے اور اقتدار اعلیٰ کی نوعیت اور خواص بیان کئے ہیں۔اس کے مطابق اقتدار اعلیٰ کو مطلق ہونا چاہیے خواہ اقتدار ایک شخص کے ہاتھ میں ہو یا عوام کی ایک جماعت کے ہاتھ میں۔ بودین بادشاہ کو خدا کا نائب ارضی تصور کرتا ہے۔رعایا پر اس کی اطاعت فرض ہے اس کی اطاعت سے گریز خدا کی اطاعت سے گریز کے مترادف ہے۔بودین اپنی کتاب "Republica" میں قیادت

---

[۱] دائرۃ المعارف الاسلامیہ:۳/۶۱۲　[۲] بدایۃ المجتہد ۲/۲۹۵، بدائع الصنائع ۷/۳،المختصر ص:۵۵

[۳] احکام القرآن:۲/۳۵۱　[۴] البحر المحیط:۳/۲۸۷

[۵] Sir Frederick Pollock, History of The Science of Politics,P:42

[۶] R. H. Murray, The History of Political Science, P: 181

کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ رعایا پر ایسا اقتدار ہے جو قانون سے بالاتر ہے۔[۱]

ہیوگو گروٹس (Hugogrotius): ہیوگو گروٹس نے اقتدار اعلیٰ کو ایک سیاسی قوت قرار دیا ہے جو ایسے شخص کو دی جاتی ہے جس کے احکام کو کوئی دوسرا شخص رد نہیں کرسکتا۔[۲]

جان لاک (John Locke): جان لاک نے قیادت کی برتری عوام کو دی ہے۔[۳] مقننہ اور بادشاہ کو اس نے صرف امین قرار دیا ہے۔

تھامس ہابس (Thomas Hobbes): تھامس ہابس پہلا مفکر ہے جس نے ایک مطلق العنان مقتدر اعلیٰ کا تصور نہایت وضاحت سے پیش کیا ہے

ھیگل (Hegel): ھیگل کے نزدیک حاکمیت ان لوگوں کی نہیں جو عوام کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ ریاست میں اصل حاکمیت ایک قانونی وجود کی ہے۔[۴]

روسو (Jean Jacques Rousseu): عصر جدید کے سرکردہ علماء قانون وفلاسفر میں روسو اپنی فکر کے اعتبار سے ابن خلدون و ابی البقاء کی تصریح سے قریب ہے۔ روسو کے نزدیک سلطنت کی بنیاد معاشرہ پر ہے ایک مجتمع گروہ یا شہریوں کی تعداد جو ایک سلطنت کے قیام کے لئے باہم متفق ہو گئے ہوں مملکت کی اعلیٰ طاقت کا مظہر ہے۔[۵]

جیمس برائس (James Bryce): مشہور انگریزی قانون دان وائی کاؤنٹ جیمس برائس کے نزدیک ''ایک سیاسی طاقت جو شخص یا جماعت اس سیاسی طاقت کو استعمال کرے وہ حکمران ہے اگر ایک شخص اس سیاسی طاقت کا سربراہ ہے تو حکومت شخصی ہوگی اگر سیاسی طاقت عوام کے ہاتھ میں ہے تو حکومت جمہوری ہوگی۔[۶]

قیادت کے بارے میں مسلم مفکرین کی آراء:

ابو البقاء: علامہ ابو البقاء جو گیارھویں صدی ہجری میں امام ابو حنیفہؒ کے قانونی طبقہ کے ایک ممتاز رکن اور قانونی معلومات کے مانے ہوئے شارح قرار دیئے گئے ہیں وہ قیادت کے بارے میں کہتے ہیں۔

''حکم اور امتناع حکم کی صورت میں ایک ایسا تصرف جس کا مقصد ومنشا اصلاح ہو''۔[۷]

فارابی: فارابی معیاری ریاست کے سربراہ کو رئیس الاول کا نام دیتا ہے رئیس اول کو وہ ایک نہایت طاقتور اور فاضل شخص کا ہونا ضروری قرار دیتا ہے۔ فارابی کے مطابق رئیس اول کو مملکت کے اصولوں کے تعین، کسی چیز کے جانچنے پرکھنے اور فوراً کسی نتیجے پر پہنچنے پر عبور حاصل ہو۔ فارابی حکومت اور جسم انسانی میں مماثلت قائم کرتا ہے سربراہ مملکت کو وہ ''دل'' سمجھتا ہے اور مملکت کے دوسرے تمام عہدیداروں کو جسم کے دیگر اعضاء کی حیثیت دیتا ہے۔ رئیس اول کو ''دل'' کہہ کر فارابی نے اس کی اہمیت واضح کی ہے۔ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ رئیس الاول میں قیادت، قوت اور اعلیٰ ذہن ہونا بہت ضروری ہے تاکہ دوسرے لوگوں میں اس نوع کی صلاحیتیں حتی الوسع پیدا کر سکے۔ فارابی نے رئیس الاول کا لفظ سربراہِ مملکت کے لئے اس لئے استعمال کیا ہے کہ اس نے ہر شعبے کی قیادت کے لیے ایک قائد کا نظریہ پیش کیا ہے ان تمام قائدین میں جو

۱۔ D.R. Bhandari, History of European Political Phisolophy, P: 238
۲۔ Eddy Asirvatham, Political Theory, P:62
۳۔ Eddy. Asirvatham, Political Theory, P: 103
۴۔ Vidya Dhar Mahajan, Recent Political Thought, P:80
۵۔ روسو، معاہدہ عمرانی، ص:۱۹۹
۶۔ Modern Democracy, P:106
۷۔ ابو البقاء، کلیات، ص:۲۸۰

ذہنی وجسمانی قوت اور اوصاف کے اعتبار سے سب سے آگے ہو اس کو رئیس الاول یعنی سربراہ مملکت تسلیم کر لینا چاہئے۔[۱]

نظام الملک طوسی: نظام الملک طوسی کے نزدیک بادشاہ مامور من اللہ ہوتا ہے لہٰذا وہ عوام کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا۔[۲] اسی لیے عوام کو اسے معزول کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ گو اس نے بادشاہ کو مطلق العنان قرار دیا ہے تاہم اس نے بادشاہ پر اتنی پابندیاں عائد کی ہیں کہ مطلق العنانی کا وجود عنقا ہو جاتا ہے۔

کیکاؤس بن سکندر: کیکاؤس کے مطابق بادشاہ مثل آفتاب ہے جس کی روشنی اور حدت امیر و غریب سب کے لیے یکساں ہے۔ کیکاؤس ایک مطلق العنان بادشاہ کا قائل ہے۔[۳] مشوروں سے منع نہیں کرتا مگر بادشاہ کو مشورہ حاصل کرنے کے بعد خود کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے کہتا ہے اسی لئے وہ بادشاہ کا عاقل ہونا ضروری سمجھتا ہے۔

امام غزالی: مقتدر اعلیٰ کے لئے امام غزالی کا استدلال نہایت منطقی ہے امام غزالی امام کو زمین پر خدا کا نائب لکھتے ہیں چنانچہ خلافت و امامت کو انتہائی ذمہ دار عہدہ قرار دیتے ہیں۔ امامت ہی مفاد عامہ کا اہم ترین ادارہ ہے نیز امام کے بغیر اسلامی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ امام غزالی کے مطابق دین کا نظام، دنیا کے نظام پر قائم رہتا ہے بعینہ دنیا کا نظام امام یا خلیفہ کے بغیر نامکمل بلکہ ناممکن ہے۔ چنانچہ نظامِ دین اسی صورت میں اور مستحکم رہ سکتا ہے کہ لوگ امام کی اطاعت کریں۔[۴]

ابن تیمیہ: ابن تیمیہ نے امور حکومت اور مملکت کو امام، خلیفہ یا سربراہ حکومت کے ہاتھوں میں ایک امانت قرار دیا ہے اور سربراہ مملکت کو ان کا امین۔ امام ابن تیمیہ دین کی گہری بصیرت رکھنے والے مجددین میں سے ہیں، فرماتے ہیں۔

"ان ولایۃ امر الناس من اعظم واجب الدین بل لا قیام للدین الا بھا" [۵]

"حقیقت یہ ہے کہ امت کے اجتماعی معاملات سرانجام دینا دراصل دین کے اہم ترین اور بڑے واجبات میں سے ہے بلکہ اقتدار اعلیٰ کے قیام کے بغیر تو درحقیقت دین قائم ہی نہیں ہو سکتا"۔

سربراہ مملکت کے لئے عدل کو انہوں نے لازمی قرار دیا ہے کیونکہ اسی پر دنیا و دین کی فلاح ہے اس کے بغیر دنیا و آخرت دونوں ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں۔ ابن تیمیہ نے سربراہ مملکت پر صبر و تحمل، غصہ پر قابو، عفو و درگزر، تکبر سے نفرت، ہوس کی مخالفت، شر سے گریز کو بطور فرض عائد کیا ہے اور حاکم و عوام دونوں کو اس امر کا پابند کیا ہے کہ وہ اپنے فرائض پوری طرح ادا کریں۔[۶]

ابن خلدون: ابن خلدون یہ تسلیم نہیں کرتے کہ خلیفہ اس زمین پر خدا کا نائب ہے۔ ان کے مطابق خلیفہ اللہ کا نہیں بلکہ رسول کا نائب ہوتا ہے۔ ابن خلدون پوری مملکت کے لئے صرف ایک خلیفہ کے قائل ہیں۔ ایک سے زیادہ خلیفہ کے انتخاب کو غلط سمجھتے ہیں۔ تاہم ابن خلدون اولین مفکر ہے جس نے اس صورت میں ایک سے زائد خلفاء کے وجود کو جائز تسلیم کیا ہے کہ مملکت کی وسعت اور فوجی قوت میں گہرا تعلق ہے۔ سلطنت جس قدر وسیع ہو حکومت بھی اسی قدر مضبوط ہونی چاہیے۔ لہٰذا اگر ایسی وسیع حکومت میں بہتر نظام کے قیام کے لئے زائد خلفا بھی ہوں تو کوئی بری بات نہیں۔ اس کے نزدیک خلیفہ میں چار صفات کا ہونا ضروری ہے۔ یعنی خلیفہ درست حواس اور درست اعضائے جسمانی کا مالک ہو۔

---

۱. Hamid A.K.Rai, History of Political Philosohy, P: 649

۲. سیاست نامہ، ص:۱۳　۳. صلاح الدین ناسک، افکار سیاسی، ص:۱۹۳

۴. پروفیسر رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص:۱۲۸　۵. السیاسۃ الشرعیہ، ص:۱۶۱　۶. صلاح الدین ناسک، افکار سیاسی، ص:۵۳۰

علم وفضل اور عدل وانصاف والا ہو۔[۱]

شاہ ولی اللہ: شاہ ولی اللہ خلیفہ کو خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ خلیفۃ الرسول تسلیم کرتے ہیں اور جو خلیفہ کی اطاعت کرتا ہے وہ بلاشبہ احکام رسالت مآبؐ کی اطاعت کرتا ہے وہ اپنی فارسی تصنیف ''ازالۃ الخفاء'' میں فرماتے ہیں

''واجب بالکفایہ است بر مسلمین الی یوم القیامۃ نصب خلیفہ مستجمع شروط''[۲]

''قیامت کے دن تک مسلمانوں پر بطور فرض کفایہ لازم ہے کہ وہ حکومت کے لئے ایک ایسا خلیفہ قائم کریں جو اس منصب کے لئے جامع صفات ہو''۔

شاہ ولی اللہ خلیفہ کیلئے سلطان کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔انہوں نے سلطان میں ترحم،خوش گفتاری اور بلند اخلاق کو ضروری قرار دیا ہے۔انکے مطابق اچھا سلطان وہی ہے۔جس کے احسانات کے بوجھ تلے عوام دب جائیں اور اس کے شیدا ہو جائیں کیونکہ خلوص ومحبت سے سلطان جو کام لے سکتا ہے وہ خوف وظلم طاری کر کے ہرگز نہیں لے سکتا۔سلطان شجاع اور بے خوف بھی ہو۔شر پسندوں،مفسدوں اور امن وامان میں خلل پیدا کرنے والوں کے لئے ایک تلوار ہو۔بہترین نظم ونسق کے لئے اس کا فہیم اور زیرک ہونا بے حد ضروری ہے۔[۳]

سرسید احمد خان: سرسید احمد خان خلافت کو حجت شرعی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں خلافت کو وہ محض دنیاوی حکومت کے انداز میں لیتے ہیں اور خلیفہ کو خلیفۃ اللہ تسلیم کرتے ہیں نہ کہ خلیفۃ الرسول۔کیونکہ ان کے خیال میں رسول اکرم ﷺ کے بعد کوئی شخص من حیث النبوۃ ان کا جانشین نہیں ہوسکتا۔سرسید حکمران کو اعلیٰ اوصاف سے متصف دیکھنا چاہتے ہیں۔انہوں نے حکمران میں سخاوت،عفو ودرگزر اور انصاف کو نہایت اہمیت دی ہے حکمران جتنا سخی ہوگا اسی قدر فائدے اس کا مقدر ہوں گے۔ انہوں نے دوسری چیز جسے حکمران کے لئے ضروری سمجھا ہے وہ حلم ہے۔ حکمران کو منکسر المزاج اور حلیم الطبع ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔[۴]

جمال الدین افغانی: جمال الدین افغانی نے مقتدر یعنی سربراہ حکومت کے بارے میں اسی نظریے سے اتفاق کیا ہے جو ابن خلدون کا نظریہ ہے مسلمان مفکرین میں صرف دو ایسے مفکر ہیں جو ایک خیال پر متفق ہیں۔یعنی یہ کہ بیک وقت دو یا زائد مقتدر بھی ہوسکتے ہیں۔ جمال الدین افغانی مسلمانوں کو من حیث القوم ایک سمجھتے ہیں لیکن یہ ضروری قرار نہیں دیتے کہ اس پوری قوم کا سربراہ بھی ایک ہو۔وہ سربراہ مملکت کو سیاسی تدبر کا حامل اور عادل،علم کی قدر کرنے والا بلند اخلاق،نرم طبیعت،غیرت مند اور شجاع دیکھنا چاہتے ہیں۔انکے مطابق جاہل،بداخلاق،بزدل اور بیوقوف،بخیل اور بے تدبیر،گمراہ اور فضول خرچ سربراہ مملکت قوم کو زوال کی طرف لے جاتا ہے۔

علامہ محمد اقبال: حکیم الامت علامہ محمد اقبال خلیفہ کو نہ تو خلیفۃ اللہ تسلیم کرتے ہیں اور نہ خلیفۃ الرسول۔وہ اسے خلیفۃ المسلمین کہتے ہیں۔انہوں نے خلیفہ کے بارے میں واضح الفاظ میں کہا ہے کہ خلیفہ نائبِ خدا نہیں اس لئے وہ معصوم نہیں ہے۔انسان ہے لہذا وہ خطا بھی کرسکتا ہے۔علامہ اقبال خلیفۃ المسلمین کو اپنے جانشین کی نامزدگی کا حق بھی دیتے ہیں خلیفہ چاہے تو اپنے بیٹے کو بھی اپنا جانشین مقرر کرسکتا ہے البتہ علامہ اقبال خلیفہ کو اپنی زندگی میں اپنے بیٹے سے بطور جانشین بیعت لینے کے خلاف ہیں۔یہ حق عوام کو ہے کہ وہ ایک خلیفہ کی وفات کے بعد دوسرے خلیفہ کا انتخاب کرلیں۔[۵]

۱　مقدمہ ابن خلدون،مقدمہ الکتاب العبر،ص:۳۵　　۲　ازالۃ الخفاء،۱/۱۷

۳　صلاح الدین ناسک،افکار سیاسی،ص:۵۵۱　　۴　صلاح الدین ناسک،افکار سیاسی،ص:۵۷۰

۵　علامہ محمد اقبال،تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ(مترجم نذیر نیازی)ص:۱۳۸

فصل دوم

ب) قیادت کی ضرورت واہمیت

دنیا کی ہر سیاسی اور اجتماعی ہیئت کی ایک غرض ہوتی ہے جو اس کے کاموں اور کارناموں کی غایت سمجھی جاتی ہے۔ یہ غرض ماحول کے تقاضوں، نیک ارادوں اور سچی امیدوں کو ایک نقطہ پر جمع کر دیتی ہے۔ سیاستدانوں کی وہ جماعت جو انسانی ہیئت کی غرض وغایت کا صحیح ادراک کر سکتی ہے اور اپنی کوشش وکاوش سے اجتماعی ہیئت بناتی ہے، سیاست کی اصطلاح میں یہی حکومت وقیادت ہے۔ گویا یہ وہ طاقت ہے جس کے ارادہ و کلام سے سیاست کی اجتماعی مشین چلتی ہے۔

ابتدائی معاشرہ کی بنیاد عرصہ ازل سے ایک ایسے تخلیقی ماحول میں قائم ہوئی ہے جو منشائے الٰہی کے عین مطابق تھا۔ انسانی معاشرہ کی تخلیق کا اولین رابطہ خداوند تعالیٰ کے ارادہ سے ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہنا چاہیے کہ انسانی معاشرہ پہلے پہل تخلیقی ارادہ میں ظاہر ہوا۔ اس کے بعد اس معاشرہ نے ربانی معاہدہ کے اثر کو قبول کیا۔ پھر اس معاشرہ میں تخلیق کے عمل کو دخل ہوا۔ جب یہ عمل مکمل ہو گیا تو اس کی حیثیت تخلیقی معاشرہ کی ہو گئی۔ حضرت آدمؑ اس فطری، خاندانی اور اسلامی معاشرہ کے سردار اور ان کی اولاد اولین ارکان تھے۔ حضرت آدمؑ کو سب سے پہلے جو عطیہ ملا وہ علم اشیاء تھا۔ علم کے بعد معاشرہ کی تنظیم کے لئے جو بنیادی بات ظہور میں آئی وہ ربانی طاقت اور انسان کی اجتماعی ہیئت کے درمیان معاہدہ اطاعت تھا۔[1]

چونکہ انسان اجتماعیت پسند واقع ہوا ہے اور اجتماعیت میں نظم وضبط برقرار رکھنے کے لئے ایک ایسے سیاسی نظام کی ضرورت ہوتی ہے جس کو ایک حاکم چلاتا ہے۔ لہذا یہ انسان کا فطری تقاضا ہے کہ ایک نظم کے تحت زندگی بسر کی جائے۔

ابن خلدون کے مطابق جونہی معاشرہ وجود میں آتا ہے انسان کی حیوانی فطرت ابھرتی ہے اس فطرت میں تشدد وعداوت داخل ہے جو اسے دوسروں سے نبرد آزما ہونے پر اکساتی ہے۔ اگر کوئی اور نظام کارفرما نہ ہو تو شاید انسان باہم جنگ وجدل کرتے ہی رہیں۔ اور پھر ختم ہو جائیں۔ لہذا جس نظام کی ضرورت پیش آتی ہے وہ نظام مملکت ہے۔ جہاں ایک حاکم بھی ہو جو انسانوں کو لڑنے مرنے سے روک سکے۔[2]

کیونکہ اطاعت بھی فطرت انسانی کا جزو ہے لہذا انسان حاکم کے حکم کی اطاعت کرتا ہے حیوان جبلی طور پر کسی کو سردار تسلیم کر لیتے ہیں مثلاً شہد کی مکھیاں، ٹڈیاں، کونجیں وغیرہ مگر انسان سوچ اور سیاست کے اعتبار سے سردار تسلیم کرتے ہیں۔ ابن خلدون کے مطابق کوئی گروہ یا قبیلہ خواہ کس قدر سادہ ہو اقتدار اعلیٰ حاصل کرنے کی خواہش اس میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے یہی وہ خواہش ہے جو معاشرے اور حکومت کو جنم دیتی ہے اور اس خواہش کے تحت غلبہ حاصل کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ دنیاوی حکومت کی تشریح کرتے ہوئے ابن خلدون لکھتے ہیں

> "ملک (مملکت) زندگی کا طبعی مرکز ہے۔ جہاں انسانی ضرورتوں نے قدرتی اہمیت حاصل کر لی ہے انسان عادتاً اقتدار پسند ہے۔ حکومت انسان کی اس حیوانی قوت کا اثر ہے جس کا رجحان غلبہ کی طرف رہتا ہے اور جو انسان کے اندر بجائے خود موجود ہے"[3]

قیادت کی قدیم ترین نوعیت گروہی اور قبائلی تھی جو غیر مہذب اور ابتدائی معاشروں میں پائی جاتی تھی قیادت کی یہ قسم بحرالکاہل کے جزائر اور افریقہ وامریکہ کے نیم وحشی قبائل میں آج بھی موجود ہے۔[4]

---

1. ابن جریر طبری، تاریخ الامم والملوک، ۱/ ۸۷
2. ابن جریر طبری، تاریخ الامم والملوک، ۱/ ۸۷
3. کتاب العبر، امامۃ وخلافۃ، ص: ۱۳۳
4. شاہد رزاقی، تاریخ جمہوریت، ص: ۳۴

معاشرہ کی یہ کیفیت مدتوں قائم رہی۔لیکن جب قبائل تقسیم ہو گئے تو آپس میں جنگ کرنے لگے کوئی ایسی طاقتور حکومت نہ تھی جوانکو قابو میں رکھتی۔اہل قبائل یہ چاہتے تھے کہ ان کی اراضی، پیداوار اور مویشیوں کی حفاظت کی جائے۔اوروہ ایسے شخص کی اطاعت پر آمادہ ہو گئے جو ان کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرے۔

قدیم تہذیبوں کے دورعروج میں مشرقی اقوام نے مصر، شام،عراق، ایران، اور چین میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں جہاں شہنشاہیت اور مطلق العنانی کوفروغ ہوا۔قیادت صدیوں تک صرف سیاسی نوعیت کی حامل رہی اور معاشرتی اوراقتصادی قیادت کو مدت دراز کے بعد اختیار کیا گیا۔یونانی ریاستوں میں فقط سیاسی قیادت موجودتھی۔معاشرتی واقتصادی قیادت ناپید تھی۔گوداخلی اعتبار سے یونانی قیادت نے بہت کام کئے شہریوں کی جان و مال کوتحفظ حاصل تھا۔قانون اورنظم ونسق کا احترام کیا جاتا تھا۔آزادشہریوں میں مساوات کا اصول ایک مؤثر اور عملی حقیقت تھا۔

قیادت کی ضرورت واہمیت کے بارے میں شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔''معاشرہ کے ہردور میں کسی نہ کسی حدتک تنظیم کی ضرورت ہوتی ہےلیکن جب معاشرہ کےافرادایک ایسی منزل پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ان میں سے ہر شخص کا پیشہ ایک دوسرے سے الگ ہوجاتا ہےتو مضبوط سیاسی تنظیم کی ضرورت بہت زیادہ ہوجاتی ہے یہ نظام انکے اجتماعی مفادات کی حفاظت کرتا ہے اورانہیں ایسی خرابیوں سے پاک رکھنے کی کوشش کرتا ہے جوان کے اجتماعی نظم ونسق کے لئے بھاری خطرہ ہوتی ہے۔اس اجتماعی نظام کوتندرست رکھنے کے لئے ایک بالا دست قوت کی ضرورت ہوتی ہے جومختلف قوتوں میں توازن قائم رکھے۔''اس قوت کوشاہ صاحب امامت کے منصب سے تعبیر کرتے ہیں۔ [۱]

نظریہ معاہدہ عمرانی: یہ نظریہ قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے کہ ریاست معاہدہ سے پیدا ہوتی ہے جس کا ذکر قدیم مقدس کتب اور فلسفیوں کی کتب میں پایا جاتا ہے۔بائیبل میں لکھا ہے۔

''پس اسرائیل کے تمام اکابر جبرون میں بادشاہ کے پاس آئے اور بادشاہ داؤد نے خداوند کے سامنے حبرون میں ان کے ساتھ ایک میثاق کیا اورانہوں نے داؤد کواسرائیل کا بادشاہ بنایا'' [۲]

ہابز کےقول کے مطابق ریاست کی جب تشکیل ہوگئی تو ریاست ہی کے افراد نے امن کی زندگی گزارنے اور فسادات سے محفوظ رہنے کے لئے تجاویز سوچنا شروع کر دیں۔بالآخر یہ طے پایا کہ معاشرہ میں سے چندافراد کوچن لیا جائے جو اس اہم ضرورت کی تکمیل میں مدد دیں۔چنانچہ افرادِ معاشرہ نے آپس میں ایک معاہدہ کیا جس میں طے پایا کہ افرادِ معاشرہ ان منتخب افراد کے تمام احکام کی تعمیل کریں گے جووہ مفادِ معاشرہ کی خاطر ریاست کے افراد کے لئے جاری کریں گے۔باہمی مصلحتوں کی بنیاد پر یہ فیصلہ ہوا کہ تمام ریاست کے افراد کسی ایک فرد کواپنا رہنما تسلیم کریں۔جو ریاست میں امن وامان، تحفظ جان و مال اورتحفظ مفادات کی ذمہ داریاں اٹھائے گا۔اس رہنما کو اپنا مقتدر اعلیٰ تسلیم کریں گے۔ [۳]

۱　الشمس الرحمٰن محسن،شاہ ولی اللہ کے عمرانی نظریے،ص:۱۰۱ تا ۱۰۴　　۲　بائیبل،۲سموئیل باب ۵ آیت ۳

۳　D.R. Bhandari, History of European Political Philosophy, P:255

جان لاک کا نظریہ قیادت: نظریہ معاہدہ عمرانی کا دوسرا بڑا مبلغ جان لاک ہے انسانی فطرت کے متعلق لاک کا نظریہ ھابز کے بالکل برعکس ہے لاک کے نزدیک جب انسان قانون فطرت کے مطابق رہتا تھا تو پرامن تھا۔اس کے نزدیک قانون فطرت عین عقل کے مطابق ہے۔

"Man hath by nature a power not only to preserve his property, that is, his life, liberty and estate against injuries and attempts of other men, but to judge and punish the breach of that law" 1

''انسان فطری طور پر اپنی جان ، مال اور آزادی کے تحفظ کی قوت رکھتا ہے اور ساتھ ہی اس قانونِ فطرت کی خلاف ورزی کے مرتکب ہونے والے کو اسی قانونِ فطرت کے تحت سزا دے سکتا ہے''

جان لاک اپنے نظریے کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"Every man gives up his actual power to the community, not to a sovereign ruler as with Hobbes; and he gives it up not absolutely, but for particular and limited purposes" 2

'' ہر فرد اپنی قوت عوامی اشتراک (معاشرہ) کے سپرد کرتا ہے نہ کہ مطلق العنان بادشاہ کے اور یہ سپردگی قطعی یا حتمی نہیں ہوتی بلکہ خاص اور محدود مقاصد کے لیے ہوتی ہے''

بعض ایسے انسان پیدا ہوئے جنہوں نے عقل کی بجائے جذبات سے کام لیا جس سے تصادم ہوا۔اس تصادم و بگاڑ کو روکنے کے لئے معاہدہ ہوا کہ ایسا نظام قائم کیا جائے جس کے تحت فطری زندگی پھر لوٹ آئے۔ لاک کہتا ہے'' حکومت کے نمائندے اکثریت کی رائے سے منتخب ہوں'' کسی حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ جو جی چاہے کرتی رہے۔قانون فطرت وہ ابدی قانون ہے جو تمام انسانوں پر یکساں طور پر منطبق ہوتا ہے۔خواہ وہ قانون ساز ہو یا قانون کے تابع ۔۳

---

۱ Sir Frederick Pollock, History of Science of Politics, P:63

۲ Ibid,P:63

۳ D.R. Bhandari, History of European Political Philosophy,P:281

اسلامی نقطہ نظر: حضرت آدمؑ کی تخلیق کے ربانی عوامل میں قیادت (امامت وخلافت) کا قطعی تصور ابتداء ہی سے شامل تھا۔

"**ولقد کرمنا بنی آدم**"[1] کے قانونی اعلان نے انسان کی سیاسی شرافت کو شرعی اہمیت دی جب سیاسی اختیارات کی دستاویز ملی تو اس کے لئے پہلا فرمان ان الفاظ میں جاری ہوا۔"**انی جاعل فی الارض خلیفه**"[2]

حضرت آدمؑ پہلے متمدن انسان، پہلے پیغمبر اور رہنمائے مذہب تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے معاشرتی قوانین کو معاشی دائرہ میں قبول کیا۔[3]

آدمؑ کو سب سے پہلا جو عطیہ ملا وہ علم اشیاء تھا علم کے بعد معاشرہ کی تنظیم کے لئے جو بنیادی بات ظہور میں آئی وہ ربانی طاقت اور انسان کی اجتماعی ہیئت کے درمیان معاہدہ اطاعت تھا۔[4] فرمانروا اور انسانیت عامہ کے افراد کے درمیان یہ پہلا ربط تھا جس کی وجہ سے انسانی ذمہ داریوں کے دنیاوی پہلو میں اجتماعی معاشرہ کی پوری تصویر نظر آنے لگی۔

اس تفصیل سے اسلامی حکومت کے قدیم تاریخی وسیاسی تصور کا امتیاز صاف طور پر واضح ہو جاتا ہے۔ انسانی حکومت کی صحیح صورت یہ ہے کہ ریاست خدا کے قانون کی بالادستی تسلیم کر کے اس کے حق میں حاکمیت سے دست بردار ہو جائے اور حاکم حقیقی کے تحت خلافت (نیابت) کی حیثیت قبول کرے۔ اس وسیع ترین نظام حکومت کو عملاً قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے سے اہل ترین اور باصلاحیت افراد کو حکومت کے عہدے تفویض کیے جائیں۔ تاکہ وہ اس حکومت کا انتظام وانصرام بہترین خطوط پر چلائیں۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"**الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر ولله عاقبة الامور**"[5]

"یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم حکومت دے دیں ان کو تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے انجام تمام کاموں کا"

پھر ایک اور جگہ پر فرمایا

"**یا یھا الذین امنوا اطیعو الله واطیعو االرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیءٍ فردوه الی الله والرسول ان کنتم تومنون بالله والیوم الاٰخر ذالك خیر واحسن تاویلاً**"[6]

"اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور رسول کا اور حکم مانو حاکموں کا جو تم میں سے ہوں پھر اگر نزاع ہو جائے تمہارے درمیان کسی چیز میں تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ اگر مانتے ہو اللہ کو اور قیامت کے دن کو۔ یہی بہتر اور اچھی تاویل ہے"

امام ابن جریر نے صحابہ وتابعین سے اولی الامر کی تفسیر میں دو قول نقل کیے ہیں۔

1۔ **ھم الامراء** یعنی مسلمانوں کے حکمران اور امراء جن کی اطاعت کا حکم ہے

2۔ **ھم اھل الفقه والدین** یعنی فقہاء اور دینی سربراہ

اور اپنی رائے اس طرح دی

---

[1] بنی اسرائیل، ۷۰/۱۷ — [2] البقرہ، ۳۰/۲

[3] ابن اثیر، تاریخ الکامل، ۱۸/۱، ابن کثیر، البدایہ والنھایہ، ۹۱/۱

[4] ابن جریر طبری: تاریخ الامم والملوک، ۸۷/۱ — [5] الحج، ۴۱/۲۲ — [6] النساء، ۵۹/۴

واولی الاقوال فی ذالک قول من قال ھم الامراء والولاۃ ۱

بہترین قول ان حضرات کا ہے جو کہتے ہیں کہ ان سے مراد امراء اور حکام ہیں۔

امام فخرالدین رازی نے اولی الامر کی تفسیر اہل حل وعقد سے کی ہے یعنی وہ لوگ جو مسلمانوں کے معاملات کے ذمہ دار اور مستند نمائندے ہوں اور فیصلہ کرنا ان کے ہاتھ میں ہو۔۲

امام جصاصؒ، امام ابن کثیر، قاضی ثناءاللہ پانی پتی اور امام طحاوی نے لکھا ہے کہ ''لفظ اولی الامر عمومی لحاظ سے دونوں طبقوں کے لئے مستعمل ہے یعنی علماء وفقہا کے لئے اور امراء حکام کے لئے بھی کیونکہ نظام امر اور سربراہی انہی دو طبقوں سے وابستہ ہے۔۳

حقیقت یہ ہے کہ آیت اگر چہ امراء کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر لفظ کے عام ہونے کی وجہ سے تمام قسم کے اصحاب امر پر منطبق ہوتی ہے۔خواہ وہ علمی اور فقہی رہنمائی کرنے والے ہوں یا سیاسی قائد ہوں۔ ملک کا نظم ونسق چلانے والے ہوں یا فوجی نظم ونسق کی قیادت کرنے والے افسر ہوں۔عدالتی فیصلے کرنے والے جج ہوں یا معاشرتی اور سماجی امر میں بستیوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے نمائندے اور سماجی کارکن، غرض جو شخص جس حیثیت میں بھی مسلمانوں کا صاحب امر ہو اطاعت کا مستحق ہے بشرطیکہ مسلمان ہو۔اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا اطاعت گزار ہو۔ابن عباسؓ سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان مروی ہے۔

عن ابن عباسؓ قال النبی ﷺ صنفان من امتی، اذا صلحا صلحت الامۃ واذاافسدت فسدت الامۃ السلطان والعلماء ۴

''میری امت کے دو قسم کے لوگوں کی حالت جب تک درست ہوگی تو امت کی حالت درست ہوگی اور جب ان کی حالت خراب ہو جائے گی، تو امت میں بھی بگاڑ اور خرابی پیدا ہو جائے گی۔ ان سے مراد حکمران اور علماء ہیں''۔

قرآن عظیم نے صدیوں پہلے تصریح کی ہے کہ اسلامی حکومت کا مقتدر اعلیٰ (اللہ تعالیٰ) اپنے حکم میں آزاد ہے جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے اور اس کی آزادی کو کوئی پابندی اور کسی قسم کی مجبوری لاحق نہیں ہو سکتی۔حضرت یوسفؑ نے ایام قید میں اپنے قیدی ساتھیوں سے کہا ''دنیا کے قید خانے کے غلامو! انسانیت عامہ کے لئے ایک اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کر لینا موجب صلاح ہے یا قسم قسم کے بہت سے اعلیٰ اقتدارات کی الجھنوں میں گرفتار ہو جانا''۔اس بات کا ذکر سورۃ یوسف میں اس طرح بیان ہوا ہے

''یا صاحبی السجن ءَ ارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحدالقھار'۵

''اے قید خانہ کے رفیقو! بھلا کئی معبود جدا جدا بہتر ہیں یا اللہ اکیلا زبردست''

حضرت ابوبکرؓ سے ایک خاتون نے پوچھا

> ''جاہلیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے جو ہماری حالت میں اصلاح کی ہے اس اچھی حالت میں ہم کب تک رہیں گے۔حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ جب تک تمہارے حکمران راہ راست پر قائم رہیں گے اس وقت تک تم اچھی حالت پر باقی رہو گے''۔

---

۱ ابن جریر طبری، تفسیر ابن جریر، ۲/۱۴۷ تا ۱۵۰　　۲ تفسیر الکبیر، ۱۰/۱۴۴

۳ احکام القرآن، ۲/۲۱۰، تفسیر ابن کثیر، ۲/۳۲۶، تفسیر مظہری، ۲/۳۴۲، طحاوی، مشکل الآثار، ۱/۴۷۶

۴ ابن عبدالبر، جامع، بیان العلم، ۱/۱۸۴　　۵ سورۃ یوسف، ۱۲/۳۹

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے علم اور اس کے مواعظ اور دلائل سے بعض لوگ متاثر ہو کر از خود گناہوں سے رک جاتے ہیں۔لیکن بعض سنگ دل اس سے اثر قبول نہیں کرتے مگر حکومت چونکہ سزائیں دیتی ہے اور اس کے پاس چونکہ مادی قوت بھی ہوتی ہے اس لئے سزاؤں کے خوف سے اکثر لوگ جرائم سے رک جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے امت نے متفقہ طور پر نصب امامت کو فرض قرار دیا ہے۔اس حکم میں کوتاہی ایک دینی حکم کی بجا آوری میں کوتاہی ہے۔علامہ ابن حزم لکھتے ہیں۔

اتفق جميع اهل السنة وجميع المرجعة و جميع الشيعة و جميع الخوارج وجوب امامة وان الامامة واجب عليها الانقياد والامام العادل يقيم احكام الله وليسوسهم باحكام الشريعة التى انى بها رسول الله ﷺ [۱]

’’کل اہل سنت، مرجع شیعہ اور خوارج سب کا اتفاق ہے کہ نصب امام واجب ہے اور یہ کہ امت پر ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ کے احکام قائم کرے ان احکام شریعت کے مطابق ان کا سیاسی نظام قائم کرے جو نبی کریم ﷺ لے کر آئے تھے‘‘۔

اور شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں۔

’’مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کا تقرر کرنا واجب بالکفائیہ ہے اور یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے‘‘[۲]

ان ارشادات سے صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری امت کا اجماع ہے۔اسلام مادی اقتدار چاہتا ہے اس کے بغیر وہ اپنا مشن پورا نہیں کر سکتا۔

---

۱ ابن حزم، الفصل الملل والنحل، ۴/ ۸۷

۲ ازالۃ الخفاء، ۱/ ۱۷

فصل سوم

ج) قیادت کی نوعیت

ریاست کے وجود میں آنے کے بعد اس کی صفت اور نوعیت کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کبھی نظریہ کی بنا پر اس کی صفت اور کبھی طرز حکومت کی بنا پر اس کی نوعیت متعین ہوتی ہے۔ نظریہ کی بناء پر وہ اشتراکی، فاشی، یا اسلامی ریاست کہلائے گی اور طرز حکومت کی بناء پر وہ آمریت جمہوریت، یا ملوکیت کہلائے گی۔ اسلامی ریاست وہ ہوتی ہے جو اسلام کے معاشرتی، مذہبی و سیاسی اصولوں پر قائم ہو۔ اور اسلامی نظام زندگی کے ان تمام تقاضوں کو پورا کرے جن کا حکم انسان کو قرآن وسنت سے ملتا ہے۔

معاشرتی نوعیت: علمائے معاشرت نے انسان کی معاشرتی زندگی پر جو تحقیقات کی ہیں ان کے نتائج کی رو سے انسان زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں بھی اجتماعیت پسند تھا۔ عام طور پر ہر انسان کی معاشرت پسندی کے اسباب دو ہی بیان کیے جاتے ہیں۔ داخلی اور خارجی۔ داخلی سبب انسان کی جبلی خواہش ہے۔ علمائے معاشرت اس پر متفق ہیں اور ارسطو کے ایک قول کو بطور استدلال پیش کرتے ہیں کہ انسان مدنی الطبع ہے۔ خارجی سبب اس کی کمزوری ہے انسان جسمانی ساخت کے اعتبار سے کمزور ہے۔ انفرادی طور پر اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتا ہے۔ لہذا ذاتی تحفظ کی خواہش اجتماعیت پسندی کو جنم دیتی ہے۔[۱]

ابن خلدون کے الفاظ میں اسے یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ''افرادانسانی کا اکٹھے مل جل کر رہنا ایک ناگزیر امر ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے اہل علم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسان پیدائشی طور پر مدنیت پسند واقع ہوا ہے''[۲] انسان کی مدنیت پسندی کے متعلق یہی دو نظریات ہیں جن کے بارے میں اہل علم میں کبھی اختلاف نہیں رہا۔ لہذا معاشرت انسان کی فطری خواہش بھی ہے اور ذاتی مجبوری بھی۔ زمانہ قدیم میں معاشرتی قیادت کی ذمہ داری خاندان یا قبیلے کے سربراہ کے سر ہوتی تھی۔ قیادت کے اوصاف میں خصوصیت کے ساتھ جنگجویانہ صلاحیت اور تدبر ضروری تھا۔ ان صلاحیتوں سے عاری قیادت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکتی تھی اور کسی اور کا مقدر قرار پاتی تھی۔ قبائلی سردار یا قائد کی ذمہ داری جہاں قبیلے کی حفاظت تھی وہاں قبیلے اور مویشیوں کے لئے خوراک کی فراہمی بھی ضروری تصور ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ قبیلے ایسے علاقوں کی تلاش میں رہتے تھے جہاں پانی کی فراوانی اور زرعی پیداوار زیادہ ہو جو قبیلے کی خوشحالی کا سبب بن سکے۔ ہر علاقے کے قبائل سیر حاصل زمین یا نخلستان کی تگ ودو میں لگے رہتے تھے۔ لہذا قبائلی لڑائیاں عام تھیں ایک قبیلہ دوسرے پر غالب آکر مغلوب قبیلے کے افراد سے استفادہ کرتا تھا ان سے سرداروں کے کھیتوں میں مزدوری کروائی جاتی جب کہ عورتیں اور بچے غالب قبیلے کے گھروں میں خدمات انجام دیتے۔ رفتہ رفتہ انہی قبائلیوں نے طاقتور بن کر دوسرے علاقوں پر قبضہ شروع کیا اور قبائلی سرداریاں بادشاہیوں میں بدل گئیں۔ سلطنتیں قائم ہوئی۔ بڑی بڑی افواج تیار کی گئیں۔ سامان حرب زیادہ سے زیادہ موثر تیار کیا جانے لگا۔ تاکہ دشمن پر قابو پانا ممکن ہو سکے۔ حکومت یا سلطنت کے قیام کے بعد یہ خود کو امیر، سلطان یا بادشاہ کا نام دیتے تھے۔ اسی تصور نے ایسے حکمران پیدا کئے جن کے ظلم وجبر کی داستانیں تاریخ کا حصہ بن گئیں اور معاشرے کے امن کو تہ و بالا کر دیا۔

۱۔ Devendra Kaushik, Central Asia in Modern Times, P: 17

۲۔ ابن خلدون، مقدمہ، ص:۴۹

اسلامی نقطہ نظر سے بھی اجتماعیت انسان کی فطری ضرورت ہے انسان اپنی طبیعت، اپنے ماحول، اپنی خواہشات اور دیگر عوامل کی وجہ سے معاشرتی تشکیل کے لئے مجبور ہوا۔ اسی تشکیل کو ہم معاشرتی تنظیم کہہ سکتے ہیں یہ معاشرتی تنظیم کسی نہ کسی مقصد کے لیے وجود میں آتی ہے۔ اس معاشرتی تنظیم کی پہلی وحدت خاندان ہے اس لحاظ سے معاشرتی تنظیم ایک ایسی تنظیم ہے جس میں انسان کی معاشی، سیاسی، قانونی، مذہبی اور تعلیمی جدوجہد سمودی گئی ہے۔

اسلام نے معاشرتی زندگی میں انقلاب آفریں اصولوں کو ایک ایسے دور میں متعارف کیا جن کا اس سے پہلے اور ہم عصر دنیا میں تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ اسلامی معاشرتی نظام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مرکز و محور اللہ تعالیٰ کی وحدت و اقتدار کا تصور ہے

ان الحکم الا للہ[1] ''فیصلے کا اختیار سوائے خدا کے کسی کو نہیں''

للہ الامر من قبل و من بعد[2] ''اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے جو پہلے بھی ہے اور بعد میں بھی''

اللہ تعالیٰ کو اسلامی مملکت کا مقتدر اعلیٰ قرار دینے کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اللہ کا یہ اقتدار مطلق و کامل ہے۔ اس اقتدار میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ خدا کی مرضی کسی ایسے مطلق العنان حکمران کی مرضی نہیں جو محض خوف و دہشت اور طاقت کے ذریعہ سے اطاعت پر مجبور کرتا ہے۔ خدا کی اطاعت کے معنی یہ ہیں کہ انسان فطرت سے ہم آہنگی پیدا کرے۔ فطرت سے ہم آہنگی کا نام اسلام ہے۔ یعنی اسلام دین فطرت ہے۔

اسلامی نظام کے مطالعہ میں یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب کی طرح محض عبادات، یا رسوم و توجیہات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے بلکہ عالمگیر ہے۔ اسکا مقصد تمام نوع انسانی کی فلاح و بہبود ہے۔ اسلام انسان کی ذہنی و دینوی زندگی میں تفریق کی بجائے ہم آہنگی پیدا کرنا چاہتا ہے اور دونوں کی فلاح و صلاح اس کے پیش نظر ہے۔ اسی بنا پر اسلام نے نہ صرف عبد و معبود اور خالق و مخلوق کا تصور بدلا بلکہ معاشرتی' سیاسی' اقتصادی' تمدنی' اخلاقی غرضیکہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی تعلیم دی۔ انسانی معاشرت کا سنگ بنیاد مرد و عورت کا تعلق ہے۔ قرآن اسے رحمت و مودت قرار دیتا ہے رشتہ داروں کے تعلق کو بھی اسی انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ خاندان ہی پہلا معاشرتی ادارہ ہے۔

ومن اٰیاتہ خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ ''[3]

''یہ بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تم ہی میں سے تمہارے لئے بیویاں پیدا کیں تا کہ تمہارے لئے راحت و تسکین کا سامان ہو اور تمہارے درمیان محبت و شفقت پیدا ہو''

وھوالذی خلق من الماء بشراً فجعلہ نسباً و صھرا۔[4]

''اللہ وہ ذات ہے جس نے آدمی کو پانی سے پیدا کیا اور اسے نسب اور سسرال والا بنایا''

انسان کے اولیں معاشرتی ادارہ یعنی خاندان کے دائرے سے باہر ساری مخلوق کے ساتھ باہمی ربط کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے یوں فرمایا ہے:

عن عبداللہ بن عمر...... ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء[5]

---

1. الانعام، ۶/ ۵۷
2. الروم، ۳۰/۴
3. الروم، ۳۰/۲۱
4. الفرقان، ۲۵/۵۴
5. البخاری، محمد بن اسماعیل، الجامع، حدیث رقم: ۵۶۶۷

عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا زمین والوں پر رحم کرو تم پر آسمان والا رحم کرے گا۔

مملکت کا اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اسلامی قیادت ایک خاص نوعیت کی حامل ہوتی ہے اسلامی مملکت کی اساس ملک وقوم کی بجائے انسان ہے اس کا مقصد منشائے الٰہی کے مطابق معاشرہ کی اصلاح ہے قرآن کریم میں امت محمدیہ کی فضیلت اس طرح بیان کی ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تومنون باللہ[۱]

''تم وہ بہترین امت ہو جسے نکالا گیا ہے لوگوں کے لئے تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اللہ پر ایمان رکھتے ہو''

مذہبی نوعیت: عہد وسطیٰ میں معاشرتی قیادت کے تصور کے ساتھ ایک نیا تصور ابھرا جو سابقہ ادوار سے متصف تھا نمرود اور فرعون نے قوت اور طاقت کے نشہ میں خدائی کا دعویٰ کیا اس دعویٰ کو اس دور کے خدا پرست لوگوں کے معاشروں نے کسی حد تک قبول کر لیا۔لیکن ان کے زوال کے بعد طاقت ور قیادت یا حکمران، رعایا کو اطاعت پر کس طرح راغب کرے اس کے لئے ایک نیا تصور ابھرا جسے ظل اللہ یا Devine right کا نام دیا گیا۔ یہ کسی ایک علاقے کا تصور نہیں تھا بلکہ مغرب ومشرق میں اکثر حکمران بادشاہ اسی تصور سے سرشار تھے کہ وہ نہ صرف خداوند کریم کے مقرر کردہ ہیں بلکہ اس زمین پر اس کی نیابت کے ذمہ دار ہیں۔اس لئے رعایا پر ان کی اطاعت لازم ہے۔اس گھناؤنے تصور نے بنی نوع انسان کو کئی صدیاں اپنی لپیٹ میں رکھا۔

پندرھویں صدی سے روم بھی اسی طرح مذہبی قدامت پسندی کا شکار تھا۔[۲] کیونکہ کیتھولک چرچ یورپ کا غالب مذہب تھا اور یورپ کے تمام ممالک کے حکمران اپنی حکومت کی بنیاد اور سلامتی کے لئے روم کے چرچ کی جانب متوجہ رہتے تھے۔اور اس کی سرپرستی کو ترجیح دیتے تھے لہٰذا ہر ملک میں رومن چرچ یا پوپ کا نمائندہ (بشپ) وہی حیثیت رکھتا تھا جو خود اس علاقے کے حکمران کی تھی۔[۳]

مغرب کی اصطلاحی زبان میں ''مشرق'' دنیا کے اس حصے کو کہتے ہیں جو نسبتاً روایت پسند، تنگ نظر اور علمی اعتبار سے پسماندہ اقوام پر مشتمل ہے۔ یہاں وہبی اور غیر وہبی دونوں اقسام کے مذاہب کی بنیادی خصوصیت عبادات کی رسمی ادائیگی تک محدود ہے لیکن عقائد کی پختگی مذہبی معلومات سے لاعلمی کے باوصف شدت کے ساتھ برقرار ہے۔اعتقاد میں شدت کے پہلو کے ساتھ عصبیت کا اثر اتنا زیادہ ہے کہ عقیدے کے خلاف خصوصاً غلط عقائد کے خلاف بھی نہ کچھ سنا جا سکتا ہے نہ سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ کسی ایسی ہی کوشش کے نتیجے میں مذہبی فسادات مشرق کا معمول پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مشرق میں سیاسی فکر پر ہمیشہ سے مذہب کا رنگ غالب رہا ہے۔غیر وہبی مذاہب میں جن مصلحین کا ذکر تاریخ میں دستیاب ہے ان میں کنفیوشس (چین) اور مہاتما بدھ (ہندوستان) کے علاوہ اکثر و بیشتر کا تعلق مغربی ایشیا سے ہے۔چین میں کنفیوشس کی فکری قیادت وقتی تھی البتہ تمام مشرق بعید میں بدھ مت چین کے علاوہ جاپان، منگولیہ، ویت نام، کوریا، روس، برما، بنگلہ دیش، تبت، نیپال اور سری لنکا میں جس انداز سے پھیلا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی تعلیمات اور فکری قیادت میں تاثر دوسرے غیر وہبی مذاہب کی نسبت زیادہ تھا اور اب بھی ہے حیرت کی بات یہ ہے کہ بدھ مت جو ہندوستان سے شروع ہوا جسے اشوک اور چندر گپت موریا ایسے حکمرانوں کی سیاسی پناہ نصیب ہوئی خود ہندوستان میں فروغ نہ پا سکا۔ بدھا کی تعلیمات اور بدھ مت کے فلسفہ نے مذہبی، اخلاقی اور تمدنی قیادت کا پہلو ابتدائی دور میں بھی نمایاں کیا اور اس دور میں بھی یہ فکری قیادت اتنی پر اثر ہے

---

۱ ال عمران، ۳، ۱۱۰　　۲ J.C. Aiyer, A Source Book of Ancient Church History, P: 54

۳ J.U. Allen, A History of Political Thoughts in the Sixteenth Century, P: 343

کہ بدھ مت آج بھی صف اول کے مذاہب میں شامل ہوتا ہے۔

ہندومت میں شخصی کردار کی ہمہ صفت اور متعدد نمائندگی نے قیادت کے جس پہلو کو سامنے رکھا وہ بھی تصوراتی تھا۔رام چندر، سیتا،لچھمن،حقیقی کردار ضرور تھے،لیکن ان کی کرداری خصوصیات نے انہیں انکی زندگی میں اوراس کے بعد بھی قیادتی حیثیت بخش دی۔ان شخصیتوں کے علاوہ بھی کچھ Epics ہندومذہب کے ساتھ منسلک رہیں جن میں کوروو پانڈو کی لڑائی کو حق و باطل کی لڑائی قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس فکری قیادت میں اعتقادات کے علاوہ کوئی ایسی شخصیت نہیں جس کی تعلیم جاری رکھی گئی ہو۔فرکوہر (Farquhar) نے موجودہ مذہبی تنظیموں کے حوالے سے جن ہندوتحریکوں کا ذکر کیا ہے وہ کسی نئی فکر کی کوشش نہیں بلکہ غیر ملکی تمدنی اثرات کو ہندو برھمہ مذہب سے اخراج کی کوشش کے بعد زمانہ قدیم کے ہندومذہب کا اجراء ہے۔[1]

اسلام چونکہ ایک مکمل طرز زندگی کا علمبردار ہے اس لئے وہ اپنا مکمل ومنفرد عبادات واخلاقیات کا نظام رکھتا ہے بنیادی عبادات کا ہی تجزیہ کیجئے تو ان میں بھی فرد کے لیے اجتماعیت کی تربیت کا انتظام ملتا ہے۔تمام افراد پرنماز باجماعت فرض قرار دے دی گئی۔انفرادی طور پر گھروں میں نماز کی ادائیگی سے منع کر کے مساجد آباد کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔نظام صلواۃ میں اجتماعیت کے عمل کے مختلف مدارج رکھے گئے ہیں۔تاکہ معاشرتی تعلقات میں بتدریج وسعت پیدا ہوتی چلی جائے۔علاوہ ازیں ہر عبادت انسان کے کردار کے اندر اخلاقی اقدار کی تقویت کا باعث بنتی ہے لازمی عبادات میں اس انسانی معاشی احتیاجات کو پوری کرنے کے پہلو کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا۔اموال کی زکواۃ کی ادائیگی مسلمانوں پر فرض قرار دی گئی ہے۔اس سے جہاں مال کی زکواۃ ادا ہوتی ہے وہاں حاجتمندوں کی ضرورتیں بھی پوری ہو جاتی ہیں۔اسلام نے پوری نسل انسانی کو ایک بندھن میں باندھنے اوران کے باہمی روابط کو فروغ دینے کے لئے حج کی صورت میں ایک عالمی اجتماع کا مستقل طور پر انتظام کردیا ہے۔اس عالمی اجتماع میں تمام مسلمان ہر قسم کے نسلی،لسانی،گروہی اور سیاسی امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک ہی طرح کے لباس اور ایک ہی طریقہ سے خدا کے گھر حاضر ہوکر فریضہ حج ادا کرتے ہیں اس سے عالمی سطح پر امت مسلمہ کے اندر یک جہتی کی فضا قائم ہوسکتی ہے۔

افراد کے لئے اجتماعی رویوں میں اخلاقی اقدار کا فروغ انقلابی تبدیلی کا پیش خیمہ بنتا ہے۔قرآن کریم کا موضوع ہی انسان ہے اوراس کی اصلاح مقصود الہٰی ہے۔قرآن کریم ہدایت ہے لیکن انسانی فطرت میں کوئی عمل صرف قوت بیانیہ سے صحیح اور مکمل نہیں ہوتا جب تک اس پر عمل کر کے نہ دکھایا جائے۔لہذا قرآن کی تفسیر آنحضور ﷺ کی سنت ہے۔

دنیاوی مفادات اور دینی مصالح کا خیال،قرآن وسنت کی روشنی میں اس پر عمل پیرا ہونا اور عبادات و معاملات میں لوگوں کی رہنمائی کرنا امت کے علماء کا کام ہے۔مذہبی قیادت جسے بقایائے صحابہ،تابعین،تبع تابعین،فقہا ومحدثین اور صلحائے امت نے آگے بڑھ کر سنبھال لیا اور امت نے اپنے دین کے معاملہ میں پورے اطمینان کے ساتھ ان کی امامت تسلیم بھی کر لی، یہ قیادت اگر چہ منظم نہ تھی نہ اس کا کوئی امام تھا جسے سب نے مرشد مان لیا ہو۔نہ ہی کوئی بااختیار کونسل تھی جو دینی مسائل کے بارے میں بروقت فیصلہ صادر کردے اور وہ پوری مملکت میں مان لیا جائے۔انفرادی حیثیت میں الگ الگ کام کر رہے تھے۔ان متفرق افراد کے پاس اخلاقی اثر و وقار کے سوا کوئی طاقت نہ تھی لیکن سب ہی ایک چشمہ ہدایت کتاب اللہ وسنت رسول اللہ سے فیضیاب تھے اور نیک نیتی سے دینی رہنمائی کر رہے تھے۔اس لئے مختلف الرائے ہونے کے باوجود اور دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں پراگندہ ہونے کے باوجود ان کا پورا گروہ مسلمانوں کو ایک ہی

[1] Modern Religious Movement in India, P:45

فکری واخلاقی قیادت فراہم کررہا تھا۔

دینی قیادت نے سیاسی قیادت کا اثر بہت کم قبول کیا۔ کیونکہ دینی قیادت کے لوگوں میں سے جو بھی سلاطین کے قریب گیا یا کوئی منصب و وظیفہ قبول کیا وہ مشکل ہی سے قوم میں اپنا اعتماد بحال رکھ سکا سلاطین سے بے نیازی اور ان کے قہر وغضب کے مقابلے میں ثابت قدمی، مسلمانوں کے اندر دینی قیادت کی اہلیت کا معیار بن گئی [۱] ☆

اس طرح پہلی صدی کے وسط سے ہی دینی قیادت کا راستہ سیاسی قیادت کے راستہ سے الگ ہو گیا۔ سیاسی قیادت سے الگ ہو کر دینی قیادت نے اسلامی اقدار کے تحفظ کے لئے جو بیش بہا خدمات انجام دیں وہ بلاشبہ نہایت قابل قدر ہیں۔ آج انہی خدمات کا نتیجہ ہے کہ دنیا میں اسلام زندہ ہے اور امت مسلمہ کا صحیح مقصد تو تب ہی پورا ہو سکتا ہے جب کہ اس امت کو ایک ایسی قیادت میسر ہو جو خلافت راشدہ کی طرح بیک وقت دینی قیادت بھی ہو اور سیاسی بھی۔

سیاسی نوعیت: اسلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے پہلی بار دنیا کو صحیح معنوں میں یہ بتایا ہے کہ مذہب و سیاست جدا نہ ہونے والی چیزیں ہیں۔ حتیٰ کہ یہودیوں میں بھی دین و سیاست کی علیحدگی مسلم تھی۔ بنی اسرائیل نے اپنے نبی سے درخواست کی کہ وہ جنگ کرنے کے لئے کوئی بادشاہ مقرر کر دیں۔[۲]

اس واقعہ کو قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"اذقالوا لنبیٍ لهم ابعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل الله" [۳]

"یہودیوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کردو جس کے ساتھ ہم مل کر خدا کی راہ میں جنگ کرسکیں"

اس طرح یہودیت میں نبوت اور بادشاہت جدا جدا منصب تھے۔ عیسائیت نے بھی اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی ان میں قیصر وکلیسا کے دو علیحدہ علیحدہ ادارے باقاعدہ طور پر تسلیم کئے گئے ہیں۔ لیکن اسلام میں دین اور دنیا مذہب اور سیاست لازم وملزوم قرار دیئے گئے ہیں۔

سیاست کے معنی اصلاح کرنا اور منوانا ہے۔ اس لغوی مفہوم کی مناسبت سے یہ دونوں ریاست وحکومت اور تدبیر مملکت کے معنی میں بھی بکثرت استعمال ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ حکومت اور ریاست کا مقصد بھی عوام کی حالت سنوارنا اور اصلاح کرنا ہوتا ہے۔

امام غزالیؒ (متوفی ۵۰۵ھ) نے یہ تعریف کی ہے

"سیاست مخلوق کی اصلاح کرنا ہے اور رہنمائی کرنا ہے اس سیدھے راستے کی طرف جو دنیا اور آخرت کی نجات کا ذریعہ ہو" [۴]

۱　مولانا مودودی، خلافت وملوکیت، ص: ۲۰۳　　۲　رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص: ۴۷

۳　البقرہ، ۲/۲۴۶　　۴　احیاء العلوم، ۱/۹

☆　اس مقام پر یہ بات سمجھ لینا مفید ہوگا کہ تیسری صدی ہجری میں جب عباسی خلافت پر زوال آنا شروع ہوا تو دینی قیادت بدستور علماء، فقہاء اور اخیار امت کے ہاتھ میں رہی مگر سیاسی قیادت دو حصوں میں بٹتی چلی گئی یہاں تک کہ آخر کار عملاً اس قیادت کے مالک وہ امراء اور سلاطین ہی رہ گئے جن کے ہاتھ میں بالفعل حکومت کی باگ ڈور آ گئی اور عباسی خلفاء صرف سجادہ نشین بن کر رہ گئے جنہیں نہ دینی قیادت حاصل تھی نہ سیاسی صرف ایک نمائشی مذہبی تقدس تھا جو "خلافت" کے نام کی وجہ سے ان کو حاصل تھا۔

مذکورہ تعریفیں دراصل نظری سیاست اور علم سیاست سے متعلق ہیں۔ مگر عملی سیاست کی بنیاد سیاسی تجربے پر ہے۔ ڈاکٹر حسن صعب سیاسی قیادت کے بارے میں لکھتے ہیں

فن الحکم الدولة اودراسة المبادی التی تقوم علیها الحکومات والتی تحدّد علاقاتها بالمواطنین وبالدول الاخریٰ۔ [1]

''سیاست ریاست پر حکومت کرنے کا ایک فن ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ان بنیادی اصولوں کا علم ہے جن پر حکومتیں قائم ہوئی ہیں اور ان قواعد وضوابط کا علم ہے جن سے حکومت اور شہریوں کے تعلقات اور بیرونی ریاستوں کے ساتھ روابط کی حدود مقرر کی جاتی ہیں۔

علامہ ابن خلدون قیادت کی سیاسی نوعیت کے بارے میں لکھتے ہیں۔

بادشاہت قانون کی بجائے مطلق العنان بادشاہ کے جبر وقہر پر مبنی ہوتی ہے۔ جو غضب اور حیوانیت کے آثار ہیں۔ ایسے حکمران رعایا پر نا قابل برداشت بوجھ ڈال کر ان کو تباہ کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لئے سیاسی قوانین وضع کرنے کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے جن کی وفاداری کے حکام ورعایا دونوں پابند ہیں۔ اگر یہ قوانین عقلاءِ قوم، ذمہ داران حکومت اور دانشوروں کے وضع کردہ ہوں تو ان قوانین پر مبنی سیاست کو سیاست عقلیہ کہا جاتا ہے۔ اور جب یہ قوانین اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ ہوں جن کو ایک شارع (رسول) نافذ کرتا ہو تو یہ سیاست حقیقیہ ہے جو دنیا وآخرت دونوں میں مفید ہوتی ہے۔ سیاسی حکومت یعنی سیاست عقلیہ عوام کو عقلی نظریات کی پابندی پر مجبور کرتی ہے جس کا مقصد دنیوی فوائد وآرام وآسائش کا حصول ہے۔ اور خلافت یعنی سیاست دینیہ وہ حکومت ہے جو عوام کو اسلامی نظریے اور شرعی قوانین کی پابند بناتی ہے اور اس پابندی کا مقصد اخروی زندگی اور دنیوی زندگی دونوں کے فوائد ومصالح کا حصول ہوتا ہے۔ [2]

اس طرح اسلامی سیاسی قیادت سیاست وشریعت کی حفاظت کرتی ہے اور نیکی کا حکم دیتی ہے اور برائیوں سے روکتی ہے، شرعی سزاؤں اور شرعی قوانین کا نفاذ کرتی ہے۔

ابن خلدون کی تقسیم کا تجزیہ اس طرح بھی کیا جا سکتا ہے کہ سیاست بنیادی طور پر تین قسم کی ہوتی ہے۔

سیاست حیوانیہ　　سیاست عقلیہ　　سیاست دینیہ

حیوانی سیاست نہ عقلی قانون کی پابند ہوتی ہے اور نہ شرعی اور دینی قانون کی بلکہ بادشاہ اور اس کے درباریوں کی خواہش نفس اس کا قانون ہوتا ہے اس قسم کے نظام سیاست کی مثالیں بادشاہت، آمریت، فوجی آمریت اور اشتراکیت ہیں جو بہت بڑی لعنت ہیں اس کے لئے حیوانی سیاست ہی موزوں نام ہے۔

عقلی سیاست اس قانون کی پابند ہوتی ہے جسے عقلاء، دانشوروں اور شرفاءِ قوم نے بنایا ہو اور اس کا مقصد عوام کی دنیوی اور معاشی فلاح و بہبود ہوتی ہے اس کی مثالیں آئینی بادشاہت اور لادینی جمہوریت ہے مگر عقلی نظام سیاست میں بھی اخروی اور ابدی زندگی کی فلاح وسعادت کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔

سیاست دینیہ ہی حقیقی کامل اور مفید سیاست ہے جس کے نظام میں انسان کی حقیقی اور ابدی سعادت کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اور دنیوی فلاح و بہبود کی ضمانت بھی یہی نظام دیتا ہے۔ اس کو خلافتِ اسلامیہ کہا جاتا ہے۔ دراصل یہی سیاست حقیقیہ ہے جو دنیا وآخرت دونوں میں مفید ہوتی ہے۔

---

[1] حسن صعب، علم السیاسة، ص: ۲۵　[2] مقدمہ ابن خلدون، فصل فی معنی الخلافة والامارة، ص: ۱۵۰ تا ۱۵۱

دوسرا باب

قدیم وجدید
تصوراتِ قیادت

فصل اول

انسانی تہذیب کے پہلے دورِ عروج میں بڑی بڑی بادشاہتیں قائم ہوئیں جن کے حیرت انگیز آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان نے دور قدیم میں بھی تمدنی ترقی کے کئی مدارج طے کر لئے تھے۔ مصر میں سب سے پہلے منتشر آبادیوں اور قبیلوں نے سلطنت کی شکل اختیار کرنی شروع کی اور ۴۰۰۰ء قبل مسیح میں وادی نیل پر ایک موروثی بادشاہ کی حکومت قائم ہوگئی۔ جو مشرق میں دریائے فرات تک پھیلی ہوئی تھی جس نے ایتھنز کے حکمرانوں کے تحت ۵۸۰ قبل مسیح میں ایک عظیم شہنشاہیت اختیار کرلی۔ جس کے حکمران نہ صرف شہنشاہی بلکہ خدائی کے بھی دعویدار تھے۔ مصر میں مدت دراز تک مختلف خاندان حکمران رہے یہاں تک کہ ۳۰ء قبل مسیح میں رومیوں نے مصر پر قبضہ کرلیا۔ انسانی تہذیب کا دوسرا گہوارہ دجلہ اور بحر روم کے درمیان کا علاقہ تھا جہاں ۵۰۰۰ء قبل مسیح اور ۴۰۰۰ء قبل مسیح کے درمیان سمیریوں نے اپنے شہر آباد کئے جو طاقتور سلطنت بن گئے ان سلطنتوں کو شام و فلسطین میں رہنے والے سامی حملہ آوروں نے فتح کر لیا[۱]

بابل کے حکمران حمورابی نے ایک عظیم الشان شہنشاہیت قائم کی جو شام اور اناطولیہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس بادشاہ کا ایک بہت بڑا کارنامہ ایک مجموعہ قوانین کی تدوین ہے۔ جس کی وجہ سے عدالت اور انصاف رسانی نے منظم شکل اختیار کی۔ ۵۵۰ء قبل مسیح میں ایرانی سلطنت ایک وسیع شہنشاہیت بن گئی۔ جو سندھ سے مصر تک اور بحر اسود سے بحر ہند تک پھیلی ہوئی تھی۔ جس کے بادشاہوں کو نہ صرف دنیاوی بلکہ مذہبی اقتدار بھی حاصل تھا۔ ۱۷۶۶ء قبل مسیح میں چین کے خاندان شانگ کی حکومت سے شہنشاہیت کا آغاز ہوا جس نے خاندان چو کے حکمران شی ہوانگ لی کے عہد میں چین کے تمام حصوں پر مشتمل متحد و مستحکم چینی شہنشاہیت کی شکل اختیار کرلی۔

مشرق کے دورِ عروج کی یہ تمام سلطنتیں مطلق العنان تھیں جن کے فرمانرواؤں نے کامل اختیارِ حکمرانی اپنی ذات میں مرتکز کرلیا تھا۔ ایشیا اور افریقہ کی وسیع شہنشاہیتوں کے برعکس یورپ کے جنوب مشرقی حصہ میں چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستیں قائم ہوئیں جو قدیم یونان کی شہری مملکتوں کے نام سے مشہور ہیں اور جنھوں نے جمہوری نظام حکومت اور جمہوری تفکر کی ترقی میں بہت نمایاں حصہ لیا' یونان میں شہری مملکت کے قیام اور ترقی کا سبب اسکی جغرافیائی حالت اور تمدنی ارتقاء ہے۔

قدیم یونان میں مملکت اور قوم کا تصور موجودہ تصورات سے مختلف تھا۔ یونان ایک مملکت نہیں بلکہ چھوٹی چھوٹی مملکتوں کا مجموعہ تھا۔ اور یونانی مملکتیں یونان' اطالیہ' شمالی افریقہ اور ایشائے کوچک تک پھیلی ہوئی تھیں ان کی تعداد سینکڑوں تھی اگر چہ ان میں اشتراک نسل و زبان تھا۔ لیکن سیاسی اعتبار سے یہ بالکل خودمختار تھیں۔ ہر شخص اپنی ایک الگ دنیا رکھتا تھا۔ ہر شہر کا جداگانہ طرزِ حکومت تھا اور ہر شہر ایک شہری ریاست (City State) کا حامل تھا۔[۲]

یونانی شہری مملکت:

شہری مملکت کے آغاز کے بارے میں یہ خیال ہے کہ کسی پہاڑی کے اردگرد رہنے والے باشندے پہاڑی پر قلعہ بندی کر کے اس کو اپنے مذہبی سیاسی اور معاشرتی مرکز کے طور پر استعمال کرنے لگتے تھے۔ ابتداء میں اتحاد کا بڑا ذریعہ مذہب ہی تھا لیکن اس کے ساتھ ہی باشندوں نے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد ہونے کی ضرورت کو بھی محسوس کیا۔ اس مقصد کے لئے اردگرد کی آزاد بستیوں اور انکے خودمختار اداروں کو متحد کیا جانے لگا۔ اس اتحاد سے شہری مملکت کی ابتداء ہوگئی بہرحال ارتقائی عمل کے باعث آخر کار یونان دو بڑی شہری ریاستوں اسپارٹا اور ایتھنز

۱۔ شاہد رزاقی، تاریخ جمہوریت، ص: ۶۳ ۲۔ D. R. Bhandari, History of European Political Philosophy, P. 4

میں تبدیل ہوگیا۔شہریوں کے بارے میں یونانیوں کا نظریہ یہ تھا کہ ہر مملکت آزاد شہریوں کا ایک ایسا مجموعہ ہوتی ہے جس کے شہری حقوق سکونت کی بنا پر نہیں بلکہ شہری کی اولاد ہونے کی بنا پر حاصل ہوتے ہیں چنانچہ کسی مملکت کا شہری خواہ وہ کہیں بھی رہتا ہو اسی مملکت کا شہری تصور کیا جاتا ہے۔ جہاں کے شہری حقوق اس کے والدین کو حاصل تھے[۱] مثلاً اگر سپارٹا کا کوئی شہری اپنا وطن چھوڑ کر ایتھنز چلا جاتا اور وہاں سکونت اختیار کر لیتا تب بھی وہ سپارٹا کا شہری ہی تصور کیا جاتا۔

یونان میں شہری مملکت کے ارتقاء کے بارے میں نامور یونانی مفکر ارسطو اور مشہور مؤرخ تھوسی ڈائڈیز (Thucydides) نے اپنی تصانیف میں اظہار خیال کیا ہے کہ یونان میں ایک نسل آباد نہ تھی بلکہ مختلف چھوٹے چھوٹے قبیلے تھے۔ان میں ربط باہمی قبائلی بنیادوں پر قائم تھا۔اوران کے سیاسی معاشرہ کی اکائی گاؤں تھا۔[۲] ارسطو کا خیال ہے کہ گاؤں بجائے خود ایک سیاسی وحدت تھا جس کی اکائی خاندان تھا اور یونانی شہری مملکت کی عمارت اسی بنیاد پر تعمیر ہوئی۔مملکت کے بارے میں یونانیوں کا بنیادی تصور یہ تھا کہ ہر مملکت کو خواہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو۔یہ حق حاصل ہے کہ وہ آزاد رہے' اپنے اوپر خود ہی حکومت کرے اور دوسری شہری مملکتوں سے حسب منشا تعلقات قائم کرے۔یونانیوں کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ انفرادی نشوونما اور انفرادی ارتقاء محض اس صورت میں ممکن ہے کہ ریاست ترقی یافتہ ہو اور وہ فرد کو انفرادی ارتقاء میں مدد دے۔ لہذا منطقی طور پر یونانیوں میں اپنی ریاست سے محبت اور اس پر مر مٹنے کا جذبہ بدرجہ اُتم موجود تھا۔یونانی معاشرے میں فرد کا تصور نہ تھا بلکہ افراد پر مشتمل معاشرے کا تصور تھا۔[۳] ریاست سے الگ اس کی کوئی زندگی نہ تھی۔ارسطو نے انسان کو سیاسی جانور کہا تھا۔غالباً اس سے ارسطو کا مفہوم ''سیاسی و معاشرتی جانور تھا''[۴]

ریاست اور فرد کے مابین گہرے تعلق کو اجاگر کرتے ہوئے ارسطو اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"A man who is without a polis by nature is either above or below the category of man." 5

''جو شخص فطری طور پر ریاست کے بغیر ہے، وہ یا تو انسانیت سے بالاتر ہے یا انسانیت سے بالکل گرا ہوا ہے''

ارسطو ریاست کو افراد کی وابستگیوں کے منضبط مجموعہ کا نام اس لئے دیتا ہے کہ افراد میں متعدد مفادات کے تحت اور اپنے وجود کی بقا کے پیش نظر اتحاد پیدا ہوتا ہے۔جس طرح کنبہ کی تشکیل کسی بیرونی طاقت، مطالبہ یا دباؤ کی محتاج نہیں اسی طرح ریاست کا وجود ایک فطری امر ہے۔

یونانیوں کے نزدیک شہری اور شہریت کا مفہوم بھی مختلف تھا انکے خیال میں شہریت کا مطلب یہ تھا۔کہ حکومت کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کے زیر نگیں رہنے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہو۔رہا یہ پیمانہ کہ کون شہری ہونا چاہیے اور کسے شہری نہیں ہونا چاہیے تو یہ بڑا واضح تھا۔شہری ریاست کی آبادی کی تقسیم یوں تھی۔

۱۔ D.R. Bhandari, History of European Political Philosophy,P: 63

۲۔ Donald Kagan, The Great Dialogue, History of Greek Political Thought, P:104

۳۔ D.R. Bhandari, History of European Political Philosophy, P:11

۴۔ Donald Kagan,The Great Dialogue History of Greek Political Thought, P: 104

۵۔ Ibid P: 16

1۔ زمیندار طبقہ　　　　2۔ صنعت و تجارت سے وابستہ طبقہ

3۔ متوسط طبقہ　　　　4۔ غلام طبقہ

آخری طبقہ حقوق شہریت اور دیگر مراعات سے یکسر محروم تھا انہیں کسی قسم کی شہری و ریاستی ذمہ داریاں نہ سونپی جاتی تھیں شہری حقوق اور ذمہ داریوں سے غلاموں کی طرح اس طبقہ کو بھی محروم رکھا گیا جو عام کارکنوں کا طبقہ تھا۔ یونانیوں کا یہ خیال تھا کہ یہ طبقہ دور اندیشی، قیاس آرائی اور غائرنظری کا حامل نہیں ہوسکتا۔ جب کہ امور مملکت چلانے کے لئے ان صلاحیتوں کا ہونا بے حد ضروری تھا۔ یونانی شہری ریاست بنیادی طور پر ایک عسکری اور ثانوی حیثیت میں ایک زرعی ریاست ہوتی تھی وہاں جسمانی طور پر درست ہر بالغ کیلیے سپاہی ہونا ضروری تھا۔[1] علاوہ ازیں افراد اور ریاست میں تعاون ہی ایسا تھا کہ فرد اور ریاست کے تنازع کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ ریاستی مفادات و مقاصد اور انفرادی مفادات و مقاصد باہم مجتمع تھے ان میں کوئی حد فاصل موجود نہ تھی۔[2]

قدیم یونان میں بھی پہلا دور ملوکیت کا تھا قبائلی سردار بہت با اختیار تھے اور سپہ سالار منصف اور مذہبی پیشوا کی حیثیت سے وسیع تر اختیارات استعمال کرتے تھے۔ لیکن قبائلی روایات کے پابند ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ سردار جو جنگوں کے قائد ہوتے تھے۔ فاتح اور بادشاہ بن گئے۔ پہلے ان بادشاہوں کی نوعیت معاہدہ کے مطابق حکومت کرنے والے یعنی دستوری حکمرانوں کی تھی۔ لیکن آگے چل کر یہ بادشاہت مطلق العنان اور موروثی بن گئی۔[3] ابتداء میں یہ اصول تھا کہ بادشاہ کا انتخاب جنگ میں قیادت کے لئے کیا جاتا تھا اور یہ منتخب شدہ بادشاہ اور اس کی رعایا' دونوں یہ عہد کرتے تھے کہ وہ اپنے فرائض پورے کریں گے۔ لیکن انتخاب کا اصول رفتہ رفتہ نظر انداز کیا جانے لگا اور وراثت کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگئی۔ یونان قدیم میں ارسطو نے قیادت کی تقسیم تین طرح سے کی ہے۔[4]

1۔ بادشاہت (ایک شخص کی حکومت) Monarchy

2۔ اشرافیہ (مفید افراد کی حکومت) Aristocracy

3۔ دستوریہ (بہت سے افراد کی حکومت) Polity

جہاں تک ملوکیت کا سوال ہے وہ ایک شخص کی حکومت کہلاتی ہے جس میں اچھائیاں بھی ہیں مگر اس میں استبدادی عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک شخص میں خواہ لاکھ اچھائیاں ہوں۔ لیکن یہ قطعاً نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اپنے جانشین میں بھی یہ محاسن چھوڑ جائے گا ہوسکتا ہے کہ اس کا جانشین اس کے برعکس ہو۔

عہد قدیم کے ان مطلق العنان حکمرانوں پر اگر کوئی اثر تھا تو صرف بڑے بڑے قبائلی سرداروں کا۔ چنانچہ قبیلہ کے بااثر خاندانوں کے بزرگوں پر مشتمل ایک کونسل ہوتی تھی جو بادشاہ کو مشورہ دیتی تھی۔ اس کونسل کو 'بول' کہتے تھے۔ پہلے تو یہ کونسل صرف مشورہ کی غرض سے بادشاہ طلب کرتا تھا لیکن رفتہ رفتہ یہ نظم و نسق کے فرائض میں بھی شریک ہوگئی۔ یونان کی ہر دستوری مملکت میں خواہ وہ ملوکیت ہوتی یا عدیدیت یا جمہوریہ بول ضرور رہا کرتی تھی یہاں تک کہ دور جابریت میں بھی یہ برقرار رہی۔ افلاطون ملوکیت کو پسند کرتا تھا لیکن کہتا تھا کہ وہ شخص جنگجو اور فلسفی ہونا

---

۱ D.R.Bhandari, History of European Political Philosophy, P:5

۲ Ernest Barker: Political Thought of Plato and Aristotle, P:11

۳ شاہد حسین رزاقی ،تاریخ جمہوریت ،ص:۲۶

۴ D. R. Bhandari,History of European Politicial Philosophy, P: 67

چاہیے۔اس کی ذاتی جائیداد نہ ہو اور نہ وہ کسی نجی ملکیت کا دعویدار ہو۔ [1] اس کے مقابلے میں ارسطو کی ملوکیت ایسے فرد کی ملوکیت ہے جو مسائل کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہو۔ معاملہ فہم ہو اور لوگ اسے سربراہ مان لیں۔

عہد قدیم کی یہ ملوکیت اپنے انتہائی عروج پر پہنچنے کے بعد زوال پذیر ہو گئی۔ اور آٹھویں صدی قبل مسیح کے وسط سے یونانی ملوکیتیں یکے بعد دیگرے ختم ہونے لگیں۔ یونانی حکمران نہ صرف بول بلکہ عوامی اسمبلی کی مرضی کے بھی پابند ہو گئے۔ اس طرح ملوکیت کے زوال کے بعد اعیانیت اور پھر عدیدیت کے لئے راہ ہموار ہونے لگی۔ بادشاہ کے اختیارات بتدریج کم کئے گئے۔ اس میں بڑا حصہ امراء کا تھا۔ جنہوں نے عوامی حقوق کے لئے نہیں بلکہ اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے بادشاہ کا اقتدار کم کرنے کی جدوجہد کی۔

اعیانیت: یونانی ریاستوں میں بادشاہوں کے خاتمہ سے امراء کی طاقت کو فروغ ہونے لگا اور ملوکیت کی جگہ اعیانیت نے لے لی۔ امراء بادشاہ کے زمانہ میں بھی بااختیار اور طاقتور تھے۔ بادشاہ ان سے مشورہ کرتا تھا۔ مفتوحہ ممالک میں ان کو بھی حصہ ملتا تھا۔ عہد ملوکیت میں زیادہ اقتدار شاہی خاندان والے لوگوں کو حاصل ہوتا تھا۔ جس طرح پہلے بادشاہ کو دیوتا کی اولاد تصور کیا جاتا تھا۔ اس طرح اعیانی دور میں امراء بھی فوق البشر سمجھے جانے لگے محض پیدائش کی بنا پر امراء بھی اعلیٰ مراتب کے مستحق اور بہترین اوصاف کے حامل تصور کیے جانے لگے۔ رفتہ رفتہ اعیانیت نے عدیدیت کی شکل اختیار کر لی۔ امراء کی حکومت موروثی بن گئی۔ باپ کے بعد بیٹا حکومت کا سربراہ ہونے لگا۔ [2]

جب بادشاہ کے ظلم و ستم بڑھ جاتے ہیں اور عوام عدل و انصاف سے محروم ہو جاتے ہیں تو معاشرے سے چند افراد عوام کی بھلائی اور عدل و انصاف کا ترازو قائم کرنے کے لئے اٹھتے ہیں اور جابر بادشاہ کی حکومت ختم کر دیتے ہیں۔ اپنی حکومت قائم کر لیتے ہیں۔ ارسطو اس ریاست کو اشرافیہ کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اچھے حکمرانوں کی جگہ دولت مند افراد نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں ۔ یہ دولت مند طبقہ اپنی خودغرضانہ اغراض کے لئے حکومت کرتا ہے۔ مفاد عامہ کی بجائے ذاتی مفاد کو ترجیح دیتا ہے۔ ھومر کی نظموں میں جس قسم کی حکومت کا تذکرہ ہے وہ یہی حکومت تھی۔ [3] ارسطو اسے عدیدیت کہتا ہے۔ اس میں اختیار چند لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ کسی اور کو مداخلت کا موقع نہیں دیتے۔ آٹھویں صدی قبل مسیح کے اختتام سے قبل یونانی ریاستوں میں عام طور سے عدیدی نظام حکومت قائم ہو گیا تھا۔ ان میں ایتھنز، سپارٹا، سائپرس، سائرس، آرگرس، ایلپس، تھیبس، اور ایجلینا زیادہ اہم تھیں۔

دستوریہ: دستوریہ میں حکومت کے اختیارات اشرافیہ سے بھی زیادہ افراد کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ جو ریاست کی فلاح اور استحکام کے لئے کوشش کرتے ہیں اس میں مقررہ مدت کے لئے معاشرے سے کچھ افراد کو چن لیا جاتا ہے تاکہ دفاع اور فلاح و بہبود کے کام کئے جا سکیں۔ یہ حکومت سب کی حکومت ہوتی ہے اور سب کے لئے کام کرتی ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ غریب بہر حال امیروں سے زیادہ ہوتے ہیں لہذا دستوری حکومت کا جمہوری حکومت میں منتقل ہو جانا منطقی بات ہے۔ اور جمہوریت کا مطلب ہے کہ وہ صرف غرباء کے مفادات کا خیال رکھے گی۔ اس طرح یونان میں جمہوری نظام فروغ پانے لگا رفتہ رفتہ یونانی جمہوریت نے اتنی ترقی کر لی کہ تاریخ عالم میں اس کو اہم مقام حاصل ہو گیا۔

---

[1] Donald Kagan:The Great Dialogue, History of Greek Political Thought, P. 191

[2] شاہد رزاقی، تاریخ جمہوریت، ص:۶۹

[3] Donald Kagan, The Great Dialogue, History of Greek Political Thought, P: 9.

یونانی جمہوریت: یونانی جمہوریت کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ایک آزاد شہری اپنے اس حق کی بنا پر کہ وہ آزاد شہری پیدا ہوا ہے۔ حکومت کے ہر عہدہ پر تقرر کا مجاز ہوتا ہے۔ اس کو حکومت کے کاموں میں براہِ راست حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔ اور ہر آزاد شہری خواہ امیر ہو یا غریب، اعلیٰ ہو یا ادنیٰ' شہری اور دستوری حقوق کے اعتبار سے مساوی ہے۔ ارسطو نے اس اصول کو عددی مساوات کا نام دیا ہے اور نظری اعتبار سے واقعی یہ بہت اہم اصول تھا۔

یونانی جمہوریت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں نمائندگی کا اصول نہ تھا بلکہ ہر آزاد شہری حکومت میں براہ راست حصہ لیتا اور قومی اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہو کر رائے دیتا تھا۔ اس کے علاوہ عاملہ اور مقننہ میں تفریق نہ تھی اور آزاد شہری ہی ان اختیارات کے بھی حامل تھے۔ اس قسم کا نظام حکومت محدود علاقوں ہی میں قائم رہنا ممکن تھا اور یونانی مملکتوں میں اس لئے کامیاب ہوا کہ یہ سب چھوٹی چھوٹی شہری مملکتیں تھیں۔

جمہوری نظام اور جمہوری افکار کی جن ترقیوں کی بدولت قدیم یونان کو تاریخ عالم میں ایک ممتاز مرتبہ حاصل ہوا اور جو آگے چل کر مختلف اقوام کی تہذیب وتمدن کی اساس بنیں ان کا سب سے بڑا مرکز ایتھنز تھا، ایتھنز کی شہری مملکت ہی وہ چھوٹی سی ریاست تھی جس کی عظمت کے اعتراف میں دنیا نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ دوسری یونانی ریاستوں کی طرح ایتھنز میں بھی پہلے ملوکیت تھی اور صدیوں کے بعد جمہوریت قائم ہوئی۔[۱]

۱۰۶۶ء قبل مسیح میں ایتھنز کا آخری بادشاہ کوڈرس مر گیا اور اس کی وفات کے بعد نظام حکومت میں یہ اہم تبدیلی کی گئی کہ حکمران کو بادشاہ کے بجائے آرکن کہا جانے لگا جس کو امراء منتخب کرتے تھے۔ آرکن زندگی بھر کے لئے حکمران بنایا جاتا تھا اور اس کا شاہی خاندان سے ہونا لازمی تھا۔ ۷۵۳ء قبل مسیح میں آرکن کی مدتِ حکمرانی دس سال کر دی گئی ۷۱۲ء قبل مسیح میں آرکن کے لئے شاہی خاندان سے تعلق کی پابندی اٹھا دی گئی اور تمام امراء کو اس عہدہ کے لئے امیدوار ہونے کا مجاز قرار دیا گیا۔[۲]

ایتھنز کے نظام حکومت میں یونانی جمہوریت کا یہ اصول پوری طرح کارفرما تھا کہ آزاد شہریوں کو نہ صرف رائے دینے بلکہ حکومت میں براہ راست حصہ لینے' اس کی پالیسیوں پر اثر انداز ہونے اور اس کے عہدہ داروں سے مواخذہ کرنے کا حق حاصل تھا۔

ایتھنز کے بعد اسپارٹا یونان قدیم کی اہم ترین مملکت اور اس نظام حکومت کا علمبردار تھا جس کی بنیاد عسکریت اور حکومت کے ہمہ گیر اقتدار کے تصورات تھے۔ لیکن اس کے باوجود اسپارٹا ان جمہوری اداروں سے یکسر خالی تھا جو یونانی نظام کی خصوصیت تھے اور جن کا اثر کم وبیش ہر ایک یونانی مملکت میں پایا جاتا تھا۔ اسپارٹا ایتھنز سے اس اعتبار سے بالکل مختلف تھا کہ اس کے معاشرتی وسیاسی نظام میں ایک تو فرد پر مملکت کو کامل اقتدار حاصل تھا اور دوسرے شہریوں کی زندگی کے ہر شعبے کو فوجی تربیت کے تابع کر دیا گیا تھا۔ اور اس طرح یہ پوری ریاست ایک فوجی کیمپ تھی جہاں عسکری زندگی اور فنون حرب میں قیادت ہی سب کچھ سمجھی جاتی تھی۔ اور دوسرے علوم وفنون کی اس کے برابر وقعت نہ تھی۔[۳] تاہم ایتھنز اور دوسری یونانی ریاستوں کی طرح اسپارٹا میں بھی یونانی معاشرہ کی یہ بنیادی خرابی موجود تھی کہ تمام جمہوری حقوق صرف آزاد شہریوں تک ہی محدود تھے۔ نیم شہری تمام حقوق سے یکسر محروم تھے۔

---

۱ شاہد حسین رزاقی، تاریخ جمہوریت، ص: ۸۰

۲ Donald Kagan. The Great Dalogue, History of Greek Political Thought, P.79

۳ شاہد حسین رزاقی، تاریخ جمہوریت، ص: ۱۰۱

سپارٹا میں کوئی تحریری دستور حکومت نہ تھا بلکہ روایات پر عمل کیا جاتا تھا جن کے متعلق یہ تصور تھا کہ یہ سب مذہبی احکام ہیں۔ یہی وہ شرائط ہیں جو انسانوں میں باہمی روابط قائم کرنے کے لئے خدا نے مقرر کی ہیں۔ چنانچہ ان شرائط پر عمل کرنے کی قسم کھائی جاتی تھی اور بادشاہ ہر ماہ قسم کھاتا تھا کہ وہ ان شرائط پر عمل کرے گا اور امراء قسم کھاتے کہ وہ بادشاہ کی اطاعت کریں گے۔ ھومر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری یونانی ریاستوں کی طرح اسپارٹا میں بھی بادشاہت تھی بادشاہ نہ صرف کشوری و عسکری قائد تھے بلکہ مذہبی سردار بھی تھے۔ [1]

---

1. Donald Kagan, The Great Dialogue, History of Greek Political Thought, P: 18-20

فصل دوم

ب) بادشاہت

غیر اسلامی نظریات میں سب سے زیادہ مروج اور قدیم نظریہ ملوکیت اور بادشاہت ہے۔ عربی زبان میں مُلک اور مَلک اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے کوئی غلط چیز نہیں رہے۔ مُلک کے لغوی معنی حکومت اور مَلک کے معنی ہیں حکمران۔ حکومت اور حکمرانی بجائے خود تو بری چیز نہیں ہیں قرآن حکیم میں انبیاء کی حکومت کو بھی ملک کہا گیا ہے۔ حالانکہ ان کی حکومت خلافت اسلامیہ اور سیاست شرعیہ کے اصول پر مبنی ہوتی تھی۔

"واتبعوا ما تتلو الشياطين على ملك سليمان" [۱]

''اور یہ اس جادو کی تابعداری کرتے تھے جسے پڑھتے تھے شیطان سلیمانؑ کی حکومت کے زمانے میں''

امام راغب اصفہانی نے ملک کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے ملک وہ ہوتا ہے جو جمہور میں امر و نہی کے ذریعہ تصرف کرتا ہے اور یہ تصرف ذی عقل لوگوں کی سیاست کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ [۲] بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ مَلک ہر اس شخص کا نام ہے جو سیاست کا مالک ہو یا اپنے نفس کے بارے میں قوائے نفسانیہ اس کے قابو میں ہوں۔ یہاں پر جس ملوکیت اور بادشاہت کا ذکر ہے وہ لغوی معنوں میں ملک و بادشاہت نہیں ہے بلکہ اس اصطلاحی ملوکیت و بادشاہت کا تعارف مقصود ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے فساد و بگاڑ اور ظلم و بربریت پھیلانے والی بادشاہت کہا ہے اور رسول اکرمؐ نے اس ملک کو عضوض یعنی کاٹ کر کھا جانے والی بادشاہت کا نام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

"ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها وجعلوا اعزة اهلها اذلة وكذالك يفعلون" [۳]

''یقیناً بادشاہ جب داخل ہوتے ہیں کسی بستی میں تو اس کو خراب کر دیتے ہیں اور کر ڈالتے ہیں وہاں کے باعزت لوگوں کو بے عزت اور ایسا ہی کرتے رہتے ہیں''

اس آیت میں بادشاہ کی جو امتیازی نشانیاں بیان کی گئی ہے ان کی روشنی میں ملوکیت اور بادشاہت کی تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے۔ ''وہ نظام حکومت جو زمین پر فساد پھیلانے اور لوگوں کو ذلیل کرنے کے لئے بنایا گیا ہو۔ اور جس کا اصل مقصد حکمرانی کی شخصی اور ذاتی بڑائی اور بالادستی قائم کرنا ہو''۔

ملوکیت' بادشاہت اور آمریت کا مزاج اور دستور اساسی ہی یہ ہے کہ ظلم و فساد کا بازار گرم کیا جائے عوام کو ذلیل و خوار کر کے بادشاہ کا غلام بنایا جائے اور بادشاہ کی بڑائی اور خدائی کو مسلط اور مضبوط کیا جائے۔ علامہ ابن خلدون نے ملوکیت کی فنی اور اصطلاحی تعریف اس طرح کی ہے۔

''استبدادی بادشاہت وہ حکومت ہے جو لوگوں کو بادشاہ کی ذاتی اغراض اور خواہشات پوری کرنے پر مجبور کرتی ہو'' [۴]

ملوکیت کے شہنشاہی نظام میں بادشاہ کی منشاء ماخذ قانون ہوتی ہے۔ پوری قوم اور سارا خزانہ اس کی ذاتی ملکیت تصور ہوتا ہے۔ وہ

---

۱ البقرہ، ۲/۱۰۲ ۲ امام راغب اصفہانی، مفردات القرآن، ص:۴۹۳ ۳ النمل، ۲۷/۳۴

۴ مقدمہ ابن خلدون، ص:۱۵۱

تنقید سے بالاتر سمجھا جاتا ہے اور کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا۔ کسی شخص کا بادشاہ بن جانا اس بات کا ثبوت سمجھا جاتا ہے کہ وہ خدا کا نمائندہ اور اس کا حکم ماننا منشاء خداوندی ہے۔ گویا بادشاہ انسانی شکل میں خود خدا ہے۔ یہ ہے بادشاہت کا قدیم ترین اور مروج نظریہ سیاست۔

مصری محقق عبدالوہاب نجار ازمنہ قدیمہ کے بادشاہوں کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''زمانہ قدیم کے بادشاہوں نے اپنے اردگرد مقدس ہونے کا ایک دائرہ بنا دیا تھا اور اپنے آپ کو خدائی کا درجہ دے دیا تھا اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اپنے آپ کو انسانوں سے بالاتر سمجھتے تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ ان کا مقدس ہونا شورش اور انقلاب برپا کرنے والوں کے راستے میں بڑی رکاوٹ بن جائے گا۔ حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں نمرود کا یہی حال تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد آنے والے یونانی اور رومی بادشاہوں اور مصر کے فرعونوں کا بھی یہی حال تھا'' [۱]

سید سلیمان ندوی پروفیسر ونسن کے حوالے سے لکھتے ہیں

> ''مصر میں سامیہ اولیٰ کے زمانے میں ستارہ پرستی جاری تھی سب سے بڑا دیوتا آفتاب تھا جس کو وہ اپنی زبان میں ''رع'' کہتے تھے ان کے دارالحکومت کو مدینۃ الشمس کہا جاتا تھا جس کو مصری ''ان'' کہتے تھے۔ یہیں سورج دیوتا کا مندر تھا بادشاہ سورج دیوتا کا بیٹا سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اس کا لقب رعمیسس یعنی ابن الشمس ہوتا تھا یہی سبب تھا کہ سلاطین مصر کو خدائی کا دعویٰ تھا'' [۲]

مولانا آزاد لکھتے ہیں

> ''مصریوں میں الوہیت آمیز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشو ونما پا چکا تھا اور تاجداران مصر نے نیم خدا کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ان کا لقب ''فاراع'' اسی لئے ہوا تھا کہ وہ ''راع'' یعنی سورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے''۔ [۳]

شہنشاہیت کے اسی تصور نے ماضی میں نمرود اور فرعون پیدا کئے جو معاشرتی استحصال کی علامتیں بنائے گئے لیکن نمرود اور فرعون خلا میں پیدا نہیں ہوئے۔ یہ اسی معاشرتی ارتقاء کی پیداوار تھے جس نے معاشرتی قیادت کو قبیلے کے سب سے زیادہ ظالم، سفاک اور بے رحم شخص کے حوالے کیا تھا۔ جس کی اطاعت کے خلاف کوئی آواز گردن زدنی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ نہ صرف خداوند کریم کے مقرر کردہ ہیں بلکہ اس زمین پر اس کی نیابت کے ذمہ دار ہیں لہٰذا جس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہر صاحب ایمان (یعنی جو بھی خدا کو ماننے والا ہو)، پر واجب ہے اسی طرح اس پر خدا کے نائب یعنی بادشاہ کی اطاعت واجب ہے۔ یہ تصور عہد وسطیٰ کے ابتدائی دور سے سترہویں صدی کے آخر تک مغرب اور مشرق میں یکساں رائج رہا۔ لیکن اس تصور کا خطرناک ترین پہلو یہ تھا کہ بادشاہ کے وہ درباری جو بادشاہ کے نیابت الٰہی کے تصور سے مستفید ہو رہے تھے اور بادشاہوں نے ان کی خدمات کے عوض انہیں وسیع وعریض جاگیریں دی ہوئی تھیں اپنی اپنی جاگیروں میں اپنی رعایا کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرنے لگے جس طرح بادشاہ اپنی رعایا کے ساتھ کرتا تھا۔ اپنی سلطنت میں بادشاہ کی ہر بات قانون کا درجہ رکھتی تھی۔ اس کی خواہشات خواہ اچھی ہوں یا بری، ان کی تکمیل درباریوں اور عہدداروں کے فرائض میں شامل تھیں۔ جاگیردار یہی توقعات اپنی رعایا اور ملازمین سے اپنی جاگیروں

---

[۱] قصص الانبیاء، ص: ۱۸۲

[۲] سید سلیمان ندوی: ارض القرآن ۲/۳۶۵

[۳] مولانا آزاد، ترجمان القرآن، ۲/۴۶۲

میں رکھتے تھے۔ ۱ اس طرح بادشاہی کے قیام کے ساتھ ساتھ جاگیرداری نظام نے پورے معاشروں کو دو حصوں میں منقسم کر دیا۔ حکمران طبقہ اور محکوم طبقہ۔

شہنشاہیت کے دور میں بھی کئی شعبوں میں ترقی ہوئی لیکن اس پورے نظام میں جو بنیادی نقص معاشرے کے استحصال سے متعلق تھا۔ اس پر قابو نہ پایا جا سکا۔ اس میں معاشرے کا ایک طبقہ اپنے مفادات کے لئے دوسرے معاشرتی طبقے کو استعمال کرتا تھا۔ اس میں ایک طبقہ وہ تھا کہ جو کسی جنگِ مغلوبہ میں غلام/کنیز کی حیثیت سے آیا یا جسے کسی صاحب حیثیت نے خرید لیا اور اسے اپنے ذاتی مفاد یا ضرورت کے لئے استعمال کیا۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو وسائل کی کمی کے باعث صاحبانِ ثروت کے لئے اجرت پر کام کرتا تھا اور جاگیرداران کی معاشی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کا استحصال کرتے تھے۔ ۲

''ہندوستان کے برہمنی تمدن'' میں بادشاہت کے بارے میں گستاؤلی بان لکھتے ہیں

''برہمنی زمانہ میں طرزِ حکومت خودمختاری پادشاہی تھا۔ پادشاہ کی اطاعت اسی طرح واجب تھی جیسے خدا کی اور جس وقت وہ تخت پر بیٹھا خواہ اس نے کسی گناہ کے ذریعے سے کیوں نہ تخت لیا ہو وہ خدا تعالیٰ کا قائم مقام سمجھا جاتا تھا۔ منو لکھتے ہیں۔

بادشاہ اگر طفلِ نابالغ بھی ہو تو اسے یہ خیال کر کے کہ یہ بھی ایک انسان ہے حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ پادشاہ فی الواقع خدا ہے انسان کی شکل میں۔

لیکن ان پادشاہوں کی حکومت پدرانہ تھی اور رعایا پر اس کا بار نہیں تھا۔ برہمن اپنے مرتبہ کی وجہ سے درجہ میں اس سے زیادہ خیال کئے جاتے تھے اور پادشاہ کو حکم تھا کہ ہر امر میں ان سے مشورہ لے انہیں دان دے اور ان کی دعا کے ذریعے سے اپنی حکومت کو سرسبز رکھے ورنہ وہ ہر قسم کے عذابِ الٰہی کا مستوجب ہوگا''۔

میکاولی متوفی ۱۵۲۷ء نے اپنی کتاب ''المطارحات'' میں اپنے دور کی اور رومی جمہوریتوں کا جائزہ پیش کیا ہے اور بادشاہت کا نظریہ دوسری کتاب ''دی پرنس'' میں پیش کیا ہے دی پرنس میں لکھتے ہیں۔

> ''ایک مطلق العنان بادشاہ جو شر کو دبانے کے لئے شر ہی کو استعمال کرتا ہو، کسی اخلاق و مذہب کا پابند نہ ہو ہر قسم کا مکر و فریب، جوڑ توڑ کرتا ہو، سازش کرتا ہو اور ہر ممکن طریقے سے اپنے اقتدار کو باقی رکھتا ہو وہی بہتر حکمران ہے کسی قانون اور قاعدے کی متعین شکل ضروری نہیں بلکہ ہر وہ قاعدہ جو اقتدار کو بحال رکھنے کے لئے مفید ہو وہی بہتر ہے'' ۴

ایک اور جگہ میکاولی لکھتا ہے

> ''نیکی ایک واہمہ سے زیادہ کچھ نہیں اصل مسئلہ برائی ہے۔ اس لئے جو بادشاہ اپنی بنیادیں مستحکم

---

۱ James Harvey Robinson, Medieval and Modern Times, P:107

۲ Cambridge Medieval History Vol.II, Chapter XX

۳ منوشاستر (باب ہفتم)، تمدن ہند، ص:۲۷۴

۴ میکاولی، مترجم حماد خیری، دی پرنس، ص:۱۴۴

رکھنا چاہتا ہے اس کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ بدی کس طرح کی جاتی ہے اس کے لئے کون ساوقت موزوں ہے اس میں خوبیوں کا ہونا ضروری نہیں لیکن بظاہر خوبیوں کا دکھائی دینا ضروری ہے'' ۱

سولھویں صدی کے دوسرے فلسفی جین بودین بھی بادشاہت کو بہتر نظام حکومت سمجھتے تھے۔ اس کا نظریہ تھا

'' قانون نافذ کرنے والا چونکہ بادشاہ ہوتا ہے اس لئے اس کو ہر قسم کی تنقید سے بالاتر ہونا چاہیے لیکن یہ میکاولی کی اخلاق سے آزاد بادشاہت کا سخت مخالف تھا اس کے نزدیک سیاست کو انسانی اخلاق سے آزاد اور علیحدہ کرنا ہرگز مناسب نہیں'' ۲

ھابس نے سٹوارٹ خاندان کی بادشاہت کی تائید میں لکھا ہے

'' عوام جب معاہدہ عمرانی کے ذریعہ حکمرانی کے اختیارات بادشاہ کو سپرد کردیں تو پھر اس کا مطلق العنان اور ہر قانون سے بالاتر ہونا ضروری ہو جاتا ہے'' ۳

اس فلسفی نے موروثی بادشاہت کی جگہ معاہدہ عمرانی کے ذریعے قائم ہونے والی بادشاہت کا تصور تو دیا ہے مگر باقی امور میں یہ اس قدیم مصری، عراقی، یونانی اور رومی تصور کا سترھویں صدی عیسوی میں بھی حامی تھا کہ بادشاہ ایک مقدس ہستی ہوتا ہے اور ہر قسم کی تنقید سے بالاتر ہوتا ہے جو ایک قسم کے دیوتاؤں کی حیثیت رکھتا ہے اور رعایا کی حیثیت اس کے پرستاروں کی ہونی چاہیے۔ ۴ انسان جب اپنے، پیدا کرنے والے کی غلامی اور اس کے رسولوں کی اطاعت سے روگردانی اختیار کر لیتا ہے تو پھر اپنے جیسے بندوں کی غلامی سے اس کو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اور وہ اپنے لیے نئے آقا اور مالک تلاش کرتا رہتا ہے۔ ۵

ملوکیت اور بادشاہت کی بھیانک تصویر فرعون مصر تھا جس کے پاس حضرت موسیٰ توحید کی دعوت لے کر گئے تھے۔ فرعون مصر کے قدیم بادشاہوں کا لقب تھا۔ عربی میں ہر سرکش اور متکبر کو فرعون کہا جاتا ہے۔ ابن منظور لکھتے ہیں

'' **الفرعنة الكبروالتجبروفرعون كل نبيٍ ملك دهرہٖ و كل عات فرعون والعتاة الفراعنة وقد تفرعن وهو ذوفرعنةٍ اے وهاءٍ و تكبر**'' ۶

'' فرعنہ کے معنی ہیں غرور اور جبر ہر نبی کا فرعون اس کے دور کا بادشاہ ہوتا ہے۔ ہر سرکش کو فرعون اور سرکشوں کو فراعنہ کہتے ہیں تفرعن کے معنی ہیں اس نے سرکشی اور غرور و تکبر کی روش اختیار کر لی ہے''۔

حضرت موسیٰ کے زمانے میں فرعون کون تھا؟ اس کے بارے میں عام مؤرخین اور مفسرین کا قول یہ ہے کہ یہ عمالقہ یعنی عملیق بن اود بن ارم بن سام بن نوح کی نسل کا ایک بادشاہ تھا جس کا نام ولید بن مصعب بن ریان تھا۔ ۷ مگر اب جدید مصری اثری تحقیقات اور حجری تحقیقات سے یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ موسیٰ کی ولادت ''رعمیسس ثانی'' کے دور میں ہوئی تھی اور اسی کے گھر میں انہوں نے پرورش پائی لیکن موسیٰ کے

---

۱ میکاولی، مترجم حماد خیری، دی پرنس، باب ۱۸، ص:۱۴۶ ۲ حسن صعب، علم السیاسۃ، ص:۹۷

۳ Bhandari, Histrory of European Political Philosophy, P:244

۴ Ibid: p. 245 ۵ گوہر رحمٰن، اسلامی سیاست، ص:۵۷

۶ لسان العرب، باب النون مع الفاظ مادہ فرعن، ۱۳/۳۲۳ ۷ ابن کثیر، تفسیر، ۱/۱۵۷

دورِ نبوت کا فرعون اسی رعمیسس ثانی کا بیٹا ''منفتاح'' تھا۔ جس کا زمانہ حکومت تقریباً ۱۲۹۵ قبل مسیح تا ۱۲۲۰ قبل مسیح تھا اس جدید تحقیق کے متعلق مصری دارالاثار کے مصور اور اثری و حجری تحقیق کے بہت بڑے عالم احمد یوسف احمد آفندی نے مستقل کتاب لکھی ہے اور بڑی تفصیل کے ساتھ اس جدید رائے کو ثابت کیا ہے۔[۱]

بہرحال فرعون موسیٰ کا جاننا یہاں اتنا ضروری نہیں ہے اصل بات یہ ہے کہ یہ ملوکیت اور بادشاہت کا قبیح ترین اور جابرانہ نظام تھا جس کو فرعون ازم کا نام دیا جاسکتا ہے۔ موسیٰ وفرعون کا قصہ دراصل اسلامی نظام اور فرعونی نظام اور توحید وشرک کی باہمی کشمکش کا سبق آموز قصہ ہے۔

قرآن کریم میں فرعون کا نام ۷۴ سورتوں اور ۷۴ مقامات پر آیا ہے موسیٰ کا اسم گرامی ۱۰۷ مقامات پر اور حضرت ہارونؑ کا ذکر ۱۴ مقامات پر آیا ہے[۲]

قرآن کریم کی آیات اور قصہ موسیٰ وفرعون کے گہرے مطالعے سے استبدادی بادشاہت کا جو سیاسی اصول اور لائحہ عمل معلوم ہوتا ہے وہ دنیا کے ہر شہنشاہی نظام حکومت کا اصول اور طریقہ کار رہا ہے اس لئے ان فرعونی اصول کا ذکر فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

1۔ ربوبیت اور الوہیت کا دعویٰ

فقال انا ربکم الاعلیٰ [۳]   ''پس کہا فرعون نے میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں''

قال لئن اتخذت الٰھا غیری لاجعلنك من المسجونین [۴]

''کہا فرعون نے اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو حاکم مانا تو تجھے بھی ان لوگوں میں شامل کردوں گا جو قید خانوں میں پڑے ہیں''

یا یھاالملاءُ ما علمت لکم من الله غیری [۵]

''فرعون نے کہا اے درباریو! میں تمہارے لئے کسی حاکم کو نہیں جانتا سوائے میری اپنی ذات کے''

عربی زبان میں رب اور الہ حاکم کے معنوں میں آتے ہیں۔ فرعون کے دعویٰ ربوبیت والوہیت کا مطلب یہ تھا کہ حاکم اعلیٰ مقتدر اعلیٰ اور ماخذ قانون میں خود ہوں میرے حکم اور قانون پر تنقید کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔

2۔ عوام کو غلام سمجھنا

انومن لبشرین مثلنا و قومھما لنا عابدون [۶]

''کیا ہم ان دونوں کی بات مان لیں جو ہم جیسے انسان ہیں اور انکی قوم ہماری غلامی کرتی ہے''

وتلك نعمة تمنھا علیَّ ان عبدت بنی اسرائیل [۷]

''اور یہ ہے تیرا احسان جو تو نے مجھ پر جتایا ہے کہ تو نے یعقوب کی اولاد کو غلام بنالیا تھا''۔

امام ابن جریرؒ فرماتے ہیں

فرعونیوں کا مقصد یہ تھا کہ موسیٰؑ وہارون کی قوم ہماری تابعدار وغلام اور ذلیل وخوار قوم ہے۔ عرب کسی بادشاہ کے تابعدار کو اس کا غلام کہتے ہیں[۸]

---

[۱] عبدالوہاب نجار، قصص الانبیاء، ص: ۲۰۱ تا ۲۰۳ [۲] گوہر رحمٰن، اسلامی سیاست، ص: ۵۸ [۳] النّزعٰت، ۷۹/۲۳ تا ۲۴

[۴] الشعراء ۲۶/۲۹ [۵] القصص، ۲۸/۳۸ [۶] المومنون، ۲۳/۴۷ [۷] الشعراء، ۲۶/۲۲ [۸] تفسیر ابن جریر، ۱۸/۲۵

ان آیات میں ملوکیت وفرعونیت کا دوسرا اصول بیان ہوا ہے کہ عوام کی حیثیت بادشاہ کے غلاموں کی ہے اور بادشاہ کی حیثیت مالک و آقا کی ہے۔

3۔ سرمائے اور دولت کو شرافت کا معیار سمجھنا

ونادیٰ فرعون فی قومہٖ قال یا قوم الیس لی ملك مصر و ھذہ الا نھر تجری من تحتی افلا تبصرون۔ ام انا خیر من ھذا الذی ھو مھین ولا یکاد یبین۔ فلو لا القی علیه اسورة من ذھب اوجاء معه الملئکة مقترنین [۱]

''اور پکارا فرعون نے اپنی قوم میں۔ بولا اے میری قوم بھلا میرے ہاتھ میں نہیں حکومت مصر کی اور یہ نہریں چل رہی ہیں میرے محل کے نیچے کیا تم نہیں دیکھتے بھلا میں ہوں بھی بہتر اس شخص سے جس کو کچھ عزت نہیں اور صاف بول بھی نہیں سکتا۔ پھر کیوں نہ اتارے گئے اس پر سونے کے کنگن یا آتے فرشتے اس کے ساتھ پرا باندھ کر''۔

ان آیات میں فرعون ازم کی تیسری نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ شرافت وعزت کا معیار سرمایہ، دولت، حکومت اور مادی قوت ہوتی ہے۔

اقتدار اور بنیادی انسانی حقوق اس نظام میں سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور مترفین کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ اسی طرح یونان کی نام نہاد جمہوریتوں میں مزدوروں، کسانوں اور غلاموں کو حق رائے دہی اور دیگر شہری حقوق حاصل نہیں تھے۔ برطانیہ میں مطلق العنان بادشاہت کے طویل دور میں رائے دہی کا حق اسی شخص کو حاصل تھا جو جائیداد کا مالک ہوتا تھا۔ [۲]

فرعون نے بھی اسی سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ ذہنیت کا اظہار اپنی قوم کے سامنے کیا تھا۔

4۔ سیاسی قتل کروانا اور بیگار لینا

واذ نجینکم من اٰلِ فرعون یسومونکم سوء العذاب یذبحون ابناء کم و یستحیون نساء کم و فی ذالکم بلاء من ربکم عظیم [۳]

''اور یاد کرو اس وقت کو جب کہ رہائی دی تھی ہم نے تم کو فرعون کی قوم سے جو تم پر بڑا ظلم کرتے تھے تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑتے تھے اس میں آزمائش تھی تمہارے رب کی طرف سے بڑی''

ابن جریرؒ نے ابن اسحٰقؒ سے نقل کیا ہے کہ

> ''فرعون نے بنی اسرائیل کو جبراً اور مفت کے خدمت گار اور مزدور بنا لیا تھا اور ان کے ذمہ مختلف کام لگا دیئے تھے۔ بعض سے عمارتیں اور محلات بنواتا تھا اور بعض سے کاشتکاری کا کام لیتا تھا جو لوگ کام کے قابل نہیں تھے ان سے ٹیکس لیتا تھا۔ سوء العذاب سے یہی مراد ہے''۔ [۴]

بائیبل میں بھی بیگار لینے اور بچوں کو قتل کروانے کی یہی وجہ بیان ہوئی ہے کہ ان کو کمزور کیا جائے۔

''اور اس نے اپنی قوم سے کہا کہ دیکھو اسرائیل ہم سے زیادہ اور قوی ہو گئے ہیں سو آؤ ہم ان کے

---

۱ الزخرف،۴۳/۵۱تا۵۳
۲ Hamid A.U.Rai, History of Political Philosophy, P: 555
۳ البقرہ،۲/۴۹
۴ ابن جریر، تاریخ طبری، ۱/۱۹۸، تفسیر ابن جریر، ۱/۲۷۱

ساتھ حکمت سے پیش آئیں۔اس لئے انہوں نے ان پر بیگار لینے والے مقرر کئے جوان سے سخت کام لے لے کر ان کوستائیں“۔[1]

قرآنی آیات اور بائیبل میں فرعون ازم کا جو اصول بیان ہوا ہے کہ حکمران طبقہ کے علاوہ باقی لوگوں کو دبایا جائے بادشاہت کو بچانے کے لئے ہر قسم کی خونریزی اور ظلم وتشدد حتیٰ کہ معصوم بچوں تک کو قتل کروانا اس شہنشاہی نظریہ سیاست کا دستور اساس ہوتا ہے۔

5۔ سیاسی رشوتیں دینا اور لوگوں کے ضمیر خریدنا

فلما جاء السحرة قالوا لفرعون ائن لنا لاجراً ان کنا نحن الغالبین قال نعم و انکم اذاً لمن المقربین[2]

”پھر جب آئے جادوگر کہنے لگے فرعون سے بھلا کچھ ہمارا حق بھی ہے اگر ہو ہم کو غلبہ، بولا فرعون ہاں اور تم اس وقت مقربوں میں ہو گے“

اس آیت میں بادشاہ کا پانچواں اصول بیان ہوا ہے کہ خون کے ساتھ طمع اور رالچ کا ہتھیار بھی استعمال کیا جائے۔ ہر دور کے بادشاہوں نے حق پرستوں کے مقابلے میں علماء سوء، نفس پرست پیروں ادیبوں اور شاعروں کے ضمیر رشوت دے کر خریدے ہیں۔فرعون نے بھی موسیٰؑ کے مقابلہ میں جادوگروں کو رشوت دے کر ان کے ضمیر خریدے تھے۔

6۔ دلیل کا جواب تشدد سے دینا

فرعون جب جادوگروں کے ذریعہ مقابلہ جیت نہ سکا اور موسیٰؑ کی صداقت کی قطعی دلیل کھل کر سامنے آ گئی جس سے متاثر ہو کر اس کے اپنے جادوگر ایمان لے آئے تو اس دلیل کا جواب اس نے تشدد سے دینے کا فیصلہ کیا اور کہا

قال اٰمنتم لہ قبل ان اٰذن لکم انہ لکبیرکم الذی علّمکم السحر فلسوف تعلمون لا قطعن ایدیکم وارجلکم من خلٰف ولاو صلبنکم اجمعین[3]

”بولا فرعون تم نے اس کو مان لیا میرے حکم دینے سے پہلے بے شک یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تم کو سکھایا جادو۔سو ابھی معلوم کر لو گے البتہ میں کاٹوں گا تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں اور تم سب کو سولی پر چڑھاؤں گا“۔

یہ ہیں فرعونیت اور ملوکیت کے چھ بڑے بڑے اصول جن سے دنیا کی ہر قسم کی بادشاہت اور ملوکیت کا سیاسی لائحہ عمل معلوم کیا جاسکتا ہے۔

چنگیزیت بھی ملوکیت اور سرداری نظریہ سیاست کی ہی ایک شکل ہے۔جس طرح بھیڑیا خون پینے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔اسی طرح چنگیز خان انسانی خون بہائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

آسمان با ما سر پیکار داشت
در بغل یک فتنۂ تاتار داشت (اقبالؒ)

تاریخ عالم میں جس قدر سفاک اور خون خوار بادشاہ ہوئے ہیں چنگیز خان ان سب سے بڑھ کر تھا۔کیونکہ اس کے عہد میں نوع انسان کا جتنا خون بہایا گیا اور جتنی بستیاں ویرانوں میں تبدیل ہوئیں کسی فاتح کی لشکر کشی میں اس کی مثال نہیں ملتی۔[4]

---

۱ بائیبل کتاب خروج باب ۱، آیات ۹ تا ۱۱
۲ الشعراء، ۲۶/۴۱،۴۲
۳ الشعراء، ۲۶/۴۹
۴ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی، تاریخ ایران، ۲/۲۳۱

ابن الاثیرؒ لکھتے ہیں

> ''اگر کوئی کہے کہ آدمؑ سے لے کر آج تک دنیا ایسی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوئی تو وہ بالکل سچا ہے تاتاریوں نے جن شہروں میں قتل عام کیا ہے ان میں سے تنہا ایک شہر کے باشندے ان بنی اسرائیل سے زیادہ ہیں جن کو بخت نصر نے قتل کیا تھا'' [1]

چنگیز خان کی بادشاہت ۵۹۹ھ میں قائم ہوئی تھی اور ۶۲۴ھ میں وہ مر گیا تھا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''میں نے ایک کتاب دیکھی ہے جس کو بغداد کے ایک وزیر علاء الدین جوینی نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں چنگیز کی مرتب کردہ اس کتاب کے اقتباسات نقل ہوئے ہیں جس کو ''ساسایا سیاسا'' کہا جاتا ہے۔ جو اس کی سلطنت کا آئین تھا۔ اور یہی اس کی اولاد کا دستور العمل تھا۔ اس کتاب میں قتل سے کم سزا نہ تھی [2]

لوگ ہٹلر اور مسولینی کے فاشزم اور آمریت کی فنی تعریفیں کرتے رہتے ہیں جب کہ چنگیزی آئین فاشزم اور آمریت کی صحیح تعریف ہے جو فرعون ازم کا جدید ایڈیشن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت سے زیادہ جابرانہ نظام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] ابن الاثیر، تاریخ الکامل، ج۱۲، ۱۱۸/

[2] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ج۔۱۲/ ۱۱۸

فصل سوم

پاپائیت

عام طور پر اشیا کی اہمیت و وضاحت اس کے متضاد سے ہوتی ہے۔ مثلاً روشنی کی اہمیت اس وقت زیادہ واضح ہوگی جب ظلمت و تاریکی کی تباہی و خرابی سے آگاہی ہو جائے۔ اسی طرح حق و باطل، ظلم اور عدل سچ اور جھوٹ کے تقابلی جائزہ سے حقیقت واضح ہوتی ہے۔ سچائی کی حقیقت پر ایمان وایقان پختہ ہو جاتا ہے۔

اسلامی قیادت کی اہمیت و جانچ پرکھ کے لئے ضروری ہے کہ دیگر غیر اسلامی نظریات اور نظام ہائے حکومت کا تعارف کرایا جائے۔ تاکہ ان ظالمانہ و مشرکانہ نظاموں کی پہچان سے اسلام کے عادلانہ اور توحید پر مبنی نظام سیاست کی سچائی پر یقین اور اذہان میں پختگی پیدا ہو جائے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"اتخذوا احبارھم و رھبانھم ارباباً من دون الله"[1]

"بنا دیا تھا انہوں نے اپنے علماء وراہبوں کو اپنا رب اللہ کے علاوہ"

اسی طرح ایک شاعر نے کہا ہے

وھل بدل الدین الا الملوك
واحبار سوء ورھبانھا

"اور نہیں بدلے دین مگر بادشاہوں نے اور علماء سوء نے اور راہبوں نے"

بقول اقبال:۔

خدا وندا یہ ترے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

پاپائیت بھی حکومت اور آمریت ہی کی دوسری شکل ہے جس میں پوپ یعنی مذہبی پیشوا کو مطلق العنان حاکمیت کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ بادشاہ سر پر شاہی تاج رکھ کر مظالم کرتا ہے اور پوپ دلق وقبا پہن کر لوگوں پر اپنی بادشاہی مسلط کرتا ہے۔

بزیر دلق مرصع کندھا دارند
دراز دستی ایں کو تاہ آستیاں بیں

لباس تقدس میں یہ مذہبی پیشوا اپنی خدائی لوگوں پر قائم کرتا ہے تحلیل و تحریم یعنی امر و نہی کے بارے میں پوپ اور اس کے نمائندوں کو معیار حق اور مختار کل کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ پاپائیت کو لوگ مذہبی حکومت کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ مذہب کی حکومت نہیں پاپاؤں کی حکومت ہے تھیا کریسی کی اصطلاح عام طور پر ایک ایسی ریاست کے لئے بولی جاتی ہے جو مذہب پر قائم ہو جس میں سارا اختیار ایک ایسے فرد یا گروہ کے ہاتھ میں ہو جو یا تو اپنے آپ کو مظہر خدا سمجھے یا اس سے براہ راست رہنمائی حاصل کرنے کا دعویٰ رکھتا ہو[2] اس سے مقصود وہ انداز حکومت تھا جو بنی اسرائیل کی زندگی میں رائج تھا۔ ان حکومتوں میں سیاسی اقتدار یا تو براہ راست ایک مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں ہوتا۔ یا یہ گروہ اقتدار کے

---

[1] التوبہ، ۹/۳۱   [2] مولانا گوہر رحمٰن اسلامی سیاست، ص: ۱۷

تخت پر متمکن ہونے والوں کی حفاظت اور پاسبانی کے فرائض سرانجام دیتا۔ خدا کے احکام حاصل کرنے کا طریقہ ان کے ہاں یہ تھا کہ وہ سب مل کر اپنے میں سے ایک انسان کا انتخاب کر لیتے اور پھر اسے یہ حق تفویض کر دیتے کہ وہ اکیلا ان کی طرف سے خداوند تعالیٰ سے ہم کلام ہو کر اس کا منشاء معلوم کر کے انہیں اس سے آگاہ کرے ان احکام کی بجا آوری سوائے اس طبقہ کے سب پر لازم ہوتی۔

آغاز میں تو سارا اختیار اس گروہ کے قبضہ میں رہا مگر وقت گزرنے کے ساتھ بادشاہ اپنے آپ کو خداوند تعالیٰ کی اس نوازش کا حقدار سمجھنے لگا اور اس طرح اس طبقہ میں یہ ہمت نہ رہی کہ وہ حکمران کے کسی قول یا فعل پر لب کشائی کی جرأت کرے البتہ فرمانروا کے مرنے کے بعد ایک مجلس منعقد کی جاتی اور اس میں اس کے اعمال کو جانچ کر یہ فیصلہ کیا جاتا کہ آیا مرنے والا بادشاہ جنت کا مستحق ہے یا دوزخ کا۔ ان لوگوں کا فیصلہ اس کے جانشین کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتا۔ ۱

یورپ کے پاپائی نظام کا سینٹ پال ہیرو تھا جس نے موسوی شریعت کو لعنت قرار دے کہ مسیحیت کی بنیاد صرف ان اخلاقی تعلیمات پر رکھی تھی جو نئے عہد نامے میں پائی جاتی ہے۔ ان اخلاقی تعلیمات میں کوئی ایسا قانون موجود نہیں جس پر ایک تمدن اور ریاست کا نظام چلایا جا سکے۔ اس لئے جب انہیں ایک نظام حکومت قائم کرنا پڑا تو ان کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشاتِ نفس کے مطابق قوانین وضع کر کے نافذ کریں۔ اور پھر کہیں کہ سب خدا کی طرف سے ہے۔ تھیاکریسی کے ان مختلف مظاہر کو سامنے رکھ کر اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں باوجود ہزار اختلافات کے جو چیز قدر مشترک کی سی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں عنان اقتدار ان افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو عام انسانوں سے بلند و بالا ہونے کے ساتھ ساتھ حاکمیت کے حقوق بھی رکھتے ہیں۔ یہ لوگ صرف فوق البشر ہونے کے دعویدار ہی نہیں ہوتے بلکہ اپنے آپ کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز بھی سمجھتے ہیں اس لحاظ سے ان کی حیثیت ایک مطلق العنان کی سی ہوتی ہے۔ جس پر مخلوق کسی قسم کی تنقید نہیں کر سکتی۔ ۲

بلنچلی اپنی کتاب Theory of State میں نہایت ہی خوبی سے ان احکام کو حاصل کرنے کے طریقہ کا نقشہ کھینچتا ہے۔ ''قانون الٰہی ایک سونا منڈھے ہوئے صندوق میں رکھا رہتا جس کی دو کر بی حفاظت کرتے اور جس کی تعظیم الہام ربانی کے مرکز کی حیثیت سے کی جاتی تابوت خیمہ کے اندر ایک پردہ کے پیچھے قدس الاقداس میں رہتا تھا۔ اور کاہنوں کی طرف سے اس کی نگرانی ہوتی تھی یہیں کاہن اعظم یہودا سے احکام معلوم کرتا اور لوگوں کو مطلع کرتا۔ قضاء جو قبائل میں شریعت کی تنفیذ پر مامور تھے وہ یہ کام خدا کے نام پر سرانجام دیتے تھے کیونکہ قانون سازی کا حق صرف اللہ کے لئے مخصوص تھا''۔ ۳

تھیاکریسی یعنی پاپائیت جن نظریات کے سہارے زندہ رہی ان میں ایک نسلی اور نسبی فضیلتوں کا عقیدہ بھی ہے۔ ہندوستان کے قدیم برہمن اور یہود و نصاریٰ کے مذہبی پیشوا ایک مدت سے مرجع خلائق بننے اور امن و فارغ البال زندگی میسر آنے کی وجہ سے اس خبط میں مبتلا ہو چکے تھے کہ یہ ان کا پیدائشی حق ہے وہ خدا کے سب سے زیادہ محبوب اور عزیز بندے ہیں اس لئے عزت، سیادت اور سربراہی ان کا لازمی حصہ ہے۔ جو کبھی ان سے الگ نہیں ہو سکتا۔

---

۱ عبدالحمید صدیقی، اسلام اور تھیاکریسی، ص:۳۱ ۲ عبدالحمید صدیقی، اسلام اور تھیاکریسی، ص:۳۲

۳ Bluntchli, The Theory of State, P: 350-351

قرآن کریم ان کے ان دعووں کو باطل قرار دیتا ہے۔

وقالت الیھود و النصریٰ نحن ابناءُ اللہ واحباءُ ہٗ، قل فلم یعذبکم بذنوبکم بل انتم بشر ممن خلق یغفر لمن یشاءُ و یعذب من یشاءُ [1]

''اور یہود ونصاریٰ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں کہہ دیجئے کہ پھر خدا تمہیں گناہوں کے بدلہ میں سزا کیوں دیتا ہے بلکہ تم بھی خدا کی مخلوق کے عام آدمیوں کی طرح ہو وہ بخشے گا جس کو چاہے گا اور سزا دے گا جس کو چاہے گا''۔

تھیا کریسی کی غایت اولی یہی ہے کہ دنیا میں ایک ظالمانہ اور قاہرانہ نظام قائم کیا جائے جن میں لوگوں پر زیادہ سے زیادہ سختیاں کی جاسکیں۔ کیونکہ ان سختیوں کو برداشت کرنے سے ہی انسان کی عاقبت درست ہوسکتی ہے، حکومت الٰہیہ کا اصل مقصد چونکہ لوگوں کی عاقبت سنوارنا ہے اس لئے اس زندگی میں جس قدر استبداد ہو گا اتنا ہی عوام کے حق میں بہتر ہو گا۔ اس بناء پر اگر تھیا کریسی کی حدود میں کوئی فاقہ مستی کا شکار ہے کوئی بیمار ہے کوئی بے گھر ہے تو اسے خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے کیونکہ اس دنیا کی سختیوں کو برداشت کرنے کے بعد ہی اسے آخرت میں جنت کی نعمتوں کی توقع ہوسکتی ہے۔ اب اگر حکومت کسی فرد کو بھوک اور افلاس سے نجات دلاتی ہے اس کا علاج کرتی ہے اسے مکان مہیا کرتی ہے تو وہ مشیت الٰہی میں حائل ہوتی ہے اس وجہ سے وہ حکومت الٰہیہ کہلانے کی مستحق نہیں ہے[2]

پاپائیت یا تھیا کریسی کو جو چیز غذا مہیا کرتی ہے وہ عوام کی جہالت ہے اس سے مذہبی طبقوں کی سطوت اور خدائی قائم رہتی ہے اس لیے ان لوگوں نے علم دین اور اس حصول کو صرف اپنے تک محدود رکھا اور باقی لوگوں کے لئے یہ ایک شجر ممنوعہ قرار دیا، مذہبی پیشواؤں کو یہ خوف لاحق ہوتا تھا کہ مذہب کے نام پر جو کچھ کیا جا رہا ہے اگر عوام کو علم ہو گیا تو ان کی پیشوائی کا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ [3] لہذا انہوں نے لوگوں کو تعلیم سے بے بہرہ رکھنے کی کوشش کی۔ تورات وانجیل کا پڑھنا عوام کے لئے ممنوع تھا۔ پوپ اور کلیسا کا فیصلہ وحیٔ خداوندی کا درجہ رکھتا تھا جس پر تنقید کرنا یا اس کی خلاف ورزی کرنا کفر وارتداد سمجھا جاتا تھا۔ حق و باطل کو خلط ملط کرنا، حق کو عوام سے پوشیدہ رکھنا اور اپنے ہاتھ سے لکھے گئے فتوے کو اللہ کی طرف منسوب کرنا، ان نام نہاد علماء اور پیروں کا پیشہ تھا۔ وہ اپنی ذاتی اغراض اور دنیاوی حرص وہوس کا اس بری طرح شکار ہو چکے تھے کہ انہیں حق و باطل کا احساس مٹ گیا۔

اس طرزِ عمل پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کی مذمت کی ہے۔

ولا تلبسوا الحق بالباطل وتکتموا الحق وانتم تعلمون [4]

''اور مت ملاؤ صحیح میں غلط اور مت چھپاؤ سچ کو جان بوجھ کر''

پاپائیت کے بارے میں مختلف مفکرین کی آراء

ازمنہ وسطیٰ ایک غیر سیاسی دور تھا۔ اس دور میں سیاست کو تحقیق وتجسس کا الگ موضوع شمار نہ کیا جاتا تھا۔ اس دور میں سیاسی فلسفہ تو برائے نام ہے۔ البتہ تحریری الجھاؤ عام ملتا ہے۔ اس وقت لوگ مرکزیت کی حامل غیر مذہبی طاقت اور ایک مرکزی مذہبی طاقت پر ایمان رکھتے تھے۔

---

[1] المائدہ، ۵/۱۸

[2] عبدالحمید صدیقی، اسلام اور تھیا کریسی، ص: ۱۱۲، ۱۱۳

[3] اسلام اور تھیا کریسی، ص: ۱۱۶، ۱۱۷۔

[4] البقرہ، ۲/۴۲

پاپائیت اور مقدس سلطنت روم کے حامی اپنے دعاوی کے ثبوت میں انجیل کی آیات پیش کرتے رہے۔ پاپائیت کے حق میں مفکرین یہ کہتے تھے۔

اگر بنی نوع انسان کو یکساں بنایا گیا ہے تو کلیسا' جس کی بنیاد خود ذات خداوندی نے رکھی ہے وہی واحد سچی ریاست ہوسکتا ہے اسے تمام مذہبی اور دنیاوی امور پر حاکمیت وفوقیت حاصل ہے۔ ریاست کا سربراہ یسوع مسیح ہے مگر یسوع مسیح کا ہر دور میں اس دنیا پر ایک نمائندہ ہوتا ہے جو ان اختیارات کا نفاذ کرتا ہے اور یہ نمائندہ پوپ ہے۔ جو عوام کا پیشوا اور مبلغ ہے۔ غیر مذہبی حاکمیت کے حق میں جو مفکرین تھے وہ کلیسا سے قطع نظر صرف، غیر مذہبی امور تک حکمران کی حاکمیت کو محدود کرتے تھے اور کلیسا کو صرف مذہبی امور کی حاکمیت تک ۔[1]

جدید مفکرین کی طرح ازمنہ وسطیٰ کے ان مفکرین نے بھی ریاست کو ہر حالت میں اخلاقی بنیادوں پر لیا ان کی دلیل یہ تھی کہ اخلاقیات محض کلیسا کی اجارہ داری نہیں۔ اس لئے کلیسا کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ریاست پر اپنا دعویٰ کرے اور غیر مذہبی امور پر اپنی حاکمیت جتائے۔

شاہ پرستوں کے خیال میں کلیسائیت اور شاہیت واحد مسیحی دولتِ مشترکہ کے دو رخ تھے لہٰذا ان دونوں کے درمیان خوشگواری اور ربط وضبط قائم رہنا چاہیے مگر اس طریق پر کہ وہ اپنے اپنے شعبہ میں سرگرم عمل رہیں اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ کلیسا صرف روحانی امور تک محدود رہے اور ریاست کے امور میں مداخلت نہ کرے۔

اس دور کے معروف مفکرین میں ہلڈر برانڈ (Hilder Brand)، مین گولڈ (Manegold)، جان آف سالسبری (John of Salisbury)، سینٹ تھامس اکیوناس (Thomas Acquinas) اور آگسٹس ٹرائمفس (Augustus Triumphus) خاص طور سے پاپائیت کے حامی گنے جاتے ہیں۔[2]

ہلڈر برانڈ: ہلڈر برانڈ جو بعد ازاں گریگوری ہفتم کے نام سے جانا جاتا تھا اپنے دور کا وہ مفکر تھا جو بڑی شدت کے ساتھ ریاست اور پاپائیت کی حاکمیت اعلیٰ کا موئید وحامی تھا وہ نہ صرف ایک مفکر بلکہ عملاً مصلح بھی تھا۔ وہ خود پوپ تھا اور اس نے نہ صرف کلیسا میں بعض اہم اصلاحات کیں بلکہ ان اصلاحات کو ایسا رنگ دیا کہ ان کے بعد کلیسا کو خود ہی دنیا دار حکمرانوں پر فوقیت وحاکمیت حاصل ہو جائے اور کلیسا ان پر مکمل کنٹرول حاصل کر سکے۔ اس نے ایک ایسی تحریک بھی چلائی جس کے باعث پاپائیت کے عزت ووقار میں اضافہ ہوا۔ اس کا تصور یہ تھا کہ پوپ کو منصف اعلیٰ کی حیثیت بھی حاصل ہو۔ جنگ وامن کے تمام اختیارات اس کے پاس ہوں ایک بادشاہ کے بعد وہ اس کے جانشین کا تعین کر کے حکمرانوں یا استبدادی طاقتوں اور جابروں کو معزول کر سکے یا یوں کہیے کہ وہ شاہ یا شہنشاہ کی جگہ جاگیردارانہ تنظیم کے بنیادی اصولوں کو اپنانا چاہتا تھا۔ [3]

مین گولڈ: مین گولڈ ایک پادری تھا۔ گریگوری ہفتم سے متاثر ہونے کے باعث اس نے پاپائیت کے حاکمیت اعلیٰ کے دعوے کی زبردست حمایت کی۔ اسے یہ اعتراف تھا کہ دنیاداری کے اختیارات یا حکومت ایک خدائی عطیہ ہے مگر اسے عوام ایک معاہدے کے تحت حکمران کو تفویض کرتے ہیں۔ لہٰذا حکمران پر لازم ہے کہ وہ منصفانہ انداز میں حکومت کرے۔ اس کے خیال میں لوگوں پر شاہی اطاعت فرض تھی تاہم یہ بادشاہ

---

1. صلاح الدین ناسک، افکار سیاسی مشرق ومغرب، ص:۱۶۱ تا ۱۶۳
2. Bhandari, History of European Political Philosophy; P. 136
3. صلاح الدین ناسک، افکار سیاسی، ص:۱۶۶

کی ذات کے باعث نہیں بلکہ اس کے اختیارات کی اطاعت ہے اس سے ظاہر ہے کہ اگر بادشاہ ذمہ دار شخص ثابت نہیں ہوتا یا اپنے اختیارات کا غلط استعمال کرتا ہے تو اسے عہدے سے معزول بھی کیا جاسکتا ہے۔

مین گولڈ نے انصاف وارتقاء پاکیزگی اور جبر واستبداد کے اعتبار سے بادشاہوں میں تخصیص بھی کی ہے اس کے خیال میں غیر منصف، جابر اور غیر ذمہ دار بادشاہ کو اختیار نہیں پہنچتا کہ وہ عوام سے اطاعت کی خواہش کرے کیونکہ جب وہ ایسے انداز اختیار کرتا ہے جو بادشاہ کے اوصاف سے دور ہوں تو یقیناً وہ اس معاہدے کی خلاف ورزی کرتا ہے جس کے تحت عوام نے اسے حکمرانی کے اختیارات تفویض کئے تھے۔[1]

جان آف سالسبری: بارھویں صدی کے مفکرین میں جان آف سالسبری کو نمایاں مقام حاصل ہے گو فکر کے اعتبار سے یہ پاپائیت کا حامی تھا۔ لیکن مزاج کے اعتبار سے ایک دنیادار عالم فاضل تھا۔ یہ مفکر اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ غیر مذہبی امور اور مذہبی امور کا دائرہ اختیار مختلف ہے تاہم کلیسا کے ہاتھ میں دونوں تلواریں ہیں اور کلیسا ہی ان میں ایک یعنی مادی اختیارات کی تلوار حکمران کو تفویض کرتا ہے۔ اس اعتبار سے بادشاہ کو اختیار دیئے جاتے ہیں، اس کے اپنے پاس اختیارات نہیں ہوتے۔ اسی لئے کلیسا پر لازم ہے کہ وہ بادشاہ پر کنٹرول رکھے۔ اور کلیسا خود محض مذہبی سرگرمیوں میں حصہ لے۔

سینٹ تھامس اکیوناس: تیرھویں صدی عیسوی میں پاپائیت کو عروج حاصل تھا۔ اس صدی میں سینٹ تھامس اکیوناس کلیسا کے اہم مرکزی حامیوں میں تھا۔ سیاست سے اسے خاصی دلچسپی تھی۔ اس کا دور یورپ میں سیاسی تنظیم کے دور کے اعتبار سے ایک علامت بن چکا تھا۔ یہ دور عالمگیر روحانی اقتدار کا تھا۔ جس میں دنیاوی حکمرانوں پر کلیسا کو مکمل فوقیت حاصل تھی۔ اکیوناس ریاست کو کلیسا کے ماتحت سمجھتے ہوئے ریاست کو بحری جہاز کا ایک بڑھئی اور کلیسا کو اس کا پائلٹ قرار دیتا ہے۔ لہٰذا ایک دنیادار حاکم پر لازم ہے کہ وہ کلیسا کی اطاعت میں ہر قدم اٹھائے۔

آگسٹس ٹرائمفس: چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں کلیسا کو مکمل حاکمیت حاصل ہو چکی تھی مقدس سلطنت روم کلیسا کے سامنے بے بس ہو چکی تھی۔ اس دور میں کلیسا نہایت منظم اور مرکزیت کا حامل تھا۔ پاپائیت نے دنیاداری کے اختیارات کو شکست فاش تو دی لیکن اب بھی دنیاداری کے اختیارات محدود دنیادار بادشاہت تک تھے اسے قومیت کے جذبے نے زیادہ تقویت دی تھی۔ ٹرائمفس کے مطابق پوپ اس زمین پر خدا کا نائب تھا اور وہ براہ راست خدا سے اختیارات حاصل کرتا تھا۔ کیونکہ پوپ کے اختیارات لامحدود ہیں۔ وہ تمام مذہبی و روحانی امور میں رہنما اور مطلق اختیارات کا حامل ہے۔ شاہ یا شہنشاہ کے دنیاداری کے قانون ہر حالت میں پوپ کی توثیق کے محتاج ہیں، پوپ کو دنیادار بادشاہوں کو سزا دینے، معزول کرنے، تخت پر بٹھانے اور ان سے پوچھ گچھ کرنے کے مکمل اختیارات حاصل ہیں کہ پوپ کے اختیارات روحانی ہیں دنیاداری امور میں بھی پوپ حرف آخر ہے۔[2]

گیارھویں صدی عیسوی سے ہی شہنشاہیت اور پاپائیت کے درمیان اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی تھی جو دراصل ملوکیت کے دو نظاموں کی لڑائی تھی اور عوام اس دوران دونوں کی غلامی میں گرفتار رہے۔ اس کے بعد مذہب اور سائنس کا معرکہ شروع ہوا۔ پوپ کو سائنس اور عقلیت پسندوں سے خطرہ تھا۔ اس لئے اہل کلیسا نے سائنس دانوں اور ماہرین طبیعات کو بے دین قرار دے دیا۔ حالانکہ خدا کا دین سائنس کا مخالف نہیں ہے۔ پاپائیت اور سائنس کے معرکے کے اس دور میں علم ہیئت وطبیعات کے مشہور عالم ''برونو'' کو صرف اس جرم میں زندہ جلا دیا گیا تھا

---

[1] افکار سیاسی، ص: ۱۶۹

[2] افکار سیاسی، ص: ۱۷۹

کہ اس نے کرہ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں کا ذکر کر دیا تھا۔ گلیلیو کو اس جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا کہ وہ زمین کے متحرک ہونے کا قائل تھا۔ اسی قسم کے جرائم کی سزا میں کم از کم ۳۲ ہزار لوگوں کو زندہ جلا دیا گیا تھا۔

جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب "Apology of Mohammad & Quran" میں لکھا ہے ''مذہبی عدالتوں کے احکام سے ایک کروڑ بیس لاکھ نفوس ہلاک کیے گئے تھے۔ یہ خونریزی خود عیسائیوں کے ہاتھوں سے عیسائیوں کی ہوئی تھی۔ [۱]

احبار و رھبان کی اسی دنیا پرستی، نفس پرستی اور بربریت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

''یا ایھالذین اٰمنوا ان کثیراً من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ'' [۲]

''اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کے علماء اور مشائخ میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے انہیں روکتے ہیں''

لوگ پاپائیت کے اسی احمقانہ اور ظالمانہ نظام کو مذہب سمجھنے لگے اور پوپ کی نفرت کے ساتھ خود مذہب کے خلاف بھی نفرت کے جراثیم پیدا ہونے لگے اس نفرت کو آگے چل کر ڈارون، مارکس اور فرائیڈ جیسے لوگوں نے مزید آگے بڑھایا جس کی وجہ سے آج یورپ مادیت اور لادینیت کے سیلاب میں تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔

پاپائیت اور تھیا کریسی کو لوگ ''مذہبی حکومت'' کہتے ہیں حالانکہ یہ مذہب کی حکومت نہیں تھی بلکہ پاپاؤں کی حکومت تھی۔ جو اس طرح کا شرک ہے جس طرح کا شرک ملوکیت اور سیکولر جمہوریت ہے۔ [۳]

پاپائیت کے باطل نظام میں بھی ملوکیت کی طرح چند افراد جو خود ہی عوام الناس کے صاحب امر بن جاتے ہیں۔ یہ عوام کے حمایت شدہ نہیں ہوتے بلکہ خود عوام کے بادشاہ بن جاتے ہیں اور اپنے نفس کے بنائے ہوئے نفسانی قوانین کو لوگوں پر ٹھونستے ہیں چونکہ ان جھوٹے شاہوں نے اپنے عزائم کے بچاؤ کے لئے مذہب کا لبادہ بھی اوڑھ لیا ہوتا ہے اس لئے عوام چارو ناچار ان کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

---

۱ بحوالہ، قاضی محمد سلیمان منصور پوری، رحمۃ للعالمین، ۲/۲۱۴ ۔۔۔ ۲ التوبہ، ۹/۳۴

۳ ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست، ص: ۳۷

فصل چہارم

د) جمہوریت

جمہوریت کی قدیم ترین نوعیت گروہی اور قبائلی جمہوریت تھی جو غیر مہذب اور ابتدائی معاشروں میں پائی جاتی تھی لیکن جمہوریت کی یہ قسم جو بحرالکاہل کے جزائر اور افریقہ وامریکہ کے نیم وحشی قبائل میں آج بھی موجود ہے جمہوری شعور کی پیدا کردہ نہ تھی بلکہ منظّم اقتدار کے فقدان کا نتیجہ تھی۔ منظّم سیاسی معاشرہ قائم ہونے کے بعد جمہوریت ایک ترقی یافتہ شکل میں سب سے پہلے یونان کی شہری مملکتوں میں اختیار کی گئی۔ وہاں اس کو اسقدر فروغ حاصل ہوا کہ یونانی ریاستوں نے جمہوریت کی تاریخ میں بنیادی اہمیت حاصل کر لی۔ جمہوری تاریخ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ جمہوریت مطلق العنانی سے پیہم نبرد آزما رہی اور حکومت واقتدار کے لیے حاکم ومحکوم کی کشمکش مختلف صورتیں اختیار کرتی گئی۔ چنانچہ جمہوریت کبھی ملوکیت سے متصادم ہوئی کبھی عدیدیت واعیانیت سے برسر پیکار رہی اور کبھی آمریت سے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جمہوریت کو فاشیت کا مقابلہ کرنا پڑا تو دوسری جنگ عظیم کے بعد اشتمالیت کا اور جمہوریت واشتمالیت کی یہ کشمکش آج بھی جاری ہے لیکن مطلق العنانی کی حامی تحریکیں جمہوریت کو فنا نہ کر سکیں۔[1]

جمہوریت اپنے اصل عربی مفہوم کے اعتبار سے کوئی بری چیز نہیں ہے ابن منظور افریقی لکھتے ہیں۔

" الجمهور هي الرملة المشرفة على ما حولها المجتمعة الرمل الكثير المتراكم الواسع ...... والجمهورة الارض المشرفة على ما حولها وجمهور كل شي معظمة و جمهور الناس جلهم[2]

''جمہور'' ریت کے اس ڈھیر کو کہتے ہیں جو ارد گرد کی زمین سے بلند اور مجتمع ہو اور بہت سی تہ بہ تہ ریت کے وسیع میدان کو بھی جمہور کہا جاتا ہے'' جمہورہ'' وہ زمین ہوتی ہے جو ارد گرد کی زمین سے بلند ہو...... ہر چیز کے بڑے حصے کو جمہور کہا جاتا ہے۔ ''جمہور الناس'' سے مراد ہے لوگوں کے ممتاز اور نمایاں افراد یا ان کی اکثریت''

لسان العرب کے مصنف اس لغوی مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ لفظ جب قوم کے ساتھ آئے تو اس سے مراد اس قوم کی اکثریت ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

جمهرة القوم اذا جمعتهم[3]

مرتضیٰ زبیدی بقول ''**والجمهور معظم كل شيءٍ**''[4]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ الجمہور کا بنیادی مفہوم کسی چیز کی اکثریت اور اس کا ممتاز اور نمایاں ہونا ہے۔

مرتضیٰ زبیدی کے الفاظ میں اس کا خلاصہ یوں بنتا ہے۔

والجمهور من الناس؛ جلهم وأشرافهم ، و هذا قول الجمهور[5]

جمہور کا لفظ انسانوں کے لئے آئے تو اس سے ان کی اکثریت یا ممتاز اکثریت مراد ہوتی ہے اسی مفہوم کے پیش نظر کتب اسلامی میں ''جمہور'' کا لفظ بکثرت استعمال ہوتا ہے جس سے مراد معتبر علماء کی اکثریت ہوتا ہے۔ جیسا کہ مندرجہ بالا عبارت میں علامہ زبیدی کے الفاظ ''وهذا قول الجمهور'' سے ظاہر ہے۔

---

[1] شاہد رزاقی: تاریخ جمہوریت: ص۔۳۴   [2] لسان العرب، ۴/ ۱۴۹ (مادہ جمہر)

[3] ابن منظور، لسان العرب، ۴/ ۱۴۹   [4] تاج العروس، ۱۰/ ۲۱۵

مولانا گوہر رحمٰن لکھتے ہیں ''حدیث، فقہ اور لغت کی کتابوں میں جمہور اسی لغوی مفہوم میں بار بار آتا ہے یعنی اکثریت یا نمایاں اور بلند مرتبہ افراد اور اس مفہوم کے اعتبار سے اس کے استعمال میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ اسلامی ریاست کا سربراہ جمہور الناس یا ان کے نمائندوں (اهل الحل والعقد) کا منتخب کردہ اور معتمد علیہ ہونا ضروری ہے اس لحاظ سے اسلامی نظام حکومت بھی جمہوری اور شورائی نظام ہے۔[۱] لیکن زیر بحث لفظ جمہوریت یا جمہور نہیں ہے بلکہ 'ڈیموکریسی'' ہے اہل مغرب نے جمہوریت کا تصور عربی ڈکشنری سے نہیں لیا ہے بلکہ یونانی لفظ ڈیموکریسی سے لیا ہے جس کے معنی ہیں عوام کی حکومت، یعنی عوام کی حکومت عوام کے ذریعے عوام کے لئے۔ اس نظام میں معیار حق اور ماخذ قانون عوام کی مرضی اور منشاء ہوتی ہے۔ جمہور الناس مختار کل اور مقتدر اعلیٰ ہوتے ہیں اور جمہوریت مطلق العنان ہوتی ہے'' اس نظام کے قومی اور عوامی نمائندوں کے لیے خدا، رسول، دین اور آسمانی کتابوں یا اخلاقی قدروں کی تابعداری ضروری نہیں ہوتی بلکہ عوام کی مرضی اور ان کی پسند کی تابعداری اور وفاداری لازمی ہوتی ہے۔

جمہوریت دراصل بادشاہت اور پاپائیت کے ردعمل میں آتی ہے، لوگ جب بادشاہ کی سیاسی بربریت اور پوپ کے مذہبی استبداد سے تنگ آگئے تو انہوں نے بے لگام آزادی کا راستہ اختیار کر لیا اور سیکولر جمہوریت کو آزادی کی نیلم پری سمجھ بیٹھے۔ آزادی کے شوق میں یہ لوگ بادشاہ اور پوپ کے ساتھ خدا، رسول، مذہب اور اخلاقی قدروں سے آزاد ہو گئے۔

تاریخی دور سے پہلے جزائر برطانیہ میں مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے جو مختلف سمتوں سے آئے تھے۔ ان میں زیادہ تر تعداد 'برٹنوں' کی تھی جن کی نسبت سے جزیرے کا نام برطانیہ پڑا۔ ان کے مذہبی پیشواؤں کو ''ڈروئڈ'' کہتے تھے۔ مقدمات کے فیصلے یہی مذہبی پیشوا کرتے تھے۔

رومیوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد برطانیہ کے عوام بنیادی حقوق کے اعلان تک مختلف ملکی یا غیر ملکی خاندانوں کی مطلق العنان موروثی بادشاہت اور مراعات یافتہ جاگیرداروں کی دہری غلامی میں گرفتار رہے۔ اگرچہ ۱۲۱۴ء میں ''میگنا کارٹا'' یعنی منشور کبیر پر بادشاہ (کنگ جان) نے دستخط کر دیئے تھے۔ جس کو انگلستان کی تاریخ میں جمہوریت کا سنگ بنیاد کہا جاتا ہے۔ لیکن دراصل یہ صرف بڑے بڑے جاگیرداروں اور پادریوں کے حقوق و مراعات کا منشور کبیر تھا کسانوں، محنت کشوں، اور غریب عوام کو اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ ۱۲۴۰ء میں شاہی مجلس کبیر کو پارلیمنٹ کا نام دیا گیا لیکن یہ صرف نام تھا حقیقت میں بادشاہت، جاگیرداروں اور امراء کی من مانیاں تھیں۔ ۱۶۴۹ء میں اس وقت کے بادشاہ چارلس اول کو جمہوریت پسندوں نے سزائے موت تو دے دی تھی اور جمہوری حکومت بھی بن گئی تھی لیکن ۱۱ سال بعد ۱۶۶۰ء میں پارلیمنٹ نے چارلس دوم کو دوبارہ بادشاہت کی گدی پر بٹھا دیا۔ ۱۶۷۹ء سے لے کر آج تک ''آئینی بادشاہت'' کو یہ لوگ سینے سے لگائے بیٹھے ہیں اور قوم کا قیمتی خزانہ برائے نام ''تاج برطانیہ'' پر خرچ کر رہے ہیں۔[۲]

مغربی تمدن کا شجرہ نسب قدیم یونانی اور رومی تمدن سے ملتا ہے اور یہی اس کا اصل مرکز ہے۔ اس تمدن سے اہل مغرب نے صرف شہنشاہی نظریہ سیاست نہیں سیکھا تھا بلکہ مادہ پرستی بھی ان کو میراث میں ملی تھی۔[۳]

یونانی تہذیب کی امتیازی خاصیت، مادیت تھی۔ افلاطون مغرب کا پہلا سیاسی مفکر تھا جس نے اپنے فکر کو ایک مخصوص طریق کار میں ڈھالا اپنے ابتدائی دور میں وہ ایتھنز کے حالات سے بے حد متأثر تھا اور وہاں کی نام نہاد جمہوریت سے نالاں نظر آتا تھا۔ غالباً اس تنفر کی وجہ یہ تھی کہ

---

۱ اسلامی سیاست، ص:۶۷

۲ برطانوی بادشاہت کی تاریخ کا یہ خلاصہ ولیم۔ایل۔لینگر کی 'تاریخ عالم' جلد دوم و سوم سے ماخوذ ہے، بحوالہ گوہر رحمٰن: اسلامی سیاست: ص۔۷۷

۳ D.R. Bhandari History of European Political Philosophy, P:49

ایتھنز نام نہاد جمہوریت کے گرد گھوم رہا تھا۔ یہ درست ہے کہ جدید دور میں افلاطون کے اس نظریہ پر کہ جمہوریت بدتر نظام حکومت ہے، خاصی تنقید ہوئی۔ لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ افلاطون کے ان افکار کے دو ہزار برس بعد بھی جمہوریت کو ایک مسلمہ طرز حکومت کا درجہ نہیں مل سکا کیونکہ تجربات کی روشنی میں جمہوری طرزِ حکومت سب سے اچھا طرز حکومت ثابت نہیں ہوا۔[1]

ارسطو کو ''بابائے سیاست'' بھی کہا جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ ارسطو اس کا مستحق بھی ہے ارسطو کی نظر میں سیاسیات کا یہ انداز فکر یہ تھا۔

ا۔ خالصتاً ایک ایسی سائنس جس کا تعلق انسان کی انتہائی اچھائیوں سے ہے اور انتہائی مکمل ریاست سے ہے۔

ب۔ ایک عملی سائنس جس کا تعلق معاشرے میں بسنے والے افراد کے آئینی اور قانونی متعلقات سے ہے۔

انہی پر ارسطو نے سیاسیات کی بنیاد رکھی۔

ارسطو کے نزدیک انسان فطری اعتبار سے اچھا ہے لہذا ریاست کے زیر سایہ اس کی رہائش کا مقصد یہ ہے کہ ریاست اس کی اچھائیوں کو چار چاند لگائے۔ ریاست کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے باسیوں کو ایک مکمل ترقی یافتہ اور خوبصورت زندگی کے مواقع مہیا کرے۔ حکومت کی نوعیت کے اعتبار سے ارسطو جمہوریت کا حامی تو ضرور تھا مگر اس جمہوریت کا مفہوم مختلف ہے۔ وہ حکومت کا انتظام وانصرام قطعی طور پر عوام کی اکثریت کے ہاتھوں میں دینا چاہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ صرف اچھے اور ذہین شہری ہی حکومتی اختیارات کی نمائندگی کریں گے اور حکومت کا نظم ونسق چلائیں گے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے جمہوریت کی مخالفت کی ہے۔ ارسطو اپنے نقطۂ نظر سے درست تھا کیونکہ ایتھنز کی نام نہاد جمہوریت بہر حال خود غرض افراد کے گروہ پر مشتمل تھی۔

یونانیوں کے جانشین رومی تھے۔ لیکن مادیت اور حیوانیت میں یہ اپنے اسلاف سے بھی آگے نکل گئے مادہ پرستی کے اس سیلاب کو روکنے کے لئے رہبانیت ایجاد کی گئی لیکن اس نے پاپائیت کی شکل اختیار کر کے دنیا پرستی کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ عوام بادشاہت و پاپائیت کے دوہرے مظالم میں گرفتار ہوگئے۔ اس لئے ردعمل کے طور پر مذہبی روایات کے خلاف ان کے اندر عداوت وتعصب پیدا ہوگیا۔ مارٹن لوتھر نے ۱۸۶۶ء میں اصلاحی تحریک شروع کی تھی۔ لیکن مادیت اور تذبذب وتشکیک کے جراثیم کا مقابلہ وہ بھی نہ کرسکا۔ اس نفرت کو آگے چل کر ڈارون، مارکس اور فرائیڈ جیسے لوگوں نے مزید آگے بڑھایا، جس کی وجہ سے آج یورپ مادیت اور لادینیت کے سیلاب میں تباہ ہوکر رہ گیا۔[2]

ڈارون، مارکس، فرائیڈ نیز دیگر مغربی مفکرین نے روحانیت سے انکار کر کے مادہ پرستی اور حیوانیت کی تعلیم دی۔ اور جان لاک، روسو اور ھابس نے لادینی جمہوریت اور عوامی حاکمیت کی آواز بلند کی۔

جان لاک کا نظریہ: سٹوارٹ خاندان کے بادشاہوں اور عوام کے درمیان خانہ جنگی کے نتیجے میں جب ۱۶۸۸ء میں شاندار انقلاب رونما ہوا تو جان لاک نے ۱۶۹۰ء میں انقلاب کے دو سال بعد اپنی کتاب 'Civil Government' (سول گورنمنٹ) شائع کی جس میں حاکمیت جمہور کے نظریے کی وضاحت کی اس کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے۔

> ''انسانی معاشرت کی اکائی مرد وعورت کا ازدواجی تعلق ہے جو دونوں کی آزاد مرضی اور آزاد معاہدے سے قائم ہوتا ہے۔ مرد کو عورت پر اختیارات تو حاصل ہوتے ہیں لیکن یہ مطلق العنان نہیں ہونے چاہییں۔ دونوں کو ازدواجی تعلق ختم کرنے کا اختیار بھی ہونا چاہیے۔ یہی حال

---

1. D. R. Bhandari, History of European Political Philosophy, P: 44

2. صلاح الدین ناسک، افکار سیاسی، ص: ۸۳تا۸۹

خاندانی نظام کا ہے جس میں خاندان کے سربراہ کو کچھ اختیارات حاصل ہوتے ہیں جن کو خاندان
واپس بھی لے سکتا ہے‘‘۔[1]

’سیاسی معاشرے‘ میں بھی اسی قسم کے ’معاہدہ عمرانی‘ کا اصول کارفرما ہونا چاہیے، عوام مقتدر اعلیٰ اور مختار کل ہونے چاہییں۔ ان کی خواہش نفس اور مرضی کو سرچشمہ قانون اور طاقت کا مرکز ہونا چاہیے اور حکمران کو عوامی خواہشات کا پابند ہونا چاہیے صحیح معاشرہ وہی ہے جس میں اختیارات فرد واحد کے ہاتھ میں نہ ہوں بلکہ عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں ہوں البتہ آئینی بادشاہت کو بحال رکھنے کی اس نے تائید کی ہے۔[2]

لاک نے برتری عوام کو دی ہے مقنّنہ اور بادشاہ کو اس نے محض امین قرار دیا ہے لاک نے انتظامیہ اور عدلیہ کو اسی لئے مقنّنہ کے ماتحت قرار دیا ہے کہ قانون کا اطلاق بہتر طریق پر ہو سکے۔ لاک جمہوریت کو ہر طرزِ حکومت پر ترجیح دیتا تھا۔ جان لاک سترھویں صدی عیسوی کا ایک مشہور انگریز مفکر ہے اور تھامس ہابس کا ہمعصر ہے وہ ۱۶۳۲ء میں برسٹل کے قریب ایک قصبے رنگٹن میں ایک درمیانے درجے کے خاندان میں پیدا ہوا اور ۱۷۰۴ء میں اوٹس کے مقام پر ستر سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔[3]

اس کا شمار انگریز فلاسفروں میں سے ایک عظیم فلاسفر کی حیثیت سے ہوتا ہے لاک نے اپنے سیاسی فلسفہ کا آغاز قدرتی زمانے ہی سے کیا ہے۔ وہ ہابس کے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا کہ قدرتی زمانہ کوئی بھیانک زمانہ تھا بلکہ وہ انسانوں کے باہمی اتفاق، امن وسکون کا زمانہ تھا۔ لاک کے نزدیک انسان کے فطری حقوق، زندگی، آزادی اور املاک پر مبنی ہیں۔ لاک انسان میں حقوق کو پیدائشی اور موروثی بھی قرار دیتا ہے۔ جان لاک نے حکومت اور نظریہ تفریق اختیارات پر بڑی تفصیل سے وضاحت کی ہے وہ لکھتا ہے کہ قوانین عوام کے مفاد کی خاطر بنائے جاتے ہیں اور ان کا مطلب عوام پر استبداد روا رکھنا ہرگز نہیں ہوتا چنانچہ جب کوئی مقتدر اعلیٰ کا فرمانروا کوئی قانون بنانے لگے تو عوام یا عوام کے نمائندوں سے مشورہ ضرور لے۔[4]

جان لاک اگرچہ مقتدر اعلیٰ کو تمام تر اختیارات دینے کے حق میں ہے لیکن ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ فرد واحد کے ہاتھ میں قانون سازی کے اختیارات اس کی گمراہی کا سبب بھی بن سکتے ہیں اس طرح قانون سازی کے اختیارات فرد واحد کے ہاتھ میں دینا ظلم واستبداد سے کم نہیں۔ اس لئے بہترین قانون وہی ہے جو عوام کی مرضی سے ہو۔ لاک جمہوریت کو ہر طرز حکومت پر ترجیح دیتا تھا اسی لئے اس نے انسان یا فرد کے بنیادی حقوق کی بھرپور حمایت کی ہے۔[5]

مانٹسکیو: ۱۶ جنوری ۱۶۸۹ء میں ایک چھوٹے سے قصبے میں پیدا ہونے والے مانٹسکیو نے قانون کے شعبے میں مہارت حاصل کی اور ۱۷۱۶ء میں اپنے چچا کے انتقال کے بعد اس کی تمام جائیداد کا وارث قرار پایا۔ ۱۷۲۱ء میں مانٹسکیو کے پرشین لیٹرز شائع ہوئے۔ یہ نہایت دلکش اور موثر انداز تحریر تھا۔ دو فرضی شخصیتیں جن کا تعلق ایران کے ساتھ تھا یورپ اور بالخصوص فرانس کی تمدنی اور سیاسی زندگی کے ساتھ مانٹسکیو کے نظریات پر بھی تنقیدی انداز میں ایک دوسرے کو خطوط تحریر کرتے ہیں۔ اگرچہ ان خطوط میں نہ کوئی تعمیری بحث ہے نہ ان کا انداز فکر انگیز البتہ ان خطوط سے

۱ John Locke, Two Treatises on Civil Govt, P: 240

۲ D.R. Bhandari, History of European Political Philosophy, P:286

۳ John Locke,Two Treatises on Civil Govt, P:240

۴ John Locke, Two Treatises on Civil Govt, P: 21

۵ H. J. Laski, Political Thought in England from Locke to Bentham, P: 40

فرانسیسی معاشرے کے ہر طبقہ سے متعلق صحیح عکاسی نظر آتی ہے۔ مانٹسکیو نے فرانس کے اس وقت کے سیاسی نظام (Absolutism) کا دفاع نہیں کیا نہ امرائی زندگی میں اس آمرانہ زندگی کی پذیرائی کی لیکن اس کا خیال تھا کہ مطلق العنانی، بادشاہی نظام میں اتنی ظالمانہ نہ تھی جتنا مستقبل کے عوامی دور میں اس کا احتمال تھا۔

مانٹسکیو کے مطابق کسی معاشرے میں فرد کی حیثیت اپنے معاشرے ہی سے متعین ہوتی ہے انفرادی طور پر نہیں۔ اس کا معاشرے میں مثبت کردار صلے کی توقعات کے بغیر ہونا چاہیے۔ کیونکہ نیکی کی کوئی قیمت نہیں اس کی توقعات تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ ہمارا رویہ دوسرے کے لئے اگر انصاف پر مبنی ہے تو درحقیقت اپنے لئے ہی سہولتوں کے دروازے کھولنا ہے۔ مانٹسکیو کی بادشاہ کے خلاف تنقید اگرچہ غیر واضح ہے لیکن وہ امراء کے اجتماعی رویوں کو بادشاہ کے خلاف ایک مساواتی طاقت قرار دیتا ہے تاکہ بادشاہ مطلق العنانی میں من مانی نہ کرسکے۔ ۱ پوپ کے خلاف بھی مانٹسکیو کا انداز فکر مثبت نہیں۔ اس کے خیال کے مطابق جس طرح بادشاہ اپنی رعایا کے ذہنوں پر اختیار رکھتا ہے اسی طرح پوپ بادشاہ کے ذہن پر اختیار رکھتا ہے مانٹسکیو کا اہم ترین اور سنجیدہ کام جو یورپ کے علاوہ امریکہ کے لئے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی مشہور تصنیف (The spirt of Law) ہے۔ اس کی تصنیف میں ان تمام امور کے متعلق جو ایک فرد یا جماعت کے معاشرتی تعلق اور بہتر حکمرانی پر منتج ہوں اور جن کی بنیاد قانون (آئین) پر ہو ذکر کیا گیا ہے۔ اس تصنیف کی ابتدا ہی مانٹسکیو نے قانون کی تعریف سے کی ہے۔ ۲ اس کے خیال کے مطابق کل کائنات قانون فطرت پر رواں دواں ہے۔ ہر ایک تخلیق کا اپنا اپنا قانون ہے۔ خداوند کریم کا اپنا قانون، مادی دنیا کا اپنا قانون انسانوں کے علاوہ مخلوقات کا اپنا قانون، جانوروں کا اپنا قانون، لہٰذا انسان کا بھی اجتماعی قانون ضروری ہے۔ ۳

اگر قدرت نے انسان کے علاوہ دیگر مخلوقات کے لئے قوانین کی تشکیل کی ہے۔ جس پر وہ زندگی بسر کر رہے ہیں تو انسان کے لئے بھی یہ قانونی رہنمائی یقیناً ہوگی۔ وہ قانون یا قوانین جو انسانی سوچ کا نتیجہ ہوں گے۔ نہ پختہ ہوں گے اور نہ بطور کلیہ اپنائے جاسکتے ہوں گے۔ کیونکہ قانون مخصوص معاشرتی روایات اور قدروں سے اخذ کیا جاتا ہے جو ہر معاشرے میں جداگانہ حیثیت سے متعین ہیں جب کہ فطری قوانین علاقائی مفادات سے بالاتر ہو کر قوانین کی سمت اور حوالہ متعین کرتے ہیں۔ جس میں انفرادی یا گروہی مفادات کا کوئی عنصر موجود نہیں ہوتا۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو قانون فطرت نے دوسری تمام مخلوقات کے متعلق نظریات پیش کئے تھے جن کی مدد سے انسانی عصبیتوں (Social Contract) کو ابھار کر حکومتوں کی تشکیل کی جاسکے اور اس حکومت کے استحکام کے لئے قانونی ضروریات مہیا کی جاسکیں تاکہ اچھی حکمرانی ممکن ہوسکے۔ مانٹسکیو نے ان افکار کی تردید کرتے ہوئے کہا۔ ''سوال یہ ہے کہ کس قسم کی حکومت؟ کچھ لوگوں کے مطابق شخصی حکومت بہتر ہوتی ہے کیونکہ یہ حکومت پدرانہ شفقت سے مزین ہوتی ہے۔ لیکن انفرادی فیصلے ہمیشہ صحیح نہیں ہوتے بلکہ ان میں غلطی کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ مانٹسکیو کی فکری بحث کا یہ پہلو دوسروں کی نسبت اس لئے اہم ہے کہ اس کی مرکزیت قانون قدرت کے قریب ہے اور یہ ہر اس قانون کے خلاف ہے جس میں ابہام یا خامیاں ہوں۔ ۴

مانٹسکیو کے مطابق انسان فطرتاً خوفزدہ اور ڈرپوک ہے۔ اسے اندرونی خوف کا احساس زیادہ ہے۔ وہ کسی دوسرے کو نقصان پہنچا ہی نہیں سکتا۔ وہ ہابس کے اس نظریے کی تردید کرتا ہے کہ فطرت جنگجویانہ نوعیت رکھتی ہے۔ اسی لئے ہر طاقتور کمزور کے لئے خطرہ ہے۔ جانوروں،

---

۱ Judd Harman, Political Thought from Plato to the Present, P: 267

۲ Kinglay Marten, The Rise of French Liberal Thought, P: 151

۳ Ibid, P: 272 ۴ Thomas J.Cook, History of Political Philosophy ,P:591

پرندوں اور انسانوں میں یہی چیز مشترک ہے۔ مانٹسکیو جانوروں اور پرندوں میں اس قانون قدرت کو تسلیم کرتا ہے۔ کیونکہ وہ عقل سلیم سے عاری ہیں۔ انسان کے لئے تسلیم نہیں کرتا کیونکہ یہ اچھے اور برے کی تمیز کر سکتا ہے۔ دوسرے فطرت کی تمام مخلوق منظّم زندگی بسر کرتی ہے جس کا مقصد دوسری طاقتور مخلوق سے حفاظت ہے۔ یہی قانون فطرت انسان کے لئے بھی ہے منظّم قوم بیرونی خطرات کا مقابلہ کر سکتی ہے اور یہی مانٹسکیو کے نزدیک وہ شعوری کیفیت ہے جس کے حصول کے لئے انسان صدیوں سے کوشش کر رہا ہے۔[۱]

مانٹسکیو جمہوریت کو صرف اس حد تک اچھی حکومت تصور کرتا ہے کہ اس طرز حکومت میں لوگوں کو مطالبات منوانے کے علاوہ تجارت کے لئے مواقع میسر آتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مانٹسکیو کا پورا سیاسی فلسفہ افراد کی انفرادی اور سیاسی آزادی کے گرد گھومتا ہے۔ مانٹسکیو بڑی سنجیدگی کے ساتھ آزادی کے پرچار کے لئے اپنے آپ کو وقف کیے ہوئے تھا۔ اس کا نظریہ آزادی بڑے بڑے مطلق العنان بادشاہوں کی مطلق العنانیت پر کاری ضرب ہے۔

روسو کا نظریہ: جین جیکس روسو کا شمار یورپ کے ان مفکرین میں ہوتا ہے جنہوں نے یورپ میں جمہوریت کی بنیاد فرد کی آزادی مساوات اور تنظیم میں اس کے کردار پر قائم کی۔ روسو اصل میں سوئس تھا لیکن فرانس میں رہائش رکھتا تھا۔ فرانس میں اس وقت بدترین بادشاہت اور جاگیرداری نظام قائم تھا اور جبری محنت کا رواج عام تھا۔ ملکی حالات اور انگلستان کے شاندار جمہوری انقلاب سے متاثر ہو کر ۱۷۶۲ء میں اس نے اپنی مشہور کتاب ''معاہدہ عمرانی'' شائع کی۔ اس نے ہابس کی مطلق العنانی بادشاہت اور جان لاک کی آئینی بادشاہت رد کر کے ''خالص عوامی حکومت'' کا نظریہ پیش کیا۔ ''ارادہ عامہ'' اور ''خواہش عوام'' کو سرچشمہ قانون قرار دیا۔ روسو کے اس نظریے کے نتیجے میں فرانس میں ۱۷۸۹ء کا عوامی انقلاب آیا اور امریکی اعلان آزادی ۴ جولائی ۱۷۷۶ء بھی اسی عوامی اقتدار اعلیٰ کے نظریے کا جز تھا۔ جسے ۳ ستمبر ۱۷۸۳ء میں پیرس کے ''صلح نامے'' پر دستخط کر کے برطانیہ نے تسلیم کر لیا اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی آزاد ریاست قائم ہوگئی۔[۲]

روسو کے خیال میں جمہوری حکومت وہ ہے جس میں عوامی اسمبلی ہی مقننہ ہوتی ہے اور وہی انتظام و انصرام کرتی ہے۔ اس کے مطابق عملی طور پر جمہوریت میں اکثریت ''ارادہ عامہ'' کی نمائندگی کرتی ہے اور اقلیت کو ارادہ عامہ کی پیروی کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ لہذا روسو کہتا ہے کہ جب قانون وضع کیے جاتے ہیں تو یہ دریافت نہیں کیا جاتا کہ اقلیت ان قوانین کو بجا قرار دیتی ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ دریافت کیا جاتا ہے کہ قوانین ارادہ عامہ سے مطابقت رکھتے ہیں یا نہیں۔[۳] روسو اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ قوموں کی ترقی کے ساتھ ساتھ حالات میں نمایاں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ لہذا ارادہ عامہ کے فرد یا افراد کے کسی گروہ کا ارادہ تبدیل بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں جمہوریت اشرافیہ میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اور اشرافیہ بادشاہت میں روسو تمام شہریوں کے ماہانہ اجتماع کو ضروری سمجھتا ہے تا کہ اگر کوئی تبدیلی آنا بھی ہو تو عوام اس کا خود تعین کریں۔ نہ کہ وہ زیر زمین اور پس پردہ آئے۔[۴]

روسو سے پہلے ہابس، لاک اور مانٹسکیو نے بھی معاشرتی استحکام اور انفرادی حقوق کے نظریات پیش کئے ہیں لیکن روسو نے جمہوریت کی بنیاد سے متعلق جو انسانی اور انفرادی حقوق کی گفتگو کی وہ قیادت کے حوالے سے اہم مقام رکھتی ہے۔ روسو نے اسے (General Will)

---

۱ William & Ebensein, Modern Political Thoughts, The Great Issues, P:160-165

۲ اسلامی سیاست، ص: ۸۰

۳ History of European Political Philosophy, P: 287

۴ Jean Jacque, Rousseau, The Social Contract, P: 25

کا نام دیا ہے۔ روسو کے مطابق انفرادی رائے میں اختلاف رائے ممکن ہے۔ ہم سب ذاتی مفاد کی بات کرتے ہیں۔ ذاتی مفاد ہر ایک کا مختلف ہے یہی فرق آراء میں ہے لیکن اجتماعی رائے عامہ اگر یکجہتی، اتفاق اور حقیقت پر مبنی ہو تو اسی کی بنیاد پر وہ اصول اور قوانین مرتب ہو سکتے ہیں۔ جنہیں (General Will) کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کی خصوصیت روسو کے مطابق اس کا متفقہ علیہ ہونا ہے۔ [۱] عملاً یہ بعید از قیاس ہے کہ کسی ایک جغرافیائی حدود میں بھی مختلف مذاہب، علاقائی تمدن، زبانیں ثقافتیں ہوتی ہیں۔ ان کا اندازِ فکر مختلف ہوتا ہے۔ پھر ایک ملک کے کئی صوبوں اور ضلعوں میں نسبتی مفاد ایک کو دوسرے سے مختلف کرتے ہیں۔ یہی نہیں مختلف پیشوں کے اعتبار سے مفادی اختلافات مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ تجارت پیشہ کے مفادات ملازم افراد سے مختلف اور صاحبان حرفت اور صنعت کاروں کے مفادات زراعت پیشہ افراد سے مختلف ہیں۔ روسو کے مطابق ان مفادات کا جنرل ول سے کوئی تعلق نہیں۔ حقیقتاً یہ تمام شعبے ملکی معیشت اور استحکام میں اپنا کردار ادا کرنے اور اس میں بہتری لانے کے خواہشمند ہیں۔ ان کی مثبت سوچ جس طرح اپنے طبقے کے لئے ہے اسی طرح ملکی معیشت کی بہتری کے لئے اور کیونکہ ملکی معیشت کی بہتری کی سوچ یکساں طور پر ہر شعبے میں پائی جاتی ہے۔ جنرل ول ایسے ہی اصولوں سے قائم ہوتی ہے۔ [۲] البتہ ایک صورت ایسی ہے جہاں جنرل ول کے تعین میں دشواری سمجھی جا سکتی ہے حب الوطنی ایک ایسا جذبہ ہے جس کی نسبت وطن سے اپنے گھر، اہل خانہ، ماحول کی بنا پر بالواسطہ ہے۔ لیکن مذہب کو اس پر فوقیت اس لئے حاصل ہے کہ اس کے ساتھ انسانی تعلق بالواسطہ نہیں بلکہ نفسی ہے۔ اگر مذہبی طور پر کسی فرد کو کسی ایک علاقے میں زندگی بسر کرنا مشکل ہو تو وہ نقل مکانی کر لیتے ہیں یعنی حب الوطنی کو مذہب پر قربان کر دیتے ہیں۔ یورپ میں پچھلی تین صدیوں میں یہودیوں کی نقل مکانی کا سبب یہی تھا۔ لیکن ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کے بعد جب انہیں ایک علاقے میں وطن حاصل ہو گیا وہ سلسلہ از خود ختم ہو گیا۔ یعنی حب الوطنی صرف اسی وقت برقرار رہتی ہے جب انسان کو مذہب کی بنیاد پر مناسب ماحول نصیب ہو۔ روسو نے مذہب کو اسی لئے جنرل ول میں خطرہ تصور کیا ہے۔ البتہ اس کے لئے صرف احتیاط کا اشارہ دیا ہے۔ یعنی انسان کی مذہبی زندگی کا تعلق ریاستی ذمہ داریوں سے علیحدہ ہے۔ مذہب کو سیاست اور سیاسی قیادت سے الگ ہی رہنا چاہیے ورنہ اگر چرچ ریاست پر حاوی ہو جائے تو تباہی ہی تباہی ہے۔ مذہب صرف ایک مذہبی ریاست ہی میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ [۳] مغربی سیاست میں جمہوریت کے حوالے سے فکری قیادت کا یہ پہلو اتنا جامع اور موثر تھا کہ اس نے رفتہ رفتہ ایک صدی کے دوران مغرب اور مشرق دونوں سمتوں میں اپنی بالادستی قائم کر لی۔ آج یہی فکر ہر سیاسی نظام میں کسی نہ کسی حیثیت سے قائم ہے۔ یہاں تک کہ شخصی حکومت (آمریت) بھی عوام کے نام یا مفادات کے نعرے پر قائم ہوتی ہے۔

جمہوریت کے بنیادی اصول

مغرب کی جمہوریت کے اصول اساسی درج ذیل ہیں۔

۱۔ **عوام کی حاکمیت:** جمہوریت کا پہلا بنیادی اصول یہ ہے کہ 'عوام کی حاکمیت' یعنی قانون کا سرچشمہ عوام کی منشاء ان کا ارادہ اور ان کی خواہش و مرضی ہے۔

۲۔ **سیکولرازم:** اس اصول کے تحت جمہوری اور عوامی حکومت کا کوئی سرکاری مذہب نہیں ہوتا البتہ شہریوں کو اپنی انفرادی زندگی میں مذہبی آزادی

---

۱ William Ebenstein, Modern Politcal Thoughts, the Great Issue, P: 165

۲ Bhandari, History of European Political Philosophy; P: 349

۳ Jean Jacque Rousseau, The Social Contract, P: 163

حاصل ہوتی ہے مگر اجتماعی تمدنی اور سیاسی معاملات میں مذہب کو داخل کرنا قانوناً جرم ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بات پر دنیا کے تمام مذاہب اور ساری آسمانی کتابوں سے ثبوت پیش کردے پھر بھی اس کی بات قابل توجہ نہیں سمجھی جاتی۔ جب تک عوامی نمائندے اس کی تائید نہ کرلیں اس کے برعکس اگر کوئی چیز ساری آسمانی کتابوں اور مذاہب میں حرام ہو مگر جب عوامی نمائندے اس کو حلال کردیں تو وہ حلال ہو جائے گی۔ آج دنیا کی تقریباً تمام جمہوریتوں نے سیکولرازم کو اپنے دستور اساسی میں شامل کرلیا ہے۔

امریکہ نے ۱۷۸۹ء کے اعلان حقوق انسانی میں سیاست اور مذہب کی علیحدگی کا اعلان کیا تھا۔ جرمنی میں فرانکفرٹ اور برلن کے اعلان مصدقہ ۱۸۴۸ء اور سوئٹزرلینڈ میں ۱۷۶۶ء میں اس علیحدگی کو مان لیا گیا۔ اور اشتراکی روس نے تو ۱۹۱۹ء سے مذہب کو اپنی تلوار اور ہتھوڑے کا نشان رکھا ہے۔ ۱

پاکستان کے اکثر لیڈروں نے سیاسی تربیت انگریزوں سے حاصل کی ہے اور تعلیم بھی انگریزی اداروں یا یونیورسٹیوں سے حاصل کی ہے اس لئے ان کے ذہن میں بھی سیکولرازم کا نظریہ سرائیت کرچکا ہے۔ مولانا مودودی اور بعض دیگر اہل علم کی کاوشوں سے اب یہ بات عام ہو رہی ہے کہ اسلام مکمل نظام حیات ہے، صرف عقیدے اور عبادات کا نام نہیں ہے۔ اور اسلام میں اجتماعی تمدنی اور سیاسی امور سے متعلق بھی مکمل احکام وہدایات موجود ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی لادین سیاست پر بڑے حکیمانہ انداز میں تنقید کی ہے۔

میری نگاہ میں ہے یہ سیاست لادین
کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوتی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر ۲

۳۔ **لبرل ازم** (بےلگام آزادی): عوام کی حاکمیت اور سیکولرازم کا منطقی نتیجہ بے قید اور مادر پدر آزادی ہی ہوسکتا ہے اور یہ عوام کا جمہوری حق مانا جاتا ہے اس آزادی کے تحت مغرب کا ایک شخص خدا اور رسولؐ کو گالی دے سکتا ہے ماں، بہن، بیٹی کے تقدس کو پامال کرسکتا ہے۔ لڑکا اور لڑکی بلوغت کے بعد جہاں چاہیں جب چاہیں افعال شنیعہ کرسکتے ہیں اور اگر والدین اعتراض کریں تو گرفتار ہوکر سزا پائیں گے۔ اس لئے کہ کسی کی نجی زندگی میں دخل دینا قانوناً جرم ہوتا ہے۔ اور جمہوری حقوق کے منافی سمجھا جاتا ہے۔ ماں باپ، اور بڑوں کا احترام کرنا لبرل ازم اور ماڈرن ازم کے خلاف ایک دقیانوسی خیال سمجھا جاتا ہے۔ سیاسی آزادی کے تحت اگر کوئی تحریک چلانی ہو، یا احتجاج کرنا ہو یا مظاہرہ کرنا ہو تو آگ لگانا؛ سنگ باری کرنا گھیراؤ کرنا اور ہر قسم کے تخریبی کام کرنا جمہوری حق سمجھا جاتا ہے۔ لبرل ازم بادشاہ یا پوپ کی غلامی ہی سے آزادی کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے ساتھ خدا رسولؐ مذہب اور اخلاقی قدروں سے بھی آزادی کا نام ہے۔

۴۔ **کیپٹل ازم** (سرمایہ داری): مذہب اور روحانی قدروں سے بغاوت کا لازمی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ انسان پیٹ کا پرستار بن جاتا ہے اور بندہ خدا کی بجائے بندہ سیم وزر کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے مغربی نظام میں بغیر سود ومنافع کے کسی کو قرض تک نہیں دیا جاتا۔ دولت کمانے کے لئے ہر حربہ استعمال کیا جاتا ہے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنا اور جائیدادیں بنانا اس نظام میں مقصد حیات ہوتا ہے۔

گرمیٔ گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری ۳

---

۱ اسلامی سیاست، ص:۱۷ ۲ کلیات اقبال، ص:۶۳۷ ۳ بانگ درا، ص:۲۹۶

۵۔ **نیشنل ازم** (قوم پرستی): قوم پرستی کا رواج ازمنہ قدیم ہی سے رہا ہے لیکن اس کا شدت سے آغاز پندرھویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ کے دو ممالک فرانس اور انگلستان سے ہوا۔ یہ دونوں ممالک آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ ان میں ایک دیرینہ جنگ جاری تھی جس کو "جنگ صد سالہ" کا نام دیا جاتا ہے۔ جنگ کے نتیجہ میں دونوں ملکوں میں زبان، نسل، وطن، اور قومی ثقافت کے جذبات ابھرے۔ جو قرون وسطیٰ کے عیسائی نظریات کے مخالف تھے۔ جب یہ جذبات زور پکڑ گئے تو یہ دونوں ملک دو قومی ریاستیں بن گئیں جیسا کہ وہ آج تک ہیں۔ اس دوران سپین اور ہالینڈ بھی جو باہم برسر پیکار تھے سولھویں صدی عیسوی میں دو قومی ریاستیں بن گئے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں تقریباً سارا مغربی اور وسطی یورپ قومی ریاستوں میں بٹ گیا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں انقلاب فرانس ہوا۔ جس کے نتیجے میں قومیت کی لہر مشرقی و مغربی یورپ میں بھی پھیل گئی اور انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی قومیت کی لہر یورپ کی حدود سے نکل کر ترکیہ، عرب، چین، جاپان، ہند، اور دیگر ممالک میں پھیل گئی۔[1] قومیت کی لہر اب بھی زوروں پر ہے۔ اس کی اساس رنگ، نسل، اور وطن ہے اس کی سوچ عالمگیر نہیں بلکہ جغرافیائی حدود کے دائرے میں محدود ہے۔ قوم پرستی اور وطن پرستی ان کا نیا مذہب ہے۔ اور قوم و وطن ان کا خدا ہے قومی اور وطنی مفاد کے لیے دوسری قوموں کا استحصال کرنا اور ان کو لوٹنا کمال سمجھا جاتا ہے۔ یہ ہے وہ قوم پرستی جو جمہوریت کا ایک ستون ہے۔

۶۔ **پارٹی سسٹم**: مغربی جمہوریت کی بنیاد سیاسی پارٹیوں پر ہے۔ پارلیمنٹ میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے مستقل طور پر دو گروپ ہوتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ پارٹی کا مفاد قومی مفاد پر مقدم سمجھا جاتا ہے۔ برسر اقتدار جماعت اگر کوئی اچھا فیصلہ بھی کرتی ہے تو اپوزیشن والے اس کی مخالفت لازماً کریں گے اور اس کی وجہ یہ بتائی جائے گی کہ ان کی پارٹی کا یہ تقاضہ ہے۔ کوئی شخص پارٹی لائن کے خلاف اسمبلیوں میں نہ ووٹ دے سکتا ہے اور نہ رائے دے سکتا ہے ورنہ اس کو پارٹی سے نکال دیا جاتا ہے۔

---

[1] اسلام اور جدید سیاسی نظریات، ص: ۱۴۳

فصل پنجم

اشتراکیت

کسی معاشرے کے انتظامی خدو خال پر نگاہ ڈالنے سے اس معاشرے کی اصل حیثیت اور اس قوم کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جو اس معاشرے کی تار و پود ہوتی ہے۔ جس طرح جمہوریت ملوکیت اور پاپائیت کے ردعمل میں آتی ہے اسی طرح اشتراکیت مغرب کی سرمایہ دارانہ جمہوریت کے ردعمل میں آتی ہے اور بین الاقوامی طور پر ابھی رو بہ ترقی ہے۔ اشتراکیت کو انگریزی میں ''سوشلزم'' کہتے ہیں جو سوسائٹی سے نکلا ہے اور اس کا ماخذ سوشل ہے جس کے معنی ہیں سماجی یا معاشرتی سیاسیات اور معاشیات کی اصطلاح میں سوشلزم کی تعریف یہ ہے کہ وہ نظام جس میں کسی ملک کے تمام ذرائع پیداوار کسی ایک فرد یا چند افراد کی ملکیت میں ہونے کی بجائے پورے معاشرے کی ملکیت قرار دیئے جاتے ہیں اور اس کا مقصد معاشرے اور فرد دونوں کی فلاح و بہبود اور فرد کو زندگی کی بنیادی ضروریات کی فکر سے نجات دلانا سمجھا جاتا ہے۔[۱]

اس نظریہ کی بعض باتیں یونان کے افلاطون اور ایران کی مزدکیت میں بھی نظر آتی ہیں۔ بلکہ اشتراکی نظریہ کسی نہ کسی شکل میں ہر دور میں موجود رہا ہے۔ آج اشتراکیت جس صورت میں نظر آتی ہے۔ یہ صورت اسے صنعتی انقلاب کے باعث ملی۔ تاہم اشتراکی تحریک میں انقلاب فرانس نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ جب انقلاب کے ابتدائی دور میں کلیسا اور امراء کی املاک ضبط کر لی گئی تو عام جائیداد کی ملکیت کا سوال ابھرا ۱۷۹۶ء میں پیرس میں بابوف (Babouf) نے ایک تحریک کا آغاز کیا جس کا مقصد تمام نجی املاک بالخصوص اراضی کی ملکیت کو ختم کرنا تھا۔ ۱۸۱۵ء سے کچھ دیگر اقتصادی عناصر کی کارفرمائی نے اشتراکیت کے نظریات کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ صنعتی انقلاب نے متعدد سماجی و اقتصادی برائیوں کو بھی جنم دیا۔ سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان خلیج مزید وسیع ہوگئی۔ آجر و ماجور کے درمیان تعلقات میں بے حد کشیدگی اور تلخی پیدا کر دی گئی۔ نتیجتاً صنعتی ممالک میں مزدوروں کے خلاف سخت قوانین نافذ کر دیئے گئے ان تمام عناصر اور عمل ورد عمل نے مل کر اشتراکیت کی بنیادوں کو ہموار کیا۔

انگلستان میں تصوراتی اشتراکیت کا مقصد صرف کارکنوں کی نہیں بلکہ سب کی بہبود تھا۔ اس کا مقصد انقلاب ہی نہ تھا بلکہ بتدریج اصلاح احوال تھا۔ برطانیہ میں رابرٹ اوون (Robert Owen) کو جذباتی یا تصوراتی اشتراکیت کا بانی سمجھا جاتا ہے اس نے آجر و ماجور کے درمیان تعلقات کو ہموار کرنے اور خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔ ۱۸۲۰ء سے ۱۸۴۰ء تک اس کے نظریات کو خاصی کامیابی نصیب ہوئی حتیٰ کہ اسی بنیاد پر برطانیہ میں کچھ قوانین کے نفاذ پر بھی غور و حوض کی ابتداء ہوگئی کچھ عملی نتائج بھی برآمد ہوئے برطانیہ میں ٹریڈ یونین قوانین بدل دیئے گئے۔ ۱۸۳۳ء میں ایسے قوانین منظور کئے گئے جن کے تحت کارخانوں کی تنظیم کارکنوں کے مفادات کی بنیادوں پر کی جائے۔[۲]

اشتراکی تحریک میں انگلستان نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ صنعتی انقلاب کے اثرات سب سے پہلے انگلستان ہی میں محسوس کئے گئے تھے۔ انگلستان میں اشتراکی نظریات دو خطوط پر پروان چڑھے۔ ان میں ایک تو گاڈون کے نظریات تھے۔ دوسری طرف ریکارڈو کے نظریات جن کا اہم ترین اصول یہ تھا کہ جو کچھ ہے محنت ہے اور محنت ہی قدر و قیمت کا سرچشمہ ہے ان نظریات کو انگلستان سے باہر خاصا فروغ حاصل ہوا۔ فرانس میں جن اشتراکی نظریات کو فروغ حاصل ہوا ان کا سرچشمہ بھی انگلستان ہی کو کہا جا سکتا ہے۔ ایسے شواہد بھی دستیاب ہیں کہ کارل مارکس نے انگلستان کے اشتراکیت پسندوں ہی سے متعدد نظریات مستعار لئے۔ اس کو باقاعدہ سیاسی اور

۱۔ گوہر رحمٰن: اسلامی سیاست؛ ص۔ ۸۵

۲۔ D.R. Bhandari, History of European Political Philosophy, P. 467,468

معاشی فلسفے کے طور پر اور زندگی کے ایک نظام کی شکل میں کارل مارکس نے پیش کیا ہے۔ اس کو بابائے اشتراکیت اور سائنٹیفک سوشلزم کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ اور اسی وجہ سے سوشلزم کو مارکسزم بھی کہا جاتا ہے۔ [۱]

کارل مارکس: ۱۸۱۸ء میں جرمنی کے یہودی گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں اس نے 'کمیونسٹ لیگ' بنائی اور فریڈرک اینگلز کے ساتھ مل کر کمیونسٹ مینی فیسٹو یعنی اشتراکی منشور مرتب کیا۔ [۲] کارل مارکس کا جرمنی، فرانس اور بلجیم سے ملک بدر ہونے کے بعد ۱۸۴۹ء میں لندن میں اقامت پذیر ہوا۔ اور ۱۴ مارچ ۱۸۸۳ء میں اپنی کرسی پر بیٹھا ہوا مر گیا۔ اس کی قبر لندن میں ہی ہے مارکس اپنی زندگی میں تو سوشلسٹ انقلاب نہ لا سکا۔ مگر اس کے بعد لینن کی قیادت میں اکتوبر ۱۹۱۸ء میں روس کی سرزمین پر یہ انقلاب آ گیا۔ [۳]

کارل مارکس، لینن، سٹالن اور دوسرے اشتراکی قائدین کی تحریروں اور تقریروں سے عیاں ہے کہ ان کا نصب العین بزور شمشیر محنت کشوں کی آمریت قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ایک ایسی آمریت کا قیام جو سرمایہ دار طبقے کو روند ڈالے اور مزدوروں کو ان پر مسلط کر دے۔ لینن کہتا ہے کہ "قوموں کی زندگی میں بڑے بڑے مسائل صرف طاقت سے ہی حل کئے جا سکتے ہیں سچ تو یہ ہے کہ کوئی اشتراکی معاشرہ بغیر آمریت کے چل نہیں سکتا۔ کیونکہ کسی اخلاقی ضابطے کا وجود سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ دین اشتراکی نظر میں ایک لایعنی نظریہ ہے۔ جو صرف لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کی ایجاد ہے۔ اسی لئے آخرت' جزاء و سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اشتراکی مفکرین اور مصلحین کے پاس صرف ایک حربہ رہ جاتا ہے وہ ہے طاقت، چنانچہ ان کے نزدیک ہر مسئلہ قوت بازو سے ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ اور اسی شخص کی منشاء کے مطابق جس کے ہاتھ میں مضبوط ڈنڈا ہو۔ [۴]

سوشلزم کا سیاسی نظام تمام تر پرولتاریہ کی آمریت پر قائم ہے۔ جس کی نمائندگی سوشلسٹ پارٹی کرتی ہے۔ اور سوشلسٹ پارٹی کا لیڈر ایسا آمر مطلق ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں ملک کا سیاہ و سفید ہوتا ہے۔ ساری ملکیتیں اس کے قبضے میں سارے کارخانے اس کے ہاتھ میں اور سارے اقتدار کی تمام ترکنجیاں اس کی جیب میں ہوتی ہیں۔ پارٹی اس کے چشم ابرو کے اشارے پر حرکت کرتی ہے۔ [۵]

یہ نظام انسان کو بگڑا ہوا اور تنازع البقاء کا مارا ہوا حیوان قرار دیتا ہے جسے شدید شکنجے میں کسے بغیر کوئی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ کہ اگر وہ آزاد ہو تو پھر کوئی اصلاح کامیابی کے دروازے تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہی وہ تصور ہے کہ جس کے تحت دنیا کی تمام سوشلسٹ ریاستوں میں نہایت آہنی قسم کی آمریتیں قائم ہیں۔ اور سوشلسٹ نظام کی کامیابی کے لئے جو پارٹی وجود میں آتی ہے اس سے اختلاف ایک شخص کو عمر بھر کے لئے جبری محنت کے لئے کیمپ میں جھونک سکتا ہے۔ سوشلزم کے سیاسی نظام میں چند پارٹی لیڈر ہی سیاسی قوت کا منبع ہوتے ہیں۔ ملک کا ہر شہری خفیہ پولیس کے سائے اور نگرانی میں ہوتا ہے۔ حکومت وقت سے ذرا سا بھی اختلاف ایک آزاد ضمیر انسان کو جیل خانے پہنچانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ سارے ملک کا پریس حکومت کی ملکیت ہوتا ہے۔ [۶]

۱۔ Bhandari, History of European Poitical Philosophy, P: 479

۲۔ Ibid, P. 480 ۳۔ R.G. Gettell. History of Political Thought, P: 385

۴۔ صادق محمد احسن، اسلام اور اشتراکیت، ص: ۱۴۷۔۱۴۶، History of European Poltical Philosophy, P: 493

۵۔ اسعد گیلانی سید، اسلام، سوشلزم اور اسلامی سوشلزم، ص: ۴۰

۶۔ ایضاً، ص: ۴۲

یہی وجہ ہے کہ سوشلسٹ نظام حکومت پر کبھی تنقید نہیں ہوتی۔ ظلم وتشدد کی ہر لہر پر مظلوم کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ ہمیشہ سرکاری ترجمان ہی بیان کرتا ہے کہ کیسے کیسے انقلاب دشمن لوگ حکومت کے قابو میں آئے جو خوفناک تخریبی کاروائیوں میں مصروف تھے۔ مظلوم بے چارہ پس دیوار زنداں پڑا رہتا ہے۔ سٹالن کے مرنے کے بعد وزیراعظم خروشیف نے پارٹی ورکرز کے ایک اجلاس میں آنجہانی سٹالن پر سخت تنقید کی۔ اس کی پالیسی کی غلطیاں بیان کیں جلسے میں سے کسی نے ایک سلپ بھیجی جس پر لکھا تھا آپ یہ باتیں ان کے سامنے کیوں نہیں کہتے تھے، خروشیف نے وہ سلپ لے کر بآواز بلند کہا کہ جس صاحب نے یہ سلپ لکھی ہے وہ کھڑے ہو کر بات کرے۔ بار بار پکارنے کے باوجود جب کوئی شخص کھڑا نہ ہوا تو خروشیف نے ہنس کر کہا کہ ان کے سوال کا یہی جواب ہے۔ یعنی جس طرح آج ان کو میرے سامنے کھڑے ہو کر بات کرنے کی جرأت نہیں۔ یہی ہمارا حال سٹالن کے سامنے تھا۔[۱] ضمیر کو اس طرح پیس دینے کے نتیجے میں عموماً سیاسی اقتدار کو اس امر کا خطرہ بھی رہتا ہے کہ لوگ اندر ہی اندر اس کے خلاف سازشیں کریں گے۔ اس لئے ایک طرف فرد پر خفیہ پولیس کا پہرہ کام کرتا ہے تو دوسری طرف ناپسندیدہ عناصر کی تباہی اور چھانٹی کے لئے پارٹی اور معاشرے کے اندر وہم وگمان اور شکوک وشبہات پر مبنی تطہیر کی مہمیں چلائی جاتی ہیں جس میں لاکھوں افراد کو حکومت مخالف قرار دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اسی ظالمانہ حرکت کو ''انقلاب کی حفاظت'' کا نام دیا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک بار یہ نظام کہیں مسلط ہو جائے تو پھر اسے بدلنا ملک کے باشندوں کے بس سے باہر ہوتا ہے۔[۲]

قیادت کے بارے میں مارکس کا نظریہ: مارکس نے منشور اشتراکیت میں کہا ہے کہ پرولتاری تحریک اکثریت کی تحریک ہے اس لئے کہ اکثریت نادار، مفلس اور مجبور ہے۔ ضروری ہے کہ اس میں وہ شدت ہو جو سرمایہ داروں کی جڑیں کھوکھلی کر دے اور انہیں آسمان سے زمین پر پٹخ دے لہذا انقلاب ہی اس شدت کا نام ہے۔ پرولتاری انقلاب برپا کریں اور اقتدار پر قبضہ کرلیں جب تک پرولتاری حاکم نہ ہوگا انسان کی محنت اس کے مسائل اس کی مجبوریوں کو نہ سمجھا جاسکے گا۔ انسان سے انصاف نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ صرف اور صرف پرولتاری ہی انقلاب کے بعد وسائل پیداوار اور حکومت پر قبضہ کر کے قدر زائد کی منصفانہ تقسیم کرسکتا ہے۔[۳]

لینن کا نظریہ: لینن کے مطابق کارل مارکس نے پرولتاری آمریت کا جو نظریہ پیش کیا وہ تاریخ میں پرولتاریوں کے انقلابی کردار سے متعلق ان کی تعلیمات کے ساتھ منسلک ہے اسی کردار کی معراج پرولتاری آمریت ہے۔ لینن کے خیال میں اشتراکیت کا انقلاب مختلف طبقاتی تصادم کے ایک مکمل دور کا احاطہ کئے ہوتا ہے۔ لہذا پرولتاری آمریت ضروری ہوتی ہے۔ لینن اقلیت کے ہاتھ میں قیادت پر مکمل یقین رکھتا ہے اس کے خیال میں اگر پیشہ ور انقلابیوں کی ایک چھوٹی سی جماعت یا تنظیم پرولتاریوں کے اقتدار پر قبضہ کے لئے ضروری ہے تو اقلیت ہی کی قیادت پرولتاری آمریت کے قیام کے بعد بھی لازمی ہے۔ کارکنوں کی اکثریت پرولتاری نظریات سے اسی صورت آگاہ ہو سکتے ہیں کہ جب انہیں کمیونسٹ قیادت اور رہنمائی حاصل ہو کمیونسٹ اقلیت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قیادت بھی سنبھالے اور حکومت بھی کرے اس لئے کہ وہ پرولتاریوں کے ارادہ عامہ کی درست نمائندگی کرتی ہے۔

اشتراکیت کے بنیادی اصول

1۔ **مادی نظریہ حیات:** مادیت کا نظریہ ڈارون کے فلسفہ ارتقاء پر مبنی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان مادی جرثومے کی ترقی یافتہ

۱۔ اسعد گیلانی سید، اسلام، سوشلزم اور اسلامی سوشلزم، ص: ۴۳
۲۔ اسعد گیلانی سید، اسلام، سوشلزم اور اسلامی سوشلزم، ص: ۴۴
۳۔ صلاح الدین ناسک، افکار سیاسی، ص: ۳۹۴

شکل ہے اور تمام حیوانات، نباتات اور جمادات مادے ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ یعنی خدا پرستی اور روحانیت کی جگہ مادہ پرستی سوشلزم کا بنیادی اصول ہے۔ لینن نے کہا ہے کہ ''مارکس کا فلسفہ مادہ پرستی کا فلسفہ ہے''

2۔ **خداوند قدوس کی ہستی سے انکار یعنی دہریت:** لینن کہتا ہے ''ہر سوشلسٹ اصولی طور پر دہریہ ہوتا ہے۔ خدا کی ہستی کے متعلق ہمارا کہنا یہ ہے کہ ہم خدا پر یقین نہیں رکھتے اور ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مذہبی پیشواؤں، زمینداروں اور سرمایہ داروں نے خدا کا تصور پیدا کیا ہے تا کہ لوٹنے کھسوٹنے والوں کی طرح وہ اپنے مفاد کا تحفظ کر سکیں۔[1]

3۔ **مذہب اور دین سے انکار:** مارکس کا یہ قول تو زبان زد عام وخاص ہے کہ مذہب ایک افیون ہے، لینن کہتا ہے ''مارکسزم مادہ پرستی ہے اور اسی وجہ سے یہ مذہب کے سخت مخالف ہے۔ روس کے آئین میں مذہب کے حق میں بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن مذہب کے خلاف پروپیگنڈا کرنا شہریوں کا حق ہے۔

4۔ **خاندانی نظام سے انکار:** مارکس خاندان کو بورژوائی (سرمایہ داری) کی نشانی سمجھتا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے منشور میں مارکس نے لکھا ہے کہ ہم کنبے کا خاتمہ چاہتے ہیں۔

5۔ **شخصی ملکیت سے انکار:** نجی ملکیت کو مارکس سرمایہ دار طبقہ کا استحصالی حربہ کہتا ہے اور کمیونسٹ سوسائٹی کی تشکیل کے لئے اس کا کلی خاتمہ ضروری سمجھتا ہے۔ اشتراکیت دراصل بدترین قسم کی سرمایہ داری اور مزدوروں کے نام پر عوام کے استحصال کا ایک ظالمانہ نظام ہے۔ ملوکیت میں بادشاہ ساری دولت پر قبضہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں بھی کروڑوں کی آبادی میں سرمایہ داروں کی تعداد لاکھوں میں ہوگی لیکن اشتراکی معاشرے میں صرف ایک سرمایہ دار ہوتا ہے۔ جو ریاست کا سربراہ ہوتا ہے۔

6۔ **طبقاتی کشمکش:** مارکس کہتا ہے مادی عوامل اور معاشی قوتوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے تصورات، خیالات اور نظریات انہی مادی حالات اور معاشی ٹکراؤ کی پیداوار ہیں۔ ''اشتراکی نظریہ سیاست یہ ہے کہ دنیا کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جائے اور ایک طبقے کو مٹا کر دوسرے کو غالب کیا جائے ۔ظلم کو ختم کرنے کی بجائے ایک طبقے کو مٹانا اور دوسرے کو اٹھانا اس کا منشور اساسی ہے۔ اس طبقاتی جنگ میں صرف سرمایہ دار اور جاگیر دار ہی نہیں مارے جاتے بلکہ مزدوروں اور کسانوں کا قتل عام بھی ہوتا ہے۔ ۱۹۱۷ء میں جب روس میں انقلاب آیا تو ابتدائی سالوں میں جو لوگ قتل کئے گئے تھے ان کی تعداد ۱۳ لاکھ ۶۷ ہزار ۶ سو ۶۶ تھی۔ جن میں مزدوروں اور کسانوں کی تعداد ۱۰ لاکھ ۸۶ ہزار تھی۔ ۲ لاکھ ۹۰ ہزار لوگ مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے اور سرمایہ دار صرف ۶۵ ہزار ۸ سو ۶۵ مارے گئے۔ یہ تھا وہ تحفہ جو مزدوروں کو اشتراکیت نے دیا۔[2]

مزدوروں کی آمریت: کارل مارکس کہتا ہے کہ مزدوروں کی آمرانہ حکومت کا قیام ضروری ہے۔ تا کہ سرمایہ داروں کے نشانات واثرات سے بھی معاشرے کو صاف کیا جائے انقلابی حکومت کو آمرانہ اقدام کرنے چاہئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اشتراکیت اپنی اصل نوعیت کے اعتبار سے لیڈر کی شخصی آمریت اور فرد واحد کی استبدادی بادشاہت کا دوسرا نام ہے۔

---

[1] V.I.Lenin, on Religion, P. 8 (بحوالہ اسلام اور اشتراکیت؛ از صادق محمد احسن، ص ۔۲۳)

[2] بحوالہ، افکار سیاسی، ص ۳۹۲

فصل ششم

آمریت

آمریت دورِ جدید کی جمہوریت کی ایک نئی قسم ہے درحقیقت یہ نظام افلاطون کی حکومت خواص اور ارسطو کی اعیانی ارسطو کریسی طرزِ حکومت کا نیا نقشہ ہے۔یعنی زمانہ قدیم کی مطلق العنان بادشاہی اور جمہوریت کے مجموعہ کا نام آمریت ہے۔زمانہ بدلا اس کے آب ورنگ بدل گئے۔سب سے پہلے کارل مارکس نے ۱۸۵۲ء میں ایک دوست کے خط میں غریبوں کی پرولتاری آمریت کا ذکر کیا۔۱۹۱۷ء کے انقلاب نے روس میں اس ڈکٹیٹرشپ کی بنیاد رکھ دی۔۱۹۲۲ء میں مسولینی نے روم پر کامیاب حملہ کیا اور فاشی آمریت کی بنیاد رکھی۔۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء کو ہٹلر نے جمہوریہ جرمنی کے بوڑھے صدر جنرل ہنڈنبرگ کے ہاتھوں سے زمام اقتدار چھین کر نازی آمریت کی بنیاد رکھی۔آمریت کے طرزِ حکومت میں ایک بات یہ ہوتی ہے کہ حکومت کی طاقت قوم کی طاقت سے فائق ہے۔وہ نہ مخالف ارادے کو برداشت کرتی ہے نہ مخالف پارٹی کو۔[1] فاشی اور آمری نظام کی بنیاد ایک خاص قوم اور نسل کی برتری پر موقوف ہے حکمران طبقہ اور نسل دوسرے تمام طبقوں اور نسلوں سے افضل ہوتا ہے آمری نظام میں مرکز حکومت زبردست طاقت کا مالک ہوتا ہے۔حکومت کے کام میں جمہور کی مرضی سے زیادہ حکومت کی مرضی کو دخل ہوتا ہے۔حکومت مملکت کے فائدے کے لئے جو پالیسی اختیار کرتی ہے انسان اس کے خلاف رائے دے کر کہیں پناہ نہیں حاصل کرسکتا ہے۔

Fascism is in the interests of a tiny minority of the richest, biggest bankers, capitalists and landlords alone. For their sake, and for their sake alone, it tortures and terrorizes. To preserve their position upon the summit of human society it is prepared to destroy all that is most precious in human culture. **2**

’’فاشزم فقط قلیل تعداد کے امراء، روساء، اور جاگیرداروں کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے اور اس مقصد کے لیے وہ معاشرہ کی مقدس ترین اقدامات کو بھی تباہ کرسکتا ہے‘‘۔

آمریت کا نظام ریاست میں عوام کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے پر بہت زور دیتا ہے روحانی ضرورتوں سے تعلق نہیں رکھتا۔اس نظام حکومت میں اونچے طبقے اور اعلیٰ نسل کے لوگ حاکم ہوتے ہیں اور عوام محکوم۔

چونکہ آمریت عقل وفطرت کے خلاف چیز ہے اس لئے یہ کبھی معمولی حالت میں نہیں پیدا ہوتی۔ بلکہ ان غیر معمولی حالات میں پیدا ہوتی ہے جب کہ مصائب کے کسی شدید حملہ نے کسی قوم کے دماغی توازن کو بگاڑ دیا ہو۔ایسے موقع پر اگر کوئی ہوشیار آدمی موجود ہوتا ہے تو وہ قوم کی بدحواسی سے فائدہ اٹھا کر عام جذبات میں اشتعال پیدا کرتا ہے۔امیدوں کے سبز باغ دکھاتا ہے اور اس طرح ان کی توجہات کو اپنے اوپر مرکوز کر کے آمرانہ اقتدار حاصل کرلیتا ہے اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر قوم کے حواس بجا ہو گئے اور اسے سوچنے کی مہلت مل گئی تو اس کی امارت ختم ہو جائے گی یہی وجہ ہے کہ ہر آمر اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے پیہم ہیجان انگیز کارروائیاں کرتا رہتا ہے تاکہ اس کی قوم کو کبھی سکون قلب کے ساتھ غور وفکر کا موقع نہ ملے۔یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کل ڈکٹیٹروں کی تاریخ خونریزیوں اور جنگ آزمائیوں سے بھری نظر آتی ہے۔

---

[1] پروفیسر ہارون خان شیروانی: مبادی سیاسیات، ص۔۳۵۶ [2] John Strachey, The Menance of Fascism, P. 255

ای۔ای۔کیلٹ (E.E.Kellett) لکھتے ہیں۔

In the Greek world, quarrelsome as it was, there was a curious underlying sense of unity. Those tiny States, jealous of their independence as they were, were yet a comity, and harboured an Hellenic conscience. Rarely, indeed, for instance, did they make slaves of Greek captives whatever they might do with barbarians.[1]

یونان کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے آمر باہمی بغض وعداوت کی بنا پر اکثر و بیشتر برسرپیکار رہتے تھے لیکن وہ اپنے دشمن کو یونانی ہونے کے ناطے غلام نہیں بناتے تھے یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے۔

Thus on the whole, the present atitude towards dictatorships tends to be one of toleration. Millions of free men feel, as strongly as ever, that they would prefer death to submission to "dictatorial" domination.[2]

''موجودہ دور میں آمریت کے بارے میں خیالات مکمل طور پر تبدیل ہو چکے ہیں اور لاکھوں انسان آمریت کے سائے تلے جینے پر موت کو ترجیح دیتے ہیں''۔

اس ضمن میں ای۔ای۔کیلٹ مزید لکھتے ہیں۔

"Most of the Men, in the present day, are known as Dictators, an unlucky misnomer. For the Roman Dictator was a constitutional officer, legally appointed, to meet a speical emergency, and for six months only".[3]

''سلطنت روما میں مخصوص ناسازگار حالات پر قابو پانے کے لئے آئینی اور قانونی طور پر چھ ماہ کے عرصہ کے لئے آفیسر مقرر کئے جاتے جسے ہر قسم کا مکمل اختیار دے دیا جاتا تھا''

ڈکٹیٹر سے مراد وہ مطلق العنان حاکم جس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون ہے اگرچہ بادی النظر میں آمر اور ڈکٹیٹر میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ تاہم غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ حکم دینے والا ہر شخص آمر تو ہو سکتا ہے۔ ڈکٹیٹر نہیں ہو سکتا کیونکہ ڈکٹیٹر مطلق العنان حاکم ایک طرح سے خدائی اختیار رکھنے کے زعم میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ایک آمر سے یقیناً ممتاز نظر آتا ہے۔ مختصراً یہ کہ آمر جنرل نام ہے اور ڈکٹیٹر اس کی خاص قسم ہے۔[4]

ڈکٹیٹر شپ ایک ایسا نظام ہے جس میں ڈکٹیٹر قوم پر غالب ہوتا ہے اور قوم مغلوب ہوتی ہے اور یہ غلبہ تشدد کے علاوہ کسی نہ کسی نظریے کی مدد سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ایک ڈکٹیٹر کو من مانی کرنے کا موقع اس وقت میسر آتا ہے جب کسی معاشرے میں بگڑے ہوئے حالات اس کی آمد کے لئے سازگار ہوتے ہیں حتیٰ کہ قوم کی بدنصیبی اپنی تباہی و بربادی کے لئے ڈکٹیٹر کا راستہ از خود ہموار کر دیتی ہے۔ حالانکہ ہر ملک میں اور ہر زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہوئے ہوں گے جن میں ڈکٹیٹر بننے کی صلاحیتیں موجود ہوں۔ لیکن وہ ڈکٹیٹر نہ بن سکے کیونکہ ان کے ملک کے حالات

۱۔ The Story of Dictatorship, P: 18

۲۔ The Story of Dictatorship, P:19

۳۔ Ibid P: 14

۴۔ سید محمد ظفر، ڈکٹیٹر کون؟ ص:11

نے ان کا ساتھ نہ دیا لیکن وہی لوگ اگر کسی ایسے ملک میں پیدا ہوتے جہاں کے حالات ڈکٹیٹر کے لئے موزوں ہوتے تو شاید وہ کامیاب ہو جاتے۔ لہذا جب تک کوئی قوم خود ڈکٹیٹر کے لئے حالات پیدا نہ کرے اور اسے اپنی گردن پر بٹھانے کے لئے کمزوری نہ دکھائے اور خود اس کے آگے نہ جھک جائے ڈکٹیٹر تسلط قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ [1]

جو بات تمام ڈکٹیٹروں میں قدرے مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ہر ڈکٹیٹر تاریخ سے ضرور واقف ہوتا ہے اور اس کا نہایت گہرا مطالعہ کرتا ہے اور وہ عوام کے رجحانات سے بخوبی واقف ہوتا ہے۔ اور ان کی ہر کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اگرچہ ڈکٹیٹروں کے طریقہ کار میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔ ہر ڈکٹیٹر کا طریقہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے تاہم ان سب میں حصول اقتدار کی لگن اور ہر جائز و ناجائز حربے کا استعمال یکساں ہے اور یہ اندیشہ کہ ان کے ناجائز حربے کے استحصال سے قومی روایات یا قوم کو نقصان پہنچے گا انہیں ہرگز پریشان نہیں کرتا کیونکہ ہر ڈکٹیٹر اپنی دانست میں یہ خیال کرتا ہے کہ ایک بار وہ کسی نہ کسی طرح اقتدار حاصل کر لے تو پھر وہ تمام نقصانات کی تلافی کر دے گا۔ یہاں تک کہ اس کے اقتدار میں آتے ہی قوم کی قسمت بدل جائے گی اور ملک کے دن پھر جائیں گے۔ [2]

ایک ڈکٹیٹر اقتدار صرف اس لئے حاصل نہیں کرتا کہ وہ عوام کی رائے اور مرضی کے مطابق حکومت کرے اور جب عوام اس سے بےزار ہو جائیں تو وہ حکومت سے دستبردار ہو جائے بلکہ وہ اپنی چالاکی اور عیاری سے کام لے کر عوام کی رائے خود مرتب کرتا ہے۔ ڈکٹیٹر کو یقین ہوتا ہے کہ عوام ایک صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ عوام سے محض اپنی مرتب کردہ رائے کے صحیح ہونے کی تصدیق حاصل کرتا ہے اور تصدیق حاصل کرنے کا طریقہ بھی ایسا ہوتا ہے کہ رائے صرف ڈکٹیٹر ہی کے حق میں جاتی ہے۔

آمر کے علاوہ ڈکٹیٹر نے اقتدار کی ہوس میں مبتلا ہو کر جو کئی غیر قانونی کاروایاں کی ہوتی ہیں اور ملک و ملت کے مفاد کے خلاف بہت سا کام بھی کیا ہوتا ہے اس کے احتساب کا خوف بھی سائے کی طرح ہر جگہ اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے اسے یہ فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ جونہی وہ اقتدار سے محروم ہوا قوم اس سے ضرور حساب لے گی۔

عوام کے اس محاسبہ سے بچنے کے لئے ایک ڈکٹیٹر کا اقتدار میں آتے ہی سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے مرتب کئے ہوئے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں ہمہ تن مصروف ہو جاتا ہے اور اس قدر تیزی سے قدم اٹھاتا چلا جاتا ہے کہ اس کے مخالفین منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اس کے سامنے قوم بھی مجبور اور بےبس ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک ڈکٹیٹر کے لئے اقتدار حاصل کرنے اور مکمل ڈکٹیٹر بن جانے تک کچھ وقت لگتا ہے اور ہر ڈکٹیٹر کی بلاشبہ اولین کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس عرصے کو جلد سے جلد طے کر لے۔ لیکن ملک و قوم کے حالات سامنے رکھتے ہوئے اس عرصے کا حتمی اور یقینی تعین نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کب ختم ہوگا۔ اس لیے ڈکٹیٹر کو تھوڑے عرصے تک انتظار بھی کرنا پڑتا ہے۔

ایک ڈکٹیٹر کے اقتدار میں آنے کے بعد عام طور پر چند سال بڑے ہنگامہ خیز ہوتے ہیں اس عرصے میں ایک ڈکٹیٹر کو اپنے پہلے کئی بیانات تبدیل کرنے پڑتے ہیں جن اقدامات کو وہ اقتدار میں آنے سے پہلے ناقابل ترمیم کہہ کر حمایت کر چکا ہوتا ہے اقتدار پانے کے بعد قابل ترمیم کہہ کر ان کی سختی سے مخالفت کرتا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے رفیقوں اور ساتھیوں کو بعض اوقات خیرباد بھی کہنا پڑتا ہے اور ان کی جگہ نئے ساتھی ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔

ایسے اداروں کو جو شخصی حکومت کے منافی ہوتے ہیں انہیں یکسر ختم کر ڈالنا ضروری ہو جاتا ہے یا پھر ان میں کوئی ایسی نمایاں تبدیل کر دی جاتی ہے جو حکومت کے تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کر سکے الغرض ایک ڈکٹیٹر وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو اس کے اقتدار کو قائم رکھنے میں مدد

---

[1] سید محمد ظفر، ڈکٹیٹر کون؟، ص: ۱۳
[2] سید محمد ظفر، ڈکٹیٹر کون؟، ص: ۱۷۔۴۱

پہنچا سکے اور ان سب کو بلا تامل یکسر مٹا ڈالتا ہے جو اس کے لئے سد راہ بنے۔

جس زمانے میں خطہ ارض ڈکٹیٹروں کے نام سے آشنا ہوا ارسطو نے اس زمانے میں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے چند ڈکٹیٹروں کے حالات کا جائزہ لیا اور یہ کہ اقتدار میں آنے اور ریاست پر قبضہ جمانے کے بعد وہ کیا کچھ کیا کرتے تھے اس کا جو تفصیلی مطالعہ کیا اس کا خلاصہ اس طرح پیش کیا ہے کہ

1۔ قدیم اور مقتدر خاندانوں کا زور توڑنا چاہیے اور نئے گھرانوں کو طاقت اور قوت بخشی جائے تا کہ لوگ ڈکٹیٹر کے آگے پیچھے پھریں۔

2۔ ممتاز شہریوں کو بغیر کسی جرم و خطا کے قتل کرنا تا کہ عام لوگوں کے دل و دماغ پر ہیبت اور خوف طاری ہو۔

3۔ عوام میں کسی قسم کی انجمن سازی نہ ہونے دینا تا کہ علیحدہ علیحدہ کوئی جماعت اس کی طاقت کو چیلنج نہ کرے۔

4۔ عوام میں ایسے مسائل کو ہوا دینا کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف ہو جائیں اور ان میں باہمی اعتماد کبھی پیدا نہ ہونے پائے اور اس طرح سے قوم کی مجموعی قوت اتنی کم ہو جائے کہ وہ ڈکٹیٹر کے لئے مطلق خطرہ نہ بنے۔

5۔ ارسطو کی تحریر سے جو خلاصہ پیش کیا گیا ہے ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ہر زمانے کی ڈکٹیٹر شپ کا عکس دیکھا جا سکتا ہے یہاں یہ بات بھی غور کے لائق ہے کہ جہاں اقتدار میں آنے کے لئے ہر ڈکٹیٹر نے اپنا اپنا الگ طریقہ ایجاد کیا۔ اور اپنے حالات کے مطابق مخصوص لائحہ عمل تیار کیا۔ وہاں اقتدار میں آنے کے بعد اپنی طاقت بڑھانے اور اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لئے تمام ڈکٹیٹروں نے ایک ہی طرح کی کاروائی کی ہے اور اقتدار میں آنے کے بعد ان کی داستان ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے۔

ای۔ای کیلٹ (E.E.Kellet) لکھتے ہیں

> "Than the tyrant, "says Cicero, "no animal more hateful can be conceived, or more justly destested, alike by gods and by men; he wears indeed a human shape, but in character is worse than the most savage beasts."1

بقول سیسرو ''خدا اور انسان کی نظر میں ایک آمر سے زیادہ قابل نفرت اور ناپسندیدہ کوئی جانور بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر چہ یہ انسان کے روپ میں ہوتا ہے لیکن کردار و صفات کے حوالہ سے یہ خونخوار درندوں سے بھی بدتر ہوتا ہے۔''

یونان کے معروف ڈرامہ نگار (Euripides) یوریپائڈز کے ڈرامہ کے معروف کردار ایٹیکلز (Eteocles) بادشاہ کا کردار ادا کرتے ہوئے اپنی اس خواہش کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> "Mother, I will not hide my thoughts from thee, I'd scale the farthest dwellings of the stars, Or seek the lowest depths beneath the earth, To gain that greatest goddess, Tyranny."2

''ماں! میں آپ سے اپنی دلی خواہشات کو نہیں چھپانا چاہتا میں استبداد کی دیوی Tyranny کے

1۔ The Story of Dictatorship, P:9
2۔ E.E.Kellet, The Story of Dictatorship,P:13

حصول کے لئے بلند ترین ستاروں اور زمین کی اتھاہ گہرائیوں تک جا سکتا ہوں''

دنیا میں کئی خوش نصیب ڈکٹیٹر ایسے بھی ہوئے ہیں۔ جن کی غیر آئینی اور غیر قانونی حکومت کو ابتدا ہی سے آئینی اور قانونی ہونے کا جواز میسر آیا۔ مثلاً ہٹلر کو، وان ہیڈن برگ نے خود حکومت بنانے کی دعوت دی اور ہٹلر نے اس بات کا ذکر بار ہا اپنی تقریروں میں کیا، کہ ''مجھے خود جمہوریہ جرمنی کے صدر نے بلایا اور کہا کہ میں حکومت بناؤں'' اس واقعہ کے متعلق ''مورس لیٹے'' (Murice Latey) نے اپنی کتاب ''ظلم'' (Tyranny) میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

> ''وان ہیڈن برگ نے ہٹلر پر بڑا احسان یہ کیا کہ اسے آئین کے تحت حکومت بنانے کی دعوت دے کر اسے آئینی طور پر حاکم بنا دیا اس طرح ہٹلر کی گزشتہ غنڈہ گردی، غیر آئینی اور خلاف قانون حرکتوں پر آئین کا پردہ پڑ گیا''۔[۱]

مسولینی نے بھی ہٹلر ہی کی طرح بادشاہ کی طرف سے حکومت بنانے کی دعوت کا انتظار کیا تھا تا کہ اسے حکومت حاصل کرنے کے بعد آئینی جواز نہ پیدا کرنا پڑے۔

تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے تقریباً ہر ڈکٹیٹر نے اپنے اقتدار کے ابتدائی دنوں میں حسب ذیل اقدامات کئے جن میں کئی تو ایسے ہیں کہ انہیں بیک وقت عمل میں لانا پڑتا ہے۔ بہر کیف جلد یا بدیر ہر ڈکٹیٹر کو ان مرحلوں سے ضرور گزرتا ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

1۔ اپنی غیر آئینی حکومت کے لئے قانونی اور آئینی جواز مہیا کرنا۔

2۔ قوم کو ایک نظریے اور فکر کے ذریعے مغلوب اور مسحور کرنا۔

3۔ عوام کی بغاوت یا بدامنی کو موثر طور پر کنٹرول کرنے کے لئے فوج اور پولیس کے علاوہ ایک خاص اور پراسرار تنظیم قائم کرنا۔

4۔ سرکاری ملازمین کو وفاداری پر مجبور کرنے کے لئے ان کے حقوق سلب کرنا۔

5۔ اپنے ان دوستوں اور ساتھیوں کو جو حصول اقتدار میں معاون ثابت ہوئے قابو میں رکھنے کے لیئے ان میں سے چند ایک کی قربانی دینا۔

6۔ ذرائع آمدنی کو مکمل طور پر اپنے قبضہ اور تصرف میں لینا۔

7۔ سرمایہ داروں کے پرانے گروہ کو کمزور کرنا اور ایک نیا گروہ پیدا کرنا یہاں اس بات کی وضاحت کرنا مناسب ہوگا کہ جب کوئی ڈکٹیٹر سرمایہ داری کے نظام کی بنیاد پر اقتدار میں آجاتا ہے تو ایسا ڈکٹیٹر ہمیشہ سرمایہ دارنہ نظام ہی کو تقویت پہنچاتا ہے۔ لیکن فرق اتنا ہے کہ وہ سرمایہ داری کے نظام کو قدیم گروہ کی بجائے جدید گروہ کے ذریعے سے چلاتا ہے۔ جسے وہ اپنے عہد میں خود پیدا کرتا ہے۔

8۔ کسی نہ کسی ملک سے جنگ آزما ہونے کے لئے جنگی تیاریوں میں مصروف رہنا اور فوج پر اپنی خاص توجہ مبذول کرنا۔ یہ آٹھ اقدامات ایسے ہیں جنہیں ہر ڈکٹیٹر اپنے اقتدار کی مضبوطی اور استحکام کی بنیاد سمجھتا ہے اور ان سے کبھی غافل نہیں رہ سکتا۔[۲]

---

[۱] Murice Latey, Tyranny, P:137

[۲] سید محمد ظفر، ڈکٹیٹر کون؟ ص:۹۳۔۹۵

ڈکٹیٹر کے ساتھی: ڈکٹیٹر کے ساتھی کون ہوتے ہیں؟ ڈکٹیٹر کا ساتھ کون نبھا سکتا ہے؟ یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ ڈکٹیٹر کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ کئی حضرات اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ وہ ڈکٹیٹر کے دوست بن چکے ہیں۔ اور نقصان اٹھا چکے ہیں۔ ڈکٹیٹر کا مزاج عام طور پر اس طرح کا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھیوں میں سے جونہی کسی نے اس کے ساتھ بے تکلفی کا رویہ اختیار کیا اس نے وہیں یک بنی دو گوش نکال باہر کیا اور اپنی بارگاہ کے قرب سے بالکل محروم کر ڈالا۔ بلکہ بعض اوقات اس گناہ کی سزا تو اس سے بھی کہیں زیادہ دی جاتی ہے۔

ایک ڈکٹیٹر کے نزدیک عزت نفس کا مجروع کرنا کوئی بری بات نہیں بلکہ یہ اس کا پیدائشی حق ہے کہ وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو بار بار ڈانٹ پلائے اور بے عزت کرے۔

وفاداری ایک ایسی شے ہے کہ جس کی آرزو ہر لیڈر کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ قوم اس کے حکم سے کبھی سرمو انحراف نہ کرے۔ بالخصوص وفا شعاری اور اطاعت گزاری کی صفت اس کے ساتھیوں اور حامیوں میں ضرور پیدا ہونی چاہیے۔

تاریخ شاہد ہے کہ وفادار جان نثاروں نے اپنے محبوب قائد کے ایک ادنیٰ سے اشارے پر اپنی جان تک قربان کر دینے میں کبھی دریغ نہیں کیا مگر ایک ڈکٹیٹر کا نقطہ نظر اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے وہ اپنے ساتھیوں سے وفاداری کی بجائے فرماں برداری چاہتا ہے۔ وہ انہیں اس بات کا حق نہیں دیتا کہ وہ اس کے سامنے دم مار سکیں اور کہہ سکیں کہ فلاں حکم ان کے ضمیر کے خلاف ہے اس لئے وہ اس کی تعمیل نہیں کر سکتے۔ ڈکٹیٹر کی پہلی اور آخری خواہش یہی ہوتی ہے کہ اس کے ہر حکم کی بلا چوں و چرا تعمیل کریں اور ہر لمحہ اس کی آواز پر لبیک کہیں۔ ایک ڈکٹیٹر کا قرب حاصل کرنے کے لئے فرمانبرداری کی صفت کا پیدا ہونا شرط اولین ہے اور جب یہ صفت پیدا ہو جائے تو اسے اس حد تک لے جائے کہ اپنی ذات درمیان میں نہ رہے اور ڈکٹیٹر کے لب ہلنے سے پہلے اس کے اشارے کو سمجھ جائے یعنی اس کی حیثیت پھر ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ ہو۔ جب تماشا دکھانے والا اسے حرکت دے تو حرکت میں آ جائے اور جب اس کا ہاتھ رک جائے تو ساکت ہو جائے اور مستقبل کا انتظار کرے اور تیار رہے کہ نہ معلوم اس کی پھر کب ضرورت پڑ جائے۔ مختصراً یہ کہ ڈکٹیٹر کا مقرب اپنے آپ کو بالکل فنا کر دیتا ہے اور کٹھ پتلی کی طرح ڈکٹیٹر ہی کا ہو کے رہ جاتا ہے۔ وہ جب چاہتا ہے تو اس سے کام لیتا ہے اور جب چاہتا ہے اپنے قرب سے دور کر دیتا ہے۔

میکاولی کہتا ہے ڈکٹیٹر کو چاہیے کہ وہ اپنے ساتھیوں پر فراخدلانہ عنایات کرے۔ تاکہ وہ اس کے شکر گزار اور اس سے خوش رہیں۔ اور اس سے انہیں اس بات کا بھی احساس ہو جائے کہ ان کا مقام و منصب ان کی حیثیت اور شخصیت ان کے علم و فضل اور قابلیت کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اور صرف ڈکٹیٹر ہی کہ نگاہ کرم کے باعث ہے۔[1]

جو لوگ اپنی قابلیت سے کہیں زیادہ بلند مرتبے پر محض ڈکٹیٹر کی نگاہ کرم ہی کی بدولت پہنچتے ہیں وہ ہمیشہ ایسے ہی کام کرتے رہتے ہیں جن سے ڈکٹیٹر کی ذات ان سے خوش رہے۔ اپنے ساتھیوں کو فرمانبرداری کی تعلیم دینا اور اس کی عادت ڈالنا ایک ایسا اہم مسئلہ ہے جس کے لئے ہر ڈکٹیٹر نے ایک کلاسیکی طریقہ اختیار کیا ہے اور اپنے ساتھیوں کو ہیبت اور مسرت کے بین رکھتا ہے۔[2]

---

1. Machiavelli. The Prince, P: 22
2. سید محمد ظفر، ڈکٹیٹر کون؟، ص:۱۴۶

فصل ہفتم

مغربی مفکرین کے قیادت کے بارے میں نظریات

میکاولی: فلورنس (اٹلی) میں ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوا اس کی وفات ۱۵۲۷ء میں ہوئی۔ میکاولی ایک نہایت حساس اور گہرا مشاہدہ رکھنے والا سیاست دان اور مفکر تھا سولھویں صدی کے آغاز میں تحریک کلیسا کے یہ رجحانات کہ کلیسا اور ریاست دونوں میں آئینی حکومت قائم ہو قریباً ناپید تھے اور قریباً پورے مغربی یورپ میں پاپائی مطلقیت شاہی اختیارات میں زبردست اضافہ کے ساتھ اسی سطح پر پہنچ چکی تھی۔ تاہم اٹلی میں یہ رجحانات قابل ذکر نہ تھے۔

میکاولی کو بابائے نظریات سیاسی کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ میکاولی ہی تھا جس نے پہلی بار ریاست کا لفظ استعمال کیا یعنی اس انداز میں جس انداز میں آج کے جدید دور میں ہم یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے خیال میں ''ریاست باہمی وابستگی کا سب سے بڑا ادارہ تھا'' [۱] میکاولی روحانی تصورات سے زیادہ مادی حقائق اوران کے ٹھوس ہونے پر یقین رکھتا تھا ارسطو نے سیاست اور اخلاقیات میں ایک تخصیص رکھی تھی مگر میکاولی نے انہیں ہر رشتہ سے الگ کر دیا۔ اس کا سلطان یا حاکم تمام اخلاقی و مذہبی اصولوں سے بالاتر تھا اس کا ثبوت اس کے نظریہ قانون سے ملتا ہے۔ وہ قانون ساز کو ایک معمار قرار دیتا ہے اور یہ معمار نہ صرف معاشرے کے لئے بلکہ ریاست کے لئے بھی ہے میکاولی نے حاکم کو پرنس (Prince) کے نام سے یاد کیا ہے۔ اس کی دو تصانیف 'Discourses' اور 'The Prince' ہیں۔ ان دونوں میں میکاولی کا یہ نظریہ غالب ہے کہ سیاسی مقاصد کے لئے غیر اخلاقی ذرائع اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور حکومت کی مضبوطی کا انحصار تو قوت اور خوف پر ہے۔ میکاولی اچھے حاکم کو پرکھنے کے لے ایک ہی کسوٹی رکھتا تھا۔ ''وہ حکومت کرنے میں کس حد تک کامیاب ہے'' یعنی وہ ریاست کی قوت میں کتنا اضافہ کر چکا ہے۔ اس نے ریاست میں کتنی توسیع کی ہے۔ اس کی طاقت کیا ہے عوام اس سے کتنا خوف کھاتے ہیں [۲]

تحریک اصلاح:

یورپ کی افکار سیاسی کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز اس وقت ہوا جب تحریک اصلاح، کے نام سے سولھویں صدی کا مذہبی انقلاب رونما ہوا اس کے تین مرحلے ہیں۔

پہلا مرحلہ: ۱۵۱۷ء سے ۱۵۳۰ء تک کا دور تھا جس کے دوران مارٹن لوتھر کو نمایاں مقام حاصل رہا [۳] اس مرحلہ میں ایک مطلق ریاست کے تصور کو فروغ حاصل ہوا ایسی مطلق ریاست جو علاقائی اور قومی خواص کی حامل ہو اور اس میں اتنی قوت ہو کہ وہ رعایا کی اطاعت حاصل کر سکے۔

دوسرا مرحلہ: ۱۵۳۰ء تا ۱۵۶۴ء کا دور تھا۔ اس دوران کالون کا دور دورہ رہا۔ کالوِن کے نظریات خاصے منطقی نوعیت کے تھے اور لوتھر کے نظریات سے مطابقت رکھتے تھے۔

تیسرا مرحلہ: ۱۵۶۴ء تا ۱۶۱۸ء کا دور تھا۔ اس دور میں تمام تر سیاسی دلچسپیوں کا مرکز مختلف طرز ہائے حکومت کی آزمائش تھی۔ جمہوری اور حقوق انسانی کے تصورات اس دور میں نمایاں رہے۔ تحریک اصلاح کے رہنماؤں کے عقائد میکاولی کی جگہ سینٹ تھامس اکیوناس کے گرد گھومتے تھے۔

---

۱ Bhandari, History of European Philosophy, P:178

۲ Ibid P: 181

۳ Bhandari, History of European Political Philosophy,P:197

سیاسی اختیارات کے بارے میں وہی نظریہ قائم ہوگیا کہ یہ خدا کی منشاء سے تفویض ہوتے ہیں۔[1]

مارٹن لوتھر: مارٹن لوتھر ۱۴۸۳ء میں جرمنی میں پیدا ہوا اور اس نے ۱۵۵۶ء میں وفات پائی۔ وہ مذھبیات کے پروفیسر کے طور پر بھی کام کرتا رہا۔ لوتھر کا مؤقف یہ تھا کہ ہر وہ چیز جس کا تعلق پیسے، جاگیر یا کسی مادی مفاد سے ہے وہ صرف غیر مذہبی ارباب حکومت کے دائرہ کار میں آتی ہے۔ پوپ اور دوسرے لوگ صرف کلیسا کے افسر ہیں لہذا انہیں کسی خاص مراعات کا مستحق قرار دینا غلط ہے اس تبلیغ وتشہیر سے مارٹن لوتھر نے پاپائیت اور اس کے مقاصد کو خاصا نقصان پہنچایا۔

لوتھر نے اپنی تصنیف (Of Secular Authority) میں انجیل کے حوالوں سے کہا کہ غیر مذہبی حکومت کے اختیارات خدا ہی کی طرف سے تفویض کیئے جاتے ہیں۔ لوتھر نے حاکم وقت کی اطاعت کو ضروری قرار دیا مگر یہ بھی کہا کہ اگر لوگ حاکم وقت کو غلط راہ پر چلتا دیکھیں تو وہ اپنی اطاعت سے دست برداری اختیار کر لینے کا حق رکھتے ہیں۔

جان کالون: (۱۵۰۹ء تا ۱۵۶۴ء) جان کالون ایک فرانسیسی نژاد شخص تھا اور پہلا مصلح تھا جس نے عقائد کا ایک مکمل منطقی نظام قائم کیا جس کے ذریعہ اصلاح شدہ کلیسا کا نظم ونسق چلایا جاسکتا تھا درحقیقت جان کالون ہی وہ شخص تھا جس نے لوتھر کے عقائد کو ایک صورت دی اور ان سے مطابقت پیدا کی۔[2]

کالون نے اپنی تصنیف 'Institute of the Christian Religion' میں انجیل کے احکام کی روشنی میں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ اچھے عیسائی کی طرح زندگی گزارنے کے لئے کن باتوں پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے سیاسی فلسفہ کے اعتبار سے کالون کو تحریک اصلاح کے تمام رہنماؤں میں انتہائی نمایاں اور قابل قدر رہنما کہا جاسکتا ہے۔ کالون نے ریاست کا تصور حاکمیت وبرتری خداوندی اور زوال انسانی پر قائم کیا۔ وہ حکمران کی اطاعت کا سبق دیتا تھا۔ مگر یہ بھی کہتا تھا کہ بعض اوقات بدعنوان حکمران کے خلاف ہوجانا اور بعض اوقات عوام کو سیدھا کرنے کے لئے طاقت کا استعمال بھی ضروری ہے۔[3]

جین بودین: (۱۵۳۰ تا ۱۵۹۶ء) سولھویں صدی کا ایک عظیم مفکر ایک سیاسی فلسفی جس نے قانونی تربیت حاصل کرنے کے بعد ہنری سوم کے دربار سے وابستگی اختیار کی وہ کئی زبانوں میں مہارت رکھتا تھا یونانی اور رومی فلسفیوں کا اس نے گہرا مطالعہ کیا۔ مختلف ممالک کے آئین اور قوانین میں بھی اس کا مطالعہ وسیع تھا۔ اس نے سیاسی افکار کے ہر پہلو پر لکھا وہ فرانس کی سیاسی جماعت (Politiques) کا ایک سرگرم رکن تھا۔ فرسودہ عقائد کا مخالف اور مذہبی رواداری کا مؤید تھا۔ جنگ سے نفرت کے باعث نہ صرف وہ امن وامان چاہتا تھا بلکہ بذات خود ہی قلم کے زور پر فرسودگی، تعصب اور مخالفین کے خلاف جہاد کے حق میں تھا، جین بودین اس امر پر یقین رکھتا تھا کہ سیاسی نظریات کی بنیاد لازماً تاریخی مشاہدات پر رکھنی چاہیے۔ میکاولی کی طرح اس نے اخلاقیات اور قانون میں بھی تخصیص کی تاہم ان دونوں کو میکاولی کی طرح بالکل الگ نہیں کیا۔ اس کے خیال میں ضابطہ اخلاق اور انصاف بہرحال سیاسی سائنس کا ایک جزو ہیں۔[4]

پندرھویں صدی میں اقتدار اعلیٰ، برتری، حاکمیت یا فوقیت کے لئے سب سے پہلے کچھ فرانسیسی مفکروں نے (Sovereignty)

---

1. صلاح الدین ناسک، افکار سیاسی، ص:۲۱۶
2. W. A. Dunning, Political Theories P. 36
3. Bhandari, History of European Political Philosophy, P. 204
4. صلاح الدین ناسک، افکار سیاسی، ص:۲۲۳

کالفظ استعمال کیا تاہم بودین پہلا شخص تھا جس نے لفظ کے جدید نظریے کوصداقت کے ساتھ بیان کیا۔اس کی وضاحت اس نے اپنی کتاب (De Republica) میں کی ہےاوراقتداراعلیٰ کی نوعیت اوراس کےخواص بتائے ہیں[۱]

اس کے مطابق اقتداراعلیٰ کوبہرحال مطلق ہونا چاہیےخواہ اقتداراعلیٰ ایک شخص کے ہاتھ میں ہویاعوام کی ایک جماعت کے ہاتھ میں اقتداراعلیٰ پرقانون فطرت کےسوادیگرکوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے[۲]

بودین کا کہنا ہے کہ ایک ریاست میں اقتدار ایک شخص کے ہاتھ میں ہونا چاہیے یا ایک جماعت کے۔ دوافراد کے ہاتھ میں اقتدارنامناسب ہے۔[۳] کیونکہ اس طرح اقتدارکا مقصدفوت ہوجاتا ہے۔اقتداراعلیٰ پرقانون فطرت کی پابندی کے بعداور پابندیاں بھی عائدکردی جائیں تووہ اقتدارتوہوسکتا ہے۔اقتداراعلیٰ نہیں[۴]وہ اقتداراعلیٰ کو''مطلق'' کےمعانی میں لیتا ہے۔بودین حاکم کوخدا کا نائب ارضی تصورکرتا ہےحاکم وقت کوظل الٰہی تصورکرتے ہوئے بودین رعایاپراس کی اطاعت فرض کردیتا ہے۔

تھامس ہابس: (۱۵۸۸ء تا۱۶۷۹ء) تھامس ہابس ۱۵۸۸ءمیں نارتھ ولٹنر کے شہرویسٹ پورٹ میں پیداہوا۔اسٹورٹ شاہوں سےتعلقات کے باعث ہابس جمہوری طرزحکومت پسندکرتاتھا۔اپنی اس کتاب میں وہ جواس نے'سٹورٹ خاندانی کی تائیدمیں شائع کی' لکھتا ہے۔

''عوام جب معاہدہ عمرانی کے ذریعہ حکمرانی کےاختیارات بادشاہ کےسپردکردیں
توپھراس کامطلق العنان اورہرقانون سے بالاترہوناضروری ہوجاتا ہے۔''

ہابس سےقبل بنیادی نظریات سیاست اخلاق اورمذہب پرمبنی تھےمگرہابس نے سیاسی نظریات کوایک نیاجامہ پہنایا۔ارسطونے اچھی زندگی کوریاست کی بنیادقرار دیا تھا۔قرون وسطیٰ کے مفکرین نے ریاست کومذہب کی بنیاددی۔مگرہابس نے انسانی نفسیات کی بنیادوں پر ریاست کومادی،نفسیاتی اورمعاشرتی چیزقراردیا۔ہابس کاسیاسی فلسفہ اس لئے مادی فلسفہ ہے کہ ہابس انسان کومادی چیزخیال کرتا ہےوہ انسان کو ایک سائنسی تخلیق قراردیتا ہے جوبیرونی گردوپیش سے متاثرہوکراپناردعمل ظاہرکرتا ہے۔ہابس نے معاشرتی معاہدے کے پرانے نظریےکونیا اندازدیا۔ہابس کےمطابق معاشرتی معاہدہ دراصل ایک حکومتی معاہدہ ہوتا ہے یہ معاہدہ حاکم ومحکوم کےدرمیان طے پاتا ہے۔[۵]

ہابس کےمطابق حاکم اعلیٰ بذات خودمعاہدہ کاایک فریق نہیں ہوتا۔نیزجب عوام ایک بارمعاشرہ کےلئے معاہدہ کرلیتے ہیں تووہ اس معاہدہ کوکالعدم قرارنہیں دےسکتا۔اس اعتبار سے ہابس کا یہ معاہدہ قطعی طورپرایک معاشرتی معاہدہ رہتا ہےحکومتی معاہدہ نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک مقتدراعلیٰ سرچشمہ اقتدارہےوہ مذہبی اختیارات بھی رکھتا ہے۔

ہابس نے اقتداراعلیٰ کے بارے میں جونظریہ قائم کیا ہےاس پرسب سے بڑااعتراض یہ ہے کہ اس حدتک مطلق ہےاورلامحدود ہے کہ اسے حقیقی نہیں کہاجاسکتا۔دراصل ہابس کی حاکمیت یااقتداراعلیٰ کی خواہش ایک مصنوعی تخلیق ہےاس کامقتدراعلیٰ قانون کاخالق ہے۔لہذا وہ قانون کامطیع ہےنہ استدلال کا۔ہابس نے اپنی حکومت کی تقسیم اقتداراعلیٰ کےحامل فردیاافرادکی تعداد کےاعتبار سے کی ہے۔یعنی

---

۱ R.H. Murray. The History of Political Science, P:181

۲ W.A. Dunning Political Theories V-II, P:103

۳ Ibid. 104 ۴ حسن صعب ڈاکٹر،علم السیاسۃ،ص:۹۷

۵ D.R.Bhandari, History of European Political Philosophy, P:241

1۔ بادشاہت Monarchy

2۔ اشرافیہ Aristocracy

3۔ جمہوریت Democracy

اول الذکر یعنی بادشاہت، اشرافیہ اور جمہوریت کے اقتدار اعلیٰ اور اس کے اختیارات میں وہ کوئی تخصیص نہیں کرتا۔ وہ سب یکساں اختیارات وفرائض کی حامل ہیں۔ ؎۱ وہ سب سے بہترین حکومت کی قسم بادشاہت کو قرار دیتا ہے کیونکہ اس طرز حکومت میں انتظام حکومت بطریق احسن سنبھالا جا سکتا ہے۔ اور کسی غیر کو حکومت کے معاملات میں دخل دینے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک اشرافیہ کا تعلق ہے اگر چہ یہ طرز حکومت بھی اچھا ہے لیکن اس طرز حکومت میں کسی وقت بے اتفاقی عدم اعتمادی اور بد دیانتی گھر کر سکتی ہے جس کی بنیاد پر ہر ایک رکن اشرافیہ کو ذاتی مفادات کے تحفظ کی لگن لگ جاتی ہے۔

اسی طرح جمہوریت کو بھی ''ہابس'' ایک اچھی طرز حکومت قرار دیتا ہے لیکن اس میں بھی آپس میں پھوٹ پڑ جانے کی بنا پر ریاست کی سلامتی کے خطرے میں پڑ جانے کا اندیشہ مسلسل مسلط رہتا ہے۔ اس لئے بہترین طرز حکومت بادشاہت ہی ہے۔ ؎۲

جان آسٹن: ایک افادیت پسند قانون دان تھا اس کے خیال میں فطری قانون ایک بے معنی و بے مقصد بات ہے اس کا کہنا ہے کہ قانون ارادے کا اظہار ہے اس ارادے کے ذریعہ انسانی عمل میں باقاعدگی پیدا کرنے کے لئے عمل کا تعین کر دیا جاتا ہے۔ اور اس کے بعد جو اس سے انحراف کرتا ہے وہ سزا کا مستحق قرار پاتا ہے وہ قانون کی دو اقسام بیان کرتا ہے یعنی الوہی اور انسانی۔ ؎۳ انسانی قانون کی جان آسٹن نے مزید دو اقسام بیان کی ہیں ایک تو وہ جو کسی آزاد ریاست میں سیاسی مقتدرین کی طرف سے مرتب کئے جاتے ہیں۔ جنہیں سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہوتا۔ انہیں مثبت اخلاقی قانون کہا جا سکتا ہے۔ لہذا جان آسٹن کے مطابق مثبت قانون ایک حکم ہے جو سیاسی مقتدر کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ اس پر عمل ضروری ہے ورنہ مقتدر کی سزا بھی دی جا سکتی ہے آسٹن نے قانونی دائرے اور اخلاقی دائرے میں نمایاں تخصیص کی ہے۔ ؎۴

آسٹن کے مطابق ریاست سیاسی حکومت کی افادیت کے باعث معرض وجود میں آتی ہے۔ ریاست کے وجود اور اس کے قیام کا سب سے بڑا سبب ریاست کی افادیت ہے۔ ؎۵ آسٹن کے مطابق حاکمیت اعلیٰ یا اقتدار اعلیٰ نہ تو بادشاہ کے پاس ہوتا ہے نہ ہی عوام کے پاس۔ بلکہ عوام کے منتخب یا مقرر کردہ ایک حصے کے پاس ہوتا ہے۔ آسٹن کے خیال میں اقتدار اعلیٰ ہی تمام قوانین کا سر چشمہ ہے۔ اس کی اطاعت انسان عادتاً کرتا ہے۔ ہابس کی طرح آسٹن بھی اس بات کا قائل ہے کہ مقتدر اعلیٰ پر کوئی پابندی نہیں اور وہ ہر قانون سے بالاتر ہوتا ہے۔ اقتدار اعلیٰ نا قابل تقسیم اور لامحدود ہے۔ ؎۶

ہیرالڈ جے لاسکی: (۱۸۹۳ء تا ۱۹۵۰ء) ہیرالڈ جے لاسکی کا شمار دور جدید کے جلیل القدر سیاسی مفکرین میں ہوتا ہے لاسکی انگلستان کے شہر مانچسٹر کے مقام پر ۱۸۹۳ء میں ایک یہودی گھرانے میں پیدا ہوا۔ گو وہ یہودی نژاد تھا لیکن اس نے طالبعلمی کے زمانے میں ایک عیسائی لڑکی

؎۱ D. R. Bhandari, History of European Political Pilosophy, P. 262

؎۲ Ibid, P.262

؎۳ R. G. Gettell. History of Political Thoughts; P. 348

؎۴ Bhandari, History of European Philosophy, P. 449

؎۵ Ibid P.449

؎۶ R. G. Gettell. History of Political Thoughts; P. 349

سے شادی کرلی بعدازاں وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے آکسفورڈ یونیورسٹی چلا گیا۔ جہاں اس نے ایم۔اے تاریخ میں سند حاصل کی اور ہارورڈ یونیورسٹی میں بحیثیت لیکچرر مقرر ہوا۔۱۹۲۰ء تک وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں منسلک رہا۔بحیثیت معلم لاسکی مرتے دم تک اسی سکول سے منسلک رہا۔

بحیثیت معلم لاسکی کا شمار بہت ہی لائق اور ذہین معلمین میں ہوتا تھا۔اور اپنے شاگردوں میں حد درجہ مقبول تھا لاسکی درس و تدریس کے علاوہ عملی سیاست میں بھی گہری نگاہ رکھتا تھا۔ ماضی و حال کی سیاست پر اس کا بہت ہی گہرا مطالعہ تھا چنانچہ اس ضمن میں دوران تعلیم ۱۹۱۹ء میں ہی امریکہ میں بوسٹن کی پولیس اسٹرائیک کی بھرپور حمایت کی تھی جس کی وجہ سے امریکی عوام میں وہ خاصا مقبول ہوگیا تھا۔اس دوران اس کے تعلقات تمام مشاہیر ملک سے ہوگئے ہر شخص اس کی قابلیت اور ذہانت کا معتقد تھا اس طرح لاسکی عملی اور علمی سیاست کے دونوں میدانوں میں سراہا جانے لگا۔اس کے رجحانات شروع ہی سے اشتراکی تھے اسی بنا پر وہ بعد میں Fabian Society (فیبین سوسائٹی) کا ممبر بنا بعدازاں اس نے برطانوی لبرل پارٹی "Libral Party" میں شمولیت اختیار کی حالات کے ساتھ ساتھ لاسکی کے خیالات میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ ایک وقت وہ آیا جس میں لاسکی کے خیالات مکمل طور پر مارکسی ہوگئے عملی سیاست میں آنے کے بعد لاسکی نے نہ صرف ملکی مشاہیر سے اپنے تعلقات رکھے بلکہ دیگر ممالک کے مشاہیر سے بھی اچھے تعلقات استوار کئے۔امریکی صدر روزولٹ سے لاسکی کی گہری دوستی تھی۔

ہیرالڈ جے لاسکی کو اس صدی میں تاریخ سیاسیات کا مشہور و معروف مفکر تسلیم کیا جاتا ہے دنیائے سیاسیات میں لاسکی وہ پہلا مفکر ہے جس نے میدان سیاست کا کوئی سا موضوع بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔اس کی تصانیف کی تحریروں سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وقت حالات اور ماحول کی مناسبت سے لاسکی کے خیالات اور اس کے سیاسی رجحانات بدلتے گئے ہیں۔اس سلسلے میں کبھی وہ تکثیر پسند Pluraust اور کبھی مارکسی Marxist اور کہیں Fabian نظر آتا ہے۔لاسکی کے خیالات میں ٹھہراؤ نظر نہیں آیا۔[1]

لاسکی نے اقتدار اور حاکمیت کے بارے میں کہا ہے کہ کوئی ریاست اپنے باشندوں پر مطلق اور لامحدود اختیارات نہیں تھوپ سکتی۔ ریاست پر بہت سی پابندیاں اور رکاوٹیں ہوتی ہیں اور کسی بھی مقتدر اعلیٰ کو کہیں بھی لامحدود اختیارات حاصل نہیں رہے۔اگر کسی نے اس کی کوشش کی تو عوام میں فوراً اپنے تحفظ کا خیال پیدا ہوگیا۔[2] اپنے نظریہ کو کثرت پسندی یا تعدد اختیار کے ذریعہ لاسکی نے ہیگل اور آسٹن کے نظریات کی مذمت کی ہے وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ مقتدر اعلیٰ مطلق ہوتا ہے بلکہ اس پر بعض آئینی پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ وہ ریاست میں رہنے والے ہر فرد پر صرف ریاست کی اطاعت ہی نہیں بلکہ ریاست کے ساتھ اس ادارے کی اطاعت کو بھی جس کا وہ رکن ہے فرض قرار دیتا ہے۔ اقتدار اعلیٰ پر بھی وہ بعض پابندیوں کے باعث اسے مطلق قرار نہیں دیتا۔ یہ پابندیاں اس پر قدیم رسومات، روایات اور مذہب کی صورت میں موجود ہوتی ہیں۔ [3]

جریمی بینتھم: (۱۷۴۸ء تا ۱۸۳۲ء) جریمی بینتھم کو انگریز افادیت پسند مفکرین کے مکتبہ فکر کا بانی کہا جاسکتا ہے۔ ۱۷۴۸ء میں وہ لندن کے ایک ممتاز قانون دان کے گھر پیدا ہوا۔اس کی ابتدائی تعلیم ویسٹ منسٹر سکول میں ہوئی بعدازاں اسے کوئینز کالج میں داخل کرادیا گیا۔اسی کالج سے صرف پندرہ سال کی عمر میں ڈگری حاصل کرلی۔ ۱۷۷۲ء میں اس نے قانون پاس کرنے کے بعد وکالت کا آغاز کردیا۔مگر عمر میں اضافے کے ساتھ ساتھ قانون میں اس کی دلچسپی کم ہوتی چلی گئی۔ آخر کار اس نے اس پیشہ کو خیرباد کہہ دیا اس کی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ مکمل نظام قانون اور

۱۔ Harold. J. Laski; An Introduction to Politics; P. 14

۲۔ Bhandari, History of European Political Philosophy, P. 535

۳۔ Ibid P.536

قانونی طریق کار کو از سر نو صحت مند خطوط پر قائم کیا جائے اپنی زندگی میں جریمی بینتھم نے انگلستان، فرانس، روس، چلی اور میکسیکو کے لئے قانون سازی کا کام بھی کیا۔

بینتھم کے مطابق قدرت نے ہر انسان کو دو حکومتوں کے ماتحت کیا ہے ان میں ایک حکومت دکھ اور درد کی ہے دوسری حکومت مسرتوں اور خوشحالی کی ہے۔ لہذا یہ کام انسان کا ہے کہ وہ اپنے لئے راہ عمل کا تعین کرے۔ [۱]

مقتدر اعلیٰ کے لئے بینتھم نے غیر محدود اختیارات کو تسلیم کیا ہے۔ اس کا مقتدر اعلیٰ سب کے لئے اور ہر شعبہ کے لیے قانون وضع کر سکتا ہے۔ مقتدر اعلیٰ کے وضع کردہ تمام قوانین اور اس کے جاری کردہ تمام احکامات کی اطاعت عوام پر فرض ہے۔ [۲] اگر کوئی فرد یا افراد کسی کے حقوق غضب کرنے کی کوشش کرتے ہیں یا قانون کی اطاعت سے گریز کرتے ہیں تو وہ کسی فطری حق کے تحت ایسا نہیں کر سکتے اور وہ سزا کے مستحق ہیں اس اعتبار سے بینتھم مقتدر اعلیٰ کو مکمل اختیارات دیتا ہے۔ مگر یہ بھی کہتا ہے کہ مقتدر اعلیٰ پر بھی اپنے فرائض غیر مشروط طور پر ادا کرنے کا فرض عائد ہوتا ہے۔ گو مقتدر اعلیٰ کو لامحدود اختیارات حاصل ہیں لیکن وہ انہیں افادیت ہی کی بنیاد پر استعمال کر سکتا ہے۔ اگر مقتدر اعلیٰ اپنی ذمہ داریاں اور فرائض عوام کے افادہ کی بنیاد پر نبھانے میں ناکام رہے تو عوام پر اخلاقی فرض عائد ہو جاتا ہے کہ مقتدر اعلیٰ کے خلاف صف آراء ہو جائیں مگر اس صف آرائی کا حق بینتھم اسی صورت میں تجویز کرتا ہے جب اس سے بہتر افادیت کا امکان ہو۔

---

۱ Bhandari, History of European Political Philosophy, P:436

۲ Ibid, P.440

تیسرا باب

قدیم وجدید تصورات کے اثرات

فصل اول

ملوکیت (بادشاہت) کے اثرات

ملوکیت کے اثرات صرف نظام حکومت تک ہی محدود نہیں رہتے بلکہ زندگی کا ہر شعبہ اور فکر و عمل کا ہر پہلو اس سے بری طرح متاثر ہوتا ہے۔ فرد واحد کا اختیار بغیر احساس مسؤلیت کے نقصان دہ ہوتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ یونان قدیم میں بھی پہلا دور ملوکیت کا ہی تھا۔ قبائلی سردار بہت با اختیار تھے سپہ سالار منصف اور مذہبی پیشوا کی حیثیت سے وسیع اختیارات استعمال کرتے تھے۔ لیکن قبائلی روایات کے پابند ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ سردار جو جنگوں کے قائد ہوتے تھے فاتح اور بادشاہ بن گئے پہلے ان بادشاہوں کی نوعیت معاہدہ کے مطابق حکومت کرنے والے یعنی دستوری حکمرانوں کی تھی لیکن آگے چل کر یہ بادشاہت مطلق العنان اور موروثی بن گئی۔ ابتداء میں یہ اصول تھا کہ بادشاہ کا انتخاب جنگ میں قیادت کے لئے کیا جاتا تھا اور یہ منتخب شدہ بادشاہ اور اس کی رعایا دونوں یہ عہد کرتے تھے کہ وہ اپنے فرائض پورے کریں گے لیکن انتخاب کا اصول نظر انداز کیا جانے لگا اور وراثت کو بنیادی اہمیت حاصل ہوگئی۔ یہاں تک کہ یہ خیال عام ہوگیا کہ اعلیٰ اوصاف اعلیٰ خاندان میں پیدا ہونے والے میں ہی ہو سکتے ہیں پیدائشی برتری کا یہ احساس نہ صرف ملوکیت بلکہ اعیانیت میں بھی جاری رہا۔ بادشاہ دیوتاؤں کی اولاد سمجھے جانے لگے۔ چنانچہ یہ بادشاہ نہ صرف حاکم اعلیٰ اور سپہ سالار اعظم ہوتے تھے بلکہ اعلیٰ ترین مذہبی پیشوا اور یونان کے عظیم ترین دیوتا زئیس (Zeus) کے احکام کے تاویل کنندہ بھی تسلیم کیے جاتے تھے۔ [1]

عہد قدیم کے ان مطلق العنان حکمرانوں پر اگر کوئی اثر تھا تو صرف بڑے بڑے قبائلی سرداروں کا تھا۔ عہد قدیم کی یہ ملوکیت اپنے انتہائی عروج پر پہنچنے کے بعد زوال پذیر ہوگئی اور آٹھویں صدی قبل مسیح کے وسط سے یونانی ملوکیتیں یکے بعد دیگرے ختم ہونے لگیں۔ ملوکیت کے زوال سے اعیانیت اور اس کے بعد جمہوریت کے قیام کی راہ ہموار ہونے لگی۔ لیکن یہ تبدیلی کسی انقلاب کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ رفتہ رفتہ ہوئی۔ بادشاہ کے اختیارات بتدریج کم کئے گئے اس میں بڑا حصہ امراء کا تھا جنہوں نے جمہوریت یا عوامی حقوق کے لئے نہیں بلکہ اپنا اقتدار بڑھانے کے لئے بادشاہ کا اقتدار کم کرنے کی جدوجہد کی۔ موروثی حکمرانوں کی جگہ منتخب شدہ عہدہ داروں یا مجسٹریٹوں کی حکومت قائم ہوئی یہ امرا بادشاہوں کے زمانہ میں بھی با اختیار اور طاقتور تھے۔ ان حکومتوں میں غریبوں پر بہت تشدد ہوتا تھا جس سے تنگ آ کر ان میں اپنا وطن چھوڑنے اور نئی بستیاں بسانے کا خیال پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ سیاسی اور معاشی حالات اس قدر نازک ہو گئے کہ ان پر قابو پانا حکومت کے لئے بہت دشوار مسئلہ بن گیا۔ ایسے مشکل اور بحرانی دور میں یونان کی متعدد ریاستوں میں کچھ اولوالعزم افراد غیر مطمئن اور لسانی طبقوں کے رہنماؤں کی حیثیت سے نمودار ہوئے اور ان کی مدد سے حکومت پر قبضہ کر کے مطلق العنان حکمران بن گئے۔ [2] سب سے بڑی خرابی قدیم یونانی تہذیب اور معاشرتی نظام کی پیدا کردہ تھی جو غلامی پر مبنی تھی۔ اور جس کی وجہ سے آبادی کی بہت بڑی اکثریت جو غلاموں پر مشتمل تھی تمام حقوق سے محروم کر دی گئی۔ چنانچہ ہر یونانی مملکت میں تمام شہری و جمہوری حقوق صرف ایسے آزاد شہریوں کو حاصل تھے جن کی تعداد اس ریاست میں ایک چوتھائی یا اس سے بھی کم ہوتی تھی۔ ہومر کے عہد میں غلامی موجود تھی اور اس نے اس کی مذمت بھی کی لیکن صرف اخلاقی بنیادوں پر افلاطون کو ان بدقسمتوں سے گہری ہمدردی تھی اور وہ آزاد شہری کو غلام بن جانے کے خطرہ کو موت سے بھی زیادہ خوفناک سمجھتا تھا۔ لیکن اس نے بھی اپنے جمہوری خاکہ میں نظام غلامی کو ختم کرنے کی تحریک نہ کی۔ ارسطو نے تو غلامی کو ایک مستقل معاشرتی عنصر قرار دے دیا ہے اور محکوم طبقہ کو معاشرتی نظام کے لئے ضروری خیال کرتا ہے۔

---

[1] Donald Kagan, The Great Dialogue History of Greek Political Thought P. 22

[2] شاہد رزاقی، تاریخ جمہوریت، ص: ۷۰

اس ضمن میں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ قدیم یونان میں غلاموں کی حالت اتنی خراب نہ تھی جتنی کہ انیسویں صدی کے امریکہ میں اور شاید اسی وجہ سے اس نظام کو ختم کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ زمانہ جاہلیت میں خالص آمرانہ حکومت کا دور دورہ تھا اس زمانہ کی سیاست مطلق العنان بادشاہت تھی۔ یہ بادشاہت اکثر مخصوص خاندانوں کی عظمت پر قائم ہوتی تھی جیسا کہ ایران میں تھا۔ وہاں آل ساسان کا یہ عقیدہ تھا کہ حکومت پر ان کا موروثی حق ہے اور انہیں تائید الٰہی حاصل ہے۔ کبھی یہ بادشاہت محض سلاطین کی عظمت پر قائم ہوتی تھی اہل چین اپنے بادشاہ کو ''شہنشاہِ فرزند آسمان'' کہتے تھے۔ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ آسمان ''نر'' ہے اور زمین ''مادہ'' ہے اور کائنات کو انہیں دونوں نے جنم دیا ہے اور شہنشاہ ختا اول زمین و آسمان کے جوڑے کی سب سے پہلی اولاد ہے۔ [۱] اسی بنا پر شاہِ وقت کو قوم کا باپ تصور کیا جاتا تھا۔ اس کو حق تھا کہ جو چاہے کرے۔

کبھی بادشاہت کسی خاص گروہ یا کسی مخصوص وطن کا حق سمجھی جاتی تھی۔ جیسا کہ مملکت روما میں اعتقاد تھا وہاں رومی وطن اور رومی قومیت کی عظمت بنیادی قانون تھا۔ دوسری قومیں اور دوسرے ملک اس قومیت کے غلام تھے۔ ان کی حیثیت ان رگوں اور شرائین کی سی تھی جن سے خون جاری ہو کر اپنے مرکز کو پہنچتا ہے سلطنت روما ہر ظلم و ستم کو جائز سمجھتی تھی۔ رومیوں کا عقیدہ اور ہم مذہب ہو کر اور حکومت کے ساتھ خلوص، وفاداری کے باوجود کوئی قوم یا فرد رومیوں کے ظلم و ستم سے بچ نہیں سکتا تھا۔ رابرٹ بریفالٹ (Robert Brifault) رومی سلطنت کے بارے میں لکھتا ہے۔

> ''رومی سلطنت کی تباہی کا سبب وہاں کی بڑھتی ہوئی خرابیاں (مثلاً رشوت وغیرہ) نہ تھیں بلکہ اصلی برائی اور خرابی فساد و شر اور حقائق سے گریز کی عادت تھی جو اس سلطنت کے قیام اور نشو و نما میں پہلے ہی دن سے موجود تھی۔ یہ خرابی سلطنت کے اندر جڑ پکڑ چکی تھی۔ کسی انسانی جماعت کی تعمیر جب کبھی اس طرح کی کمزور اور کج بنیاد پر کی جائے گی تو اس کے گرنے سے صرف عملی سرگرمیاں اور ذہانتیں نہیں بچا سکتیں۔ اور چونکہ خرابیوں ہی پر اس سلطنت کی بنیاد تھی اسی لئے اس کا خاتمہ اور زوال بھی ضروری تھا'' [۲]

اسی طرح مصر و شام کی رومی حکومت کے بارے میں ڈاکٹر الفرڈ بٹلر (Dr. Alfred Butler) لکھتا ہے۔

> ''مصر میں رومی حکومت صرف ایک ہی غرض و غایت اپنے سامنے رکھتی تھی اور وہ یہ تھی کہ جس طرح ممکن ہو رعایا سے مال لوٹ کھسوٹ کر حکام کو فائدہ پہنچایا جائے رعایا کی بہبودی اور خوشحالی اور عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کا خیال تک نہیں آتا تھا۔ رعایا کی تہذیب اور اخلاق کو درست کرنا اور ترقی دینا تو بڑی چیز ہے، ملک کے مادی وسائل کو ترقی دینے کی بھی اس کو فکر نہ تھی۔ مصر پر ان کی حکومت ان پردیسیوں کی سی حکومت تھی جو صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کرتی ہے اور محکوم قوم کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنے تک کی بھی ضرورت نہیں سمجھتی'' [۳]

اسی طرح ایک عرب شامی مؤرخ شام میں رومی بادشاہت کے بارے میں لکھتا ہے۔ ابتداء میں رومیوں کا شامیوں کے ساتھ اچھا اور منصفانہ برتاؤ تھا لیکن جب ان کی حکومت بوڑھی ہوگئی تو اس نے بدترین قسم کی غلامی کی شکل اختیار کر لی اور بدترین معاملہ جو غلام اور رعیت کے

۱۔ تاریخ چین از جیمس کارکرن، بحوالہ ابوالحسن ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، ص: ۷۸

۲۔ Robert Brifault , The Making of Humanity, P. 159

۳۔ Dr. Alfred Butler, Arabs Conquest of Egypt the last thirty year of the Roman Dominion. P. 42

ساتھ کیا جاسکتا ہے اس نے اپنی محکوم رعایا کے ساتھ کیا۔ روم نے براہ راست شام سے بھی الحاق نہیں کیا اور شام کے باشندوں کو کبھی بھی رومیوں کی طرح شہری حقوق حاصل نہیں ہوئے۔ ہمیشہ غریب الوطن افراد کی طرح رعایا بن کر رہے۔ اکثر سرکاری ٹیکس ادا کرنے کے لئے اپنی اولاد کو بیچ دینے پر مجبور ہوئے۔ مظالم کی زیادتی تھی غلام بنانے اور بیگار لینے کا عام رواج تھا اسی بیگار سے رومی حکومت نے وہ ادارے اور کارخانے تعمیر کیے جو رومیوں کا کارنامہ سمجھے جاتے ہیں۔[1]

ایران میں بھی سیاسی و معاشی نظام عادلانہ نہ تھا بلکہ اکثر حالات میں بہت ہی ناہموار اور ظالمانہ تھا خراج اور ٹیکس وصول کرنے والے عملہ کے اخلاق، ان کی خواہشات اور ملک کے جنگی اور سیاسی حالات کے مطابق یہ نظام بدلتا رہتا تھا۔ ایران بعہد ساسانیان کا مولف لکھتا ہے۔

> ''خراج اور ٹیکس کے لگانے اور وصول کرنے میں محصلین خیانت اور استحصال بالجبر کے مرتکب ہوتے تھے۔ چونکہ مالیات کی رقم ہر سال مختلف ہوتی تھی۔ اسی لئے آمد و خرچ کا تخمینہ لگانا مشکل ہوتا تھا۔ بسا اوقات یہ ہوتا کہ ادھر جنگ چھڑ گئی اور روپیہ ندارد۔ ایسی حالت میں غیر معمولی ٹیکس لگائے جاتے اور ہمیشہ اس کی زد مغرب کے مالدار صوبوں خصوصاً بابل پر پڑتی تھی''[2]

ایران کی قومی زندگی میں دولت و خوشحالی مخصوص افراد کے اندر محدود تھی معدودے چند اشخاص نہایت دولت مند تھے باقی نہایت تنگ دست اور پریشان حال تھے ایرانی تاریخ میں نوشیروان کا زمانہ حسن انتظام اور عدل گستری کے لیے ضرب المثل ہے ''ایران بعہد ساسانیاں'' کا مصنف لکھتا ہے۔

> ''خسرو (نوشیروان) کی مالی اصلاحات میں بے شک رعایا کی نسبت خزانے کے مفاد کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا تھا عوام الناس اسی طرح جہالت وعسرت میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ جیسا کہ زمانہ سابق میں طاقتور لوگ کمزوروں کو دباتے تھے اور ان کے ساتھ ظلم اور بے رحمی کا سلوک کرتے تھے''۔[3]

یہ حال صرف ایران ہی میں نہ تھا اس کی معاصر و حریف بازنطینی سلطنت میں بھی سخت قسم کا طبقاتی نظام اور امتیازی سلوک رائج تھا۔ Robert Brifault لکھتا ہے۔

> ''یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی اجتماعی ادارہ زوال پذیر ہوتا ہے تو اس کے چلانے والے اس کی حرکت اور ارتقاء کو روک دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں پاتے۔ اسی لئے رومی معاشرہ (اپنے انحطاط کے دور میں) سخت درجہ کی ظالمانہ طبقہ واریت کے شکنجہ میں جکڑا ہوا تھا۔ سوسائٹی میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اپنے پیشے کو بدل سکے۔ ہر لڑکے کے لئے ضروری تھا کہ اپنے باپ کا پیشہ اختیار کرے''۔[4]

دونوں سلطنتوں میں بڑے بڑے عہدے، بڑے خاندانوں اور گھرانوں کے لئے مخصوص تھے۔ جو جاہ و حشم رکھتے اور حکام میں ان کا رسوخ تھا جب کہ نت نئے ٹیکسوں نے عوام کی کمر توڑ دی تھی بہت سے کسانوں نے کھیتی باڑی چھوڑ دی تھی۔ ان کو اس مقصد سے کوئی دلچسپی نہ تھی جس کے لئے بار بار جنگیں کی جاتی تھی۔ حکومت کی خوبی خدمت کرنے سے نجات حاصل کرنے کے لئے انہوں نے عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں پناہ لی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیکاری اور جرائم کی گرم بازاری ہوئی اور ناجائز طریقوں سے روپیہ پیدا کرنے کا مرض عام ہوگیا۔

---

1. محمد کرد علی، خطط الشام، ۱/۱۰۱
2. ایران بعہد ساسانیاں، ص۱۶۳ (بحوالہ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر) ص:۸۳
3. ایران بعہد ساسانیاں، ص۱۶۳ (بحوالہ انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر) ص:۸۳
4. The Making of Humanity, P:160

روم و ایران دونوں جگہ عام طور سے لوگوں پر عیش پرستی کا بھوت سوار تھا مصنوعی تہذیب اور پر فریب زندگی کا سیلاب امڈ آیا تھا جس میں وہ سر سے پاؤں تک غرق تھے سلاطین روم اور شاہان ایران اور ان کے امراء و روساء خواب غفلت میں پڑے ہوئے تھے۔ عیاشی کی انتہا تھی۔ تکلفات زندگی تعشیات اور سامان آرائش کی بہتات تھی۔ پارسی مورخ شاہین مکاریوس کے بیان کے مطابق کسریٰ پرویز کے پاس بارہ ہزار عورتیں تھی، پچاس ہزار اصیل گھوڑے اور اس قدر سامان تعیش، محلات، نقد و جواہرات تھے کہ ان کا اندازہ مشکل ہے اس کا محل اپنی شان و شوکت میں جواب نہیں رکھتا تھا۔ [1]

اسلامی فتوحات کے بعد جب ایرانی عراق سے بے دخل ہوئے تو انہوں نے وہ اندوختہ چھوڑا جس کی قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ طبری کی روایت ہے عربوں کو مدائن کی فتح میں ترکی خیمے ملے جو سر بمہر ٹوکروں سے بھرے ہوئے تھے عرب کہتے ہیں کہ ہم سمجھے اس میں کچھ کھانے کا سامان ہوگا۔ کھولنے سے معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتن ہیں۔ [2] لوگ اس انتہا پسندانہ معاشرت اور اس کے تباہ کن لوازم و ضروریات کے اس طرح عادی ہو گئے تھے اور یہ تمدن ان کے رگ ریشہ میں اس طرح سرائیت کر گیا تھا کہ یہ تکلفات ان کی عادت ثانیہ بن گئے تھے۔ مدائن کی فتح کے وقت شہنشاہ ایران یزدگرد جس بے سروسامانی اور پریشانی میں دارالسلطنت چھوڑ کر بھاگا اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں مگر اس عجلت و پریشانی میں بھی وہ اپنے ساتھ جو سامان لے گیا۔ اس سے اس کی ذہنیت اور معیار تمدن کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ایران بعہد ساسانیاں کا مصنف لکھتا ہے

''یزدگرد اپنے ہمراہ ایک ہزار باورچی، ایک ہزار گویے، ایک ہزار چیتوں کے محافظ اور بہت سے دوسرے لوگ لیتا گیا اور یہ تعداد اس کے نزدیک ابھی کم تھی''۔ [3]

ابن جریر لکھتا ہے ''ہرمزان شکست کھانے کے بعد جب پہلی بار مدینہ آیا اور حضرت عمرؓ کی مجلس میں حاضر ہوا تو اس نے پانی مانگا پانی ایک موٹے سے پیالہ میں لایا گیا۔ اس نے کہا کہ میں پیاسا مر جاؤں گا مگر اس بھدے پیالہ میں پانی پینا میرے لئے ممکن نہیں چنانچہ اس کے لئے تلاش کر کے دوسرے برتن میں پانی لایا گیا جس سے وہ پی سکا'' [4] اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایرانیوں کی عادتیں کس قدر بگڑی ہوئی تھیں۔ وہ مصنوعی زندگی اور تکلفات کے کس قدر عادی اور سادہ و فطری زندگی سے کس درجہ دور ہو چکے تھے۔ اس عیش پسند اور مسرفانہ زندگی کا لازمی نتیجہ تھا کہ ٹیکسوں میں اس قدر اضافے ہو جائیں جو رعایا کے لئے نا قابل برداشت ثابت ہوں نئے نئے قوانین بنائے جائیں جن کی رو سے کسانوں، تاجروں، کاریگروں سے زیادہ سے زیادہ مال حاصل کیا جائے۔ آئے دن ان کے اضافوں اور بھاری ٹیکسوں نے رعایا کی کمر توڑ دی اور حکومت کے مطالبات سے ان کی پیٹھ بوجھل ہوگئی۔

مؤرخ ''خطط الشام'' رومی حکومت کے طرز عمل اور اس کی مدوں اور آمدنیوں کے متعلق لکھتا ہے۔

''شامی رعایا پر لازم تھا کہ وہ حکومت کو ٹیکس ادا کرنے اور اپنی تمام پیداوار اور آمدنی کا دسواں حصہ اور راس المال کا ٹیکس ادا کرے۔ فی کس ایک رقم مقرر تھی جس کا ادا کرنا لازمی تھا۔ اس کے علاوہ رومی قوم کے جتنے ذرائع آمدنی تھے حکومت ان سے حصہ وصول کرتی تھی''۔ [5]

روم و ایران دونوں مملکتوں میں اہل ملک دو علیحدہ طبقوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ان دونوں کے درمیان بیّن فرق تھا۔ ایک طبقہ بادشاہوں، شہزادوں، جاگیرداروں و دولتمندوں کا تھا۔ دوسرا طبقہ کاشتکاروں، کاریگروں، اور چھوٹے تاجروں کا تھا۔ جن کی زندگی سراپا کلفت و مصیبت تھی ان کا دماغ ہر وقت پریشان اور پراگندہ رہتا نہ ان کو حقیقی سکون میسر تھا نہ اطمینان قلب حاصل ہوتا تھا۔

---

[1] شاہین مکاریوس، تاریخ ایران، ص: ۹۰ [2] تاریخ طبری، ۴/ ۱۷۸ [3] ایران بعہد ساسانیان، ص۔ ۸۱
[4] تاریخ طبری، ۴/ ۱۶۱ [5] خطط الشام، محمد کرد علی، ۵/ ۴۷

بادشاہت اور ملوکیت کی ایک شکل چنگیزیت ہے جس طرح بھیڑیا خون پیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح چنگیز خان انسانی خون پیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

تارتاری منگولیا یا مغلستان کے صحرائے گومی میں رہنے والی ارواح پرست قوم تھی اس صحرا کے شمالی علاقے میں چنگیز خان کے آباء و اجداد کو سرداری مقام حاصل تھا۔ ابھی یہ نوعمر تھا کہ اس کے والد انتقال کر گئے۔ تاتاری سرداروں نے اس کی سرداری قبول نہ کی۔ لیکن بڑی مشقت جھیلنے کے بعد تاتاری سرداروں کو مغلوب کر کے اس نے اپنی ریاست قائم کر لی۔ چند برسوں میں چین و ترکستان تک زیرنگیں کر لئے۔

حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں

> ''ان تاتاریوں کا فساد اور ظلم انتہائے چین سے لے کر عراق تک پھیل گیا۔ ۶۱۷ھ میں عراق، الجزیرہ، شام اور مصر کے علاوہ چنگیز خان نے باقی تمام ممالک کو فتح کر لیا یہ لوگ جس شہر پر قبضہ کر لیتے تو اسکی ساری آبادی کو قتل کر ڈالتے اور مکانات، مساجد اور مدارس کو جلا ڈالتے تھے''۔[۱]

ابن الاثیر المتوفی ۶۳۰ھ نے اس چنگیزی فتنے کے صرف ابتدائی بارہ سال دیکھے ہیں سقوط بغداد کے وقت (۶۵۶ھ) یہ زندہ نہیں تھے جو چنگیز کے پوتے ہلاکو خان کے ہاتھوں برباد ہوا تھا۔ چنگیزی بربریت و درندگی کے بارے میں ابن الاثیر لکھتے ہیں۔

> ''اگر کوئی کہے کہ آدمؑ سے لے کر آج تک دنیا ایسی ہی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوئی تو وہ سچا ہے تاتاریوں نے جن شہروں میں قتل عام کیا ان مین سے تنہا ایک شہر کے باشندے ان بنی اسرائیل سے زیادہ ہیں جن کو بخت نصر نے قتل کیا تھا۔ ان وحشیوں نے مردوں، عورتوں اور بچوں کو بڑی سفاکی سے قتل کیا''۔[۲]

محرم ۶۱۷ھ میں یہی طرز عمل سمرقند کے ساتھ کیا گیا خوارزم میں ابتدائی حملے کے دوران ایک لاکھ افراد کو قتل کر دیا گیا اور پھر شہر کا بند توڑ کر سارے شہر کو زیرآب کر دیا۔ بلخ ترمذ اور خراسان کے شہروں کے ساتھ بھی اسی قسم کا سلوک کیا گیا۔[۳]

حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت سے زیادہ جابرانہ نظام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ جو ابتدا سے بندوں کو فرد واحد کی اغراض و خواہشات نفس کا غلام بناتا ہے۔ غیراسلامی نظریات میں سب سے زیادہ مروج اور قدیم نظریہ ملوکیت اور بادشاہت ہے۔ امام راغب اصفہانی نے ملک کا مفہوم اس طرح بیان کیا ہے۔

> ''ملک وہ ہوتا ہے جو جمہور میں امرونہی کے ذریعہ تصرف کرتا ہے اور یہ تصرف ذی عقل لوگوں کی سیاست کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے''۔[۴]

قرآن مجید میں اس ملوکیت کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے

ان الملوك اذا دخلوا قرية افسدوها و جعلوا اعزة اهلها اذلة وكذالك يفعلون [۵]

''یقیناً بادشاہ جب داخل ہوتے ہیں کسی بستی میں تو اس کو خراب کر دیتے ہیں اور وہاں کے باعزت لوگوں کو بےعزت کر ڈالتے ہیں اور ایسا ہی کرتے رہتے ہیں''۔

---

[۱] ابن کثیر البدایہ والنہایہ، ۱۳/۸۶۔۸۷　[۲] ابن اثیر، تاریخ الکامل، ۱۲/۳۵۸۔۳۵۹　[۳] ابن الاثیر، تاریخ الکامل، ۱۲/۳۶۶۔۳۶۷

[۴] امام راغب اصفہانی، مفردات القرآن، ص: ۴۸۹　[۵] النمل، ۲۷/۳۴

اس آیت کی روشنی میں ملوکیت اور بادشاہت کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے وہ نظام حکومت جوزمین پر فساد پھیلانے اور لوگوں کو ذلیل کرنے کے لئے بنایا گیا ہو۔ اور جس کا اصل مقصد حکمران کی شخصی اور ذاتی بڑائی اور بالا دستی قائم کرنا ہو۔ اسلام میں بھی جب خلافت کی بجائے ملوکیت درآئی تو نتیجہ اسی ظلم واستبداد کی صورت میں برآمد ہوا۔ اسلام کی دیوار آہنی میں کئی رخنے پیدا ہو گئے جن سے مسلسل فتنے اور مصائب نفوذ کرتے رہے۔

دین وسیاست میں عملی تفریق ہوگئی اس لئے کہ خلفاء علم اور دین میں ایسا مرتبہ نہیں رکھتے تھے جس سے ان کو علماء اور اہل دین کی ضرورت نہ پڑے انہوں نے حکومت وسیاست کو تنہا اپنے ہاتھ میں رکھا اور مشیر یا ماہرین خصوصی کے طور پر جب چاہا یا جب ان کے مصالح کا تقاضا ہوا علما اور اہل دین سے مدد لی۔ جتنی چاہی بات قبول کی اور جب چاہا ان کے مشورے پر عمل نہ کیا اور اس طرح سیاست دین کی نگرانی سے آزاد ہوگئی۔ ارکان حکومت یہاں تک کہ خود خلفاء دین واخلاق کا کامل نمونہ نہیں تھے بلکہ ان میں سے بعض اشخاص میں جاہلی جراثیم اور میلانات پائے جاتے تھے دین کی نگرانی ختم ہوچکی تھی۔ احتساب اٹھ چکا تھا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا زور ختم ہو چکا تھا کہ اس کی پشت پر کوئی طاقت اور حکومت کی جماعت نہیں تھی۔ وہ محض چند دین دار اشخاص کا رضا کارانہ عمل تھا، جن کے پاس کوئی قوت وتعزیر نہ تھی۔ جاہلیت کو اسلامی ممالک کے اندر سانس لینے کا موقع ملا تو عیش وعشرت، ترفع وتنعم کی زندگی عام ہوگئی۔ تفریحات ولہو ولعب کی گرم بازاری ہوئی۔ نفس پروری کا غلبہ ہوا۔ ان میں روح جہاد تھی نہ قوت اجتہاد جو دین کی پیشوائی اور عالمگیر قیادت کے لیے ضروری ہے۔

خلفائے راشدین کے بعد دنیا کی رہنمائی کے منصب جلیل پر وہ لوگ حاوی ہو گئے جنہوں نے اس کے لئے کوئی حقیقی تیاری نہیں کی تھی۔ خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز کی ذات کو مستثنیٰ کر کے تمام خلفائے بنی امیہ اور بنی عباس کا یہی حال تھا۔

یہ لوگ اپنے اخلاق واعمال ومعاملات میں اسلام کی شرعی سیاست اس کے جنگی قانون اور اس کے تمدنی نظام اور اس کی اخلاقی تعلیمات کی بہت کم نمائندگی کرتے تھے۔ اس طرح غیر مسلموں کے دلوں سے اسلام کے پیغام کا احترام اور اثر جاتا رہا۔ ان کا اعتماد ان لوگوں سے زائل ہوگیا۔

اس دور انحطاط میں مسلمانوں میں شرک وجہالت، قدیم جاہلی قوموں کے عقائد وخیالات اور دینی گمراہی نے بھی نفوذ کرنا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی زندگی میں اور ان کے مزاج میں ایسی بدعات نے گھر کرلیا جو ان کو صحیح دین سے دور لے گئیں۔ پس جب دین میں انسانی عقل دخل دینے لگے اور خود ساختہ اعمال ورسوم داخل ہو جائیں تو دنیا وآخرت کی سعادت کی ضمانت باقی نہیں رہتی۔

فصل دوم

مذہبی اثرات (پاپائیت کے اثرات)

حضرت عیسیٰؑ نے بنی نوع انسان کی محبت کو اپنی تعلیمات میں بنیادی اہمیت دی۔ عیسائیت کے پیش نظر چونکہ انسان کی روحانی نجات تھی اس لئے تمام تر توجہ روحانیت پر مرتکز رہی اور مادی و معاشرتی مسائل نظر انداز کر دیئے گئے روحانی زندگی کی اصلاح کے لئے عیسائیت نے رہبانیت اختیار کر لی اور حکومت کو قیصر کا حق قرار دے کر دنیاوی زندگی سے بے تعلق ہوگئی۔ اس طرز عمل کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ عیسائیت کے علمبرداروں نے معاشرتی نظام کی خرابیاں دور کرنے پر توجہ نہ کی۔

حضرت عیسیٰؑ کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد، عیسائیت شدید مظالم کا شکار ہوتی رہی اور تقریباً چار سو برس تک کوئی منظم صورت اختیار نہ کر سکی۔ لیکن مشرقی رومن شہنشاہیت کا سرکاری مذہب بننے کے بعد اس نے بہت قوت حاصل کر لی اور کلیسا کے اقتدار سے اسے کچھ فوائد حاصل ہوئے لیکن انسانی زندگی کی دین و دنیا میں تقسیم معاشرہ میں ہم آہنگی پیدا نہ کر سکی اور یہی سبب تھا کہ جب عیسائیت نے پاپائیت کی شکل اختیار کی تو کلیسائی نظام، حکومتی نظام سے متصادم ہوا اور حصول اقتدار کی اس کشمکش نے یورپ کے دورِ مظلمہ کو تاریک تر بنا دیا۔

پانچویں سے پندرھویں صدی عیسوی تک کی دس صدیاں یورپ میں دورِ ظلمت (Darkages) کہلاتا ہے۔ کبھی بادشاہت اور پاپائیت کی کشمکش اور کبھی ان دونوں کا عوام الناس کے خلاف ''خوشگوار'' سمجھوتہ۔

جب ریاست پر عیسائیت چھا گئی تو یورپ کا بیشتر حصہ بھی عیسائیت کے دامن میں چلا گیا۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ روم میں عالم مغرب کے لئے بیک وقت مذہبی اور غیر مذہبی قیادت کا قیام عمل میں آ گیا دوسری طرف عیسائیت کے آغاز اور کلیسا کی ترقی نے عہدِ وسطیٰ کے سیاسی افکار پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ دراصل عہد وسطیٰ کے آغاز میں رومی سلطنت کے سیاسی ڈھانچے میں کچھ مذہبی عقائد کے اثرات بڑھنا شروع ہوئے، جو شہنشاہ تھیوڈسیئس (Theo Dasius) کے دور میں عیسائیت کو سرکاری مذہب بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ کلیسائی افکار کے مطابق حکمرانی کا اختیار خدا کی طرف سے عطا کردہ تھا۔ جبکہ روم کا نظریہ ریاست عوام کو قوت کا سرچشمہ قرار دینا تھا، جہاں تک کلیسا کا تعلق ہے تو یہ پہلے بے ضابطہ حالت میں تھا مگر رفتہ رفتہ اسے مرکزیت حاصل ہوتی چلی گئی۔ کلیسائے روم کو ایک صدر دفتر کی سی حیثیت حاصل ہوگئی عیسائیت سرکاری مذہب بن گیا۔[1] روم کے بشپ کو ایک مرکزی اور مختار کل کی حیثیت حاصل تھی۔ اس طرح جو غیر مذہبی امور و فرائض پادریوں کے ہاتھوں میں گئے ان کے باعث کلیسا کے اثرات مزید گہرے ہو گئے۔[2] پوپ کی سیاسی حیثیت اور بادشاہ کی مذہبی حیثیت ایک دوسرے میں مدغم ہوگئی ساتویں صدی عیسوی تک یورپ سیاسی اور اخلاقی لحاظ سے کمزور ہو چکا تھا۔ مگر مذہبی اجارہ داروں کی گرفت سیاسی اداروں پر مستحکم تھی۔

نویں صدی کا آغاز شارلیمان (charlemagne) کی پوپ کے ہاتھوں مذہبی رسومات کے ساتھ تاج پوشی سے ہوا جب کہ روم کی ریاست کو مقدس سلطنتِ روما (Holy Roman Empire) کا درجہ حاصل ہو چکا تھا۔ مقدس سلطنت روما کی اطاعت مذہبی فریضہ کے طور پر لازمی قرار دے دی گئی۔ شارلیمان کے بعد سلطنت روما انتشار کا شکار ہوئی مگر پوپ کا اختیار اور اجارہ داری برقرار رہی۔ منقسم ریاست کے ہر حصے میں ہر بادشاہ کا تقرر پوپ کی مرضی سے ہوتا رہا عوام کی مرضی یا حقوق کا کوئی تصور نہ رہا۔ سلطنت تین حصوں، اٹلی، فرانس، اور جرمنی

۱۔ Hernshaw, The Social and Political Ideas, P:14

۲۔ صلاح الدین ناسک: افکار سیاسی؛ ص۔ ۱۳۵

فصل سوم

سیاسی اثرات

کسی بھی سیاسی نظام یا نظریہ کے اثرات کا تعلق بنیادی طور پر ان افکار سے ہوتا ہے جن پر وہ نظام قائم ہوتا ہے۔ چنانچہ نظریہ، افکار کا آئینہ دار ہوتا ہے اور یہی فکر یا نظریہ نظام تشکیل دیتا ہے۔ جس کے اثرات کا مطالعہ اور مشاہدہ اس دور کے یا مابعد ادوار کے مؤرخین و محققین کا سرمایہ تحقیق ہوتا ہے۔ اس بنا پر از حد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم زیرِ نظر مقالہ میں قدیم افکارِ سیاسیہ کے ساتھ ساتھ جدید یا مغربی طرز ہائے فکر کے نمائندہ افراد کی سیاسی بصیرت یا فکر کا مطالعہ کریں۔ اس مطالعہ سے غرض ان سیاسی اثرات کی تفہیم ہے جن کا آمدہ صفحات میں ذکر کیا جائے گا کہ یہی قدیم وجدید سیاسی اثرات کی تمہید ہے۔

مغربی سیاسی افکار کو افلاطون اور ارسطو سے برٹنیڈ رسل تک ایک طویل دور تک پھیلایا جا سکتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کی تعداد تین سو سے زائد ہے لیکن وہ مفکر جنہیں فکری قیادت کا شرف حاصل ہے یا جن کے افکار سے دوسرے مفکرین نے استفادہ کیا ہے کم ہیں۔ ان میں کچھ نام جنہوں نے سیاسی فکر کو مخصوص حوالے سے پرکھا ہے والٹیئر ، روسو اور مانٹسکیو ہیں۔ جنہوں نے شہنشاہیت کے خلاف انقلاب فرانس کی فکری بنیاد رکھی اور تمام عالم انسانیت کو انسانی معاشرتی اہمیت' مساوات اور اس کے سیاسی حقوق سے روشناس کرایا ان کی فکری نوعیت کا اختلاف بھی غیر معمولی نہ تھا۔ چنانچہ ان مسائل کو مابعد کے مفکرین نے اپنے اپنے شعبوں کے حوالے سے سیاسی افکار کی قیادت کی جو نہایت اہم ہے۔ تحریک احیاء العلوم سے قبل قیادت کا تصور انفرادی قوت اور صلاحیت کا پر اثر استعمال تھا۔ جو فرد اپنی قوت کے ذریعے اور اپنے ساتھیوں کے ذریعے دوسروں پر غالب آنے کی قوت رکھتا تھا۔ معاشرتی قیادت کا حق رکھتا تھا اور اس کے حق کو تسلیم بھی کیا جاتا تھا۔ تحریک احیائے العلوم کے دوران ہی یورپ کی سیاسی زندگی سے اقتدار چرچ کے اثرات کم ہونے لگے۔ یہ لڑائیاں جو مذہب کے نام پر لڑی گئیں پہلے اصلاح چرچ (Reformation) کے نام پر پھر (Counter Reformation) کے نام پر لڑی گئیں۔ عیسائی فرقہ پرستی کا یہ دور یورپ کے تمام ممالک خصوصاً مرکزی اور مغربی یورپ کے معاشروں کے لیے تباہ کن تھا۔ ان جنگوں میں تخت نشینی کی جنگوں نے مزید شدت پیدا کر دی تھی۔ جو کبھی سپین، کبھی فرانس، انگلستان اور کبھی جرمنی اور نیدرلینڈ کے حوالے سے پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی تھیں۔ اس دور کی تین شخصیات ایسی ہیں جن کی قیادت کے اثرات پورے یورپ پر نظر آتے ہیں۔[۱]

1۔ مارٹن لوتھر 2۔ چارلس پنجم آف سپین 3۔ کارڈینل رچلو (فرانس)

مارٹن لوتھر: مارٹن لوتھر جس نے پاپائیت کے خلاف آواز بلند کی اور اس کے غلط عقائد کی نشاندہی کی۔ اس نے خود کو چرچ کی بے ضابطگیوں سے علیحدہ رکھا کسی حد تک کامیاب بھی ہوا۔ مگر اس کی تمام کامیابیوں پر تعریف کی بجائے تنقیص جاری رہی۔ لوتھر نے چرچ کو خیر آباد کہا اور یونیورسٹی آف وٹن برگ میں مذہبی علوم کا پروفیسر مقرر ہو گیا۔ ۱۵۱۰ء میں لوتھر روم چلا گیا اور ان خرابیوں کا خود جائزہ لیا جو پاپائیت کے زیر سایہ پروان چڑھ رہی تھیں۔ واپسی پر لوتھر چرچ کی اصلاح کے لئے مصمم ارادہ کر چکا تھا۔ جس کا موقعہ جلد ہی فراہم ہو گیا۔[۲]

لوتھر کا پہلا نشانہ (Indulgences) پر ہوا یہ ایک ایسی سند تھی جو کسی بھی اخلاقی یا مادی جرم کہ پادری کے روبرو اقرار پر دی جاتی تھی۔

۱۔ Mukher Jee. European History, 45-54

۲۔ James Harway Robinson, Medieval and Modern Times, P:284

میں تقسیم ہوگئی۔ سکنڈے نیویا کے جنگجو قبائل نے بدامنی پھیلانا شروع کر دی۔ تاہم یہ روایت بن گئی کہ ہر بادشاہ پوپ کے ہاتھوں تاج پوشی کے بعد ہی حقیقی فرمانروا شمار ہو سکتا تھا کیونکہ پوپ دین و دنیا کا مالک تھا، معاشرے میں خواندگی کی شرح ناگفتہ بہ تھی۔ شارلیمان کی کوششوں سے تعلیمی ترقی کا کچھ سامان ہوا تھا مگر وہ صرف لاطینی زبان کی ترقی کے علاوہ کوئی نتیجہ نہ دے سکی۔ اور یہ بالواسطہ طور پر چرچ کی اجارہ داری میں اضافہ ہی کا ایک پہلو تھا۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا میں لکھا ہے۔

The clergy alone knew to read and write as long as latin was the sole medium of communication. 1

(صرف مذہبی طبقہ ہی پڑھنا لکھنا جانتا تھا کیونکہ لاطینی زبان ہی ذریعہ ابلاغ تھی جسے صرف وہی جانتے تھے اور سمجھتے تھے)

نویں صدی عیسوی کے بعد سے پاپائیت نے نہ صرف مذہبی بلکہ دنیاوی معاملات میں بھی اپنی حاکمیت کا دعویٰ شروع کر دیا تھا۔ ۷۵۶ء میں اٹلی میں ایک پاپائی ریاست قائم ہوگئی تھی جس کا سیاسی حاکم بھی پوپ تھا۔ ۱۰۷۳ء میں گریگوری ہفتم پوپ منتخب ہوا اور اس نے یہ دعویٰ کیا کہ رومن کلیسا خدا کا قائم کردہ ہے۔ پوپ کا اقتدار عالمگیر ہے وہ شہنشاہ کو معزول کر سکتا ہے اور اس کی رعایا کو شہنشاہی احکام کی پابندی سے آزاد کر سکتا ہے۔ ۲

عیسائیت نے قانون فطرت، مساوات اور انسانی طرز حکومت کے معاملات میں باقاعدہ اصول وضع کر لئے۔ حکومت کو خدا کی طرف سے عطا کردہ اختیارات پر مبنی جان کر ریاست کی اطاعت کو خدا کی اطاعت قرار دیا گیا۔ یہ نقطہ نظر روم کے روائیتی نقطہ نظر سے مختلف تھا۔ بعد میں یہی تصور حاکمیت عیسائی پادریوں اور بادشاہوں کے درمیان نزاع کا باعث بنا۔ مذہب کی سرکاری سرپرستی نے اس ادارے کو غیر معمولی قوت سے نوازا۔ جس نے اسے اخلاقی بدحالی اور سماجی ظلم کی جانب گامزن کر دیا شاہی ایوانوں میں مذہب اور مذہبی اداروں میں شاہانہ طرز زندگی سرائیت کر گیا۔ جہالت، غربت اور اخلاقی بے راہ روی کے شکار عوام الناس کی زندگی مذہب و سیاست کے گٹھ جوڑ نے اجیرن کر دی۔

مطلق العنان بادشاہت نے خدائی نمائندگی کا دعویٰ لے کر اسے اپنے حق میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ جب کہ پاپائیت اسی کی بدولت حکومت پر اپنی برتری ثابت کرنے میں لگی رہی۔ ریاست کے بارے میں عیسائیت کا یہ عقیدہ تھا کہ اس کا مقصد انصاف کا قیام ہے چونکہ یہ ایک مقدس تصور ہے لہذا ریاست بھی مقدس ہے اور اس کی اطاعت لازم ہے اس پہلو سے عیسائیت کا عروج یورپ کی تہذیبی ترقی کا باعث بنا جیسا کہ ول ڈیورانٹ (Will Durant) کہتا ہے۔

To the Church, more than to any other institution, owed the resurrection of civilization. 3

''تہذیب کا احیاء کسی بھی دوسرے ادارے سے زیادہ چرچ ہی کا مرہون منت تھا''

یورپ روم کی مذہبی قدامت پسندی کا شکار تھا۔ کیونکہ کیتھولک چرچ یورپ کا غالب مذہب تھا اور یورپ کے تمام ممالک کے حکمران اپنی حکومت کی بنیاد اور سلامتی کے لئے روم کے چرچ کی جانب متوجہ رہتے تھے۔ اور اس کی سرپرستی کو ترجیح دیتے تھے لہذا ہر ملک میں رومن چرچ یا پوپ کا نمائندہ (بشپ) وہی حیثیت رکھتا تھا جو خود اس علاقے کے حکمران کی تھی۔

۱　Encyclopedia Britanica Vol.I, P. 849

۲　D.R. Bhandari, History of European Political Philosophy, P. 127-128.

۳　The Story of Civilizaton, the Reformation, P:5,6.

چرچ کے ساتھ عوامی عقیدت، اقرار جرم گناہ اور بخشش کے تصور نے بہت بڑھادی تھی۔ تعلیم کی کمی نے اس عقیدت کو اتنا فروغ دیا کہ چرچ کی یورپی سیاست میں مداخلت نے یورپ کے حکمرانوں میں سے کچھ کو چرچ کے خلاف کر دیا۔ کلیسا پر سے لوگوں کا اعتبار اٹھ گیا جس کے نتیجے میں ''شاہی پاپائیت'' یا ''پاپائیت کی بادشاہت'' کے خلاف نفرت نے جنم لیا۔ عیسائیت کے افکار سے آگے بڑھ کر لوگوں نے مطلقاً مذہب سے ہی راہِ فرار اختیار کر لی۔

سینٹ آگسٹائن (St. Augustine) نے اپنی کتاب "De Civitate Dei" میں جس الوہی ریاست کا نقشہ پیش کیا تھا اس کے دو نمایاں پہلو انصاف اور امن تھے۔ تاہم وہ غلامی کو گناہوں کی سزا قرار دے کر اس کے خاتمے کے لئے کوشش کرنے کو ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے کلیسا کے اختیارات کو بادشاہ کے اختیارات سے بالاتر قرار دیا۔ [۱] آگسٹائن کا خیال تھا کہ دنیاوی بادشاہوں کو ختم ہو جانا چاہیے اس کی جگہ خدائی سلطنت معرض وجود میں آئے گی اور شہرِ الوہی قائم ہوگا۔ جو عالمگیر حیثیت اختیار کر لے گا۔

The city which shall have no end is that civitias Dei which has its latest most perfect terrestrial manifestation in the christian church. **2**

آگسٹائن نے اس نقطہ نظر کے خلاف کہ زوال روم میں بنیادی کردار عیسائیت کا ہے۔ اپنی کتاب میں نہ صرف عیسائیت کا دفاع کیا بلکہ روم کے عروج کو عیسائیت کے فروغ کے ساتھ مشروط قرار دیا۔ اس کے خیال میں روم کا زوال بداعمالیوں کا نتیجہ تھا۔

چودھویں صدی عیسوی میں کلیسا کے خلاف ردعمل تیز تر ہو چکا تھا۔ بقول ول ڈیورانٹ (Will Durant)

Throughout the fourteenth century the church suffered political humiliation and moral decay.**3**

''چودھویں صدی میں مسلسل چرچ سیاسی تذلیل اور اخلاقی زوال جھیلتا رہا''

شاہی ایوانوں میں مذہب اور مذہبی اداروں میں شاہانہ طرز زندگی سرائیت کر گیا۔ اربابِ کلیسا اخلاقی انحطاط و پستی اور اپنے تنعم و عیش پرستی میں خالص دنیادار حلقوں سے بھی آگے بڑھ گئے۔ اہل کلیسا کے سامنے امراء اور دولت مندوں کی عیش وعشرت بھی شرماتی تھی۔ خانقاہیں بداخلاقی کے اڈے بن گئے تھے۔ ان اہل دین کی سب سے خطرناک غلطی یہ تھی کہ انہوں نے اپنی مقدس دینی کتب میں ان تاریخی، جغرافیائی اور طبعی نظریات کو شامل کر دیا جو اس زمانے کی تحقیقات و مسلمات تھے۔ احبار و رھبان کی اسی دنیا پرستی، نفس پرستی اور بربریت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

''مسلمانو! یہودیوں اور عیسائیوں کے علماء اور مشائخ میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو لوگوں کا مال ناحق اور ناروا کھاتے ہیں اللہ کی راہ سے انہیں روکتے ہیں'' [۴]

۱۔ D.R.Bhandari, History of European Political Philosopy, P:115.

۲۔ Hernshaw, The Social and Political Ideas,P:14

۳۔ The Story of Civilization the Reformation, P:6

۴۔ التوبہ، ۹/۳۴

جس کے عوض چرچ یا پادری کو تحفہ کی صورت میں رقم بخش دی جاتی۔ بظاہر اس رقم کو کسی نیک مقصد ہی کے لئے لیا جاتا تھا۔ لیکن لوتھر کے خیال کے مطابق کسی بھی گناہ کو اس انداز سے معاف کیا جانا نہ مذہباً ممکن تھا نہ قانوناً نہ اخلاقاً۔ جرم کا تدارک صرف جرم کی سزا تھی۔ بلکہ مروجہ طریق کار جرم کے فروغ کا محرک تھا۔ ۱۵۱۷ء میں روم کا ایک پادری Tetzel جرمنی Indulgences کی فروخت کے لئے آیا تو لوتھر نے وٹن برگ کے چرچ کے دروازے پر پچانوے نکاتی اعتراضات چسپاں کر دیئے جو Indulgence کی فروخت کیخلاف ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے اور لوتھر کے خیال کے مطابق ناقابل تردید تھے۔ اس طرح مارٹن لوتھر نے ایک نئے عیسائی فرقے کی بنیاد رکھی۔ جسے (Protestant) پروٹسٹنٹ کا نام دیا گیا۔ لوتھر کا (Indulgences) کے خلاف احتجاج کا مقصد رومن چرچ کو نقصان پہنچانا نہ تھا نہ ہی وہ چرچ کے مذہبی اختیار کے خلاف تھا۔ حقیقتاً وہ اقرار جرم اور معافی کا بھی قائل تھا لیکن جرائم کی معافی کے عوض پادریوں کا کاروبار ایک ایسی برائی تھی جو بہت سے برائیوں کو پیدا کر رہی تھی۔

لوتھر، ان تمام سختیوں کے باوصف جو اسے اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے قید و بند کی صورت میں برداشت کرنی پڑیں، کچھ حکومتوں کی سرپرستی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ بالآخر یورپ میں ایک نیا سیاسی افق ابھرا جو مذہبی فرقہ واریت کی تنگ نظری سے بالاتر تھا۔[۱]

چارلس پنجم: چارلس پنجم سپین کے تخت پر چارلس اول کی حیثیت سے حکمران بنا اس کی حکومت سپین کے علاوہ نئی دنیا (امریکہ کے ایک وسیع حصہ پر تھی) سولھویں صدی کے نصف اول میں شہنشاہیت کے انتخابات کے بعد چارلس اول سے چارلس پنجم بن گیا اور یورپ کی عظیم شخصیت کے طور پر ابھرا۔ یورپ میں چارلس پنجم کی حکومت کو آمریت (شخصی حکومت) کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔ جس کی ہمت، حکمت عملی اور تدبر نے شخصی حکومت کے حوالے سے نئی جہتیں فراہم کیں۔ چارلس کی قیادتی خصوصیات بعد میں فرانس کے ولیم چہارم اور لوئیس چہاردہم کے لیے اہم مشعل راہ ثابت ہوئیں۔ اگرچہ لوئس چہاردہم نے فرانس کو سترھویں صدی میں وہی مرکزی حیثیت دی جو سولھویں صدی میں چارلس نے سپین کے لیے فراہم کی تھی، سیاسی اور تمدنی طور پر یورپ ان صدیوں میں سپین اور فرانس کی نقل کرتا تھا۔[۲]

کارڈینل رچلو: اس دور میں یورپ کی تیسری شخصیت جس نے اپنے تدبر سے انتظامی صلاحیت اور قیادت سے فرانس کو پورے یورپ میں شہرت سے ہمکنار کیا کارڈینل رچلو تھا۔ رچلو لوئیس چہاردہم کا وزیر اعظم تھا۔ جس نے ۱۶۲۴ء میں فرانس کا انتظام سنبھالا جب فرانس اندرونی خلفشار کا شکار تھا اور خانہ جنگی کے خطرات افق پر چھائے ہوئے تھے۔ رچلو نے ایسے وقت میں فرانس کو نہ صرف خانہ جنگی سے محفوظ رکھا بلکہ اپنی حکمت عملی اور تدبر سے یورپی ممالک میں فرانس کا وقار بلند کیا یہاں تک کہ اس کے اٹھارہ سالہ دور حکومت میں فرانس کا حکمران درحقیقت رچلو ہی رہا۔ رچلو نے یورپی قیادت میں ایسے سیاسی نظریات قائم کئے جن سے بعد میں بہت سے سیاسی رہنماؤں اور جرنیلوں نے فائدہ اٹھایا ان میں دو نام نپولین اور بسمارک خصوصیت کے ساتھ شہرت رکھتے ہیں۔ ان دونوں کے سیاسی کرداروں اور نظریات میں رچلو کے اثرات نظر آتے ہیں۔[۳] رچلو سمجھتا تھا کہ صرف خود مختار اور طاقتور بادشاہ ہی درست فیصلہ کرسکتا ہے۔ جبکہ درباری امراء کے مشوروں میں امرا کا ذاتی مفاد نتائج پر اثر انداز ہوتا ہے اور حکومت خاطر خواہ فائدے حاصل نہیں کرسکتی۔ رچلو کے نظریے کے مطابق طاقتور بادشاہ فرانس کو یورپ کے دوسرے ممالک میں ممتاز حیثیت دے سکتا تھا۔ اور وہی اس کی خارجہ حکمت عملی کا بنیادی نقطہ تھا۔[۴] اسی حکمت عملی کے تحت اس نے اندرون ملک Huguenots کو اس لئے

---

۱ James Harway Robinson, Medieval and Modern Times, P:287

۲ Mukhar Jee, European History, P:49

۳ Ibid, P:49

۴ James Harway Robinson, Madieval and Modern Times,P:339

نہیں کچلا کہ وہ پروٹسٹنٹ تھے اور وہ ان کے خلاف پادری ہونے کے ناطے مذہبی تعصب رکھتا تھا بلکہ امراء کا یہ گروہ بہت زیادہ طاقتور تھا۔ فوجی اعتبار سے بھی اور فرانس کی معیشت میں تجارت وصنعت کے اعتبار سے بھی بہت زیادہ اثر تھا۔ ۱

رچلو کی کامیابی کے بہت سے راز تھے جو مؤرخین نے بیان کئے ہیں اس کی ان ذاتی صلاحیتوں کے علاوہ کہ وہ ہر قسم کے حالات کو اپنے حق میں موڑ لینے کی خُو رکھتا تھا۔ وہ اپنی حکمت عملی دوسروں سے مخفی رکھ کر صرف احکامات جاری کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے مخالفین پس پردہ رہ کر بھی اس کے عزائم کو ناکام نہ بنا سکتے تھے۔ رچلو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ رچلو فرانس میں کیتھولک اور فرانس کے باہر پروٹسٹنٹ ہے۔

مندرجہ بالا مباحث سے جو نتائج سامنے آتے ہیں اور جو مابعد یورپ کے مستقبل پر رفتہ رفتہ اثر انداز ہوئے وہ درج ذیل ہیں۔

1۔ تحریک احیائے العلوم سے قبل قیادت کا تصور انفرادی قوت اور صلاحیت کا پراثر استعمال تھا۔ جو فرد اپنی قوت کے ذریعہ اور اپنے ساتھیوں کے ذریعہ دوسروں پر غالب آنے کی قوت اور صلاحیت رکھتا تھا معاشرتی قیادت کا حق رکھتا تھا اور اس کے حق کو تسلیم بھی کیا جاتا تھا۔

2۔ تحریک احیائے العلوم نے معاشرتی قیادت کو زندگی کے مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا اور کمال فن یا علمی استعداد یا نئی ایجاد یا نیا فکری نظریہ جسے معاشرتی مقبولیت حاصل ہوئی ہو مخصوص علم وفن میں قیادت کے حوالے سے پہچانا جانے لگا۔ اس طرح فنون لطیفہ کے قائد اور تھے، سائنسی ایجادات کے قائد اور۔ لیکن ان تمام قائدین میں جن لوگوں کی قیادت کے اثرات فی زمانہ بھی نظر آتے ہیں اور جن قائدین نے حقیقتاً فکری اور معاشرتی انقلاب کو انسانی حقوق کی پاسداری اور ایک دوسرے کی احتیاج پر باہمی مفادات کی بنیاد پر قائم کیا جو یورپ میں پانچ سو سال تک اپنے افکار کی انفرادی طور پر روشنی پھیلاتے رہے۔ وہ سیاسی مفکر تھے جنہیں فکری قیادت کا شرف حاصل ہے یا جن کے افکار سے دوسرے مفکرین نے استفادہ کیا ہے ان میں کچھ نام جنہوں نے سیاسی فکر کو مخصوص حوالے سے پرکھا ہے۔ والٹیر روسو اور مونٹیسکو ہیں۔ جنہوں نے شہنشاہیت کے خلاف انقلاب فرانس کی فکری بنیاد رکھی اور تمام عالم انسانیت کو انسانی معاشرتی اہمیت' مساوات اور اس کے سیاسی حقوق سے روشناس کرایا۔ انہی کے افکار سے جمہوریت کے چراغ روشن ہونا شروع ہوئے۔

والٹیر: والٹیر نے فرانس میں اس وقت آنکھ کھولی جب فرانس مذہبی انتہا پسندی میں فرقہ واریت کا شکار تھا۔ والٹر نے اس ماحول سے نکل کر 1726ء میں انگلستان میں قدم رکھا۔ فرانس کے ماحول نے والٹیر کو صرف تیس سال کی عمر میں ذہنی پختگی نصیب کی۔ اس نے Locke (لاک) اور Newton (نیوٹن) کی تصانیف کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ ان سے نظریاتی طور پر متاثر ہوا۔ ۲ والٹیر جمہوریت کا دلدادہ نہ تھا اور نہ اسے عوام سے کوئی لگاؤ تھا اس نے عوام کے انفرادی اور سیاسی حقوق سے متعلق بھی کوئی نظریہ پیش نہیں کیا۔ لیکن اس نے جو فکر دیا وہی ان کی بنیاد بنا۔ اس دور کے لکھنے والے خواہ انگلستان کے ہوں یا فرانس کے روایت پسندی (شہنشاہیت) کے قائل ہوں یا عوام دوست، مہارت کے ساتھ لکھنے والے ہوں یا برملا اظہار کرنے والے اپنے اپنے نقطۂ نظر میں شدت پسند، ناراض اور صاحب علم ہونے کے باوجود تنگ نظر تھے۔ ان کا خطاب صرف امراء کے طبقہ سے تھا۔ اس کے برعکس والٹیر ایک معقول، انسان دوست اور آزادی پسند انسان تھا فرانس واپسی کے بعد، وہ مذہبی انتہا پسندی کو چھوڑ کر رواداری اور برداشت کی ترغیب دینے لگا اس کا انداز فرانس کے حکمرانوں کیلئے ناقابل قبول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ

---

۱ James Harway Robinson, Madieval and Modern Times,P:396

۲ Ibid.. P. 465

اسے قید کی سزا بھی کاٹنی پڑی۔ لیکن رہائی کے بعد بھی اس نے اپنا مشن جاری رکھا البتہ اس نے انداز تحریر طنزیہ کرلیا اور براہ راست تنقید سے گریز اختیار کرلیا۔ والٹیئر اپنے افکار کی بناء پر فرانس بلکہ پورے یورپ میں مقبولیت اختیار کر گیا۔ والٹیر کو فرانس میں صرف سراہا ہی نہیں گیا، اس کے نظریات پر تنقید بھی ہوئی۔ چرچ پر تنقید میں اس کا اعتدال سے گریز اور شدت پسندی کا رجحان تھا۔ جس کے خلاف وہ لکھتا رہا۔ اس نے مذہبی فرقہ بندیوں پر بھی تنقید کی جو باہمی طور پر دست وگریباں تھے۔ والٹیئر کا سب سے بڑا کارنامہ فرانس میں مذہبی منافرت میں رواداری اور انتہا پسندی میں مقبولیت کا شعور پیدا کرنا تھا۔ [1]

مانٹسکو: مانٹسکو کے مطابق کسی معاشرے میں فرد کی حیثیت اپنے معاشرے میں مثبت کردار اور صلے کی توقعات کے بغیر ہونی چاہیے اسی طرح بادشاہ کے خلاف مانٹسکو کی تنقید غیر واضح ہے لیکن وہ امراء کے اجتماعی رویوں کو بادشاہ کے خلاف ایک مساواتی طاقت قرار دیتا ہے کہ بادشاہ مطلق العنانی میں من مانی نہ کر سکے۔ پوپ کے خلاف بھی مانٹسکو کا انداز فکر مثبت نہ تھا۔ اس کے خیال میں جس طرح بادشاہ اپنی رعایا کے ذہنوں پر اختیار رکھتا ہے۔ اسی طرح پوپ بادشاہ کے ذہن پر اختیار رکھتا ہے۔ مانٹسکو کا اہم ترین اور سنجیدہ کام جو یورپ کے علاوہ امریکہ کے لئے بھی اہمیت رکھتا ہے اس کی مشہور تصنیف (The spirit of law) ہے اس تصنیف میں تمام امور جو ایک فرد یا جماعت کی معاشرتی تعلق اور بہتر حکمرانی پر منتج ہوں اور جن کی بنیاد قانون (آئین) پر ہو ذکر کئے گئے۔ اس تصنیف کی ابتداء ہی مانٹسکو نے قانون کی تعریف سے کی ہے اس کے خیال کے مطابق کل کائنات قانون فطرت پر رواں دواں ہے۔ اس کتاب میں ہر طرز حکومت پر بحث کی گئی ہے۔ قوانین میں ردو بدل اور وضع قوانین کے بارے میں بھی تفصیلی ذکر ہے اس کا کہنا تھا کہ سوال یہ نہیں کہ حکومت کئی ہاتھوں میں ہے یا معدودے چند ہاتھوں میں ہے سوال یہ ہے کہ اس کے محاسن کیا ہیں۔ حکومت میں رہنے والوں کا معیار بلند ہے یا نہیں۔

روسو: روسو نے افلاطون، لاک، مونٹیسکو ہابس اور گروٹس کا خاصا گہرا مطالعہ کیا۔ اس کا تاریخی مطالعہ عمیق تھا ابتداً اس پر افلاطون کے نظریات اثر انداز تھے مگر بعد ازاں وہ مانٹسکو کے نظریات سے خاصا متاثر ہوا۔ روسو کے انقلابی نظریات اور سیاسی دنیا کے ساتھ ساتھ آنے والی نسلوں پر ان کے اثرات ناقابل فراموش ہیں۔ فرانس میں اس کے نظریات آزادی ومساوات اور اقتدار اعلیٰ نے 1789ء کے عملی انقلاب کی حیثیت اختیار کی۔ یہ سب اس کی تصنیف 'معاشرتی معاہدہ'، کا اعجاز تھا، فرانس کے ساتھ روسو کے نظریات کا اثر امریکہ نے بھی قبول کیا۔ انیسویں صدی میں جب جیفرسن تحریک کا آغاز ہوا تو یہ محسوس کیا گیا کہ یہ تحریک سراسر روسو کے نظریات پر مبنی تھی اور اس سے متاثر تھی۔ امریکہ کا اعلان آزادی اور مسودہ حقوق روسو کے نظریات کی جیتی جاگتی تصاویر ہیں۔ جدید سیاسی فلسفہ پر روسو نے گہرے اثرات مرتب کئے۔ اس کے نظریات کے باعث ریاست میں اتحاد واستحکام کی ضرورت کا احساس فزوں تر ہوا۔ اس اعتبار سے وہ جدید قومی ریاست کا خالق تھا۔ روسو جتنی شدت کے ساتھ انفرادیت کا علم بردار ہے۔ اسی شدت کے ساتھ وہ اجتماعیت کی بات بھی کرتا ہے۔ معاشرتی عدم مساوات پر روسو کے پے در پے حملوں نے مارکس کو تحریک دی۔ جدید عوامی انقلابی تحریکوں کو بھی اس کے نظریات سے کافی تقویت حاصل ہوئی۔

روسو کے مطابق اقتدار اعلیٰ اس منظم ادارے کے پاس ہوتا ہے جو معاشرتی معاہدے کے باعث وجود میں آتا ہے اور ارادہ عامہ اس میں کارفرما ہوتا ہے۔ ارادہ عامہ عوام کے مطلوبہ مفادات کا اظہار ہے لہذا ارادہ عامہ کو اقتدار اعلیٰ بھی کہا جا سکتا ہے اور کیونکہ ارادہ عامہ ناقابل انتقال، ناقابل تنسیخ، ناقابل تقسیم اور لامحدود ہے۔ لہذا یہ تصور منطقی طور پر مطلقیت کی طرف جاتا ہے اس کے مطابق عملی طور پر جمہوریت میں اکثریت ارادۂ عامہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ اور اقلیت کو ارادہ عامہ کی پیروی کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ مغربی سیاست میں جمہوریت کے

---

1. James Harway Robinson, Madieval and Modern Times,P:467

حوالے سے فکری قیادت کا یہ پہلو اتنا جامع اور موثر تھا کہ اس نے رفتہ رفتہ ایک صدی کے دوران مغرب اور مشرق دونوں سمتوں میں اپنی بالادستی قائم کر لی۔ آج یہی فکر ہر سیاسی نظام میں کسی نہ کسی حیثیت سے قائم ہے۔ یہاں تک کہ آج کی شخصی حکومت (آمریت) بھی عوام کے نام یا مفادات کے نعرے پر قائم ہوتی ہے۔

مشرق میں قیادت کے سیاسی اثرات: مغرب کی اصطلاحی زبان میں مشرق دنیا کے اس حصے کو کہتے ہیں جو نسبتاً زیادہ روایت پسند، تنگ نظر اور علمی اعتبار سے پس ماندہ اقوام پر مشتمل ہے۔ یہاں وہبی اور غیر وہبی دونوں اقسام کے مذاہب کی بنیادی خصوصیت عبادات کی رسمی ادائیگی تک محدود ہے۔ لیکن عقائد کی پختگی مذہبی معلومات سے لاعلمی کے باوصف شدت کے ساتھ برقرار ہے۔ اعتقاد میں شدت کے پہلو کے ساتھ عصبیت کا اثر اتنا زیادہ ہے کہ عقیدے کے خلاف نہ کچھ سنا جاتا ہے نہ سمجھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق میں سیاسی فکر پر ہمیشہ سے مذہب کا رنگ غالب رہا ہے۔ الہامی و وہبی مذاہب کے علاوہ غیر وہبی مذاہب میں جن مصلحین کا ذکر تاریخ میں دستیاب ہے۔ ان میں کنفیوشس (چین) مہاتما بدھ (ہندوستان) کے علاوہ اکثر و بیشتر کا تعلق مغربی ایشیا سے ہے۔ ایشیا کے بیشتر لوگ سام (Samatic) کی نسل سے ہیں اور یہ ترکی کے جنوبی سرحدوں سے وادی گنگا تک پھیلے ہوتے ہیں۔ چین میں کنفیوشس کی فکری قیادت وقتی تھی البتہ تمام مشرق بعید میں بدھ مت کی وسعت چین کے علاوہ جاپان، منگولیا، ویت نام، کوریا، روس، برما، بنگلہ دیش، نیپال، تبت اور سری لنکا میں جس انداز سے پھیلا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی تعلیمات کا تاثر دیگر غیر وہبی مذاہب کی نسبتاً زیادہ تھا اور اب بھی ہے۔ اس طرح بدھ مت جو ہندوستان سے شروع ہوا اور اسے اشوک اور چندر گپت موریا ایسے حکمرانوں کی سیاسی پناہ نصیب ہوئی لیکن ہندوستان میں فروغ نہ پا سکا۔ بدھ مذہب میں دو چیزیں ہندو مزاج کے خلاف تھیں۔ مہاتما بدھ خود مواحد تھے اور ایک خدا کی تلقین کرتے تھے۔ جو ہندو مزاج کے برعکس تصور تھا۔ بدھا کی تعلیمات اور بدھ مت کے فلسفہ نے مذہبی اخلاقی اور تمدنی قیادت کا پہلو ابتدائی دور میں بھی نمایاں کیا اور اس دور میں بھی یہ قیادت اتنی پُر اثر ہے کہ بدھ مت آج بھی صف اول کے مذاہب میں شامل ہوتا ہے۔

ہندو مذہب میں شخصی کردار کی ہمہ صفات با مقصد و نمائندگی نے قیادت کے جس پہلو کو سامنے رکھا وہ تصوراتی تھا۔ موجودہ مذہبی تنظیموں کے حوالے سے جن میں ہندو تحریکوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ نئی فکر کی کوشش نہیں بلکہ غیر ملکی تمدنی اثرات کو ہندو برہما مذہب سے اخراج کی کوشش کے بعد زمانہ قدیم کے ہندو مذہب کا اجراء ہے۔ ان تمام مذہبی تنظیموں نے سیاسی کامیابیوں کے علاوہ کوئی دوسرا اثر زیادہ دیرپا حیثیت سے برقرار نہیں رکھا۔

مشرق میں چین قدیم ترین تہذیب کا مرکز رہا ہے جہاں اس سیاسی قیادت کے دوررس نتائج برآمد ہوئے، چین کی قیادت ابتدا ہی سے جغرافیائی اور معاشی ماحول سے متاثر تھی ہندوستان کی طرح چینی معاشرہ بھی زمینداروں اور کاشتکاروں پر مشتمل تھا۔ کنفیوشس کا دور ۴۷۹ تا ۵۵۱ قبل مسیح کا ہے۔ اس کے نظریات معاشرتی اخلاقیات میں ایسے آفاقی اصولوں پر قائم تھے جو کسی زمانے اور مقام کی نسبت سے بالا کہے جا سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے کنفیوشس کو بڑی شہرت حاصل رہی اور اس کے افکار کی افادیت کو چین سے باہر بھی سراہا جانے لگا۔ بدھ مت کے چین میں فروغ کے بعد کنفیوشس ازم کو چین میں زوال آیا اور رفتہ رفتہ اس کے نظریات تاریخی پس منظر میں چلے گئے۔[1]

اسلام کا سیاسی نظام اور اس کے اثرات دیگر تہذیبوں اور اقوام کے برعکس بہت دوررس اور نتیجہ خیز تھے۔ لیکن ملوکیت کے فروغ کے بعد یہ نظام انتشار کا شکار ہو گیا۔

---

1. D. R. Bhandari, History of European Political Philosophy, P.635

فصل چہارم

جمہوری طرزِ قیادت کے اثرات

جمہوری طرزِ حکومت کے ارتقاء کو دورِ جدید کی سیاسی وسماجی ترقی کا ایک بین ثبوت سمجھا جاتا ہے اس وقت جمہوریت کو محض ایک طرزِ حکومت نہیں، بلکہ ایک طرز زندگی کے طور پر اپنالیا گیا ہے۔اس کی بنیادی وجہ جمہوریت کے ان اصول واقدار کو قرار دیا جاتا ہے جن کے تحت وہ افرادِ معاشرہ کو آزادی، مساوات اور حقوق انسانی سے فیض یاب کرتی ہیں۔جدید جمہوریت کو عوام کی بالا دستی، اکثریت کی مرضی اور انسانیت کی فلاح پر مبنی طرزِ حکومت کی ضمانت مانا گیا ہے۔جدید ماہرِ سیاسیات، ایچ۔جے لاسکی (Laski) لکھتا ہے:

Democracy rests on a belief in the fundamental dignity and importance of the individual, in the essential equality of human beings, and in the need for freedom. [1]

(جمہوریت، فرد کی عظمت اور اہمیت کے بنیادی اصول پر قائم ہوتی ہے اور اس کا انحصار انسانوں کے درمیان ایک اٹل مساوات اور ان کی آزادی کی شرط پر ہوتا ہے)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ موجودہ جمہوریت کی بنیاد، فرد کی اہمیت وعظمت پر ہے اور یہاں افرادِ معاشرہ کی آزادی، مساوات اور عوامی طاقت کو جمہوریت کی روح قرار دیا گیا ہے۔میخائل سیٹورٹ (Micheal Stewart) اس فلسفے کی عملی تشریح یوں کرتا ہے۔

When people claim that their country is a democracy we understand them to say that, as for as is humanly possible, all the adult citizen have an equal opportunity to exercise political power. (2)

(جب کسی ملک کے لوگ ایک جمہوری ریاست ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں جہاں تک انسانی سطح پر ممکن ہے.....تمام بالغ شہریوں کو یکساں مواقع میسر ہیں کہ وہ اپنی حاکمیت کا حق استعمال کریں)

یعنی اس کے خیال میں تمام شہریوں کو عملاً سیاسی (حق کے استعمال کی) قوت، یکساں اور مساوی طور پر حاصل ہو تو جمہوریت روبہ عمل ہوگی وگرنہ نہیں۔

عملی سطح پر اس مقصد کے حصول کے لئے جمہوری معاشرے اپنی ضرورت اور حالات کے مطابق اپنا طرزِ حکومت ترتیب دیتے ہیں۔ قدیم دور سے طرز ہائے حکومت کو مختلف قسموں میں تقسیم کرنے کے لئے حکمرانوں کی تعداد کو بنیاد بنایا جاتا ہے اس لحاظ سے جمہوریت کو دیکھا جائے تو وہ ایک فرد یا چند افراد کی جگہ اکثریت کی حکومت کا نام ہے جیسا کہ بابیو (Bobio) کہتا ہے:

Democracy is one of the three possible governmental forms in the typology which classifies such forms depending on the different numbers of rules; more precisely it is that form of government in which power is exercized by all the people, or by the greater part, or by the masses. (3)

۱۔ An Introduction to Poliltics, P-48　　۲۔ Modern Forms of Government, P.199

۳۔ Noberto Bobio, Democracy and Dictatorship, (Tr. Peter Kannealy),P-135

یعنی جمہوریت، ان تین ممکنہ طرز ہائے حکومت میں سے ایک کا اصطلاحی نام ہے جو حکمرانوں کی مختلف تعداد کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ممتاز کی جاتی ہیں۔ زیادہ موزوں الفاظ میں یہ ایک ایسا طرزِ حکومت ہے جس میں تمام لوگ یا عوام الناس کی بڑی اکثریت اپنا حق حاکمیت استعمال کرتی ہے۔

عوامی اکثریت کی یہ شرکت براہ راست ہو تو وہ طرز حکومت براہ راست جمہوریت Direct Democracy کہلاتا ہے اور اگر یہ شرکت بالواسطہ (یعنی منتخب نمائندوں کے ذریعے) ہو تو یہ طرز حکومت بالواسطہ جمہوریت (Representative Democracy) کہلائے گا۔

جمہوریت اور اس کے اثرات کے بارے میں کسی تجزیے کے لئے ضروری ہے کہ مذکورہ بالا اصول و اہداف کو سامنے رکھتے ہوئے سب سے پہلے اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ آیا جمہوریت کا اپنے اہداف کے حصول میں کامیابی کا دعویٰ کس حد تک درست ہے۔ اس حوالے سے درج ذیل سوالات سامنے آتے ہیں۔

(i)　کیا جمہوریت محض ایک طرز حکومت (کے طور پر کامیاب) ہے یا ایک طرز زندگی (کے طور پر)؟

(ii)　کیا جمہوریت کسی مخصوص معاشرے اور خاص ریاست میں کامیاب ہوتی ہے یا یہ زمان و مکان سے ماوراء ایک آفاقی اور عالمگیر اصول ہے؟

جمہوریت کے ارتقائی سفر کی کہانی سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ آغاز میں اپنے اصطلاحی مفہوم کے لحاظ سے اور عمل کے میدان میں، یہ محض ایک طرز حکومت (Form of Government) کا نام تھا۔ قدیم و جدید سیاسی مفکرین نے طرز ہائے حکومت کی قسم کے طور پر، اس کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بطور طرز حکومت بھی یہ نظام اسی دور جدید میں ہی مقبول ہوا ہے جب کہ اس سے پہلے ناپسند کیا جاتا رہا ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں صرف دو ماہرین سیاسیات کی رائے بطور مثال پیش کی جاتی ہے۔ جان ڈن (John Dunn) اٹھارویں صدی تک، جمہوریت کی یہ صورتحال بتاتا ہے۔

Democracy was not yet a faith, not an ideology, not an ethic, it was still a technical term of political science. **(1)**

(جمہوریت نے اس دور (اٹھارہویں صدی عیسوی) تک ایک عقیدے کی شکل اختیار کی تھی نہ ایک نظریہ زندگی اور اخلاقی اصول کی...... بلکہ یہ سیاسیات کی محض ایک فنی اصطلاح تھی)

اسی طرح پال ای کارکورن (Paul E. Corcoran) کی رائے کا گراہم ڈنکن نے حوالہ دیا ہے

From the perspective of twenty five hundred years of western political thinking, almost no one, untill recently, thought democracy to be a very good way of structuring political life. **(2)**

(مغربی سیاسی سوچ کو گذشتہ پچیس سو سال کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ماضی قریب تک کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس نے جمہوریت کو سیاسی زندگی کی تشکیل کا کوئی بہت بہتر نظام سمجھا ہو)

۱۔ Democracy, P:59

۲۔ Graem Duncan, Democratic Theory and Practice, P:13

البتہ جہاں تک جدید دور میں اس کے لغوی معنوں اور وسیع ہوتے ہوئے مفہوم کا تعلق ہے تو یہ بات صحیح ہے کہ ماضی قریب سے اسے قبول عام کی سند حاصل ہے:

Democracy is the world's new universal religion. (1)

گزشتہ دوصدیوں میں وقوع پذیر ہونے والے عالمی واقعات اور انسانی رویوں میں در آنے والی ''جمہوری'' تبدیلیوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جمہوریت کے اثرات دور جدید میں، انسان کے فکر وفلسفہ (Ideology) اور تہذیب وتمدن (Culture & Civilizaion) دونوں پہلوؤں پر ہوئے ہیں۔ ان کی ایک سطح انفرادی زندگی (Individual Life) اور دوسری سطح اجتماعی زندگی (Social Life) کی ہے۔لیکن افسوس کہ ان اثرات کی ایک سطح خوشنما اور مفید ہے، جب کہ دوسری بھیانک اور ضرررساں ہے۔

انفردی آزادی وخودمختاری نے مذہبی ومعاشی آزادی (Liberalism) سے بالخصوص مغربی انسان کو روشناس کیا۔مگر یہ آزادی ایک طرزِ زندگی کے طور پر ارتقاء پذیر ہو کر جدید لادینیت (Secularism) کی صورت میں مقبول عام ہوگئی۔

اجتماعی اقتدار نے پہلے قومیت پرستی کو فروغ دیا پھر احساسِ برتری کے ساتھ نئے فاشزم (Fascism) اور نوآبادکاری کے توسیع پسندانہ رجحان (Colonial Expansion) کی صورت میں دنیا پر چھا گیا۔

نیشنلزم اور فاشزم نے دنیا کا جغرافیہ تبدیل کر کے رکھ دیا۔ایک طرف تو قوموں کی قومیں غلام بنالی گئیں اور دوسری طرف بیسویں صدی کے پہلے ہی نصف میں دوعظیم جنگوں کے ذریعے کروڑوں انسانوں کو موت اور ذلت کی وادی میں دھکیل دیا گیا۔کیا اس سب کچھ کو ہم جمہوریت کی'' کامیابی کہہ سکیں گے؟..........

اب اس تصور اور فلسفے پر غور کیجئے جسے جمہوریت کی روح کہا جاتا ہے یعنی یہ کہ' جمہوریت کا دوسرا نام Rule of People یعنی عوام کی حاکمیت ہے۔ یہ فلسفہ (اگر اسے فلسفہ کہا جاسکے تو) ایک طرف تو فکری ونظری اعتبار سے کئی حوالوں سے نامکمل اور محل نظر ہے اور دوسری طرف تجربات نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس تصور کے عملی صورت میں ڈھلنے تک، اس میں کئی انحراف (Deviations) واقع ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر دو الفاظ Rule اور People کے مفاہیم کی تعین میں الجھاؤ اور پیچیدگی در آتی ہے یعنی یہ کہ لفظ Rule کے تحت اقتدار اور حاکمیت کی نوعیت اور حدود وآداب کیا ہوں اور لفظ People کے تحت 'عوام' سے مراد کون ہے؟

1۔ حکومت میں عملاً چند لوگ ہو سکتے ہیں جب کہ عوام سے مراد اکثریت ہے، جس کا حکومت کرنا عملاً محال ہے۔ پھر یہ کہ حکومت کرنے کے لئے جس دانائی، بصیرت اور قابلیت کی ضرورت ہے وہ اکثریت کی بجائے اقلیت میں پائی جاتی ہے۔ اس حوالے سے بھی عوام الناس کا حکومت کرنا ناممکن العمل ٹھہرتا ہے۔

2۔ لوگ یعنی People ایسا لفظ ہے جو بظاہر ایک 'کل' کی نمائندگی کرتا ہے اور اجتماعیت کا مفہوم رکھتا ہے مگر اس کے اجزاء یعنی افراد ذہنی وجسمانی استعداد کے لحاظ سے، معاشی وسماجی مقام کے حوالے سے پسند وناپسند اور ترجیحات کے اعتبار سے نہ صرف باہم مختلف بلکہ باہم متضاد ہوتے ہیں۔ لہٰذا صلاحیت مواقع اور ترجیحات کے فقدان کی بنیاد پر ان کا کسی ایسے فیصلے پر پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے جو سب کے لئے یکساں طور پر مفید اور قابل قبول ہو۔

3۔ ''لوگوں کی حکومت'' میں اکثریت کے اصول (Majority Principle) کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں یعنی جس چیز کو زیادہ افراد

---

1 Graem Duncan, Democratic Theory and Practice, P:13

قبول کریں قانون بن جائے گی جب کہ ایک ایسا فیصلہ، جس کی حمایت اقلیت کر رہی ہو اور وہ خواہ کتنی ہی معقولیت پر مبنی ہو، رد کر دیا جائے گا۔ اب یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ انسانوں کی اکثریت اپنے عمومی فیصلوں میں، معقولیت ومنطقیت کی بجائے خواہشات و جذبات کو بنیاد بناتی ہے۔ لہذا اکثریت کے اصول کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ فیصلے غلط ہوتے ہیں اور دوسرا یہ کہ اقلیت، اکثریت کے جبر میں آجاتی ہے۔ اگر یہ جمہوریت ہے تو اس کو عوام کی حاکمیت نہیں اکثریت کی حاکمیت (Majority Rule) کہنا ہوگا۔[1]

4۔ اس پر مستزاد یہ کہ معیار یہ نہیں رہتا، کہ ''کون (اور کیا)'' رائے دے رہا ہے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ ''کتنے (اور جیسی بھی)'' رائے دے رہے ہیں۔ اس طرح سارے کا سارا معاملہ (Quality) یا معیار کی بجائے (Quantity) یا مقدار اور تعداد پہ چلا جاتا ہے۔

5۔ تاہم اکثریت کا اصول عقلی دلائل کے لحاظ (Logical Basis) یا اخلاقی بنیادوں پر (Moral Ground) سے درست نہ بھی ہو تو کسی فیصلہ اور نتیجہ تک پہنچنے میں، یہی طریقہ کار اپنانا پڑتا ہے۔ خاص طور پر ایسے معاملے میں جہاں لوگوں کی مرضی ہی کو بنیاد بننا ہو ایک معاملہ بہت اہم ہے۔ وہ یہ کہ:

(i) لوگوں یا عوام الناس میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ریاستی وحکومتی فیصلوں یا معاملات میں مداخلت سے دلچسپی نہیں رکھتے، اس لئے کہ اس کا انہیں شعور نہیں ہوتا۔

(ii) بہت سوں کا ان فیصلوں سے سروکار نہیں ہوتا۔ کیونکہ کچھ لوگوں کی ترجیحات میں شامل نہیں ہوتا کہ وہ سیاست وحکومت کے کاموں سے وابستہ ہوں

(iii) بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو شعور اور دلچسپی رکھنے کے باوجود مجبور ہوتے ہیں کہ انہیں ایسے معاملات میں صحیح طور پر شرکت کرنے کے مواقع اور وسائل میسر نہیں ہوتے۔

لہذا ایک تو اکثریت کے اصول کے نفاذ میں مشکلات پیش آتی ہیں اور دوسرا ایسی صورتحال میں جمع ہونے والی رائے کو حقیقی اکثریت کی رائے یا اکثریت کی حقیقی رائے کہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ گویا طریق کار خود، روح جمہوریت کو کچل کے رکھ دیتا ہے۔

The very means by which socialist and democratic parties endeavour to create a democratic society is the procedure through which it must necessarily be lost. **2**

(جن ذرائع کی مدد سے اشتراکی اور جمہوری پارٹیاں، ایک جمہوری معاشرہ بنانے کی کوشش کرتی ہیں، وہی طریقہ کار دراصل حقیقی جمہوریت کو لازمی طور پر کھو بیٹھتا ہے)

مزید برآں اس میں ظلم یہ ہوتا ہے کہ ایک سیاسی دانشور یا ماہر دستور وقانون کی رائے کو، جو ریاستی وحکومتی معاملات سے زیادہ متعلق، موزوں اور مفید ہو سکتی ہے ایک ان پڑھ کسان کی رائے کے برابر گنا جاتا ہے جو بعض اوقات اس کے شعور یا اس کی دلچسپی کے لحاظ سے اور بعض اوقات اس کے غیر متعلق اور غیر موزوں ہونے کے لحاظ سے بے فائدہ بلکہ نقصان دہ ہوتی ہے۔

اسی بنیاد پر سیاسی ماہرین یہ تجزیہ کرتے ہیں کہ جمہوری نظریہ، خود جمہوری عمل اور طریقہ کار کی کوتاہیوں کی نذر ہو جاتا ہے۔

Democratic Practice throws a drak light on democracy theory. **3**

۱۔ David Held, Models of Democracy, P. 122 ۲۔ Jack Lively, Democracy, P.9

۳۔ Graem Duncan, Democratic Theory and Practice, P13.

اکثریت کے اصول کا یہ پہلو بھی تجزیہ طلب ہے کہ آیا جمہوری طریقے سے حاصل ہونے والی رائے، واقعتاً اکثریت کی رائے ہوتی ہے یا نہیں......؟ اس کا جواب ہاں میں نہیں دیا جاسکتا۔

(i) جمہوری نظام حکومت کو عمل میں لانے کے لئے انتخاب (Election) کا طریقہ کار اپنایا جاتا ہے اس طریق کار کی پیچیدگیوں اور خامیوں سے قطع نظر......الیکشن میں رائے دینے کا حق دار صرف رجسٹرڈ ووٹر ہوسکتا ہے، غیر رجسٹرڈ نہیں۔ اس طرح آبادی کا ایک حصہ جو ''عوام'' میں شامل ہے مگر جمہوری عمل سے باہر رہتا ہے۔

(ii) بطور ووٹر رجسٹرڈ ہونے کی شرط بلوغیت (یا خاص حد عمر) ہے۔ جس کا مطلب ہے عوام الناس میں سے خاص عمر کے افراد اس عمل میں حصہ لیتے ہیں۔

(iii) پھر جب ووٹ ڈالے جاتے ہیں تو سارے رجسٹرڈ ووٹرز، ووٹ نہیں ڈالتے، بہت سارے لوگ الگ رہ جاتے ہیں اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آیا ''عوام'' کی اکثریت جمہوری عمل میں حصہ لیتی یا......اقلیت شامل ہوتی ہے اور اکثریت دور رہتی ہے۔

گویا اشتراکی مفکرین کا یہ اعتراض صحیح ثابت ہوجاتا ہے:

Liberal Political doctrines effectively restrict freedom to a minority of the population. **1**

(آزاد منشی کا سیاسی اصول، موثر طریقے سے، آزادی کو آبادی کی ایک اقلیت تک محدود کردیتا ہے)

مزید یہ کہ خود ڈالے گئے ووٹوں کی تعداد کا تجزیہ کیا جائے تو کچھ پہلو ایسے سامنے آتے ہیں کہ اکثریت کا خواب پورا نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر

(i) اگر امیدوار دو ہوں اور ان کا فرق ۵۱ اور ۴۹ کا فیصد کا ہو تو کیا ۵۱ فیصد کو (یعنی صرف ایک کے فرق سے اور وہ بھی درج بالا تشنہ تکمیل طریق کار کے تحت) اکثریت کہا جائے گا؟......

(ii) اگر امیدوار دو سے زیادہ ہوں (مثلاً چار) تو بہت دفعہ یہ ہوتا ہے کہ ۱۰۰ میں سے تیس ووٹ لینے والا ''اکثریت'' کا نمائندہ منتخب ہوجاتا ہے جب کہ اس کے خلاف (تین) مختلف امیدواروں کے حق میں ڈالے گئے (فرض کیا 20,24,26) ۷۰ ووٹ ''اقلیت'' قرار پاتے ہیں۔

درج بالا تجزیئے سے یہ بات واضح ہوکر سامنے آتی ہے کہ عوام کی حکومت کا تصور اور اکثریت کے اصول کا عمل میں آنا بہت حد تک ناممکن ہے۔ اس بنیاد پر نوبرٹو بابیو (Noberto Bobio) یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ:

No true democracy has ever existed nor ever will. **2**

(حقیقی جمہوریت کبھی معرض وجود میں نہیں آتی اور نہ ہی مستقبل میں کبھی آئے گی)

اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوری نظام کے پنپنے کے لئے کچھ خاص پس منظر اور ماحول درکار ہے جس کی عدم موجودگی میں جمہوری طرز حکومت، ثمر بار نہیں ہوسکتا۔ گویا جمہوریت کوئی ایسا آفاقی اصول اور عالمگیر صداقت نہیں جو ہر جگہ پر درست پایا جائے بلکہ ایک خاص طرح کے حالات اور خام مال کے ذریعے معرض وجود میں آتی ہے اور اسی خاص طرح کے ذرائع سے زندہ رہتی ہے۔

1۔ حقیقی جمہوریت کی سب سے پہلی ضرورت ایک ایسی ریاست ہے جو محدود آبادی کی حامل ہو۔ قدیم یونانی آبادیوں میں ایسی ریاستیں ہی جمہوریت کے لئے مثالی قرار پاتی تھی۔ جہاں سارے شہری ایک وقت میں ایک جگہ جمع ہوکر اپنے اجتماعی معاملات کا فیصلہ، بحث و تمحیص کے

---

۱ Noberto Bobio, The Future of Democracy, P:16

۲ Noberto Bobio, Democracy and Dictatorship: P. 149

بعد کر سکتے تھے۔ یہ الگ بات کہ شہری کی تعریف میں ایک محدود اقلیت ہی شامل ہوتی تھی بلکہ بچے، غلام اور نصف آبادی یعنی خواتین اس پورے عمل سے الگ رکھے جاتے تھے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ حقیقی جمہوریت کے لئے یونانی ریاستوں کو مثالی قرار دینا تاریخی طور پر غلط ہوگا تاہم انہیں ابتدائی تجربہ گاہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ ایسی تجربہ گاہیں دنیا کے کئی ایک علاقوں میں اس دور میں موجود تھیں۔

دور جدید کی بڑی ریاستیں جہاں ایک ایک شہر، یونان کی ریاستوں سے کہیں زیادہ آبادی رکھتا ہے، کیسے ممکن ہے کہ اصل جمہوریت کی راہ پا سکے۔

گویا دور جدید میں اس سہولت کی عدم دستیابی کی بنیاد پر نمائندہ جمہوریت اپنانے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں رہتا۔ جدید دنیا میں اس کی کئی ایک صورتیں تخلیق کی گئی ہیں مگر اس سلسلہ میں بہت سے سوال بے جواب رہتے ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ جمہوری خود مختاری...... جو آزاد معاشروں میں براہ راست جمہوریت میں شریک ہونے والے ایک فرد کو حاصل ہوتی ہے...... قابل انتقال ہے یا نہیں؟ آیا کوئی ایک فرد دوسرے کی نمائندگی ذہن و دل اور مافی الضمیر کے لحاظ سے کر سکتا ہے؟...... قدرتی بات ہے کہ یہ ناممکن نظر آتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دورِ جدید کی نمائندہ جمہوریت، دراصل بنیادی جمہوری فکر اور طبقے اور فلسفے سے انحراف کے مترادف ہے، جیسا کہ ڈیوڈ ہیلڈ (David Held) لکھتا ہے۔

... a shameful and mistaken deviation from the original idea of government by the people, for the people and through the people. **(1)**

(موجودہ جمہوری طرز حکومت دراصل غلط فہمی پر مبنی ایک شرمناک انحراف ہے، اس نظریہ سے کہ (یہ جمہوریت کی بنیاد ہے) یعنی: لوگوں کے ذریعے......لوگوں کی خاطر......لوگوں کی حکومت......)

مزید برآں یہ کہ اس کے نتیجے میں جو ادارے معرض وجود میں آتے ہیں وہ جمہوریت کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں جیسا کہ کارل مارکس نے واضح کیا تھا:

Parliaments create inacceptable barriers between the ruled and their representatives. **(2)**

پارلیمان (ایوان)، رعایا اور ان کے منتخب نمائندوں کے درمیان، ناقابل قبول، رکاوٹیں کھڑی کر دیتے ہیں

نمائندہ جمہوریت (Representative Democracy) قائم کرنے کا سب سے بڑا اور بنیادی واحد ادارہ انتخابات ہیں۔ یہ خود حقیقی جمہوری حکومت کے قیام میں سب سے پہلی اور سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں۔ وہ یوں کہ موجودہ الیکشن کے نظام میں دولت مند طبقے کے علاوہ کوئی عام آدمی منتخب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ حصہ ہی نہیں لے سکتا۔ جب یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ معاشرے میں دولت مند افراد اقلیت میں ہوتے ہیں اور عوام الناس (غرباء) اکثریت میں۔ آج کے دور میں انتخابات ایک صنعت بن چکے ہیں امیدواروں کے حق میں رائے بنانے والی کمپنیاں اور ادارے بھاری رقوم لے کر ان کا تشخص اور تاثر (Image and Impact) بناتی ہیں ظاہر ہے یہ سب کچھ عام آدمی کے بس کا کھیل نہیں۔

ایسی صورتحال میں منتخب ہونے والے ممبران ایک ایسا ادارہ اور سیاسی طبقہ وجود میں لاتے ہیں جو عوام کا نہیں بلکہ خواص کا نمائندہ ہوتا

۱۔ David Held. Models of Democracy. P.130　　۲۔ Jack Lively, Democracy: P. 62

ہے اور اس طرح یہ نمائندے اپنے مخصوص مفادات کے حصول کے لئے کوشاں ہو جاتے ہیں۔ ایسے معاشروں میں صرف سرمایہ داروں کو قوت و حاکمیت حاصل ہوتی ہے اور جمہوریت ان کی اس فوقیت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس طرح عوام الناس محروم طبقے میں تبدیل ہو کے رہ جاتے ہیں لہذا بقول برنکن (Burnkein) کے، مارکس (Marx) کا یہ تجزیہ درست ثابت ہوتا ہے کہ:

Democracy is the outcome of bourgeois capitalist society and emerges as a product of the more or less violent over throw of feudal forms of property ownership and of aristocratic political regimes. (1)

(جمہوریت، دراصل ایک سرمایہ دارانہ بورژوائی معاشرہ کی پیداوار ہے جس نے، جائیداد کی ملکیت کے، جاگیرداری نظام اور اشرافیہ کی سیاسی حاکمیت کے، پرانے نظام کی کوکھ سے جنم لیا ہے)

پسماندہ ممالک میں ان پڑھ عوام کے لئے یہ طرز حکومت سیاسی لحاظ سے ناممکن العمل اور سماجی الجھنوں کا گورکھ دھندا بن کے رہ گیا ہے کیونکہ سیاسی نظام کے عملی اظہار کے لئے تعلیم وشعور بنیادی ضرورت ہے۔ پھر نمائندگی کرنے والوں اور نمائندوں کو منتخب کرنے والوں کے لئے چونکہ کوئی تعلیمی معیار مقرر نہیں ہوتا، لہذا جمہوریت ایک جاہلوں کی حکومت (Government of the ignorant People) بن کے رہ جاتی ہے جہالت عام ہونے اور سیاسی مہارت نہ ہونے کی بنیاد پر ایسی حکومت اور عوام دونوں...... پیشہ ورانہ مہارت اور منظم نوکر شاہی کے غلبہ میں آجاتے ہیں۔

حکومت کا ایک اہم فریضہ اور کردار معاشرے میں ہم آہنگی اور یک جہتی پیدا کرنا ہوتا ہے جب کہ انتخابی جمہوریت میں پارٹی سسٹم کی وجہ سے معاشرے میں مختلف طبقات کے مفادات کا باہمی ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے۔ نا اتفاقی اور طبقاتی سبقت کا رجحان بڑھنے لگتا ہے۔ افراد معاشرہ کے درمیان اس غیر اعلان شدہ کشمکش (Undeclared Conflict) پیدا کرنے کی بنیاد پر جمہوریت پورے تمدن کے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

اسی بنیاد پر قدیم سیاسی مفکرین تھیوسی ڈائیڈز (Thucydides) افلاطون (Plato) اور ارسطو (Aristotale) اس طرز حکومت کی مخالفت، نظریاتی اور عملی، دونوں پہلوؤں سے کرتے رہے۔ گراہم ڈنکن (Duncan) کے بقول،

They found Athenian democracy, both in theory and in practice, to be vengeful, impolite in war and peace, unstabel and mean spirited in its internal affairs. 2

''وہ لوگ ایتھنز کی جمہوریت کو فکر وعمل دونوں کے لحاظ سے ایسا سمجھتے تھے کہ یہ طرز حکومت، امن و جنگ کے حوالے سے منتقم مزاج اور غیر شائستہ ہے......اور داخلی معاملات کے لحاظ سے غیر مستحکم اور ادنیٰ درجہ کے رویہ کا حامل بھی''۔

جمہوریت نے معاشروں میں انفرادی خواہشات کی حوصلہ افزائی کو ایک قانونی شکل دی ہے، جس سے افراد معاشرہ میں حرص وہوس کی مسابقت نے جنم لیا ہے۔ اجتماعی مفاد پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اس طبقاتی مسابقت میں غریب اور کمزور پس کے رہ گیا ہے۔

اس تجزیے سے یہ اہم بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جن مقاصد اور آئیڈیلز کو سامنے رکھ کے جدید جمہوریت کو فروغ دیا گیا تھا۔ دراصل وہ ایسے میکنزم کا منطقی نتیجہ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ گویا یہ ان مقاصد کے حصول کا موزوں ذریعہ ہی ثابت نہیں ہوئی۔ ڈیماکریسی جو کچھ پیدا کر سکتی

۱۔ John Burnkein, Is Democracy Possible, P:156

۲۔ Graem Duncan. Democratic Theory and Pratctice. P. 13

تھی وہ کرچکی اور جو کچھ اس کے ذریعے حاصل ہوا ہے وہ ان آئیڈیلز کے ساتھ میل نہیں کھاتا جو عوام کی حکومت کے دلکش نعرے میں مضمر تھے۔

اس پر ستم یہ ہے کہ آج مشرق ومغرب میں جمہوریت کو ایک مقدس گائے (Sacrosanct) کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اس کی خامیاں تلاش کرنا غیر ضروری اور ناجائز سمجھا جاتا ہے اور اس کی خوبیوں کے بارے میں سوال کرنے کو غیر جمہوری رویہ، گردانا جاتا ہے۔

جمہوریت کی اس دلکشی اور پسندیدگی کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ تأثر قائم کرنے میں کامیاب ٹھہری ہے کہ اس نے ایک مخصوص مراعات یافتہ طبقے کی حکومت میں، عوام الناس کی قابل ذکر تعداد کو کسی حد تک شامل کرلیا ہے۔

گویا جمہوریت کے ہوتے ہوئے عوام الناس اس حقیقی مغالطے میں رضا کارانہ گرفتار رہتے ہیں کہ وہ بھی حکومت میں شامل ہیں۔ اور جمہوری میکنزم کی غلام گردشوں میں سے گزرتے ہوئے، اس سراب کا تعاقب کرتے رہتے ہیں۔ جمہوریت کا یہ ادھوراپن، ایسا مستقل نقص ہے جو اس کی بنیادوں کے ساتھ وابستہ ہے وہ مقاصد جو بذریعہ جمہوریت حاصل ہونے چاہیں وہ دراصل خود جمہوریت کے ارتقاء کیلئے بطور خام مال درکار ہوتے ہیں۔

فصل پنجم

آمرانہ طرزِ قیادت کے اثرات

زمانہ قدیم کی مطلق العنان بادشاہی اور جمہوریت کے مجوعہ کا نام آمریت ہے۔اس لئے یہ دونوں کے مصائب کی حامل ہے۔ بادشاہی کے مصائب کا اقرار تو اب ہر شخص کو ہے۔حیرت ان مدعیان عقل ودانش پر ہے جو ایک طرف آمریت کے ایسے مہمل نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں۔اور دوسری طرف اس بات کے دعویدار ہیں کہ ہم انسانیت کی قدر وقیمت پہنچانتے ہیں۔اس سے بڑھ کر انسانیت کی توہین اور کیا ہوسکتی ہے کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی جماعت خود اپنے ہی جیسے ایک انسان کے ہاتھ میں اپنی زندگی کی باگ ڈور تھما دے۔

لغت میں آمر کی جو تعریف آتی ہے وہ یوں ہے کہ حاکم، حکم دینے والا، جب کہ اصطلاحی طور پر آمر سے مراد ڈکٹیٹر ہے ڈکٹیٹر کی تعریف یہ ہے کہ وہ مطلق العنان حاکم جس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون ہے، اگرچہ آمر اور ڈکٹیٹر میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا۔تاہم غور کریں تو ہر شخص جو حکم دیتا ہے آمر تو کہلا سکتا ہے مگر ڈکٹیٹر نہیں ہوسکتا۔کیونکہ ڈکٹیٹر ایک طرح سے مطلق العنان حاکم جو خدائی اختیار رکھنے کے زعم میں مبتلا ہوتا ہے اس لیے وہ ایک آمر سے ممتاز نظر آتا ہے۔[1]

چونکہ آمریت عقل وفطرت کے خلاف چیز ہے اس لئے یہ کبھی معمولی حالت میں نہیں پیدا ہوتی۔بلکہ ان غیر معمولی حالات میں پیدا ہوتی ہے جب مصائب کے کسی شدید حملہ نے کسی قوم کے دماغی توازن کو بگاڑ دیا ہو۔ایسے موقع پر اگر کوئی ہوشیار آدمی موجود ہوتا ہے تو وہ قوم کی بدحواسی سے فائدہ اٹھا کر عام جذبات میں اشتعال پیدا کرتا ہے۔امیدوں کے سبز باغ دکھاتا ہے اور اس طرح ان کی توجیہات کو اپنے اوپر مرکوز کر کے آمرانہ اقتدار حاصل کر لیتا ہے۔اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر قوم کے حواس بجا ہو گئے اور اسے سوچنے کی مہلت مل گئی تو اس کی امارت ختم ہو جائے گی۔یہی وجہ ہے کہ ہر آمر اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے پیہم ہیجان انگیز کاروائیاں کرتا رہتا ہے۔تاکہ اس کی قوم کو کبھی سکون قلب کے ساتھ غور وفکر کا موقع ہی نہ ملے۔[2] یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کل ڈکٹیٹروں کی تاریخ خونریزیوں اور جنگ آزمائیوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔اس کا نتیجہ علاوہ خونریزی، بدامنی اور بےاطمینانی کے یہ بھی ہوتا ہے۔کہ سوسائٹی میں عقل سلیم کی نشوونما رک جاتی ہے۔اور لوگوں میں اس کی صلاحیت ہی نہیں رہتی کہ معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور فکر کر سکیں۔ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جماعت کی فکر ہی نہیں بلکہ اخلاقی زندگی بھی تباہ وبرباد ہو جاتی ہے۔اس کے علاوہ نظام آمریت میں جماعت کا اخلاق شخصی اخلاق کے تابع ہو کر شخصی ہو جاتا ہے اور اس میں صرف آمر کی زندگی کا نمایاں خلق غالب ہو جاتا ہے۔حالانکہ تمدن کے قیام اور مزاج تہذیب کی بقا کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف اشخاص کے مختلف اخلاق واوصاف عالیہ جماعت میں نشوونما پاتے رہیں تاکہ جماعت کا اجتماعی مزاج اعتدال سے تجاوز نہ کر جائے، جماعت زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر سکے اور اس کا کیریکٹر یک طرفہ ہو کر نہ رہ جائے۔تاریخ شاہد ہے کہ آمریت جماعت کو جس سرعت کے ساتھ ایک ناپائیدار ظاہری ترقی کی طرف لے جاتی ہے اس سے دس گنا زیادہ سرعت کے ساتھ وہ اس کو تنزل وادبار کی طرف لے جاتی ہے۔اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ جماعت کے اجتماعی مزاج کو غیر معتدل بنا کر اس کی اخلاقی وفکری بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے اسلئے اس کی ترقی ہی اس کے تنزل وادبار کا سبب بن جاتی ہے۔بلکہ درحقیقت اس کی ترقی وتنزل بصورت ترقی ہوتی ہے۔اور اس کا عروج بالکل اس سرخی کی طرح ہوتا ہے جو دق کے مریض کے چہرے پر نمایاں ہو جاتی ہے اور تیمار دار کو افزائش قوت وتندرستی کا فریب دیتی ہے۔

---

[1] سید محمد ظفر: ڈکٹیٹر کون؟ ص۔۱۱　[2] سید محمد ظفر: ڈکٹیٹر کون؟: ص۔۱۳

مزید یہ کہ آمر ہمیشہ ایسے افراد کو ابھرنے سے روکتا رہتا ہے جو اپنی قابلیت کی وجہ سے اس کے مدمقابل ہو سکتے ہیں اس طرح ایک طرف تو افراد میں اپنی فطری قوتوں کو نشو ونما دینے کا جذبہ دب جاتا ہے اور دوسری طرف جماعت ایسے اشخاص کی اعلیٰ صلاحیتوں کے فوائد سے محروم رہتی ہے اس کے علاوہ آمر کا عزم اصولی نہیں ہوتا ہے بلکہ جذباتی ہوتا ہے اس لئے آمریت میں نظام عدل کا قیام ناممکن ہو جاتا ہے۔ لوگ آمر کے زیر سایہ رہنے سے زیادہ موت کو ترجیح دیتے ہیں۔

"Millions of free men feel, as strongly as ever, that they would perfer death to submission to "dictatorial" domination. 1

آزادی قانون کا جوہر ہے قانون اگر آزاد نہ ہو تو اس کا صحیح فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ قانون سازی اور نفاذ قانون دونوں امور کا ایک شخص کے ہاتھ میں ہونا قانون کی آزادی وغیر جانبداری کا گلہ گھونٹ دیتا ہے۔ قانون نافذ کرنے والا جب قانون وضع کرتا ہے تو اس میں اپنے صالح اور اپنی سہولتوں کا زیادہ لحاظ رکھتا ہے جس سے اکثر اوقات عدل وانصاف کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔

اس طریق کار میں سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اس کی کوئی عقلی اور اخلاقی بنیادی نہیں ہے۔ سوائے طاقت اور قوت کے اور کیا چیز ہے جو ایک فرد کے انفرادی ارادے کو ایک جماعت پر مسلط کر دینے کو حق بجانب قرار دے سکتی ہے۔ ۲

کسی بھی معاشرے کے انتظامی خدوخال پر نگاہ ڈالنے سے اس معاشرے کی اصل حیثیت اور اس قوم کی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جو اس معاشرے کی تار و پود ہوتی ہے۔ حکیم امت کے الفاظ میں:

محفل نظمِ حکومت چہرۂ زیبائے قوم

کارل مارکس، لینن، سٹالن اور دوسرے اشتراکی قائدین کی تحریروں اور تقریروں سے عیاں ہے کہ ان کا نصب العین بزور شمشیر محنت کشوں کی آمریت قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ایک ایسی آمریت کا قیام جو سرمایہ دار طبقے کو روند ڈالے اور مزدوروں کو ان پر مسلط کر دے۔ لینن کے قول کے مطابق:

''مارکس کے یہ الفاظ ہمیں کیا بتاتے ہیں یہی کہ ایک انقلابی حکومت کو آمرانہ اقدامات کرنے چاہیں اور اس آمریت کا کام یہ ہے کہ پرانی روایات کی یادوں کی نیست و نابود کر دے'' ۳

لینن مزید کہتا ہے:

''قوموں کی زندگی میں بڑے بڑے مسائل صرف طاقت سے ہی حل کیے جاتے ہیں'' ۴

سچ تو یہ ہے کہ اشتراکی معاشرہ بغیر آمریت کے چل ہی نہیں سکتا کیونکہ کسی اخلاقی ضابطے کا وجود سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا جاتا، دین اشتراکی نظر میں ایک لایعنی نظریہ ہے جو صرف لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کی ایجاد ہے اس لئے آخرت، جزا اور سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اشتراکی مفکرین اور مصلحین کے پاس صرف ایک ہی حربہ رہ جاتا ہے اور وہ ہے طاقت۔ چنانچہ ان کے نزدیک ہر مسئلہ قوت بازو سے ہی حل کیا جا سکتا ہے اور اس شخص کی منشاء کے عین مطابق جس کے ہاتھ میں مضبوط ڈنڈا ہو۔

سوویت یونین میں اصل اقتدار کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھ میں ہے انتخابات میں کوئی ایسا شخص بطور امیدوار کھڑا نہیں ہو سکتا جو کمیونسٹ

۱۔ E.E. Kellet. The Story of Dictatorship, P:209

۲۔ E.E. Kellet. The story of Dictatoriship, P. 19

۳۔ V.I. Lenin: Selected Works Vol. 1, P. 558

۴۔ Ibid: P. 559

پارٹی کارکن نہ ہو اور ماسوائے کمیونسٹ پارٹی کے ملک میں اور کوئی دوسری سیاسی پارٹی نہیں ہے۔ امیدوار کا انتخاب کمیونسٹ پارٹی کرتی ہے اور انتخاب لڑنے کے لئے صرف ایک ہی امیدوار میدان میں ہوتا ہے جو کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے نامزد کیا جاتا ہے۔ اس کا کوئی مدمقابل نہیں ہوتا۔ رائے دھندگان کا صرف یہی کام ہوتا ہے کہ وہ اسی واحد امیدوار کے حق میں ووٹ ڈالیں۔

اس طرح سوویٹ یونین میں آزادی تحریر وتقریر کسی کو بھی حاصل نہیں مگر صرف ان کو جو اپنی تحریر وتقریر میں کمیونسٹ پارٹی کے نظریات کی ترویج اور اشاعت کرتے ہیں۔ حصول علم کے ذرائع، ریڈیو، سینما اور پریس کا استعمال بھی صرف انہی مقاصد کے لئے ہوتا ہے حتیٰ کہ چرچ بھی کمیونسٹ نظریات پھیلانے پر مجبور ہوتا ہے۔

ایک دفعہ 'پراوڈا' نے جو حکومت کا اخبار ہے لکھا۔

بزدل سرمایہ داروں اور انقلاب کی مخالف پریس کا سوویٹ ملک میں ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ جو شخص بھی سوشلسٹ حکومت کا تختہ الٹنا چاہے اور لوگوں کی سماجی جائیداد کو نقصان پہنچانا چاہے وہ عوام کا دشمن ہے اسے سوویٹ یونین میں اپنے ناپاک ارادے کی تکمیل کے لیے کاغذ کا ایک پرزہ تک نہیں ملے گا اور نہ وہ کسی طبع خانے کے دروازے کے اندر داخل ہو سکے گا۔ اسے کوئی ہال یا کمرہ یا کوئی ایسا کونہ نہیں ملے گا جہاں سے وہ اپنے مسموم جذبات کا اظہار کر سکے۔[1]

آمریت میں پارٹی کی ساری قوت لیڈروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور لیڈروں کے نظریات کو عملی جامہ پہنانا اراکین کا فرض ہوتا ہے عام اراکین کا پارٹی کے پروگرام یا پالیسی بنانے میں کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔ جمہوریت وآمریت کا مقابلہ کرتے ہوئے مولانا شبلی نعمانیؒ اپنی مایہ ناز کتاب 'الفاروق' میں اس طرح رقم طراز ہیں:

''جمہوری وشخصی طرز حکومت میں جو چیز سب سے بڑھ کر مابہ الامتیاز ہے وہ عوام کی مداخلت اور عدم مداخلت ہے یعنی حکومت میں جس قدر رعایا کو دخل دینے کا حق ہوگا اسی قدر اس میں جمہوریت کا عنصر زیادہ ہوگا۔ یہاں تک کہ سلطنت جمہوری کی آخیر حد یہ ہے کہ مسند نشین حکومت کے ذاتی اختیارات بالکل فنا ہو جائیں اور وہ جماعت کا ایک رکن ہی رہ جائے برخلاف اس کے شخصی سلطنت میں تمام دارومدار صرف ایک شخص پر ہوتا ہے۔ اس بنا پر شخصی سلطنت سے درج ذیل اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔

(i) بجائے اس کے کہ ملک کے تمام قابل اشخاص کی قابلیتیں کام میں آئیں صرف چند ارکان سلطنت کی عقل وتدبیر پر کام چلتا ہے۔

(ii) چونکہ بجز چند عہدہ داروں کے اور لوگوں کو ملکی انتظامات سے کچھ سروکار نہیں ہوتا اس لئے قوم کے اکثر افراد سے انتظامی قوت اور قابلیت رفتہ رفتہ معدوم ہونے لگتی ہے۔

(iii) مختلف جماعتوں اور فرقوں کے خاص حقوق کی اچھی طرح حفاظت نہیں کرتی کیونکہ جن لوگوں کو ان حقوق سے غرض ہے ان کو انتظام سلطنت میں دخل نہیں ہوتا اور جن لوگوں کو دخل ہوتا ہے ان کو غیروں کے حقوق سے اس قدر ہمدردی نہیں ہو سکتی جتنی خود ارباب حقوق کو ہو سکتی ہے۔

(iv) چونکہ بجز چند ارکان سلطنت کے کوئی شخص بھی ملکی اور قومی کاموں میں دخل دینے کا مجاز نہیں ہوتا اس لئے قوم میں ذاتی اغراض کے سوا قومی کاموں کا مذاق معدوم ہو جاتا ہے۔

یہ نتائج شخصی سلطنت کے لوازم ہیں اور کبھی اس سے جدا نہیں ہو سکتے۔ برخلاف اس کے جمہوری سلطنت میں اس کے برعکس نتائج ہوں گے۔ اس بنا پر جس سلطنت کی نسبت جمہوری وشخصی کی بحث ہو اس نوعیت کا اندازہ نتائج سے بھی کیا جا سکتا ہے۔[2]

---

[1] Modern. Govt. P. 320، (بحوالہ مقالات علمی)　[2] الفاروق؛ ص۔۱۸۸

اسلام میں آمریت کے لئے کوئی گنجائش نہیں ۔خلیفۃ المسلمین بھی عام مسلمانوں میں سے ہوتا ہے اوران جیسے حقوق رکھتا ہے خلافت کی وجہ سے وہ ہمراہیوں میں سے ممیّز وممتاز نہیں ہوتا۔رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی منصب نبوت کے لحاظ سے سب سے بالاتر تھی لیکن اس کے باوجود آپ نے کبھی اپنے ہمرایوں پر برتری وفوقیت کا اظہار نہیں فرمایا یہی طریقہ آپ کے خلفاء کا تھا۔

دمشق کی فتح کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے دمشق کا سفر فرمایا۔آپ کے پاس ایک اونٹنی تھی اور ایک غلام ہمراہ تھا۔خلیفۃ المسلمین اور ان کا غلام باری باری اونٹنی پر سوار ہوتے تھے۔ جب منزل مقصود قریب تھی تو اونٹنی پر سوار ہونے کے باری غلام کی تھی ۔اس نے عرض کیا کہ آپ ہی اونٹنی پر سوار رہیں کیونکہ اب منزل قریب ہے کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا۔آپ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں ، میں تمہیں تمہارے حق سے محروم کرنا نہیں چاہتا۔چنانچہ جب آپ منزل مقصود پر پہنچے تو غلام اونٹنی پر سوار تھا اور آپ مہار کھینچ رہے تھے۔

خلیفۃ المسلمین کو عوام پر اپنی مرضی ٹھونسنے کا اختیار نہیں تھا حتیٰ کہ رسول اکرم ﷺ نے بعض اوقات اگر کوئی ہدایت فرمائی تو لوگوں نے ان سے پوچھا کہ یہ اللہ کا حکم ہے یا آپ کی رائے۔اور جب آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ میری اپنی رائے ہے تو لوگ اس پر عمل کرنے پر اپنے آپ کو پابند نہیں پاتے تھے۔

درحقیقت قرآن وسنت ہی احکامات اور ہدایات کا سرچشمہ تھے۔خلیفہ کی ذاتی خواہش سے ایسا نہیں ہوتا تھا۔حتیٰ کہ باہمی مشورہ کسی آمریت کی قطعی نفی کر دیتا ہے۔

رسول پاک ﷺ کی ذات گرامی کے متعلق تو قرآن مجید شاہد ہے۔

وما ینطق عن الھویٰ ۔ ان ھو الا وحیٌ یوحیٰ[1]

''وہ اپنی خواہش سے لب کشائی نہیں کرتے مگر وہ وحی جو ان کی طرف بھیجی گئی ہوتی ہے (وہی بیان کرتے ہیں)''

خلفائے راشدین کاروبار مملکت میں کبھی انا اور ضد کے کام نہیں لیتے تھے اور نہ ہی اپنی ذات کو اپنے منصب کی وجہ سے عام لوگوں سے برتر سمجھتے تھے۔حتیٰ کہ اگر خلیفۃ المسلمین دوسرے لوگوں میں مل کر بیٹھے ہوتے تو ناواقف آدمی کے لئے یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے خلیفۃ المسلمین کون سے ہیں۔

دور جدید میں آمر کے اختیار کا دائرہ قرون وسطیٰ کے مقابلہ میں بہت زیادہ وسیع ہے ملک کے سارے معاشی ذرائع فرد واحد کے ہاتھ میں ہوتے ہیں عدالتیں ، پریس اور مسلح افواج اسی کے اقتدار کی محافظ اور پاسبان ہیں۔نظام تعلیم اسی کی چاکری اور خدمت گزاری کے لئے لوگوں کے ذہنوں کو ڈھالتا ہے۔

اس نظام میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں۔کسی قسم کی اخلاقی پابندی کو قبول نہیں کیا جاتا ،شائستگی اور اچھائی کا نام ونشان نہیں ملتا۔

---

[1] النجم،۵۳/۳۔۴

چوتھا باب

مقاصد ومصالح

کا اجمالی جائزہ

فصل اول

اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہے جس کا نصب العین عوام کی انفرادی و اجتماعی بہبود ہے یہ بہبود محض دنیاوی ساز و سامان کی حد تک ہی نہیں بلکہ اس میں اُخروی زندگی کی فلاح بھی شامل ہے۔

علامہ شاطبی لکھتے ہیں:

> ''فرد کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے بندوں کے درمیان اپنی طاقت اور استعداد کے مطابق خلیفۃ اللہ کی ہے۔ جب کہ ایک فرد اتنی استعداد بھی نہیں رکھتا کہ وہ اپنے ذاتی حالات اور اپنے اہل و عیال کے مصالح کی نگرانی ہی کر سکے کجا یہ کہ پورے قبیلے یا تمام بنی نوع انسان کے مصالح کا تحفظ کر سکے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مشترک انسانی ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری اجتماعی سیاست پر ڈالی ہے۔ اسی بناء پر زمین میں ریاست کا قیام عمل میں آیا'' [۱]

شریعت اسلامی میں کوئی معاملہ ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں شریعت انسان کی رہنمائی نہ کرتی ہو۔ اس میں عبادات اخلاق اور عقائد کے پہلو بہ پہلو افراد اور جماعتوں کے باہمی تعلقات کی درستی اور اصلاح کے لئے بھی احکام ملتے ہیں۔ ان احکام کو لوگ انفرادی طور پر نافذ کرنا چاہیں تو ناممکن ہے۔ اس کے لئے ایسی قیادت کا ہونا ضروری ہے جس کو افراد پر اقتدار اور غلبہ ہو۔ امام ابن تیمیہ نے اپنے اس قول میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے۔

> ''انسانوں کے معاملات کی تنظیم دین کے سب سے بڑے واجبات میں سے ہے بلکہ خود دین کا قیام بھی اسی طرح ممکن ہے اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور مظلوم کی امداد کا جو حکم دیا ہے۔ اور وہ تمام احکام جو جہاد، عدل اور حدود اللہ کے قیام سے متعلق ہیں ان پر قوت اور امارت کے بغیر عمل کرنا ممکن نہیں ہے'' [۲]

الف) دینی و دنیوی مصالح کے حصول کا ذریعہ

اسلامی ریاست اسلامی عقیدے اور اصول و احکام کی اساس پر وجود میں آتی ہے یہ کوئی محدود علاقائی ریاست نہیں ہے جو مخصوص جغرافیائی سرحدوں کی پابند ہو اور نہ یہ محدود معنوں میں کوئی نسلی ریاست ہے جو کسی خاص قوم یا نسل پر مشتمل ہوتی ہے بلکہ یہ اپنے نظریے کی طرح وسیع اور لامحدود ہوتی ہے اس کے ساتھ ساتھ پھیلتی چلی جاتی ہے۔ جہاں تک اسلامی ریاست کے مقاصد کا تعلق ہے تو وہ اس کے بنیادی مزاج کا منطقی نتیجہ ہیں۔ جو اسلام کے مقاصد کا عکس ہیں۔ انہی مقاصد کا حصول اسلامی قیادت کی ذمہ داری ہے۔ اس کا مقصد قیام امن اور افراد انسانی کے لئے فلاح و اطمینان کا حصول ہی نہیں اور نہ ہی فقط ان کی جان کی حفاظت اور انہیں ظلم و زیادتی سے بچانا ہے بلکہ ریاست کے تمام اعمال و دوائر میں اسلامی احکام کی تقلید اور دنیا بھر میں دعوت اسلامی کی تبلیغ کو بھی لازمی خیال کرتی ہے۔ ایسا کرنا اس کے بنیادی مقاصد میں شامل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

الذین ان مکنٰهم فی الارض اقاموا الصلوٰة واتواالزکوٰة و امروا بالمعروف ونهوا عن المنکر ولله عاقبة الامور [۳]

''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع

---

[۱] الموافقات فی اصول الشریعہ، ۲/ ۲۷۷　[۲] السیاسۃ الشرعیہ، ص: ۱۷۲-۱۷۳　[۳] الحج، ۲۲/ ۴۱

کریں گے اور تمام معاملات انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہیں''

اس آیت میں قیادت کے ضمن میں جن پانچ باتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ نماز کا نظام قائم کریں گے اور اسی طرح دوسری عبادات کا اہتمام بھی کریں گے۔

۲۔ زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے اور اس طرح اسلام کے پورے معاشی نظام کو قائم کریں گے۔

۳۔ اس قیادت کے تمام اقدام نیکیوں کو فروغ دینے کے لئے ہوں گے۔

۴۔ تمام اقدام برائیوں کو مٹانے کے لیے ہوں گے۔

۵۔ اگر اقتدار ذاتی اغراض کے لئے، نیکیوں کو مٹانے اور برائیوں کو پھیلانے کے لئے استعمال کیا تو اس کے برے نتائج ان کو خود بھگتنے ہوں گے۔ اس لئے ''وللہ عاقبۃ الامور'' کہہ کر فرمادیا کہ تمام معاملات کا فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہوگا۔

اسلامی قیادت دینی و دینوی مصالح کے حصول کا ذریعہ ہے۔ ان فرائض کو قرآن نے بہت واضح انداز میں بیان فرمایا ہے۔ ظاہر ہے کہ نظام صلوٰۃ کا قیام ایک مخصوص نوعیت کے ماحول اور معاشرے کے ایک خاص کردار کی تشکیل کا مطالبہ کرتا ہے اور ریاست کے اس فرض کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ لوگوں کو خدا کی عبادت کے قابل بنانا ریاست کا فرض ہے زکوٰۃ کی فراہمی اور اس کی تقسیم کا کام بھی ایک مخصوص طرز کا معاشی نظام ہی کرسکتا ہے اس نظام میں مساکین، مقروض اور اہل حاجت لوگوں کا خون چوسنے کی بجائے ان کی دستگیری کا تصور موجود ہے۔

اس آیت سے قبل آیت نمبر ۴۰ میں کہا گیا ہے کہ جن لوگوں پر ظلم کیا گیا ہے اور وہ اپنے گھروں سے نکالے گئے ہیں ان کو اب ظالموں کے خلاف لڑنے کی اجازت ہے اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔

> ابن جریرؒ فرماتے ہیں: ''ان لوگوں سے مراد اصحاب رسولؐ ہیں اور معروف کا حکم دینے سے مراد توحید اور احکام خداوندی کی اطاعت کا حکم دینا ہے اور نہی عن المنکر سے مراد شرک اور اللہ کی نافرمانی کے کاموں سے روکنا ہے''۔[۱]

امام قرطبیؒ لکھتے ہیں

> ''ابن عباسؓ کا قول ہے کہ اس آیت کا مصداق اول مہاجرین وانصار ہیں لیکن وہ لوگ بھی اس کے مصداق ہیں جو اخلاص کے ساتھ ان کی تابعداری کرتے ہوں۔ ابوالعالیہ، ضحاک اور ابن ابی نجیح فرماتے ہیں کہ اس آیت میں حکمرانوں کے لیے ہدایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ ان کو ملک اور سلطنت عطا فرمادیں تو وہ اپنے اقتدار میں یہ کام کریں گے جو خلفائے راشدین نے کئے تھے''[۲]

مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں

> ''اللہ کے مددگار اور اس کی تائید ونصرت کے مستحق لوگوں کی صفات یہ ہیں کہ اگر دنیا میں انہیں حکومت وفرمانروائی بخشی جائے تو ان کا ذاتی کردار فسق و فجور اور کبر و غرور کے بجائے اقامت صلوٰۃ ہو۔ ان کی دولت عیاشیوں اور نفس پرستیوں کے بجائے ایتائے زکوٰۃ میں صرف ہو۔ ان کی حکومت نیکی کو دبانے کی بجائے اسے فروغ دینے کی خدمت انجام دے۔ اور ان کی طاقت بدیوں کو پھیلانے کی بجائے ان کے دبانے میں استعمال ہو'' [۳]

---

۱ تفسیر ابن جریر، ۱۷/ ۱۷۸   ۲ قرطبی: تفسیر، ۱۲/ ۷۳   ۳ تفہیم القرآن، ۳/ ۲۳۴

اس ایک فقرے میں اسلامی قیادت کے مقصد 'نصب العین' اور اس کے کارکنوں اور فرمانرواؤں کی خصوصیات کا جوہر نکال کر رکھ دیا گیا ہے۔ اور یہ کہ اختیار دراصل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اس کی طاقت ایک ذرا سے بیج کو تناور درخت بنا دیتی ہے اور ایک تناور درخت کو مٹی میں تبدیل کر دیتی ہے اسی کو یہ قدرت حاصل ہے کہ متکبر اور مغرور لوگ جو اپنے دبدبے پر نازاں ہیں انہیں ایسا گرائے کہ دنیا کے لئے نمونہ عبرت بنا دے اور جنہیں دیکھ کر کوئی گمان بھی نہ کر سکتا ہو کہ یہ کبھی اٹھ سکیں گے انہیں ایسا بلند کرے کہ دنیا میں ان کی عظمت و بزرگی کے ڈنکے بج جائیں۔

اسلامی ریاست میں حکمران اور اس کی حکومت کا اولین فریضہ یہ قرار دیا گیا کہ وہ اسلامی نظام زندگی کو کسی رد و بدل کے بغیر جوں کا توں قائم کرے اور اسلام کے معیار اخلاق کے مطابق بھلائیوں کو فروغ دے' اور برائیوں کو مٹائے۔ اور یہی قرآن کی رو سے امت مسلمہ کا مقصد وجود بھی ہے۔

وکذالك جعلناکم امة وسطالتکونوا شهداء علیٰ الناس ویکون الرسول علیکم شهیداً۱

''اور اس طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت (راہ اعتدال پر قائم رہنے والی امت) بنا دیا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ''

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنکر و تومنون بالله ۲

''تم وہ بہترین امت ہو، جسے لوگوں کی (اصلاح و ہدایت) کے لئے نکالا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو، اللہ پر ایمان لاتے ہو''

جس کام پر محمد ﷺ اور آپؐ سے پہلے کے تمام انبیاء مامور تھے وہ قرآن مجید کی رو سے یہ تھا کہ:

ان اقیمواالدین ولاتتفرقوا فیه ۳

''دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ''

غیر مسلم دنیا کے مقابلے میں آپؐ کی ساری جدوجہد صرف اس غرض کے لئے تھی کہ

یکون الدین کله لله ۴

''دین پورا کا پورا صرف اللہ کے لئے ہو جائے''

اور تمام انبیاء کی امتوں کی طرح آپؐ کی امت کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کا حکم یہ تھا کہ:

لیعبدوا الله مخلصین له الدین حنفآء ۵

''وہ یکسو ہو کر اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے''

اس لئے آپؐ کی قائم کردہ ریاست کا اصل کام ہی یہ تھا کہ دین کے پورے نظام کو قائم کرے اور اس کے اندر کوئی ایسی آمیزش نہ ہونے دے جو مسلم معاشرے میں دورنگی پیدا کرنے والی ہو۔ اس آخری نکتے کے بارے میں نبی ﷺ نے اپنے اصحاب اور جانشینوں کو سختی کے ساتھ متنبہ فرمادیا کہ:

من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهورد۶

''جو شخص ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات نکالے جو اس کی جنس سے نہ ہو اس کی بات مردود ہے''

---

۱ البقرہ، ۲/۱۴۳　۲ ال عمران، ۳/۱۱۰　۳ الشوریٰ، ۴۲/۱۳　۴ الانفال، ۸/۳۹
۵ البینہ، ۹۸/۵　۶ مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنہ، ۱/۲۱۵

ایاکم ومحدثات الامور فان کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة[۱]

''خبردار! نرالی باتوں سے بچنا، کیونکہ ہر نرالی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی''

و شر الامور محدثاتها و کل بدعة ضلالة[۲]

''برا معاملہ نرالی باتیں ہیں اور ہر نئی بات گمراہی ہے''

اسی سلسلے میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد بھی ہمیں ملتا ہے کہ میری امت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی۔

لا یجمع امتی أو قال امة محمد علی ضلالةٍ و ید الله علی الجماعة و من شذ شذ فی النار[۳]

''میری امت یا محمد کی امت گمراہی پر جمع نہیں ہوسکتی اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہے اور جو کوئی گرا وہ آگ میں جا پڑا''

اللہ تعالیٰ سورہ نور میں فرماتا ہے

وعد الله الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم ولیمکنن لهم دینهم الذی ارتضیٰ لهم ولیبدلنهم من بعد خوفهم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً و من کفر بعد ذالك فاولٰئك هم الفاسقون[۴]

''وعدہ کرلیا اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ انہوں نے نیک عمل کیے کہ ان کو خلافت دے گا زمین میں جیسا کہ خلافت دی تھی ان لوگوں کو جو پہلے گزر چکے ہیں اور مضبوط کردے گا ان کے لئے اس دین کو جسے اس نے پسند کیا ان کے لئے اور دے دے گا ان کو خوف کے بدلے میں امن پس وہ میری بندگی کریں گے شریک نہ کریں گے میرے ساتھ کسی کو اور جو کوئی ناشکری کرے گا اس کے بعد تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں''۔

اس آیت میں پانچ چیزوں کا وعدہ کیا گیا ہے:

۱۔ مومنین صالحین کو زمین کی خلافت اور سیاسی قیادت دی جائے گی۔

۲۔ دین اسلام کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرے گا اور اس کو غالب کیا جائے گا۔

۳۔ مسلمانوں کو اتنی قوت اور شوکت دی جائے گی کہ ان کو دشمنوں کا کوئی خوف نہیں رہے گا۔

۴۔ اس خلافت وحکومت میں لوگ خدا ہی کی بندگی کریں گے اور شرک کا نظام ختم ہوجائے گا۔

۵۔ جو لوگ اس خلافت کی ناشکری کریں گے اور بغاوت کریں گے۔ وہ فاسق سمجھے جائیں گے۔

اس آیت کریمہ سے صاف اور واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست خدا کی نعمت ہے اس کے بغیر صرف تبلیغ وتعلیم سے نہ دین غالب ہوسکتا ہے اور نہ امن وامان قائم ہوسکتا ہے اور نہ ہی شرک کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔

قاضی ابوبکر بن العربیؒ فرماتے ہیں

''علماء دین نے کہا ہے کہ یہ آیت چاروں خلفاء کی خلافت کے حق ہونے کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خلیفہ بنایا تھا اور ان کی امانت، دیانت کو پسند فرمایا تھا۔ یہ حضرات خدا کے پسندیدہ دین پر

۱۔ مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، ۲۴۳/۱	۲۔ مشکوٰۃ: باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، ۲۱۶/۱

۳۔ مشکوٰۃ: باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، ۲۴۹/۱	۴۔ النور، ۵۵/۲۴

قائم رہے تھے فضیلت میں آج تک ان سے کوئی آگے نہیں بڑھ سکا۔ یہ مسلمانوں کی سیاسی قیادت پر قائم رہے تھے۔ اور شوکت اسلام کا دفاع کرتے رہے تھے اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ انہی کے دور میں پورا ہوا تھا۔ اگر یہ وعدہ ان کے بارے میں نہیں ہے اور ان کے زمانے میں پورا نہیں ہوا تو پھر اس کے اہل کون لوگ ہوں گے''۔[1]

مولانا مودودیؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں

قرآن دراصل خلافت اور استخلاف کو تین مختلف معنوں میں استعمال کرتا ہے اور ہر جگہ سیاق وسباق سے پتہ چل جاتا ہے کہ کہاں کس معنی میں یہ لفظ بولا گیا ہے:

اس کے ایک معنی ''خدا کے دیئے ہوئے اختیارات کا حامل ہونا'' اس معنی میں پوری اولاد آدم زمین میں خلیفہ ہے۔ دوسرے معنی ہیں ''خدا کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے امر شرعی (نہ کہ محض امر تکوینی) کے تحت اختیارات خلافت کو استعمال کرنا'' اس معنی میں صرف مومن صالح ہی خلیفہ قرار پاتا ہے کیونکہ وہ صحیح طور پر خلافت کا حق ادا کرتا ہے اور اس کے برعکس کافر وفاسق خلیفہ نہیں بلکہ باغی ہے کیونکہ وہ مالک کے ملک میں کسی کے دیئے ہوئے اختیارات کو نافرمانی کے طریقے پر استعمال کرتا ہے۔

تیسرے معنی ہیں ''ایک دور کی غالب قوم کے بعد دوسری قوم کا اس جگہ لینا'' پہلے دونوں معنی خلافت' بمعنی ''نیابت'' سے ماخوذ ہیں، اور یہ آخری معنی خلافت' بمعنی ''جانشینی'' سے ماخوذ اور اس لفظ کے یہ دونوں معنی لغت عرب میں معلوم ومعروف ہیں۔[2]

اب جو شخص بھی یہاں اس سیاق وسباق میں آیت استخلاف کو پڑھے گا وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس امر میں شک نہیں کرسکتا۔ کہ اس جگہ خلافت کا لفظ اس حکومت کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو اللہ کے امر شرعی کے مطابق اس کی نیابت کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کرنے والی ہو۔ اس لیے کفار تو درکنار، اسلام کا دعویٰ کرنے والے منافقوں تک کو اس وعدے میں شریک کرنے سے انکار کیا جارہا ہے۔ اسی لئے فرمایا جارہا ہے کہ اس کے مستحق صرف ایمان اور عمل صالح کی صفات سے متصف لوگ ہیں۔ اسی لئے قیام خلافت کا ثمرہ یہ بتایا جارہا ہے کہ اللہ کا پسند کردہ دین، یعنی اسلام، مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے گا۔ اور اسی لئے اس انعام کو عطا کرنے کی شرط یہ بتائی جارہی ہے کہ خالص اللہ کی بندگی پر قائم رہو جس میں شرک کی ذرہ برابر آمیزش نہ ہونے پائے۔

اس جگہ ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ یہ وعدہ بعد کے مسلمانوں کو تو بالواسطہ پہنچتا ہے۔ بلا واسطہ اس کے مخاطب وہ لوگ تھے جو نبیؐ کے عہد میں موجود تھے۔ وعدہ جب کیا گیا تھا اس وقت واقعی مسلمانوں پر حالت خوف طاری تھی اور دین اسلام نے ابھی حجاز کی زمین میں بھی مضبوط جڑ نہیں پکڑی تھی۔ اس کے چند سال بعد یہ حالت خوف نہ صرف امن سے بدل گئی بلکہ اسلام عرب سے نکل کر ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصے پر چھا گیا اور اس کی جڑیں اپنی پیدائش کی زمین ہی میں نہیں کرۂ ارض میں جم گئیں۔ یہ اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ خلفائے راشدین کے زمانے میں پورا کردیا۔

قیادت صحیح معاشرے کو فعال بناتی ہے۔ نیکی کا حکم دینے کے لئے ایک ایسے نظام قانون کی ضرورت ہے جو صرف نیکیاں کرنے کی اجازت ہی نہ دے بلکہ نیکی کی پرورش کی ہمت افزائی بھی کرے۔ اور ان کے تحفظ کا ماحول بھی تیار کرے تاکہ پورا معاشرہ نیکی کا زرخیز کھیت بن جائے جس میں نیکی کا بیج بونا آسان ہو۔ اسی طرح بدی سے روکنے کا اہتمام کرنے سے مراد صرف مجرموں کو سزا دینا ہی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد

[1] احکام القرآن، ۳/۱۳۹۲　　[2] تفہیم القرآن، ۳/ ۴۱۸، ۴۱۹

یہ ہے کہ پورے معاشرے کی ظاہری اور داخلی فضا کو اس طرح بنا دیا جائے کہ اس میں بدی کی پرورش کے تمام راستے بند ہو جائیں یہاں تک کہ بدی کے خیال کی نشو ونما کے راستے بھی مسدود ہو جائیں۔ اور معاشرے میں صالحیت اور پاکیزگی بتدریج اس طرح چھا جائے کہ نیتوں کا فتور تک اصلاح پذیر ہو جائے۔ معاشرے کی فلاح و بہبود کا یہ کام ایک صالح اور صحیح قیادت کے ذریعہ ہی ممکن ہے معاشرے کی ترقی کا انحصار قیادت صحیحہ پر ہی موقوف ہے۔ قیادت صحیحہ کے فقدان سے معاشرہ بے آہنگی اور انتشار کا شکار ہوگا۔ ڈاکہ، چوری، خیانت، اخلاق رذیلہ کی روک تھام نہ ہوگی۔ عزت، جان، مال عدم تحفظ کا شکار ہوں گے۔

اسلامی قیادت میں دینی و دنیوی شعبے الگ نہیں کئے جاسکتے۔ کیونکہ اسلام کی نگاہ میں دنیا اور آخرت دونوں ایک ہی مسلسل زندگی کے دو مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ سعی و عمل کا ہے اور دوسرا مرحلہ نتائج کا۔ زندگی کے پہلے مرحلے میں دنیا کو جس طرح برتیں گے۔ دوسرے مرحلے میں ویسے ہی نتائج ظاہر ہوں گے۔ اسلام کا مقصد انسان کے دین و عمل کو اس طرح تیار کرنا ہے کہ زندگی کے اس ابتدائی مرحلے میں دنیا کو صحیح انداز میں برتے اور دوسرے مرحلے میں صحیح نتائج حاصل کرے۔ تو اسلامی نقطۂ نظر سے پوری دنیوی زندگی دینی زندگی ہے اس میں اعتقادات و عبادات سے لے کر تمدن و معاشرت اور سیاست و معیشت کے اصول و فروغ تک ہر چیز ایک معنوی اور مقصدی ربط کے ساتھ مربوط ہے۔ معتقدات دین اور عبادات دینی کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ وہ نظام زندگی بھی اختیار کرنا ضروری ہے۔ جس کی عمارت اپنی عبادات کی بنیاد پر اٹھائی جاتی ہے۔ اس سے انحراف اسلام کی رو سے غلط ہے۔ اور " **افتومنون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض**"[۱] کا مصداق ہے۔ دائرہ اسلام میں رہنے کیلئے نظام زندگی ہی کافی نہیں بلکہ اسلامی طرزِ حیات بھی ضروری ہے۔ قائد کی ذمہ داری سیاسی و معاشی زندگی کے معاملات کو منظم کرنا ہے۔ سرمایہ دار، زمیندار، کاشتکار، راعی اور رعیت کے مفاد، مزدور اور آجر کے درمیان موافقت واشتراک عمل کا خیال رکھنا ہے۔

اسلام مادی ترقی، علو اور تمکن فی الارض کا حصول اسلامی اصولوں کے مطابق بنانے میں مدد کرتا ہے۔ مگر ساتھ ہی فرعونی و نمرودی علو اور ابراھیمی و موسوی علو میں امتیاز بھی کرتا ہے۔ وہ دنیا کو " **مزرعة الآخرہ**" (آخرت کی کھیتی) سمجھ کر اور انسان کو زمین میں خلیفہ الٰہی قرار دے کر زندگی کے جملہ معاملات کی تنظیم کرتا ہے۔ تاکہ انسان اس دنیا میں صحیح رویہ رکھے اور اس کے نتیجہ میں آخرت کی کامیابی سے ہمکنار ہو۔

ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

> "ولایات و امارات کا اصل مقصود مخلوق خدا کی خدمت و اصلاح ہے۔ جب دین کو لوگ چھوڑ دیں گے تو سخت ترین گھاٹا اٹھائیں گے اور جو دنیوی نعمتیں ان کو دی گئی ہیں قطعاً مفید اور نفع بخش نہ ہوں گی اور جس دنیا سے ان کو دینی اصلاح حاصل ہوتی ہے وہ نہ ہوگی"[۲]

تو جو حاکم حتی المقدور لوگوں کے دین اور دنیا کی اصلاح کرے گا تو وہ اپنے زمانے میں سب سے بہتر و افضل اور افضل المجاہدین ہوگا۔

آپؐ کا فرمان ہے

یوم من امام عادل افضل من عبادة ستین سنة[۳]

"امام عادل کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے"

آپؐ نے فرمایا

ان احب الناس الی الله یوم القیامة و أدناهم منه مجلسا امام عادل و ابغض الناس الی الله

---

[۱] البقرہ، ۲/۸۵	[۲] السیاسۃ الشرعیہ (اردو ترجمہ مولانا آزاد)، ص: ۱۰۹	[۳] علی متقی، کنز العمال، ۶/۶

وابعدهم منه مجلسا امام جائر[۱]

''قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے سب سے زیادہ محبوب اور قریب عادل امام ہوگا اور اللہ کے نزدیک مبغوض ترین شخص ان میں سے ظالم امام ہوگا''

جب رسول اللہ ﷺ کسی کو حاکم، امیر حرب یا سپہ سالار بنا کر بھیجتے تھے تو سب سے پہلے اسے نماز با جماعت پڑھانے کا حکم فرماتے تھے۔ حضرت معاذؓ کو یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو فرمایا:

''اے معاذؓ سب سے اہم امر تمہارے لئے میرے نزدیک نماز ہے''

جب حاکم امر اس ستون کی حفاظت کرے گا تو نماز اسے منکرات وفواحش سے بچائے گی اور دوسرے معاملات میں مددگار رہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

یا ایھاالذین اٰمنوا استعینوا بالصبر والصلٰوۃ ان اللہ مع الصٰبرین[۲]

''اے ایمان والو! صبر اور نماز کا سہارا لو بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''

---

۱ ترمذی، حدیث رقم: ۱۳۲۹		۲ البقرہ، ۲/۱۵۳

فصل دوم

مادی و روحانی رہنما' دینوی و مادی قیادت کا امتزاج

اسلام اپنے نظام کی بنیاد ایک ایسے جامع تصور زندگی پر رکھتا ہے جو مادی طرز فکر کی یکسر نفی کر دیتا ہے۔ وہ عمل کی بنیاد روحانی اور اخلاقی عنصر پر رکھتا ہے اور فوری منفعت کے نظریہ کو باطل قرار دیتا ہے۔ جہاں تک روحانی رہنمائی کا تعلق ہے وہ بظاہر انسانی روح اور اس کے لوازمات کا خیال رکھنے کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتی ہے جیسے جسم انسانی، روح اور جسم دونوں سے مرکب ہے اسی طرح معاشرہ کی فلاح یا ریاست کی تہذیب و ترقی کے لئے اس کے مادی و روحانی دونوں عناصر کا لحاظ ضروری ہے چنانچہ قیادت میں مادی ہنر مندیوں کے خصائص بھی بدرجہ اتم موجود ہونا ضروری ہیں۔

آج مغرب پر جو مادی طرز فکر چھایا ہوا ہے وہ اخلاق کی بنا منفعت کو قرار دیتا ہے اور اپنے مفادات کے لئے دوسرے کا گلا کاٹنا واجب سمجھتا ہے یہ فکر زندگی سے روحانی عنصر کو یکسر ختم کر دیتا ہے۔ اور تجربہ گاہوں سے نہ دریافت کیے جاسکنے والے ایمان کا منکر ہے۔ یہ مجرد اعلیٰ مقاصد کا قائل نہیں۔ اور فلسفہ عملیت کی طرح اشیاء کی حقیقت کا وجود نہیں تسلیم کرتا۔ صرف ان کے عملی وظیفہ (Function) پر نگاہ رکھتا ہے۔ یہ طرز فکر مارکسی مادیت کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ اور یہ نیا نہیں بلکہ صدیوں پرانی یونانی تہذیب کا طرۂ امتیاز بھی ''مادیت'' ہے یونانی قوم کا علم فلسفہ، شاعری، حتیٰ کہ دین، سب ان کی مادی روح کی غمازی کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کی قدرت کا تصور مختلف دیوتاؤں کی شکل کے بغیر نہ کر سکے۔ انہوں نے ان صفات کے بت تراشے اور ان کے معبد تیار کئے تاکہ محسوس طریقہ سے ان سے تعلق رکھیں۔ ان کے ہاں ایک رزق کا دیوتا تھا ایک رحمت کا اور ایک قہر و غضب کا پھر ان کی طرف انہوں نے مادی جسم خصوصیات اور متعلقات منسوب کئے اور ان کے گرد قصے کہانیوں کا ایک جال پھیلا دیا انکے نزدیک محبت کا ایک دیوتا تھا تو ایک حسن کا۔

مغربی علماء نے بھی یونانی تہذیب میں مادیت کے غلبہ کو تسلیم کیا ہے۔ متعدد مغربی علماء نے یونانیوں کی دینی کمزوری اور اس کی بے اثری ،خشیت و خوف اور مذہبی اعمال و رسوم میں سنجیدگی کی کمی اور کھیلوں اور تفریحات کی کثرت کا ذکر کیا ہے۔ تاریخ اخلاق یورپ کا مصنف لکھتا ہے

''یونانی تحریک تمام تر عقلی اور دماغی تھی بخلاف اس کے مصری تحریک یکسر روحانی و باطنی تھی۔ وہ رومی مصنف آپولیس کا یہ قول نقل کرتا ہے کہ مصری دیوتاؤں کی عزت آہ و زاری سے تھی اور یونانی دیوتاؤں کی رقص و سرود سے۔ پھر خود کہتا ہے کہ اس میں شبہ نہیں کہ اس مقولہ کے آخری جز کی تصدیق تاریخ یونان میں قدم قدم پر ہوتی ہے۔ درحقیقت کسی مذہب کے مراسم میں جشن، کھیل اور تماشوں کی اتنی آمیزش نہیں پائی جاتی جتنی اس میں ہے اور نہ کسی مذہب میں خوف و دہشت کا عنصر اس قدر قلیل پایا جاتا ہے جتنا اس میں، خدا کا تقدس بس اسی درجہ کا تھا کہ جتنا کسی بزرگ شخص کا ہوتا ہے۔ اسے چند معمولی مراسم کے ساتھ یاد کرنا اس کی عظمت و تمجید کے لئے کافی تھا''۔[۱]

مغرب کی مادہ پرست ذہنیت اور یونانیوں کا فلسفہء الٰہیات اور اس کے عقائد کی ساخت کچھ ایسی ہی واقع ہوئی تھی کہ خشوع و خضوع، انابت و رجوع الی اللہ کی کیفیت ان میں پیدا ہی نہیں ہوسکتی تھی ان کی عبادت و مذہبی اعمال ایک قالب بے روح سے زیادہ نہ تھے۔

یونانیوں کے جانشین رومی ہوئے وہ قوت، مملکت کی تنظیم اور سلطنت کی وسعت اور عسکری صفات میں ان سے فوقیت لے گئے۔ لیکن علم و فلسفہ، ادب و شاعری، تہذیب و شائستگی اور تمدن میں وہ یونانیوں کے درجہ کو نہیں پہنچ سکے۔ رومی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ رومی اپنے مذہب

---

[۱] بحوالہ۔ سید ابوالحسن علی ندوی: انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر ؛ ص۔ ۲۳۸

وعقائد میں راسخ الایمان نہ تھے کیونکہ مشرکانہ وتو ہم پرستانہ مذہب روم میں رائج تھا۔جس کا تقاضہ یہ تھا کہ رومی علم میں جس قدر ترقی کرتے جائیں انکے دماغ روشن ہوتے جائیں اتنا ہی مذہب کی عظمت میں کمی واقع ہوتی جائے۔رومیوں کی ایک بڑی خصوصیت ان کی شاہ پسندی اوراستعماری روح اور زندگی کا خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نگاہ ہے۔اور یہی وہ ترکہ ہے جو موجودہ یورپ کو ورثہ میں ملا ہے اور اہل یورپ کا رخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف ہوتا چلا گیا۔خیالات ٗنقطۂ نظر ٗنفسیات وذہنیت، اخلاق واجتماع ٗعلم وادب ٗحکومت وسیاست ٗغرض زندگی کے تمام شعبوں میں مادیت غالب آ گئی۔علماء فلسفہ وعلم طبیعات نے کائنات میں اس طرز پرغور اور بحث شروع کی کہ گویا نہ اس کا کوئی خالق ہے نہ منتظم وحاکم اور طبیعات و مادہ کے ماورا کوئی ایسی طاقت نہیں ہے جو اس عالم میں تصرف اور اس کا نظم ونسق کرتی ہے۔ ہر اس چیز کے ماننے والے سے عذر کیا جو حواس اور تجربہ کے اندر نہ آ سکے اور جس کا وزن شمار و پیمائش نہ ہو سکے۔اسی دور میں یورپ کے ہر گوشہ میں بہت بڑی تعداد میں ایسے مصنف، ادیب ٗمعلم اجتماعی اور سیاسی پیدا ہوئے جنھوں نے مادیت کا صور پھونکا۔دیگر اہل ملک کے دل ودماغ میں مادہ پرستی کے بیج بودیئے۔علماء اخلاق ٗکبھی اخلاق کی مادی تشریح کرتے کبھی لذتیت کی یعنی (فلسفہ اپی کورین اور رواقی فلسفہ) *

مصنفین، اہل قلم اور اہل دماغ نے اپنی جادو بیانی ٗسحر طرازی اور خطابت وشاعری سے قدیم اخلاق اور اجتماعی نظامات کے خلاف سارے ملک میں ایک بغاوت برپا کردی۔معصیت کو خوش نما اور دلفریب بنا کر پیش کیا۔طبیعتوں کو ہر قید وبند، ہر ذمہ داری وجوابدہی سے آزاد ہونے کی اور مطلق آزادی کی کھلی تبلیغ کی ٗزندگی سے پورے پورے تمتع، مطالبات نفس کی پوری تکمیل اور لذت پرستی (فلسفہ اپی کیورس) کی اعلانیہ دعوت دی ٗنقد لذت اور ظاہر ومحسوس مادی نفع کے سوا ہر چیز کا انکار اور تحقیر کی۔

یورپ کا موجودہ مذہب جس کی دلوں اور روح پر حکومت ہے وہ عیسائیت نہیں بلکہ مادہ پرستی ہے۔مغربی نفسیات اور مغربی زندگی سے اس کی قدم قدم تصدیق ہوتی ہے۔موجودہ مغربی تہذیب اور قدیم یونانی اور رومی تہذیب میں قریبی مماثلت پائی جاتی ہے۔زندگی کی ہوس، لذت طلبی اور ذواقی اور دنیا میں شوق گل چینی کی ویسی ہی کیفیت ہے۔جو یونانی تہذیب میں نظر آتی ہے۔اس طرح انیسویں اور بیسویں صدی کی مغربی زندگی یونان وروما کی جاہلی زندگی کا مرقع بن گئی۔

---

* اس فلسفہ کے بانی اپی کیورس بذات خود ایک راست باز اور نیک شخص تھا۔ جو لذات کے خلاف جہاد اور تزکیۂ نفس وخود ضبطی کا پرچار کرتا رہا۔مگر اس فلسفہ کو اپی کیورس کے دیگر بیشتر نمائندوں نے غلط رنگ دیا ہے۔اپی کیورس تعیش ٗنشاط اور شہوت پرستی کا مخالف مگر صحیح مسرت کے حصول کی جدو جہد کا علم بردار تھا اس نے اپنی تمام زندگی پانی اور نان پر گزار دی۔مگر اس کے نمائندوں نے اس کے اس فلسفہ کو فلسفہ شکم پروری تعیش اور لذات قرار دیا۔اخلاقی اقدار جو اس فلسفہ کا جزو لاینفک ہیں انہیں قطعاً نظر انداز کر دیا۔صرف شکم پرستی اور لذات نفسی کو ہی اہمیت دی۔

اپی کیورس کے فلسفہ کے مطابق ''معاشرتی معاہدہ'' ہی ریاست کی بنیاد ہے۔اس فلسفہ کے مطابق انسان بہر حال خود غرض ہے۔ذاتی مفادات کے باعث لوگوں کو ایک معاہدے میں شامل ہونا پڑا۔انہوں نے اس کے مطابق ریاست کی بنیاد رکھی۔اس طرح حکومت کا قیام عمل میں آیا۔اپی کیورس بھی ہابس کی طرح ریاست کے قیام کو تحفظ کی ضرورت کا تقاضا سمجھتا تھا۔اسی طرح رواقی (Stoics) مدرسۂ فکر کے حامی بھی تصور مسرت کی نمائندگی کرتے تھے۔اور اپی کیورس کے فلسفہ کے مؤید تھے کہ زندگی کا مقصد حصول مسرت ہے مگر ان رواقیوں کا تصور مسرت اپی کیورس فلسفے سے مختلف تھا۔اس فلسفے کی بنیاد زینو نے ڈالی تھی۔سسرو، سینکا مارکس، وغیرہ، اس کے معروف پیروکار تھے۔زینو کے مطابق حقیقی مسرت وہ ہے جو محاسن میں ملتی ہے نہ کہ ہر اس چیز میں جو دلکش نظر آئے۔لہذا انسان کو استدلال اور عقل سے کام لینا چاہیے نہ کہ احساسات سے۔رواقیوں کے نزدیک قانون قدرت۔ناقابل ترمیم مطلق اور استدلال پر مبنی ہے۔چنانچہ قانون قدرت کے تحت زندگی بسر کرنا دراصل استدلال کے تحت زندگی بسر کرنا ہے۔رواقیوں نے دنیا کے سامنے آزادروح کی بنیاد پر برابری کا تصور رکھا۔اسی طرح انہوں نے عالم پروری اور بھائی چارے کی بنیاد قوانین قدرت کی عالمی سطح پر رکھی۔Cicero اپی کیورس کے فکر کا نمائندہ تھا۔اس کی تحریروں نے رواقیت کے افکار کو جلا بخشی۔یہ حقیقت ہے کہ عیسائیت خود، رواقی فلسفہ سے بے حد متاثر ہے اور اس کے بیشتر نظریات اس میں شامل ہیں۔

یورپ، امریکہ، چین اور روس جس مادی فکر پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کے مقابلہ پر آنے والی واحد حقیقی قوت اسلام ہے اسلام ہی کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں ایک ہمہ گیر اور ہم آہنگ فکر کا حامل ہے۔ وہ انسانی معاشرہ میں کش مکش اور نزاع کی جگہ اجتماعی الفت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ وہ زندگی کو ایک روحانی تصور عطا کرتا ہے۔ جو اسے آسمان پر فروکش خالق سے جاملاتا ہے۔ اور ساتھ ہی زمین پر اس کے رجحانات کی تعین کرتا ہے۔ یہ تصور زندگی کو صرف مادی اغراض کی تکمیل کی مشین بنا کر نہیں رکھ دیتا ہے۔ وہ زندگی کو ان پست مقامات کی غلامی سے نکال کر جن کو آج یورپ امریکہ اور روس سب یکساں طور پر اپنا آئیڈیل بناتے ہیں' بلند تر مقام کی طرف لے جاتا ہے۔ درحقیقت تمام روحانی مذاہب جن میں مسیحت پیش پیش ہے۔ امریکہ اور یورپ کی مادیت کو بھی اس طرح باطل سمجھتے ہیں جس طرح روس کی اشتراکی مادیت کو۔ کیونکہ دونوں کا مزاج ایک ہے اور زندگی کے روحانی تصور کے منافی ہے۔ مسیحیت ایک انفرادی، گوشہ گیر اور سلبی مذہب بن چکی ہے۔ اس کے زیر سایہ زندگی کو دائمی اور فعال نشو ونما نصیب نہیں ہوسکتی۔ مسیحیت اپنی اس شکل میں جو اسے بالآخر دے دی گئی ہے۔ ہر آن متغیر معاشی اور سماجی نظاموں کے قدم بہ قدم نہیں چل سکتی۔ کیونکہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ عملی زندگی کے بارے میں کوئی جامع نظریہ نہیں رکھتی۔ اس کے برعکس اسلام ایک کامل آفاقی نظام ہے۔ جس میں عقیدہ بھی ہے اور قانون بھی۔ وہ سماجی اور معاشی زندگی کی تنظیم ضمیر اور قانون دونوں کے ذریعہ عمل میں لاتا ہے۔ وہ انسانیت کو کائنات وحیات کے بارے میں ایک جامع، ہمہ گیر اور مکمل فکر عطا کرتا ہے۔ اور ایک ایسی تفصیلی شریعت دیتا ہے جو معاشرہ کی بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق نئے فروعی احکام پیش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

اسلامی دعوت کی کامیاب پیش رفت کا زیادہ تر دارومدار اسکی قیادت پر ہوتا ہے۔ وہ اگر خداترس، ذمہ دار، صاحب بصیرت' جرأت مند، ایثار پیشہ اور مثالی کردار کی ہو تو اس کے پیچھے آنے والے ساتھیوں کے حوصلے بلند اور ان کے دشمنوں کے حوصلے پست ہوجاتے ہیں۔ اور اگر وہ کوتاہ کار اور پست ہمت ہو تو جیتی ہوئی بازی بھی ہار جاتی ہے۔ مادی اور روحانی رہنمائی کے لیے قیادت کی کچھ مخصوص صفات کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

۱۔ قائدین ان اصولوں کو دل وجان سے مانتے اور ان پر ایمان رکھتے ہوں جن اصولوں پر اسلامی نظام قائم ہوتا ہے۔ ان اصولوں کے منکر یا ان سے منحرف لوگ اس نظام کو نہیں چلا سکتے۔ چلائیں بھی تو انکے ذریعہ اسلامی نظام مملکت قائم نہیں ہوسکتا۔

۲۔ قیادت پر فائز لوگ خوفِ خدا رکھنے والے، نیک اور ایماندار ہوں۔ وہ ظالم' خدا سے غافل، خواہشات واغراض کے بندے بے عمل، دو غلے، مفاد پرست اور وعدہ خلاف نہ ہوں۔

۳۔ وہ معاملہ فہم، دانا صاحب علم اور ذہنی وجسمانی صلاحیتوں سے متصف اور اپنے منصب کے لئے ضروری اہلیتوں کے مالک ہوں۔

۴۔ قائد کی امانت ودیانت مسلّم ہو وہ منصبی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوں ان کا بوجھ اٹھانے کا احساس رکھتے ہوں۔ اور قابل اعتماد کردار کے مالک ہوں۔

اسلامی نقطہ نظر سے انسان صرف اس جسد خاکی کا ہی نام نہیں ہے جو چوپاؤں کی طرح کھاتا پیتا اور دیگر چیزوں سے متمتع ہوتا ہے۔ یہ جسد خاکی تو ایک اعلیٰ وارفع وجود کے لئے مٹی کا ایک پیکر ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدمؑ کے ضمن میں اشارہ کیا ہے۔

فاذا ستویته و نفخت فیه من روحی[۱]

''جب میں نے آدمؑ کو درست کیا اور اسمیں اپنی روح پھونکی''

یہی وہ اعلیٰ وارفع روح ہے جو انسان کو ممیّز کرتی ہے اور اس کو عزت وتکریم کا مقام عطا کر کے زمین پر خلافت الٰہی کا اہل بناتی ہے۔

۱۔ الحجر، ۱۵/۲۹

اسلام میں قیادت کے لئے اہلیت کا معیار اعلیٰ نسب، خاندان ونسل، زر وزمین یا جبر وقوت نہیں بلکہ تقویٰ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ سب سے زیادہ وہ اللہ سے ڈرنے والا اور پرہیز گار ہو۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم[۱]

''درحقیقت اللہ کے نزدیک تم سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے''

خلفائے راشدین کے انتخاب میں امت مسلمہ نے یہی اصول مدنظر رکھا کہ صالح ترین فرد ہی ان کے حکمران بن سکے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اس لئے خلیفہ بنایا گیا کہ امت کے اہل ترین اور صالح ترین فرد تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کے بارے میں فرمایا:

بل نبایعك أنت فأنت سیدنا و خیرنا و أحبنا الی رسول اللہ ﷺ[۲]

''ہم تو آپ سے بیعت کریں گے آپ ہمارے سردار اور ہم سب سے بہتر اور ہم سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کے محبوب ہیں''

حضرت علیؓ نے فرمایا:

لما قبضه النبی ﷺ، نظرنا فی امرنا فوجد نا النبی ﷺ قد قدّم ابا بکر فی الصلوٰۃ فرضینا لدنیانا من رضی رسول اللہ ﷺ لدیننا فقد منا ابا بکر[۳]

''جب رسول اکرم ﷺ وفات پا گئے تو ہم نے اپنے معاملے کی طرف دیکھا۔ ہم نے دیکھا کہ حضور ﷺ نے نماز میں حضرت ابوبکرؓ کو آگے کر دیا تھا۔ لہذا ہم اس شخص پر اپنی دنیا کے لئے راضی ہو گئے جس سے حضور ﷺ ہمارے دین کیلئے راضی ہو گئے تھے پس ہم نے ابوبکرؓ کو آگے کر دیا اور خلیفہ بنا دیا''۔

دنیا کے معاملات میں بھی وہی امام اور حکمران ہوگا جو دین میں امام ہو اور دنیا کا امام ہی دین کا امام ہوگا اس لئے کہ دین و دنیا میں اسلام کوئی تفریق اور علیحدگی پیدا نہیں کرتا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب حضرت عمرؓ کو بطور خلیفہ نامزد کیا تو آپ نے فرمایا:

فولیت علیهم خیر هم وأقواهم علیهم وأحرصهم علی ما ارشد هم[۴]

''میں نے ان پر ان کے سب سے بہتر کو سب سے قوی تر کو سب سے زیادہ راہ راست پر چلانے کے خواہشمند کو والی بنایا ہے''۔

اسلامی نظام کے معنی ہی یہ ہیں کہ اسلام تمام شعبوں اور مادی و روحانی دائروں میں معاشرہ کا رہبر و رہنما اور قائد ہو معاشرہ کا عقیدہ اسلامی ہو۔ اس کے افکار ونظریات، جذبات واحساسات، اخلاق واسلوب تربیت رسوم وروایات اسلامی ہوں۔ تمام قوانین وتشریعات اسلام کے سانچے میں ڈھلے ہوں۔

ان تمام عناصر پر توجہ قیادت صالحہ کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ ایسے لوگ جو قوی اور امانت دار ہوں جب بات کریں تو سچ بولیں۔ وعدہ کریں تو اسے وفا کریں ان کے پاس امانتیں رکھی جائیں تو انہیں مستحقین کو لوٹا دیں اور جب کوئی معاہدہ کریں تو اس کی پاسداری کریں۔

یہ ہیں وہ اوصاف وخصوصیات جو ایک اسلامی قیادت میں پائی جاتی ہیں اور جب یہ خصوصیات کسی معاشرے میں کارفرما ہوں تو اس میں طبقاتی احساس رکھنے والوں، رقابت اور چپقلش کرنے والوں، انتقامی جذبات کی بنا پر تخریب کاری کرنے والوں اور باہم ایک دوسرے پر ظلم

۱ الحجرات، ۴۹/۱۳　　۲ البخاری، الجامع، کتاب الانبیاء، ۲/۳۸۴ حدیث رقم: ۳۴۶۷

۳ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۳/۱۸۳　　۴ ابن سعد، اطبقات الکبریٰ، ۳/۱۸۳

وستم کرنے والوں کا گزر نہیں ہوتا۔ سب لوگ باہمی اخوت' محبت اور رواداری کے ماحول میں رہتے ہیں اور اخوت وایمان کی مضبوط بنیاد پر وہ بنیان مرصوص بن جاتے ہیں۔یعنی سیسہ پلائی ہوئی مضبوط دیوار۔اس طرح اسلامی قیادت کے لئے ریاست کے دفاع کی اصل اور حقیقی قوت اس کے تمام باشندوں کی باہمی محبت، اخوت اور مضبوط برادرانہ تعلق میں پوشیدہ ہوتی ہے وہ ایک ساتھ جینے، ایک ساتھ مرنے اور جہاد زندگانی میں ایک ساتھ جدوجہد کرنے کا جذبہ اور داعیہ رکھتے ہیں۔ظاہر ہے کہ جس قیادت کو ایسے پختہ کردار خداترس محبت کرنے والے اور بھائی بھائی مومن بن کر رہنے والے باشندے میسر ہوں تو اس کے لئے ریاست کا اندرونی دفاع انتہائی آسان ہوتا ہے

ایسے لوگ کسی بھی ہنگامی حالت کے موقع پر اپنا مال، اپنا گھر بار، اپنی جانیں اور اپنے بچے اور نوجوان ایسی خادم خلق ریاست کے دفاع کے لئے لگا دیتے ہیں۔عورتیں اپنے زیورا تار دیتی ہیں۔مرد مورچوں میں پہنچ جاتے ہیں۔اور ریاست کے ایک ایک فرد میں ایسی مشفق اور ہمدرد ریاست کے خطرے میں دیکھ کر وہ جذبہ پیدا ہوتا ہے جو دشمنوں کو لرزا دیتا ہے اور بدخواہوں کو بھگا دیتا ہے۔اس کے باوجود مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اس مضبوط معاشرتی اور اخلاقی بنیاد پر ایک مضبوط جنگی اور دفاعی مشین بھی نصب کرنا ضروری ہے سورۃ الانفال میں فرمایا گیا:

واعدوالهم ما استطعتم من قوةٍ ومن رباط الخيل ترهبون بهٖ عدو الله وعدوكم واخرين من دونهم لا تعلمونهم الله يعلمهم وما تنفقوا من شئٍ فى سبيل الله يوف اليكم وانتم لا تظلمون [۱]

''اور تم لوگ اپنی مقدور بھر قوت اور گھوڑوں کا پڑاؤ (ہر وقت) تیار رکھو جس کے ذریعہ تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھا سکو، اور ان قوموں پر بھی جن کو تم اس وقت نہیں جانتے، اللہ ان کو جانتا ہے (جن سے تمہارا سابقہ مستقبل میں پڑنے والا ہے) اور اللہ کی راہ میں (سامان جنگ کی تیاری پر) جو کچھ تم خرچ کرو گے (اس کا بدلہ) تم کو پورا ملے گا۔اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا''

قرآن حکیم میں ہر دور کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے چنانچہ اس آیت کریمہ میں گھوڑوں کا لفظ دور قدیم کی رعایت سے لایا گیا ہے اور ما بعد کے ادوار کی رعایت سے ''قوۃ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔اس سے مراد ہر قسم کی قوت اور جدید سے جدید تر سامانِ جنگ ہوسکتا ہے۔اسی طرح'' **عدوالله و عدوكم**'' سے مراد دورِ نزول کے منکرین حق اور دشمنانِ اسلام ہیں۔اور '' **وآخرين من دونهم**'' سے مراد مابعد کی اقوام۔'' **ترهبون به عدوالله**'' (تا کہ تم اللہ کے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھا سکو) کا مقصد عسکریت، فلسفۂ جنگ، خلافت ارض کی غرض و غایت اور امن عالم کی بنیادی اینٹ ہے یعنی محض اس رعب و دبدبے ہی کی بدولت تمہیں امن وامان اور چین وسکون حاصل ہوسکتا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ کمزوری کی بدولت ہر قوم اور ہر ملک دبانے اور حق مارنے لگ جائے گا کیونکہ عسکری اعتبار سے قوموں کی کمزوری ان کی موت کے مترادف ہے۔

یہ آیت کریمہ بیک وقت نہ صرف حتی المقدور جنگ کی تیاری اور اس راہ میں انفاق کی ترغیب وتحریص دلا رہی ہے بلکہ خلافت ارض کا فلسفہ بھی سمجھاتے ہوئے اور مستقبل کے بارے میں کچھ پیش گوئیاں کرتے ہوئے اپنے متبعین کو چالاک دشمنوں سے چوکنا اور ہوشیار رہنے کی تلقین بھی کر رہی ہے۔

گویا عوامی مورال (Morale) کے ساتھ ایک مضبوط مستقل فوج (Standing Army) بھی ہر وقت تیار رہنی چاہیے تا کہ بوقت ضرورت فوراً جنگی کاروائی کی جاسکے۔اسلام نے مادی قوت کی فراہمی کے لیے مسلمانوں کو انفاق فی سبیل اللہ کی تعلیم دی ہے اور یہ اپنی استطاعت بھر ہر فرد کے ظرف کا معاملہ ہے جنگ تبوک کے موقعہ پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنا سارا گھر ریاست کے حوالے کر دیا۔حضرت عمرؓ

---

[۱] الانفال، ۸/۶۰

فاروق نے نصف اثاثہ حوالے کر دیا اور ہر مسلمان نے بقدر ایمان و ظرف' مال وزر پیش کیا۔ اسلامی ریاست کبھی مادی لحاظ سے تہی دامن نہیں ہوتی ضرورت پڑنے پر پوری قوم کی پائی پائی فی سبیل اللہ اس کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ یہی جذبۂ ایثار و انفاق اسلامی ریاست کی دفاعی قوت کا سب سے بڑا امادی مظہر ہے اور اس کی دفاعی قوت ہے یہ جذبہ جب کسی فرد میں نمودار ہوتا ہے تو وہ ٹینکوں سے لڑ جاتا ہے اور توپوں کے منہ پھیر دیتا ہے۔ اس کی زندہ مثال بے سروسامان مجاہدین افغانستان ہیں جنہوں نے چند برس میں روس جیسی کم ظرف مکار اور ظالم و جابر سپر قوت کا منہ پھیر دیا ہے۔ یہ جذبۂ جہاد جب کسی مسلمان قوم میں نمودار ہوتا ہے تو اس کا ہر فرد خالد بن ولید، طارق بن زیاد اور محمد بن قاسم بن کر اٹھتا ہے اور دشمن کی فوجوں پر بجلی بن کر گرتا ہے۔

فصل سوم

جذبۂ خدمت ''سید القوم خادمھم''

اسلامی ریاست کے قائد کا تصور بھی دنیا بھر کے تصورات حکمرانی سے مختلف ہے کیونکہ اسلام میں قیادت کی روایت مخدوم کی نہیں بلکہ خادم کی ہے۔ وہ اختیار و امر کو تسکین قلب اور غرور نفس کا ذریعہ نہیں بناتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے غلبے اور اس کی رضا کے حصول کے لیے اپنا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔

اسلامی سربراہ مملکت مطلق العنان بادشاہ یا آمر نہیں ہوتا بلکہ خالصتاً سید القوم خادمھم یعنی قوم کا سردار اس کا خادم ہوتا ہے کا عملی نمونہ ہوتا ہے اسی تصور کے تحت آپ ﷺ نے فرمایا:

من ولاهُ الله عزوجل شيئاً من أمر مسلمين فاحتجب دون حاجتهم و خلتهم و فقرهم احتجب الله تعالىٰ عنه دون حاجته و خلته وفقره ''[۱]

''جسے اللہ عزوجل نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنایا ہے اور وہ ان کی ضروریات اور فقر سے بے پرواہ ہو کر بیٹھ رہا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہو جائے گا''

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''خلیفہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے اور رعایا پر اس طرح شفقت کرے جس طرح آدمی اپنے اہل وعیال پر شفقت کرتا ہے'' [۲]

اسلامی ریاست کی قیادت، محنت، خدمت اور مشقت کا کام ہے اس کی حیثیت رعایا کے باپ کی سی ہوتی ہے جیسے وہ سب کا غمخوار، ہمدرد، مشفق، مہربان، ممد و معاون، معلم اور قائد ثابت ہو وہ سب کی بھلائی چاہتا ہو اس سے کسی کو جانبداری اور انتقام کا خطرہ نہ ہو وہ بے لوث اور مسلمانوں کے لیے مخلص ہو۔ اپنے مزاج اور فرائض کے اعتبار سے اسلامی قیادت کمزوروں، ضعیفوں، مظلوموں اور پسماندہ لوگوں کی پشت پناہ ہوتی ہے۔ اس امارت کے سلسلے میں خلفاء اور ائمہ کا یہ تصور ہے کہ یہ کمر شکن بوجھ ہے جس کو اٹھانے کے لیے کوئی مرد دانا جلد تیار نہیں ہوتا۔ یہ کوئی اعزاز نہیں ہے کہ اس کے لئے کوشش کی جائے یہ خدا اور رسولؐ کی امانت ہے۔ قرآن حکیم کی درج ذیل آیتِ مبارکہ سے یہی حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ قیادت کی ذمہ داری اہل دانش کو سونپی جاتی ہے نہ کہ وہ جو خود اس کی جستجو اور تڑپ رکھتے ہوں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ان الله يامركم ان تودوالامانات الىٰ اهلها واذاحكتم بين الناس أن تحكموا بالعدل [۳]

''بے شک اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو''

اہل سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں اقتدار سنبھالنے کی ہر طرح سے صلاحیت موجود ہو، جنہیں اگر علم میں رسوخ ہو تو فیصلہ کرنے کی بصیرت بھی ہو، جو ملکی معاملات کو سمجھتے اور پرکھتے ہوں تو بین الاقوامی امور کی سوجھ بوجھ بھی رکھتے ہوں۔ امانت داری ان کی خصلت ہو تو خدمتِ خلق ان کا شعار ہو۔

---

۱ ابوداؤد السجستانی، سلیمان بن اشعث، السنن، حدیث رقم: ۲۹۴۸ ۲ ابوعبید، کتاب الاموال، ۱/۱۱۴، ۱۱۷ ۳ النساء، ۴/۵۸

آپ کا فرمان ہے:

مامن عبد استرعاه الله رعية فلم يحطها بنصيحة الا لم تجد رائحة الجنة ۱

''جس بندے کو اللہ نے رعیت کے معاملات کا محافظ و نگران بنایا اور اس نے بھلائی اور خیر خواہی کی ذمہ داری پوری نہیں کی تو وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا''

مامن والٍ یلی رعية من المسلمين فيموت وهو غاش لهم الا حرم الله عليه الجنة ۲

''کوئی حکمران جو مسلمانوں میں سے کسی رعیت کے معاملات کا سربراہ ہو اگر اس حالت میں مرے کہ وہ ان کے ساتھ دھوکہ اور خیانت کرنے والا تھا تو اللہ اس پر جنت حرام کر دے گا''

مامن امير یلی امر المسلمين ثم لا يجهد لهم ولا ينصح الا لم يدخل معهم فی الجنة ۳

''کوئی محکوم جو مسلمانوں کی حکومت کا کوئی منصب سنبھالے پھر اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے جان نہ لڑائے اور خلوص کے ساتھ کام نہ کرے وہ مسلمانوں کے ساتھ جنت میں قطعاً داخل نہ ہوگا''

اسی طرح ایک بار آپؐ نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے فرمایا:

يا اباذر انت ضعيف وانها امانة وانها يوم القيامة خزی وندامة الامن اخذ بحقها وادی الذی عليه فيها ۴

''نبی ﷺ نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا کہ اے ابوذر! تم کمزور آدمی ہو اور حکومت کا منصب ایک امانت ہے۔ قیامت کے روز وہ رسوائی اور ندامت کا موجب ہوگا سوائے اس شخص کے جو اس کے حق کا پورا پورا لحاظ کرے اور جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اسے ٹھیک ادا کرے''

من اخون الخيانة تجارة الوالی فی رعيته ۵

''کسی حاکم کا اپنی رعیت میں تجارت کرنا بدترین خیانت ہے''

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں

''جو شخص حکمران ہو اس کو سب سے زیادہ بھاری حساب دینا ہوگا اور وہ سب سے زیادہ سخت عذاب کے خطرے میں مبتلا ہوگا اور جو حکمران نہ ہو اس کو ہلکا حساب دینا ہوگا اور اس کے لئے ہلکے عذاب کا خطرہ ہے کیونکہ حکام کے لئے سب سے بڑھ کر اس بات کے مواقع ہیں کہ ان کے ہاتھوں مسلمانوں پر ظلم ہو۔ اور جو مسلمانوں پر ظلم کرے وہ خدا سے غداری کرتا ہے'' ۶

اسلامی ریاست میں خلیفہ (سربراہ ریاست) کا اہم ترین فرض انتظام ریاست ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

يا داود انا جعلنٰك خليفة فی الارض فاحكم بين الناس بالحق ولا تتبع الهوىٰ فيضلك عن سبيل الله ۷

''اے داؤد ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ مقرر کیا ہے تم لوگوں میں حق اور صداقت سے حکومت کرو۔ خواہش کے

---

۱ البخاری، الجامع، کتاب الاحکام، حدیث رقم: ۶۶۱۷
۲ البخاری، الجامع، کتاب الاحکام، حدیث رقم: ۶۶۱۸
۳ مسلم، الجامع، کتاب الامارہ، حدیث رقم: ۱۴۲
۴ علی المتقی، کنز العمال، ۶/ ۸ حدیث رقم: ۱۴۶۴۳
۵ علی المتقی، کنز العمال، ۶/ ۹ حدیث رقم: ۱۶۶۵۳
۶ علی المتقی، کنز العمال، ۵/ ۲۵۵
۷ ص، ۳۸/ ۲۶

پیچھے نہ پڑ جانا ورنہ وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کے راستے سے بھٹکا دے گی''

اس آیت مبارکہ میں خداوند عالم نے محض تفویض خلافت و حکومت پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ خود خلیفہ کو امور سلطنت کے انجام دینے کا حکم دیا ہے۔ نیز اتباع خواہشاتِ نفسانی میں انہیں بری الذمہ نہیں کیا بلکہ اسے گمراہی سے تعبیر کیا ہے۔

محمد بن یزداد نے جو مامون الرشید کا وزیر تھا یہ شعر مامون کے لئے کہے تھے

من کان حارس دنیا انه فمن		ان لا ینام وکل الناس نوّام
وکیف ترقد عینا من تضیفه		همان من امره حل وابرام[1]

''جو دنیا کا نگہبان ہو اسے سزاوار ہے کہ خود نہ سوئے چاہے تمام عالم سوتا ہو اور بھلا ایسے شخص کو کیونکر نیند آسکتی ہے جس کا دماغ ہر وقت انتظام سلطنت کی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے''

قاضی ابو یوسف: کتاب الخراج میں ہارون الرشید کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

''امیر المومنین! خدائے بزرگ و برتر نے جس کی ذات ہر طرح کی حمد و ثنا کی واحد مستحق ہے آپ پر ایک بڑی بھاری ذمہ داری ڈال دی ہے (اگر یہ بحسن و خوبی انجام دی جائے تو) اس کا ثواب سب سے زیادہ ہوتا ہے اور (اگر کوتاہی ہو تو) اس کی سزا بھی ساری سزاؤں سے سخت ہے اس نے اس امت کا بار آپ کے کاندھوں پر ڈالا ہے اب آپ صبح و شام ہر آن خلق خدا کی کثیر تعداد کے لئے (ایک عمارت کی) تعمیر میں مصروف ہیں اللہ نے آپ کو ان کا نگران بنا دیا ہے۔ اور ان کو بطور امانت آپ کے سپرد کر دیا ہے ان کے جملہ امور کا سرپرست بنا دیا ہے''[2]

آگے فرماتے ہیں

''دنیا میں جو لوگ (قوموں کے) نگران ہیں ان کو اپنے رب کے حضور اپنا معاملہ اسی طرح بے باق کرنا ہوگا جس طرح چرواہا (مویشیوں کے گلہ کو واپس لا کر) اپنے آقا کے سامنے ایک ایک جانور کا حساب بے باق کرتا ہے اللہ نے جو آپ کو حکمرانی بخشی ہے اور جو ذمہ داریاں آپ کو سونپی ہیں انکو حق پر استوار کیجئے خواہ (آپ کا دور حکمرانی) دن کی ایک گھڑی کے بقدر کیوں نہ ہو۔ کیونکہ قیامت کے دن اللہ کے حضور سب سے نیک بخت نگران وہ ہوگا جو رعایا کے لئے موجب سعادت ہوگا''[3]

اسلامی معاشرے کی قیادت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے ساتھ جب ایسی تنبیہات و وعیدات بھی موجود ہوں تو کون شخص آسانی سے آگے بڑھنے کی جسارت کر سکتا ہے۔ چنانچہ دور سعادت میں جس کسی پر بھی یہ ذمہ داری پڑی اس پر خدا اور خلق کے سامنے جوابدہی کا احساس اور خوف خدا کا غلبہ کچھ ایسا حاوی رہا کہ اس کی رات کی نیندیں اور دن کا آرام حرام ہو کر رہ گیا۔ ایسے لوگ ملت کی فلاح و بہبود کے کاموں میں کھپ کر ہی رہ گئے۔

جب ذمہ داری کا یہ بوجھ حضرت ابوبکر صدیقؓ پر پڑا تو انہوں نے لوگوں کے سامنے کھڑے ہو کر فرمایا:

''میں آپ لوگوں پر حکمران بنایا گیا ہوں حالانکہ میں آپ کا سب سے بہتر آدمی نہیں ہوں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں نے یہ منصب اپنی رغبت اور خواہش سے نہیں

---

۱ الماوردی، احکام السلطانیہ ص:۳۱	۲ کتاب الخراج، ص:۱۰۶	۳ کتاب الخراج، ص:۱۰۷

لیا ہے۔ نہ میں یہ چاہتا تھا کہ کسی دوسرے کے بجائے یہ مجھے ملے۔ نہ میں نے کبھی خدا سے اس کے لئے دعا کی۔ نہ میرے دل میں کبھی اس کی حرص پیدا ہوئی۔ میں نے تو اسے بادل ناخواستہ اس لئے قبول کیا ہے کہ مجھے مسلمانوں میں فتنۂ اختلاف اور عرب میں فتنۂ ارتداد برپا ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ میرے لئے اس منصب میں کوئی راحت نہیں ہے۔ بلکہ یہ بارِ عظیم ہے جو مجھ پر ڈال دیا گیا ہے، جس کے اٹھانے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے الا یہ کہ اللہ ہی میری مدد فرمائے۔ میں یہ چاہتا تھا کہ میرے بجائے کوئی اور یہ بار اٹھالے۔ اب بھی اگر آپ لوگ چاہیں تو اصحاب رسول اللہؐ میں سے کسی اور کو اس کام کے لئے چن لیں۔ میری بیعت آپ کے راستے میں حائل نہ ہوگی۔ آپ لوگ اگر مجھے رسول اللہ ﷺ کے معیار پر جانچیں گے اور مجھ سے وہ توقعات رکھیں گے جو حضورؐ سے آپ رکھتے تھے تو میں اس کی طاقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ وہ شیطان سے محفوظ تھے اور ان پر آسمان سے وحی نازل ہوتی تھی۔ اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کیجئے، اگر غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دیجئے۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت، تمہارے درمیان جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے یہاں تک کہ میں اس کا حق اسے دلواؤں اگر خدا چاہے۔ اور تم میں سے جو طاقتور ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے حق وصول کروں اگر خدا چاہے کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی قوم اللہ کی راہ میں جدوجہد چھوڑ دے اور اللہ اس پر ذلت مسلط نہ کردے۔ اور کسی قوم میں فواحش پھیلیں اور اللہ اس کو عام مصیبت میں مبتلا نہ کردے۔ میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور رسولؐ کا مطیع رہوں۔ اور اگر میں اللہ اور رسولؐ کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے۔ میں پیروی کرنے والا ہوں، نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں[۱]

حضرت عمرؓ اپنے ایک خطبہ میں کہتے ہیں:

''لوگو، کوئی حق والا اپنے حق میں اس مرتبے کو نہیں پہنچا ہے کہ اللہ کی معصیت میں اس کی اطاعت کی جائے۔۔۔۔ لوگو میرے اوپر تمہارے جو حقوق ہیں وہ میں تم سے بیان کئے دیتا ہوں، ان پر تم مجھے پکڑ سکتے ہو۔ میرے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ میں تمہارے خراج اللہ کے عطا کردہ فے میں سے کوئی چیز نہ وصول کروں مگر قانون کے مطابق اور میرے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ جو کچھ مال اس طرح میرے پاس آئے اس میں سے کچھ نہ نکلے مگر حق کے مطابق''[۲]

حضرت عمرؓ جن لوگوں کو عامل بنا کر کہیں بھیجتے تھے ان کو خطاب کر کے کہتے:

''میں تم لوگوں کو امتِ محمد ﷺ پر اسلئے عامل مقرر نہیں کر رہا ہوں کہ تم ان کے بالوں اور ان کی کھالوں کے مالک بن جاؤ بلکہ میں اس لئے تمہیں مقرر کرتا ہوں کہ تم نماز قائم کرو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلے کرو اور عدل کے ساتھ ان کے حقوق تقسیم کرو''[۳]

۱　ابن جریر، تاریخ طبری، ۲/ ۴۵　　۲　ابن ہشام: السیرت النبویہ، ۴/ ۳۱۱　　۳　ابن جریر: طبری، ۳/ ۲۷۳

حضرت عثمانؓ نے بیعت کے بعد جو پہلا خطبہ دیا اس میں انہوں نے فرمایا:

''سنو میں پیروی کرنے والا ہوں، نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔ جان لو کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی پیروی کرنے کے بعد تین باتیں ہیں جن کی پابندی کا میں تم سے عہد کرتا ہوں۔ ایک یہ کہ میری خلافت سے پہلے تم نے باہمی اتفاق سے جو قاعدے اور طریقے مقرر کئے تھے ان کی پیروی کروں گا۔ دوسرے یہ کہ جن معاملات میں پہلے کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہوا ہے ان میں سب کے مشورے سے اہل خیر کا طریقہ مقرر کروں گا۔ تیسرے یہ کہ تم سے اپنے ہاتھ روکے رکھوں گا جب تک کہ تمہارے خلاف کوئی کاروائی کرنا قانون کی رو سے واجب نہ ہو جائے''۔[1]

اسی طرح حضرت علیؓ کا عمل تھا

حضرت علیؓ نے اپنی تنخواہ کا معیار وہی رکھا جو حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی تنخواہوں کا تھا۔ آدھی آدھی پنڈلیوں تک اونچا تہبند پہنے رہتے اور وہ بھی اکثر پیوند لگا ہوا ہوتا۔ عمر بھر کبھی اینٹ پر اینٹ رکھنے کی نوبت نہ آئی۔ ایک مرتبہ ایک صاحب جاڑے کے زمانے میں آپ سے ملنے گئے دیکھا تو ایک بوسیدہ چادر پہنے بیٹھے ہیں اور سردی سے کانپ رہے ہیں [2] شہادت کے بعد آپ کے ترکے کا جائزہ لیا گیا تو صرف سو درہم نکلے جو آپ نے ایک غلام خریدنے کے لئے پیسہ پیسہ جوڑ کر جمع کئے تھے۔[3] کبھی کسی ایسے شخص سے بازار میں کوئی چیز نہ خریدتے تھے جو آپ کو جانتا ہوتا کہ وہ قیمت میں امیر المومنین ہونے کی بنا پر آپ کیساتھ رعایت نہ کرے۔ جس زمانے میں حضرت معاویہؓ سے ان کا مقابلہ درپیش تھا لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ جس طرح حضرت معاویہؓ لوگوں کو بے تحاشا انعامات اور عطیے دے دے کر اپنا ساتھی بنا رہے ہیں آپ بھی بیت المال کا منہ کھولیں اور روپیہ بہا کر اپنے حامی پیدا کریں۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر ایسا کرنے سے انکار کر دیا کہ ''تم چاہتے ہو میں ناروا طریقوں سے کامیابی حاصل کروں''۔[4] ان سے خود ان کے بڑے بھائی حضرت عقیلؓ نے چاہا کہ بیت المال سے ان کو روپیہ دیں، مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تم چاہتے ہو کہ تمہارا بھائی مسلمانوں کا مال تمہیں دے کر جہنم میں جائے۔[5]

حضرت علیؓ نے حضرت قیس بن سعدؓ کو مصر کا گورنر مقرر کر کے جو فرمان اہل مصر کے نام بھیجا تھا اس میں وہ فرماتے ہیں

''خبردار رہو، تمہارا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق عمل کریں اور تمہارے معاملات کو اللہ کے مقرر کردہ حق کے مطابق چلائیں اور نبی ﷺ کی سنت کو نافذ کریں اور در پردہ بھی تمہاری خیر خواہی کریں''۔[6]

اس فرمان کو مجمع عام میں سنانے کے بعد حضرت قیسؓ بن سعد نے اعلان کیا کہ اگر ہم اس طریقہ پر تمہارے ساتھ برتاؤ نہ کریں تو ہماری کوئی بیعت تم پر نہیں ہے۔

ایک گورنر کو حضرت علیؓ نے لکھا

''اپنے اور رعیت کے درمیان لمبے چوڑے پردے حائل نہ کرو۔ حکام کا رعیت سے پردہ کرنا نظر کی تنگی اور علم کی کمی کا ایک شاخسانہ ہے اس پردے کی وجہ سے ان کو صحیح حالات معلوم نہیں ہوتے،

---

[1] ابن جریر: طبری، ۳/ ۴۴۶　[2] ابن کثیر، ۸/ ۳　[3] ابن سعد، طبقات، ۲/ ۳۸

[4] ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ، ۱/ ۱۸۲　[5] ابن قتیبہ، الامامۃ والسیاسۃ، ۱/ ۷۱　[6] ابن جریر، الطبری، ۳/ ۵۵۰۔۵۵۱

چھوٹی باتیں ان کے لئے بڑی بن جاتی ہیں اور بڑی باتیں چھوٹی ہو جاتی ہیں۔ اچھائی ان کے سامنے برائی بن جاتی ہیں اور برائی ان کے لئے اچھائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور حق باطل کے ساتھ خلط ملط ہو جاتا ہے''[۱]

حضرت علیؓ کا محض یہ قول ہی نہ تھا بلکہ ان کا عمل بھی اسی کے مطابق تھا کوفہ کے بازاروں میں خود دُرّہ لے کر نکلتے، لوگوں کو برائیوں سے روکتے، بھلائیوں کی تلقین کرتے اور تاجروں کی ایک ایک منڈی کا چکر لگا کر یہ دیکھتے کہ وہ کاروبار میں بددیانتی تو نہیں کر رہے ہیں۔ اس روزمرہ کی گشت میں کوئی اجنبی آدمی ان کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ بلاد اسلام کا خلیفہ اس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے، کیونکہ نہ ان کے لباس سے بادشاہی کی شان ظاہر ہوتی تھی اور نہ ان کے آگے کوئی چوبدار ہٹو بچو کہتا پھرتا تھا۔[۲]

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے برسر عام اعلان کیا کہ ''میں نے اپنے عاملوں کو اس لئے نہیں بھیجا کہ وہ تم لوگوں کو پیٹیں اور تمہارے مال چھینیں، بلکہ اس لئے بھیجا ہے کہ تمہیں تمہارا دین اور تمہارے نبیؐ کا طریقہ سکھائیں۔ جس شخص کے ساتھ اس کے خلاف عمل کیا گیا ہو وہ میرے پاس شکایت لائے خدا کی قسم میں اس سے بدلہ لوں گا۔ اس پر حضرت عمرو بن العاص مصر کے گورنر نے اٹھ کر کہا کہ اگر کوئی شخص مسلمانوں کا والی ہو اور تادیب کی غرض سے کسی کو مارے تو کیا آپ اس سے بدلہ لیں گے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا ''ہاں خدا کی قسم میں اس سے بدلہ لوں گا میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو اپنی ذات سے بدلہ دیتے دیکھا ہے۔[۳]

ایک اور موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنے تمام گورنروں کو حج میں طلب کیا اور مجمع عام میں کھڑے ہو کر کہا کہ ان لوگوں کے خلاف جس شخص کو کسی ظلم کی شکایت ہو وہ پیش کرے پورے مجمع میں سے صرف ایک شخص اٹھا اور اس نے حضرت عمر بن العاص کی شکایت کی کہ انہوں نے ناروا طور پر مجھے سو کوڑے لگوائے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اٹھو اور ان سے اپنا بدلہ لے لو۔ عمر بن العاصؓ نے احتجاج کیا کہ آپ گورنروں پر یہ دروازہ نہ کھولیں۔ مگر انہوں نے کہا کہ ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو خود اپنے آپ سے بدلہ دیتے دیکھا ہے۔ اے شخص اٹھ اور اپنا بدلہ لے لے۔'' آخر کار عمرو بن العاصؓ کو ہر کوڑے کے بدلے دو اشرفیاں دے کر اپنی پیٹھ بچانی پڑی۔[۴]

ان واقعات کا سنجیدگی سے مطالعہ کرنے والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ نظام خلافت اگر قائم ہوگا تو ایسے ہی سیاسی اخلاق کی بدولت قائم ہوگا۔ خلافت خدا پرستی کا مظہر ہے۔ رہبانیت اور ترک دنیا کا کام نہیں۔ اور نہ دنیا اور دین کو جدا جدا کرنے کا نام ہے۔ خلافت کے علمبرداروں نے اس منصب سے وہ فائدہ نہیں اٹھایا جو بالعموم اہل دنیا اٹھایا کرتے ہیں۔ نہ ان کو جاہ و جلال کی ضرورت تھی اور نہ اقتدار کے مزے لوٹنے کی۔ وہ لوگ حکمرانی سے اس قدر بے رغبت ہوئے کہ ان کے اندر اس سلسلے میں مسابقت کا نشان نہیں ملتا۔ جب اسباب مسابقت باقی نہ رہے تو پھر مسابقت کیوں ہوتی۔ عوامل کشمکش معدوم ہو جائیں تو کشمکش ختم ہو جاتی ہے ہر صحابی مناصب حکمرانی میں دوسروں کی نسبت اپنا بہت کم حصہ سمجھتا تھا۔ اگر کوئی منصب کسی صحابی کو پیش کیا جاتا تو وہ دوسروں کی خوبیاں اور صلاحیتیں بیان کرنا شروع کر دیتا۔

یہ نتیجہ تھا محض ان لوگوں کی سیرت کا جو حکومت کا کاروبار چلا رہے تھے اور تمدن کے نگران تھے اور ان کے عقیدے، تربیت، طرز حکومت اور اصول سیاست کا، اس لئے کہ وہ جہاں اور جس حال میں ہوتے دین و اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ وہ حکام کی حیثیت میں ہوتے یا فوج کے سالار کی، ہمیشہ محتاط و پاک دامن دیانت دار، امانت شعار، خدا ترس اور منکسر مزاج پائے جاتے۔

---

۱ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۸/۸
۲ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۸/۴-۵
۳ ابن جریر، الطبری، ۳/۲۷۳
۴ ابو یوسف، کتاب الخراج، ص: ۱۱۶

ابن کثیر لکھتے ہیں۔

''ایک رومی سردار مسلمان فوجوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے'' رات کو تم ان کو عبادت گزار پاؤ گے اور دن کو روزہ دار، عہد وفا کرتے ہیں۔ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور آپس میں پورا انصاف اور مساوات برتتے ہیں۔ دوسرے کے الفاظ ہیں'' وہ دن کو شہسوار ہوتے ہیں اور رات کو عبادت گزار اپنے مفتوحہ علاقہ میں بھی وہ قیمت دے کر کھاتے ہیں، سلام کر کے داخل ہوتے ہیں اور ایسا جم کر لڑتے ہیں کہ دشمن کا خاتمہ ہی کر دیتے ہیں۔ ایک تیسرے شخص نے ان الفاظ میں تعریف کی'' رات کو دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ ان کو دنیا سے کچھ تعلق نہیں اور عبادت کے سوا کوئی کام نہیں اور دن کو گھوڑے کی پیٹھ پر اس طرح نظر آئیں گے کہ گویا یہی کام ہے۔ بڑے تیر انداز، اور بڑے نیزہ باز خدا کی یاد میں اس طرح مشغول و تر زبان کہ ان کی مجلس میں کسی بات کا سننا مشکل ہوتا ہے [1]

اسی اخلاق و تربیت کا نتیجہ تھا کہ مدائن کی فتح میں کسریٰ کا مرصع تاج اور اس کا فرش بہار جو لاکھوں اشرفیوں کی مالیت کا تھا فوج کے ہاتھ لگتا ہے، لیکن کیا مجال کہ اس میں ذرا بھی تصرف کیا جائے وہ قائد کے حوالہ کر دیتے ہیں اور قائد حضرت عمرؓ کو بھیج دیتے ہیں وہ تعجب کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے اس کو حوالہ کر دیا اور حفاظت کے ساتھ پہنچایا ان کی امانت واقعی قابل تعریف ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے پیروؤں کی یہ پہلی جماعت ایسی ہی تھی کہ اس کے سایہ اور اس کی حکومت میں نوع انسانی کو پوری کامیابی و سعادت حاصل ہوا اور اس کی قیادت میں اس کا جو قدم پڑے وہ صحیح پڑے، اور صحیح منزل کی طرف اٹھے، دنیا کو ہر قسم کا اطمینان اور فارغ البالی ہر طرح کی سرسبزی و شادابی اور خیر و برکت حاصل ہو، انسانوں کی مصلحتوں کا ان سے زیادہ جاننے والا اور ان سے زیادہ ان کا خیال رکھنے والا، دنیا کے لئے ان سے بہتر نگران و محافظ اور انسانوں کا ان سے بڑھ کر خیر خواہ کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ بعض اہل مذاہب کی طرح دنیا کی زندگی کو لعنت کا طوق نہیں سمجھتے تھے اسی کے ساتھ وہ اس کو عیش و عشرت کی آخری فرصت و مہلت بھی نہیں سمجھتے تھے کہ اس کا ایک ایک منٹ قیمتی سمجھتے اور اس کے لذائذ اور نعم کو کسی دوسرے دن کے لئے نہ اٹھا رکھتے، اسی طرح سے وہ اس زندگی کو کسی سابق قدیم گناہ کی سزا بھی نہیں سمجھتے تھے جو ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے، نیز مادہ پرست اقوام کی طرح وہ دنیا کی کوئی ایسی نعمت بھی نہیں سمجھتے تھے جس پر وہ بھوکوں کی طرح گریں۔ اور زمین کی دولتوں اور خزانوں کو پڑا ہوا لاوارثی مال بھی نہیں سمجھتے تھے جس کے لوٹنے کے لئے وہ ٹوٹ پڑیں، وہ کمزور قوموں کو شکار نہیں سمجھتے تھے جس کے شکار کرنے کے لئے وہ ایک دوسرے سے مقابلہ کریں۔ ان کا اعتقاد تھا کہ یہ زندگی اللہ کی ایک نعمت ہے جس میں اللہ سے قرب حاصل کرنے اور اپنے کمال انسانی تک پہونچنے کا ان کو موقع دیا گیا ہے اور عمل اور جد و جہد کی ایک مہلت ہے جس کے بعد اس کے لئے کوئی مہلت نہیں۔

الذی خلق الموت والحیوٰة لیبلوکم ایکم احسن عملاً [2]

جس نے مرنا اور جینا بنایا تا کہ تم کو جانچے کہ کون تم میں عمل میں بہتر ہے

انا جعلنا ما علی الارض زینة لها لنبلوهم ایهم احسن عملاً [3]

ہم نے جو کچھ زمین پر ہے اس کو اس کی رونق بنایا ہے تا کہ لوگوں کو جانچیں کہ کون ان میں زیادہ اچھا کام کرتا ہے

---

[1] البدایہ والنہایہ، ۵۳/۷　[2] الملک، ۲/۶۷　[3] الکہف، ۷/۱۸

فصل چہارم

ارتکاز اختیار کی بجائے احساس مسؤلیت و مواخذہ

اسلامی ریاست میں قیادت اور مناصب کی طلب کی سخت حوصلہ شکنی کی گئی ہے کیونکہ اسی سے اغراض کی وہ کشمکش پیدا ہوتی ہے جو کسی نظام کو تباہی سے دوچار کر دیتی ہے اور یہی طلب منصب ادائے فرض کے احساس کو کند اور مفاد پرستی کے ذوق کو تیز کر دیتی ہے اس لئے حکومت کے ذمہ دارانہ مناصب کے لئے عموماً اور قیادت (امارت) کے لئے خصوصاً وہ لوگ سب سے زیادہ غیر موزوں ہیں جو خود عہدہ حاصل کرنے کے طالب ہوں اور اس کے لئے کوشش کریں۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

تلک الدار الاخرة نجعلها للذین لا یریدون علوا فی الارض ولا فساداً [۱]

''وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ اپنی بڑائی کے طالب ہوتے ہیں اور نہ فساد برپا کرنا چاہتے ہیں''

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے۔

انا واللہ لا نولی علیٰ عملنا هذا احداً سأله او حرص علیه [۲]

''بخدا ہم اپنی اس حکومت کا منصب کسی ایسے شخص کو نہیں دیتے جو اس کا طالب ہو یا اس کا حریص ہو''

آپ ﷺ نے فرمایا:

ان اخونکم عند نا من طلبه [۳]

''تم میں سب سے بڑھ کر خائن ہمارے نزدیک وہ ہے جو اسے خود طلب کرے''

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا:

انا لا نستعمل علی عملنا من ارادهٔ [۴]

''ہم اپنی حکومت میں کسی ایسے شخص کو عامل نہیں بناتے جو اس کی خواہش کرے''

عبدالرحمٰن بن سمرہ سے حضورؐ نے فرمایا:

''یا عبدالرحمن بن سمرة لا تسأل الامارة فانك اذا اوتیتها عن مسئلة وكلت الیها ،وان اوتیتها عن غیر مسئلة اعنت علیها'' [۵]

''اے عبدالرحمٰن بن سمرہ امارت کی درخواست نہ کرو کیونکہ اگر وہ تمہیں مانگنے پر دی گئی تو خدا کی طرف سے تم کو اسی کے حوالے کر دیا جائے گا اور اگر وہ تمہیں بے مانگے ملی تو خدا کی طرف سے تم کو اس کا حق ادا کرنے میں مدد دی جائے گی۔

حضرت ابوعمامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

''جو شخص دس یا دس سے زیادہ افراد کے معاملات کا ذمہ دار ہے وہ قیامت کے دن اللہ کے حضور اس طرح آئے گا کہ اس کے ہاتھ اسکی گردن کے ساتھ بندھے ہوئے ہوں گے پھر یا تو اس کی نیکی اس کو آزادی دلائے گی یا اس کے گناہ اس کو ہلاک کر دیں گے اس امارت کا

---

۱ القصص، ۲۸/۸۳　۲ مسلم، الجامع، کتاب الامارہ، حدیث رقم: ۳۴۰۲　۳ ابوداؤد، کتاب الامارہ، حدیث رقم: ۲۹۳۰

۴ علی المتقی، کنز العمال، ۶/۸، حدیث رقم: ۱۴۷۸۱　۵ البخاری، صحیح بخاری (اردو) حدیث رقم: ۲۰۱۷

آغاز ملامت، اس کا وسط ندامت اور اس کا آخر قیامت کے دن رسوائی ہے''

اس کے علاوہ قرآن پاک نے نہایت ہی وضاحت کے ساتھ اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ اس دنیا میں ہر انسان پر فرداً فرداً اس کے تمام اچھے اور برے اعمال کی ذمہ داری ڈال دی گئی ہے اس لئے یہ خیال بالکل خام ہے کہ کوئی ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا کفارہ ادا کر سکتا ہے۔ یا اللہ کے علاوہ انہیں معاف کر دینے کا مجاز ہے۔ اسلام نے اس توقع کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی کہ کوئی فرد بھی کسی بڑے سے بڑے تعلق اور کسی مضبوط سے مضبوط واسطہ کے طفیل جرائم کی پاداش سے بچایا جا سکتا ہے۔

ولا تکسب کل نفسٍ الا علیھا ولاتزروازرۃ وزراخریٰ ۱

ہر نفس جو کچھ کماتا ہے اس کا بوجھ اسی پر ہے کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

لن تنفعکم ارحامکم ولا اولادکم یوم القیٰمۃ یفصل بینکم واللہ بما تعملون بصیر ۲

قیامت کے دن تمہارے رشتے اور تمہاری اولاد ہرگز کام نہ آئے گی تمہارے درمیان اللہ فیصلہ کرے گا۔ اور اس کی نظر تمہارے عملوں پر ہے۔

ولا تزروازرۃ وزراخریٰ وان تدع مثقلۃ الی حملھا لا یحمل منہ شیٔ ولو کان ذا قربیٰ ۳

کوئی شخص کسی دوسرے کا بارِ گناہ اپنے سر نہ لے گا اور کسی پر گناہوں کا بڑا بار ہو اور وہ اپنا ہاتھ بٹانے کے لئے کسی کو بلائے تو وہ اس کے بوجھ کا کوئی حصہ اپنے اوپر نہ لے گا خواہ وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

یاٰیھاالناس اتقو اربکم واخشوا یوماً لایجزی والد عن ولدہٖ ولامولود ھو جازٍ عن والدہٖ شیئا ۴

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو اور اس دن کا خوف کرو جب کہ نہ کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام آئے گا نہ بیٹا اپنے باپ کے کچھ کام آئے گا۔

ان آیات شریفہ سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق کوئی فرد خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اور کسی بھی منصب پر فائز ہو تو کسی دوسرے کو نجات کا وعدہ دلا سکتا ہے اور نہ اسے مغفرت کی دستاویز دینے کا حق رکھتا ہے۔ قرآن کی رو سے ان ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت بالکل حرام ہے۔ اور غالباً اسی قسم کی کمائی کے متعلق کلام پاک میں یہ تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

یا ایھاالذین اٰمنوآ انَّ کثیرا من الا حبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ ۵

''اے مومنو! یہودیوں اور عیسائیوں کے علماء اور مشائخ میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو لوگوں کا مال ناحق و ناروا کھاتے ہیں اور اللہ کی راہ سے انہیں روکتے ہیں''۔

خداوند تعالیٰ نے ایک مسلم سوسائٹی میں ایسی تمام چیزوں کے استعمال کو منع فرما دیا ہے جن کی ترکیب ان عناصر سے کی گئی ہے جو یا تو جسمانی امراض کا مبدا بنتی ہیں یا لوگوں کے قوائے حیوانی کو برانگیختہ کرنے میں ممد و معاون ہوں یا ان کے استعمال سے غرور، خودنمائی اور جابرانہ نخوت ایسے مذموم جذبات بھڑکتے ہوں۔

وکلوا مما رزقکم اللہ حلالا طیباً ۶

''پس اللہ نے جو کچھ تم کو رزق دیا ہے اس میں سے حلال طیب کھاؤ''

---

۱ الانعام،۶/۱۶۴　۲ الممتحنہ۶۰/۳　۳ فاطر،۳۵/۱۸　۴ لقمان۳۱/۳۳

۵ التوبہ،۹/۳۴　۶ المائدہ،۵/۸۸

یایھاالناس کلو ا مما فی الارض حلالا طیبا و لا تتبعوا خطوات الشیطن انه لکم عدو مبین ا؎

''اے لوگو! جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال طیب کھاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ بلاشبہ وہ تمہارے لئے کھلا دشمن ہے''۔

حلالا طیبا کی تفسیر مفسرین اس طرح لکھتے ہیں

طیب سے مراد وہ اشیاء ہیں جن کے ساتھ غیر کا حق متعلق نہ ہو اس لئے کہ نص قرآنی نے جن اشیا کو حرام کیا ہے ان کی حرمت تو ذاتی ہے اور اس لئے مضطر (مجبور) کے علاوہ کسی حالت میں کسی کے لئے انکا استعمال درست نہیں اور ان کے علاوہ جن اشیاء کی حرمت اس شے کی حقیقت اور ذات میں نہیں پائی جاتی ہے بلکہ باہر کے اسباب سے حرمت آتی ہے ان کی ممانعت طیب کہہ کر کر دی گئی ہے۔

پس جو شے ناحق لی گئی ہے اور صحیح طریق کار سے حاصل نہیں کی گئی بلکہ ربا، رشوت، جوا، ظلم، غصب، دھوکہ، خیانت اور چوری جیسے ناپاک ذرائع سے حاصل کی گئی ہے وہ بھی حرام ہے اس لئے کہ طیب نہیں ہے پس ہر خبیث شے حرام ہے خواہ وہ خبث باہر کے اسباب و ذرائع سے اس میں آیا ہو یا اس کے اندر موجود ہو۔

اس کے علاوہ قرآن پاک نے بڑی سختی کے ساتھ مال و دولت کے احتکار اور اکتناز کو منع فرمایا ہے۔ تاکہ دولت کی گردش رک کر عام لوگوں کی زندگی کو خستہ حال نہ کر دے۔

والذین یکنزون الذھب والفضة ولا ینفقونھا فی سبیل الله فبشرھم بعذاب الیم۔ یوم یحمیٰ علیھا فی نار جھنم فتکویٰ بھا جباھھم و جنوبھم وظھورھم ھذا ماکنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون ٢؎

''اور جو لوگ خزانہ بنا کر رکھتے ہیں سونے اور چاندی کو اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دو جس روز کہ اس مال پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور پیٹھ کو داغا جائے گا (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے واسطے جمع کر رکھا تھا اور اب اسکے جمع کرنے کا مزہ چکھو''۔

اسی طرح قرآن پاک نے خرچ پر بھی پابندی عائد کر دی ہے تاکہ سماج کا کوئی طبقہ اپنی دولت کو عیش و عشرت میں ضائع نہ کرے۔

کلوا واشربوا ولا تسرفوا ٣؎

''کھاؤ پیو اور اسراف نہ کرو''

ولا تبذر تبذیرا، ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین ٤؎

''حد سے تجاوز نہ کرو، بلاشبہ اخراجات میں حد سے تجاوز کرنے والے شیطان کے بھائی ہے''

ان آیات کے اندر اخلاق کے وہ اسباق موجود ہین جو اہل منصب کی رہنمائی کے لئے مدد و معاون ہیں۔ یہ وعیدیں اسلامی ریاست میں مناصب کی بھاری ذمہ داری کا شدید، محکم اور ہر دم زندہ و تازہ احساس رکھنے کے لیے اسلامی حکومت کے حکام کو دی گئی ہیں۔ تاکہ عہدہ جسے دنیا بھر میں منفعت اور مفاد حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی نظام میں بھی اس مقصد کے لئے نہ استعمال ہونے لگے۔ جو شخص ان وعیدوں کی موجودگی میں بھی عہدہ طلب کرتا ہے یا تو اسے آخرت کا ڈر نہیں ہے یا اسے منصب کی ذمہ داری کا پورا پورا شعور نہیں ہے۔ یا پھر اس کی نیت میں فتور ہے۔ اسی لئے خود عہدے کی طلب کو ہی اس عہدے کے لئے نااہلیت کی دلیل قرار دے دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر

ا؎ البقرہ، ۲/۱۶۸　　٢؎ توبہ، ۹/۳۴، ۳۵　　٣؎ الاعراف، ۷/۳۱　　٤؎ الاسراء، ۱۷/۲۶، ۲۷

کے اسے یونہی نہیں چھوڑ دیا ہے کہ وہ جو چاہے کرے اور اس سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

افخسبتم انما خلقناكم عبثاوأنكم الينا لا ترجعون ۱؎

''کیا تم نے سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے''۔

ہر فرد اپنے اعمال کے بارے میں جوابدہ ہے قیامت کے روز اس سے ضروران کاموں کی باز پرس ہوگی۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ جو اقتدار و اختیار اور دنیاوی نعمتیں عطا کی گئی تھی اس نے انہیں کس طرح استعمال کیا۔

ثم لتسئلن يومئذعن النعيم ۲؎

''پھر ضرور اس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں جواب طلبی کی جائے گی''

حضور اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا

وأنكم ستلقونه ربكم فيسألكم عن اعمالكم ۳؎

''اور بے شک تم اپنے رب سے ملاقات کرو گے پھر تمہارے اعمال کے بارے میں پوچھا جائے گا''

اعمال کی پوچھ گچھ میں یہ نہ ہوگا ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرے پر ڈالا جائے۔

ولا تكسب كل نفس الا عليها ولا تزر وازرة وزر أخرىٰ ۴؎

''ہر شخص جو کماتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود ہے کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا''

جس طرح ہر فرد اپنے اعمال و فرائض کا جوابدہ ہے اسی طرح وہ دوسروں سے متعلق اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کے بارے میں بھی جوابدہ ہے۔ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

ألا كلكم راع و كلكم مسؤل عن رعيته فالامام الاعظم الذى على الناس راع وهو مسئول عن رعية ۵؎

''سنو! تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور تم میں سے ہر ایک شخص سے اپنی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ وہ امام جو لوگوں پر نگران ہے اس سے رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی''۔

اس اصول جوابدہی سے کوئی بھی مستثنیٰ نہیں ہے۔ شریعت وقانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ حاکم اور محکوم میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ ہی حاکم کو مسؤلیت کے سلسلہ میں کوئی استثناء حاصل ہے حکمران اور عوام دونوں میں کوئی قانونی امتیاز نہیں۔

حکومت اور اس کے اختیارات اور اموال، خدا اور مسلمانوں کی امانت ہیں جنہیں خدا ترس، ایمان دار اور عادل لوگوں کے سپرد کیا جانا چاہیے۔ اس امانت میں کسی شخص کو من مانے طریقے پر، یا نفسانی اغراض کے لئے تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔ اور جن لوگوں کے سپرد یہ امانت ہو وہ اس کے لئے جواب دہ ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ان الله يامركم ان تؤد والامانٰت الى اهلها واذا حكمتم بين الناس ان تحكموا بالعدل، ان الله نعما يعظكم به ، ان الله كان سميعا بصيرا ۶؎

''اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو، اللہ تمہیں اچھی نصیحت کرتا

۱؎ المومنون، ۲۳/۱۱۵　۲؎ التکاثر، ۱۰۲/۸　۳؎ السیرۃ النبویۃ، ابن ھشام، قسم ثانی ص: ۶۰۳

۴؎ الانعام، ۶/۱۶۴　۵؎ البخاری، الجامع، کتاب الاحکام، حدیث رقم: ۶۶۰۵، مسلم کتاب الامارہ، حدیث رقم ۳۴۰۸　۶؎ النساء، ۴/۵۸

ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے''۔

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

عن عائشة رضي الله عنها قالت قال رسول الله ﷺ اذا اراد الله بالامير خيراً جعل له وزير صدقٍ ان نسی ذکره وان ذکر اعانه واذا اراد الله به غيره ذلك جعل له وزير سوءٍ ان النسی لم يذکره و ان ذکر لم يعنه[۱]

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے آپؐ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ کسی حکمران کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے تو اسے ایک سچا وزیر عطا کرتا ہے کہ جب حاکم بھول جائے تو وہ اسے یاد کرا دے اور اس کے ساتھ تعاون کرے اور جب کسی کے ساتھ اس کے علاوہ ارادہ رکھتا ہو تو اسے برا وزیر دے دیتا ہے۔ کہ جب حاکم بھول جائے تو اسے یاد نہ کرائے اور اس کے ساتھ تعاون نہ کرے۔

علامہ وحید الزمان لکھتے ہیں۔

یہ حدیث ایک اصل عظیم ہے امراء اسلام کے لئے تواریخ کی کتابوں کو دیکھا تو معلوم ہو کہ اکثر بادشاہوں کی حکومت اسی وجہ سے تباہ ہوتی ہے کہ ان کے وزیر اور مشیر نالائق اور برے ہوتے ہیں جن بادشاہوں کے وزیر، مشیر عمدہ اور عقیل ہوتے ہیں ان کی حکومت کو روز بروز ترقی ہوتی ہے ہر بادشاہ کو چاہیے کہ اپنے جلسۂ وزراء میں عمدہ عمدہ، متدین اور ہوشیار لوگ بھرتی کرے جو ملک کے عادات و رسوم سے اور قدیمی سلطنتوں کے حالات اور تدبیر و انتظام اور سیاست مدن سے بخوبی واقف ہوں اور ہر وقت بادشاہ کو نیک صلاح دیں اور بری بات سے باز رکھیں۔

منصب سے مفاد کے ضمن میں نبی کریمؐ کا ارشاد مبارک ہے۔

من ولی لنا عملا ولم تكن له زوجة فليتحذ زوجة ، ومن لم يكن له خادم فليتحذ خادماً، اوليس له مسكن فليتخذ مسكناً ، اوليس له دابة فليتخذ دابة،فمن اصاب سوایٰ ذالك فهو غال او سارق[۲]

''جو شخص ہماری حکومت کے کسی منصب پر ہو وہ اگر بیوی نہ رکھتا ہو تو شادی کر لے اور اگر خادم نہ رکھتا ہو تو ایک خادم حاصل کر لے۔ اگر گھر نہ رکھتا ہو تو ایک گھر لے لے، اگر سواری نہ رکھتا ہو تو ایک سواری لے لے۔ اس سے آگے جو شخص قدم بڑھاتا ہے وہ خائن ہے یا چور''

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں:

من يكن اميرا فانه من اطول الناس حسابا و اغلظه عذابا، ومن لا يكون اميرا فانه من ايسر الناس حساباً و اهونه عذاباً لان الامراء اقرب الناس من ظلم المؤمنين و من يظلم المؤمنين فانما يخفر الله[۳]

''جو شخص حکمران ہو اس کو سب سے زیادہ بھاری حساب دینا ہوگا۔ اور وہ سب سے زیادہ سخت عذاب کے خطرے میں مبتلا ہوگا۔ اور جو حکمران نہ ہو اس کو ہلکا حساب دینا ہوگا۔ اور اس کے لئے ہلکے عذاب کا خطرہ ہے، کیونکہ حکام کے لئے سب سے بڑھ کر اس بات کے مواقع ہیں کہ ان کے ہاتھوں مسلمانوں پر ظلم نہ ہو، اور جو مسلمانوں پر ظلم کرے وہ خدا سے غداری کرتا ہے''۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں

لو هلك حمل من ولد الضان ضياعاً بشاطئ الفرات خشيت ان يسألني الله[۴]

''دریائے فرات کے کنارے ایک بکری کا بچہ بھی اگر ضائع ہو جائے تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ اللہ مجھ سے باز پرس کرے گا''

---

۱ علامہ وحید الزمان، سنن ابوداؤد، ص: ۴۵۸، حدیث رقم: ۱۱۵۸　۲ کنز العمال، ۶/۳۴۶

۳ کنز العمال، ۵/۲۵۰۵　۴ کنز العمال، ۵/۲۵۱۲

مسلمانوں کا یہ ایمان وعقیدہ ہے کہ انبیاء معصوم عن الخطا ہوتے ہیں حضور اکرم ﷺ معصوم عن الخطا تھے۔ اس کے باوجود آپؐ نے حقوق العباد کے معاملہ میں خود کو عام مسلمانوں سے مستثنیٰ نہیں رکھا۔

آپ ﷺ کا ارشاد ہے

انہ قد دنا منی حقوق من بین اظہر کم وانما أنا بشر فأیما رجل کنت اصبت من عرضہ شیئا فھذا عرضی فلیقتض ،وأیمارجل کنت أصب من بشرہ شیئا فھذا بشری فلیقتض،وأیما رجل کنت أصبت مالہ شیئا فھذا مالی فلیأخذ۔ا

"تم میں سے بعض کے حقوق مجھ سے وابستہ تھے۔ میں بھی ایک بشر ہوں اس لئے جس شخص کی آبرو کو میں نے کچھ نقصان پہنچایا ہو تو یہ میری آبرو موجود ہے اسے بدلہ لے لینا چاہیے۔ جس شخص کے جسم کو میں نے کچھ تکلیف پہنچائی ہو تو یہ میرا جسم موجود ہے اسے بدلہ لے لینا چاہیے۔ جس شخص کے مال کو میں نے نقصان پہنچایا ہو تو یہ میرا مال موجود ہے اسے لے لینا چاہیے"۔

اللہ کے نبیؐ نے اسلامی مملکت کے حکمران ہونے کی حیثیت سے حقوق العباد میں خود کو قانون کے سامنے پیش کر کے اس اصول کو بالفعل قائم کر دیا۔ کہ ایک حکمران بھی عام شہری کی طرح قانون کے سامنے جوابدہ ہے۔ ایک بار آپؐ کے ہاتھ مبارک سے لکڑی کا ایک سرا ایک شخص کے منہ پر لگ گیا اور خراش آئی۔ آپؐ نے فرمایا کہ مجھ سے انتقام لے لو۔ ۲

اسلام کی انہی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ اسلامی مملکت کے ایک عام شہری نے حضرت عمرؓ جیسے رعب اور دبدبے والے حکمران وقت کو ایک جلسہ عام میں للکار کر کہا ہم تمہاری بات اس وقت تک نہیں سنیں گے جب تک تم اپنے جسم پر پہنے ہوئے کرتے کے بارے میں جواب نہ دے دو۔ ہر آدمی کو ایک ایک چادر ملی تھی اور حضرت عمرؓ کا حصہ بھی ایک عام مسلمان کے برابر تھا۔ ایک چادر تمہارے کرتے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ حضرت عمرؓ کے کہنے پر آپ کے بیٹے نے وضاحت کی کہ انہوں نے اپنے حصے کی چادر بھی اپنے باپ کو دے دی تھی جس سے یہ کرتا پورا ہوا۔ تب اس شخص نے کہا اب کہو ہم تمہاری بات سنیں گے اور مانیں گے۔ ۳

اسی طرح حضرت عمرؓ جب خلیفہ تھے تو ایک مقدمہ میں عدالت میں پیش ہوئے ابی بن کعب نے حضرت عمرؓ کے خلاف حضرت زید بن ثابت کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ حضرت عمرؓ مدعی کی حیثیت سے پیش ہوئے۔

قرآنی آیات، سنت رسول اور تعامل خلافت راشدہ نے یہ بات شرعاً و قانوناً طے کر دی ہے کہ اسلامی مملکت کا ہر شہری خواہ وہ سربراہ مملکت ہو یا سربراہِ حکومت، انتظامی عہدیدار ہو یا عدالتی افسر یا عام شہری سب اپنے فرائض اور اختیارات کے سلسلہ میں جوابدہ ہیں اور قانون کے سامنے مساوی ہیں۔ کسی کو بھی مسؤلیت اور قانون سے مستثنیٰ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ حکمران کو بیک وقت دو قسم کی مسؤلیتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وہ امت کے سامنے بھی جوابدہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی، وہ ایک عام شہری کی طرح ہر قانون کا پابند ہو گا۔ اور کسی بھی الزام کے ثابت ہو جانے پر وہ قابل مواخذہ ہو گا۔ اور قانون کے مطابق اسے سزا دی جا سکے گی۔

اسلام عہدوں کو ایک اہم ذمہ داری قرار دیتا ہے اور یہ تصور پیش کرتا ہے کہ ہر انسان راعی ہے اور اس سے اس کی رعایا کے متعلق قیامت کے روز پوچھا جائے گا۔ جو شخص جتنی بڑی ذمہ داری اٹھائے گا اور جتنے بڑے عہدہ پر فائز ہو گا اس سے اسی قدر زیادہ حساب مانگا جائے گا۔ اسلام انسانوں کو ذمہ دار بناتا ہے اللہ پوری کائنات کو بنا کر بے دخل نہیں ہو گیا کہ اب انسان جو چاہیں اودھم مچاتے رہیں بلکہ ہر انسان سے اس کے ایک ایک عمل کا حساب لیا جائے گا۔

ا ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، ۶/ ۴۵۵ ۲ شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ، ۲/ ۲۸۵ ۳ محمد حسین ھیکل، عمر فاروق، ص: ۵۹۰

جمہوری نظام حکومت جو کہ ایک لا دینی نظام ہے اس میں خدا کے سامنے جوابدہی کا تصور مفقود ہے۔ بلکہ عہدے اور مناصب تگ ودو سے حاصل کئے جاتے ہیں اور عزت وشرف کا نشان سمجھے جاتے ہیں۔لہذا ہر شخص جائز و ناجائز طریقوں سے حکومت پر قابض ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

آمر، جابر اور ڈکٹیٹر حضرات مختار کل ہوتے ہیں ان کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ ہی اس بات کے لئے کافی ہیں کہ وہ کس قدر خوف خدا سے عاری اور غیر ذمہ دار لوگ ہیں اپنے نفس کے ان پرستاروں نے عوام الناس کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خدا کے صالح بندے ہمیشہ عہدوں اور ذمہ داریوں سے دور بھاگتے رہے ہیں اور اگر ان پر اس قسم کا کوئی بوجھ ان کی خواہش کے خلاف ڈال ہی دیا گیا ہے تو ان کی ساری زندگی اس بوجھ کے نیچے دب کے رہ گئی۔ان کے لئے نہ کھانے پینے میں کوئی لذت باقی رہ گئی اور نہ دوست احباب کے اندر کوئی دلجمعی۔کسی معزز عہدے کے ملنے پر خوشیاں منانا اور جشن کرنا تو الگ رہا۔زندگی کی جو تھوڑی بہت آزادیاں انہیں میسر تھی وہ بھی اسی کے ملنے کے بعد ان سے چھین گئیں۔اس منصب کے ذریعے سے بیوی بچوں کے کروفر اور اعزا واقربا کے شان واعزار میں چار چاند لگانا تو درکنار، اب تک اپنی انفرادی سعی سے جو خدمت ان کی بن آتی تھی، اس منصب کی ذمہ داریوں نے اس سے بھی ان کو محروم کر دیا۔زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کے دین اور ملت کی خدمت کے لئے وقت ہو گیا۔ان کے عزیز قریب سب جیتے جی ان سے بیگانہ ہو کے رہ گئے۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو خلافت کے لئے نامزد فرمایا تو ان کو بلا کہ مندرجہ ذیل نصیحت فرمائی:

> ''میں تم کو ایک نصیحت کرتا ہوں اگر تم اس کو یاد رکھو گے تو موت سے زیادہ کوئی چیز تم کو محبوب نہ ہوگی اور وہ لازماً آنی ہے اور اگر تم اسکو بھلا دو گے تو موت سے کسی طرح نہیں بچ سکتے۔تم پر اللہ کے کچھ حقوق رات میں ہیں جس کو وہ دن میں قبول نہیں کرے گا، اور کچھ حقوق دن میں ہیں جن کو وہ رات میں قبول نہیں فرمائے گا۔اور وہ نفل نہیں قبول کرے گا۔ جب تک کہ تم فرائض ادا نہ کر لو گے۔ہلکی میزان دراصل ان لوگوں کی ہے جن کی میزان قیامت کے روز اس وجہ سے ہلکی ہو کہ انہوں نے دنیا میں باطل کی پیروی کی جو ہلکا اور بے وزن ہے اور جس میزان میں باطل رکھا گیا ہے۔اس کے لئے یہی زیبا ہے کہ وہ ہلکی ہو۔اور بھاری میزان کے لئے دراصل ان لوگوں کی میزان ہے جو قیامت کے دن اس وجہ سے بھاری ہوگی کہ انہوں نے دنیا میں حق کی پیروی کی جو بھاری ہے اور جس میزان میں صرف حق رکھا گیا ہے اس کے لئے یہی زیبا ہے کہ وہ بھاری رہے۔
> اگر تم نے میری یہ نصیحت یاد رکھی تو موت سے زیادہ کوئی غائب تم کو محبوب نہ ہوگا۔اور وہ بہر حال آ کے رہے گی۔اور اگر تم نے یہ نصیحت بھلا دی تو کوئی غائب تم کو موت سے زیادہ مبغوض نہ ہوگا اور تم اس سے بھاگ نہ سکو گے''۔ [1]

اسماء بنت عمیس (حضرت ابوبکر کی بیوی) سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے یہ بھی فرمایا:

> ''میں اپنے پیچھے جو عظیم ذمہ داری چھوڑ کے جا رہا ہوں اس کو سامنے رکھ کر میں نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔تم نے رسول اللہ کی صحبت اٹھائی ہے۔اور دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح اپنی ذات پر

---

[1] قاضی ابو یوسف، کتاب الخراج، ص۔۱۱۰

ہم کو اور اپنے بیوی بچوں کو ترجیح دیتے تھے۔ یہاں تک کہ حضورؐ کے بخشے ہوئے عطیوں کے بچے ہوئے حصہ میں سے ہم حضور ﷺ ہی کے بیوی بچوں کو ہدیے بھیجتے تھے۔ اور تم نے میری صحبت اٹھائی ہے اور یہ دیکھا ہے کہ میں نے اپنے پیش رو کی کسطرح پیروی کی ہے۔ **واللہ ما نمت فملھت ولا توھمت فسھوت وان لعلیٰ السبیل ما زغت** ۔ خدا کی قسم میں کبھی غافل ہو کے نہیں سویا کہ مجھے خواب نظر آتے اور نہ میں نے ہوا میں قلعے بنائے کہ میں بھٹکتا، میں سیدھے راستے پر قائم رہا اس سے کچھ نہیں ہوا) اور سب سے پہلی چیز جس سے اے عمر میں تم کو ڈراتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہر نفس کی ایک خاص طرح کی خواہش ہوتی ہے۔ اگر اس کو وہ خواہش پوری کر دی جاتی ہے تو پھر وہ دوسری کے لئے پاؤں پھیلاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے ان لوگوں سے ہشیار رہنا جن کے پیٹ طرح طرح کے ارمانوں سے پھولے ہوئے ہیں اور جن کے دماغ اونچی اونچی فضاؤں میں پرواز کر رہے ہیں اور جن میں سے ہر شخص اپنی ذات کی بلندی کا خواہاں ہے۔ انہی میں سے ایک کی لغزش کی وجہ سے ان کو سخت حیرانی و پشیمانی پیش آنے والی ہے''۔ [1]

''پس خبردار تم وہ شخص نہ بننا اور اسبات کو خوب یاد رکھو کہ جب تک تم اللہ سے ڈرتے رہو گے۔ یہ لوگ تم سے ڈرتے رہیں گے اور جب تک تم سیدھے رستے پر رہو گے یہ لوگ تمہارے لئے سیدھے رہیں گے''

حضرت عمرؓ نے اس بار کو جیسا کچھ محسوس کیا اس کا ایک سرسری اندازہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ایک بیان سے ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں:

''حضرت عمرؓ کو خنجر مارا گیا، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ امیر المومنین، جنت کی بشارت قبول کیجئے۔ جس وقت لوگوں نے کفر کیا آپ نے اسلام قبول کیا۔ جس وقت لوگوں نے آنحضرت ﷺ کا ساتھ چھوڑا آپ نے ان کے ساتھ ہو کر جہاد کیا۔ رسول اللہؐ جس وقت دنیا سے رخصت ہوئے آپ سے راضی تھے۔ آپ کی خلافت کے بارہ میں دو آدمیوں نے بھی اختلاف نہیں کیا اور آپ کی موت شہادت کی موت ہو رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سب کچھ سننے کے بعد فرمایا۔ جو کچھ کہا ہے ذرا اس کو پھر دہرانا۔ میں نے تعمیل ارشاد کی۔ انہوں نے میری پوری بات سننے کے بعد فرمایا: اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کہ زمین میں جتنا سیم و زر بھی ہے اگر وہ سارا کا سارا مجھے مل جائے تو میں ظاہر ہونے والے دن کے ہول سے بچنے کے لئے فدیہ میں دے دوں گا۔'' [2]

حضرت عمرؓ کی زندگی کا ہر واقعہ اس بات کی شہادت ہے کہ انہوں نے خلافت کی ذمہ داریوں کو ویسا ہی کچھ محسوس کیا جیسا ان کے محسوس کرنے کا حق تھا۔ جس زمانہ میں عام الرمادہ کا مشہور قحط واقع ہوا۔ اس قحط نے اس حقیقت کو پوری طرح آشکارا کر دیا کہ ایک اسلامی

---

[1] قاضی ابو یوسف، کتاب الخراج، ص:۱۲　　[2] قاضی ابو یوسف، کتاب الخراج، ص:۸۷

حکومت کے امیر کی ذمہ داری فی الواقع کیا ہے۔اور حضرت عمرؓ نے اس کو کس طرح محسوس کیا۔

''عام الرمادہ میں لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ کا سرخ وسفید رنگ بالکل سیاہ پڑ گیا ہے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ زمانہ قحط میں رعایا کی تکلیف میں شریک ہونے کے خیال سے انہوں نے اپنے اوپر گھی اور دودھ وغیرہ کی قسم کی چیزیں بالکل حرام کر لی تھیں۔زیادہ تر بھوکے رہتے۔یہاں تک کہ لوگ ان کی حالت کو دیکھ کر کہنے لگے کہ اگر قحط دور نہ ہوا تو حضرت عمرؓ کو رعایا کا غم ہلاک کر ڈالے گا''۔

''قحط کے زمانے میں حضرت عمرؓ نے گھر میں کھانا کھانا ترک کر دیا تھا، باہر بھوکوں کو کھلانے جو چیز پکواتے وہی کھانا عام لوگوں کے ساتھ خود بھی کھا لیتے''

''قحط کی شدت جب بہت بڑھ چکی تھی ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے سامنے گھی میں چورا کی ہوئی روٹی لائی گئی۔انہوں نے ایک بھوکے بدو کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا۔بدو تھالی کے اندر گھی کے ذرے ایک ایک کونے سے تلاش کرتا۔حضرت عمرؓ نے اس کا یہ حال دیکھ کر فرمایا: شاید تمہیں گھی بہت دیر کے بعد کھانے کو ملا ہے۔اس نے کہا: ہاں! اے امیر المومنین، اتنی مدت سے (اس نے کچھ مدت متعین کر کے بتائی) نہ گھی کھایا نہ کوئی اور روغن اور نہ کسی کھانے والے ہی کو دیکھا حضرت عمرؓ نے یہ سنا تو اس قدر متاثر ہوئے کہ قسم کھالی کہ جب تک قحط دور نہ ہوگا نہ گوشت کھاؤں گا اور نہ گھی۔اور اس عہد پر اس وقت تک قائم رہے جب تک قحط دور نہ ہو گیا''۔

''اس عہد پر اس مضبوطی کے ساتھ قائم رہے کہ ایک روز بازار میں دودھ اور گھی بکنے آیا۔ان کے غلام نے چالیس درہم میں اس کو خرید لیا۔جب حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ تم نے بہت گراں خریدا۔جا کر اس کو صدقہ کر دو۔میں اتنا اسراف کر کے کوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔اس کے بعد کچھ دیر سر جھکائے کھڑے رہے اور پھر بولے۔''**کیف یعنینی شأن الرعیة اذا لم یمسسنی ما یمسهم**'' (مجھے رعایا کے دکھ درد کا کیا اندازہ ہو گا اگر مجھ پر وہی کچھ نہ گزرے جو ان پر گزر رہی ہے)[۱]

اس زمانے میں جو سختیاں خود برداشت کیں اور جو سختیاں اپنے بیوی بچوں پر ڈالیں ان کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی رعایا کا کس قدر خیال رکھتے تھے اور خود اپنی جان پر کیا کیا مشکلات برداشت کرتے تھے۔ایسے بہت سارے واقعات ابن سعد نے ''طبقات'' میں روایت کئے ہیں۔ان میں سے بعض یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

''ایک مرتبہ ان کے سامنے گھی میں پکا ہوا گوشت لایا گیا۔اس کے کھانے سے انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ان دونوں میں سے ہر ایک چیز بجائے خود سالن ہے۔پھر اس اسراف کی کیا ضرورت تھی''

''ایک شخص سے پینے کے لئے پانی مانگا۔اتفاق سے اس کے پاس شہد موجود تھا۔اس نے وہ پیش کر دیا۔آپ نے اس کو واپس کر دیا کہ میں اس کو قیامت کے روز حساب میں شامل نہیں کروانا چاہتا''۔

---

[۱] قاضی ابو یوسف، کتاب الخراج؛ ص:۱۱۰

''اپنے بچوں میں سے کسی کے ہاتھ میں خربوزے کی ایک پھانک دیکھ لی۔ اس کے پیچھے بھاگے کہ امیر المومنین کے فرزند، تم خربوزے اڑا رہے ہو اور امت محمدؐ تباہ ہو رہی ہے! بچہ روتا ہوا گھر میں بھاگا جب ان کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ یہ خربوزہ ایک کف دست کھجور کی گٹھلیاں دے کر خریدا گیا ہے تب کہیں جا کر مطمئن ہوئے''

''ایک عورت کو دیکھا کہ راشن میں جو آٹا اور گھی اس کو ملا ہے اسے ملا کر کچھ بنا رہی ہے لیکن اس سے بن نہیں رہا۔ فرمایا اس طرح نہیں اس طرح بناؤ اور یہ کہہ کر اس کے پاس بیٹھ کر خود بنانے لگے''

''حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ گھی کا برتن اور آٹے کی بوری لئے ہوئے ہیں۔ اتنے میں کچھ بھوکے لوگ نظر آئے تو ان کو خود پکا کر کھلایا''

''قحط کی شدت کے نو مہینوں میں یہ معمول رہا کہ لوگوں کو عشاء کی نماز پڑھا کر گھر میں داخل ہوتے اور آخر شب تک گریہ و زاری میں مشغول رہتے اور دعا کرتے کہ اے اللہ اس امت کی تباہی میرے ہاتھوں نہ ہو۔ لیکن جب یہ دعا قبول نہ ہوئی اور آسمان سے پانی کی ایک بوند بھی نہ برسی تو اپنے عمال کو لکھا کہ ایک معین دن میں لوگوں کو لیکر نکلو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اس قحط کو دور فرمائے۔ خود بھی لوگوں کو لے کر نکلے۔ سر پر نبی ﷺ کی چادر مبارک تھی۔ نماز کی جگہ پہنچ کر سب نے خوب رو رو کر دعائیں کیں۔ حضرت عمرؓ خود اس قدر روئے کہ ان کی داڑھی تر ہو گئی۔ عباس بن عبدالمطلبؓ پہلو میں کھڑے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور سر آسمان کی طرف اٹھا کر کہا ''اے اللہ ہم تیرے رسولؐ کے چچا کو تیرے حضور سفارشی بناتے ہیں۔ حضرت عباسؓ نے بھی خوب رو رو کر دعا کی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی''

جس شخص نے اپنی ذمہ داریاں اس سرگرمی اور بے نفسی کے ساتھ ادا کیں کہ تاریخ میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ وہ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود ایک لمحہ کے لئے بھی مطمئن نہیں ہوا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ وہ اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت اٹھائی اور آپ دنیا سے جب تشریف لے گئے تو مجھ سے راضی تھے۔ میں نے ابو بکرؓ کی صحبت اٹھائی اور وہ بھی مجھ سے مطمئن گئے۔ مجھے کسی بات کی بھی پریشانی نہیں ہے۔ بس اگر کوئی پریشانی ہے تو اس امارت کی ذمہ داریوں کی پریشانی ہے۔ اس کے لئے اس قدر پریشان رہتے کہ نہ شب میں آرام فرماتے نہ دن میں۔ جب بعض لوگوں نے توجہ دلائی کہ آپ کی یہ بے آرامی آپ کو کھا جائے گی تو فرمایا: ''کیا کروں اگر شب میں آرام کروں تو میں تباہ ہو جاؤں گا اور اگر دن میں آرام کروں تو رعایا تباہ ہو جائے گی'' اور ان تمام جانبازیوں کا دنیا میں تو کوئی صلہ، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ انہوں نے قبول نہیں فرمایا آخرت میں بھی کسی بڑے صلہ کے مدعی نہ تھے۔ بار بار بس یہی فرماتے تھے ''برابر برابر پر چھوٹ جاؤں تو غنیمت ہے۔ آخری حج کے موقعہ پر منیٰ میں ایک جگہ پر چادر زمین پر بچھا دی اور اس پر لیٹ گئے اور ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر نہایت رقت کے ساتھ یہ دعا فرمائی:

اللهم كبرت سني، ورق عظمي وضعفت قوتي وانتشرت رعيتي
فاقبضني اليك غير عاجز ولا ملوم

''اے خدا میں بوڑھا ہو گیا، میری ہڈیاں چٹخنے لگ گئیں، میری قوت کمزور ہو گئی، میری رعایا بہت پھیل گئی، بس اب تو مجھے اپنے پاس اس حال میں بلا لے کہ نہ میں نا اہل قرار پاؤں اور نہ سزاوارِ ملامت''

خلفائے بنی امیہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز اسلام اور اسلامی روح سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان پر جب امارت کا بارِ گراں ڈالا گیا تو ذمہ داریوں کے احساس نے ان کا جو حال کیا اس سبب سے خلافت سے پہلے اور خلافت کے بعد کی زندگی میں ایک نمایاں فرق ہو گیا۔

''مدینہ کے ایک شیخ نے بیان کیا کہ ''میں نے عمر بن عبدالعزیز کو مدینہ میں دیکھا وہ سب سے زیادہ خوش پوشاک، سب سے زیادہ خوشبو لگانے والے، سب سے زیادہ اکڑ کر چلنے والے تھے۔ پھر میں نے ان کو خلیفہ ہونے کے بعد دیکھا کہ ان کا چلنا بالکل راہبوں کے چلنے کی طرح ہو گیا۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ انداز رفتار ایک فطری چیز ہے۔ اس میں تغیر ممکن نہیں۔ تو حضرت عمر بن عبدالعزیز کا تغیر حال اس دعویٰ کی کھلی تردید ہے'' [۱]

---

[۱] قاضی ابو یوسف، کتاب الخراج، ص:۱۰

فصل پنجم

پاپائیت کے تصور سے جداگانہ تصور

اسلامی مملکت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرم ﷺ کے منشاء کو پورا کرنے کے لیے منصۂ شہود پر نمودار ہوتی ہے اس کی ہر طرح کی قانون سازی کی اساس قرآن وسنت ہیں جو کہ نا قابل تنسیخ وتبدل ہیں۔ اس کے باوجود ایسی مملکت وحکومت پر پاپائیت یا مذہبی حکومت کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ اسلام مذہب و دین کے نام پر کسی فرد گروہ یا ادارہ کو اجارہ داری کا پرمٹ جاری نہیں کرتا۔ اسلامی مملکت میں دین کے نام پر کوئی مراعات یافتہ یا اجارہ دار طبقہ نہیں جو دینی احکامات کے بارے میں سیاہ وسفید کا مالک ہو۔

محمد اسد اپنی تصنیف "The Principles of State and Government in Islam" میں لکھتے ہیں۔

Every adult Muslim has the right to perfrom each and every religious function, no person or group can legitimately claim to possess any special sanctity by virtue of the religious functions entrusted to them. Thus the terms 'theocracy' as commonly understood in the west is entirely meaningless within the Islamic environment." **1**

''ہر مسلمان جو کہ بالغ ہو یہ حق رکھتا ہے کہ وہ مذہبی رسم ادا کرے۔ کوئی آدمی یا گروہ قانونی طور پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لئے کسی خاص تقدس کا درجہ ومقام رکھتا ہے۔ لہٰذا 'تھیاکریسی' کے بارے میں جس انداز سے مغرب میں سوچا جاتا ہے وہ اسلامی طرزِ زندگی میں بے معنی ہے''

اسلامی ریاست میں مذہبی حکومت (تھیاکریسی) کے الزام کو رد کرتے ہوئے سید مودودی کہتے ہیں کہ مغربی اصطلاح میں مذہبی حکومت دو بنیادی تصورات کا مجموعہ ہوتی ہے۔

۱۔ قانونی طور پر اللہ تعالیٰ کی بادشاہت وحکمرانی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

۲۔ پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کا ایک طبقہ اللہ تعالیٰ کا نمائندہ اور ترجمان بن کر اس بادشاہت کو قانونی وسیاسی حیثیت سے عملاً نافذ کرواتا ہے۔

اسلام کے نظام سیاسی میں پہلے جزو کو تسلیم کیا جاتا ہے یعنی یہ کہ حاکمیت واقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوگا۔ لیکن دوسرے جزو کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات کے سوا کسی فقیہہ، امام ولی یا عالم کا یہ رتبہ نہیں کہ اس کے قول وفعل کو حکم خداوندی کی حیثیت سے بے چون وچرا مان لیا جائے۔ اس صریح فرق کے ہوتے ہوئے اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح میں مذہبی حکومت کہنا غلط ہے۔ ۲

اسلام اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نیابت وترجمانی کا حق کسی فرد یا طبقہ کی بجائے پوری امت مسلمہ کو دیتا ہے ارشاد ربانی ہے۔

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنهون عن المنكر ۳

''تم وہ بہترین امت ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو''

اسلام سے قبل دیگر مذاہب کے لوگوں نے اپنے مذہبی علماء کو اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ ان کی ہر جائز وناجائز بات کو شریعت سمجھ کر

۱۔ The Principles of State and Government in Islam, P:21

۲۔ اسلامی ریاست، ص: ۴۸۰ ۳۔ آل عمران، ۳/۱۱۰

من وعن تسلیم کرلیا جاتا تھا۔ ان کی ہر بات حکم الٰہی اور قانون تصور کی جاتی۔ قرآن مجید میں اس کا ذکر یوں کیا گیا ہے۔

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ [۱]

انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا معبود بنالیا۔

اس ضمن میں حضرت عدی بن حاتم طائی سے روایت ہے۔

عن عدی بن حاتم الطائی قال اتیت النبی و فی عنقی صلیب من ذھب فقال یا عدی اطع عنك ھذا الوثن و سمعتہ یقرا فی سورة براء ة اتخذوا احبارھم ورھبانھم ارباباً من دون اللہ قال اما انھم لم یکونوا یعبدونھم ولکنھم کانوا اذا احلو شیاً استحلوہ واذا مرحوا علیھم شیاً "ھذا حدیث حسن غریب" [۲]

"حضرت عدی فرماتے ہیں کہ میں جب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس وقت میرے گلے میں سونے کا صلیب تھا آپ ﷺ نے فرمایا "اے عدی اس بت کو پھینک دو آپ ﷺ اس وقت سورۃ برات کی یہ آیت پڑھ رہے تھے انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوائے اپنا رب بنالیا تھا۔ فرمایا خوب سمجھ لو! کہ یہ لوگ ان کی پرستش نہیں کرتے تھے لیکن ان کے یہ علماء اور بزرگ جب کسی چیز کو حلال ٹھہراتے تو ان کے یہ پیروکار اس کو حلال سمجھتے تھے"

اسلام نے جس بت کو " **اربابامن دون اللہ**" کہہ کہ خود پاش پاش کر دیا ہو بھلا وہ اس کی دوبارہ پوجا کی اجازت تو کجا اپنے دامن میں جگہ تک کیسے دے سکتا ہے۔ یہ مقصد کائنات میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے منہ موڑ کر پورا نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان ان سے پوری طرح فائدہ اٹھائے مگر ان میں گم ہو کر نہ رہ جائے۔ پاپائیت میں تقویٰ کا معیار یہ ہے کہ انسان اس دنیا اور اس کے جملہ مسائل سے بے رغبتی اور بے تعلقی اختیار کر کے خداوند تعالیٰ کی رضا تلاش کرے۔ اس کے برعکس اسلام یہ کہتا ہے کہ نیکی دنیا کو ترک کر دینے میں نہیں بلکہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں رہتے ہوئے خدا کی نعمتوں سے بھرپور استفادہ کرنے میں اس کی خوشنودی کو ملحوظ خاطر رکھے۔

چنانچہ قرآن حکیم میں بڑی صراحت سے کہا گیا ہے۔

یا یھاالناس کلوا ممافی الارض حلالا طیباً ولا تتبعوا خطوات الشیطن انہ لکم عدو مبین ہ انما یامرکم بالسوءِ والفحشاءِ وان تقولوا علی اللہ ما لا تعلمون [۳]

"اے لوگو! جو کچھ زمین میں حلال اور پاک ہے اس میں سے کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے وہ تو تمہیں بدی اور بے حیائی اور خدا کے بارے میں ایسی باتیں کرنے کا حکم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے"۔

یایھاالذین اٰمنوا لا تحرموا طیبٰت ما احل اللہ لکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین و کلوامما رزقکم اللہ حلالاً طیباً واتقوا اللہ الذی انتم بہ مومنون [۴]

"اے ایمان لانے والو! جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں ان کو اپنے اوپر حرام نہ کرو، اور حد سے نہ گزرو کہ اللہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ان پاک اور حلال چیزوں میں سے کھاؤ جو اللہ نے تمہیں عطا کی ہیں اور اس خدا کے غضب سے ڈرو جس پر تم ایمان رکھتے ہو"۔

قل من حرم زینة اللہ التی اخرج لعبادہٖ والطیبٰت من الرزق [۵]

"کہو کہ کس نے اللہ کی اس زینت اور پاکیزہ روزی کو حرام کیا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے نکالی ہے"۔

۱۔ التوبہ، ۹/۳۱		۲۔ محمد بن عیسیٰ امام ترمذی، جامع ترمذی، کتاب تفسیر سورہ توبہ، حدیث رقم: ۳۰۹۵

۳۔ البقرہ، ۲/۱۶۸، ۱۶۹		۴۔ المائدہ، ۵/۸۷، ۸۸		۵۔ الاعراف، ۷/۳۲

ورھبانیۃ ن ابتدعوھا ما کتبنٰھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ ۱

''اور رہبانیت کا طریقہ جو مسیح کے پیروؤں نے خود نکال لیا تھا وہ ان پر ہم نے لازم نہیں کیا تھا۔ ہم نے صرف رضائے الٰہی کے حصول کا حکم دیا تھا''۔

ان الرھبانۃ لم تکتب علینا ۲　　''بے شک رہبانیت ہم پر لازم نہیں''

لا صرورۃ فی الاسلام ۳　　''اسلام میں تجرد نہیں''

خداوند تعالیٰ کا یہ فرمان اور نبی آخر الزمان کی تصریحات اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ اسلام کی نظر میں رفعت اخلاق یہ نہیں کہ انسان اس دنیا کو چھوڑ دے، اس کی لذتوں اور زینتوں کو اپنے اوپر حرام کر لے۔ اس کے برعکس اسے یہ بات ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ یہ دنیا انسان ہی کے لئے بنائی گئی ہے اور اس کا فرض یہ ہے کہ اس کو برتے اور خوب برتے۔ مگر برے اور بھلے، حق و ناحق کو جان کر برتے۔ خدا نے اسے شعور اور آگہی کی جو قوتیں عطا کی ہیں ان سے کام لے اور اپنے عمل سے ثابت کردے کہ وہ ترغیبات کے ہجوم میں رہتے ہوئے بھی خدا کی یاد سے غافل نہیں ہوا۔ یہ دنیا دار العمل ہے اور اس میں جو شخص اپنے باعمل ہونے کا ثبوت پیش نہیں کرتا وہ اپنے مقصد تخلیق کو بالکل ضائع کر دیتا ہے۔ اسلام میں بندگی صرف کسی غار میں بیٹھ کر ذکر و اذکار میں انہماک کا نام نہیں بلکہ یہاں زندگی کی کشاکش، بازاروں کے شور وشعب اور کاروبار کی مصروفیت میں رہ کر خدا کو نہ بھولنا اصلی عبادت ہے۔

رجال لا تلھیھم تجارۃ و لا بیع عن ذکر اللہ و اقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ یخافون یوما تتقلب فیہ القلوب والابصار ۴

''وہ جوانمرد جن کو تجارت اور خرید و فروخت اللہ کی یاد اور نماز کے قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے غافل نہیں کرتی وہ اس دن سے ڈرتے ہیں جن میں دل اور نگاہیں پلٹ جائیں گی''

یہاں صرف خدا کی یاد اور اس کی عبادت پر اکتفا نہیں بلکہ نماز کے بعد کسب معاش حصول رزق اور محنت و تجارت کی بھی ترغیب ہے اور انہیں بھی فرائض میں شامل کیا گیا ہے۔

فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ ۵

''جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کی تلاش کرو''

یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس ریاضت کو بھی پسند نہیں کیا جس میں انہماک انسان کو اس کے دنیاوی حقوق فراموش کرا دے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو جو مسلسل روزہ رکھتے تھے اور رات رات بھر نمازیں پڑھتے تھے یہ نصیحت فرمائی۔

فان لجسدک علیک حقاً وان لعینک حقا وان لزوجک علیک حقا صم و افطر ۶

''تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے تمہاری آنکھوں کا بھی حق ہے۔ تمہاری بیوی کا بھی حق ہے۔ کسی دن روزہ رکھو کسی دن نہ رکھو''

اسلام کائنات اور زندگی کے متعلق جو نقطۂ نظر رکھتا ہے اس کا اثر زندگی کے ہر پہلو پر نمایاں ہے۔ تھیا کریسی نے انسانی زندگی کو دو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے، ایک خدا کا اور دوسرا قیصر کا، اور ان دونوں کا آپس میں کوئی میل نہیں۔ نیکی، راست بازی اور صالحیت صرف خدا کے لئے ہے۔ باقی رہے امورِ دنیا تو ان میں انسان کو پوری آزادی ہے۔ وہ جس طرح چاہے عمل کرے اسی وجہ سے پاپائیت نے عبادت کا

۱　الحدید، ۵۷/۲۷　　۲　احمد بن حنبل، مسند، ۶/۲۲۶　　۳　(تخریج) مشکوٰۃ، کتاب المناسک، ص:۲۲۲

۴　النور، ۲۴/۳۷　　۵　الجمعہ، ۶۲/۱۰　　۶　بخاری، الجامع، حدیث رقم:۱۸۷۴، مسلم، الجامع، حدیث رقم:۱۱۵۹، نسائی، سنن، حدیث رقم ۲۶۹۹

یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ یا تو انسانوں کا ایک مخصوص گروہ صرف پوجا پاٹ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دے، یا جماعت کا ہر فرد اپنے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت خدا کے ذکر کے لیے نکالے اور پھر سمجھ لے کہ اس نے خدا کا حق ادا کر دیا ہے۔ اسلام اس تصورِ عبادت اور دین اور دنیا کی اس تفریق کو سراسر باطل سمجھتا ہے اس کا انسان سے مطالبہ یہ ہے کہ اس کی ساری زندگی اس کے سارے اوقات ایک خدا کی چاکری میں گزریں۔ وہ اپنے آپ کو دائمی اور ہمہ وقت ملازم سمجھے اور اس کی اس حیاتِ مستعار کا ہر لمحہ خدا کی عبادت میں صرف ہو۔ اس کا سونا، جاگنا، اس کا کھانا پینا، اس کا چلنا پھرنا، غرض اس کے سارے افکار و اعمال سب کے سب خدا کے قانون شرعی کے پابند ہوں۔ اسے اپنی نجات کے لئے کسی خلوت کدے میں گوشہ نشینی، یا کسی سنسان جنگل میں چلہ کشی کی ضرورت نہیں۔ اس کی فلاح کا مدار اس بات پر ہے کہ وہ حیات اجتماعی سے بھاگ کر نہیں بلکہ اس کے ساتھ رہ کر اپنے خالق سے اپنی محبت اور وفاداری کا ثبوت پیش کرے۔ اس کی نجات کا راز فرار میں نہیں بلکہ اس میں ہے کہ ہر قسم کے دنیاوی تعلقات، ذمہ داریوں اور امانتوں کے ساتھ خوف و لالچ، امید و بیم کے ماحول میں رہ کر اپنے پیدا کرنے والے کی منشاء کو پورا کرے۔ اسلام نے روحانی ترقی اور خدا کی یافت کا جو طریقہ بتایا ہے وہ یہ ہے کہ خدا اس کو انسانوں کے درمیان، دنیوی زندگی کے ہنگامہ کارزار میں ملے گا۔ جنگلوں اور ویرانوں میں نہیں۔ اسلام نے دین و دنیا کی تفریق کو مٹا دیا ہے۔ مسلمان کی دعا ہمیشہ یہی ہوتی ہے۔

ربنا اٰتنافی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة وقنا عذاب النار[۱]

''اے ہمارے پروردگار ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی ہم کو جہنم کی آگ سے بچا''

---

[۱] البقرہ، ۲/۲۰۱

فصل ششم

عصری تصورات قیادت کے ساتھ موازنہ اور نتائج

جمہوری نظام حکومت میں قوت کا سرچشمہ عوام کو قرار دیا جاتا ہے کہ عوام براہ راست یا بالواسطہ سربراہ ریاست کا انتخاب کرتے ہیں۔ نظام حکومت چلانے کے لئے اس کو کچھ ذمہ داریاں اور اختیار تفویض کرتے ہیں۔ ان اختیارات کو سربراہ عوام کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ اگر حکمران ان اختیارات سے انحراف کرتا ہے تو عوام براہ راست اور اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے احتساب ومواخذہ کرتے ہیں

یورپ کا نظام جمہوریت کچھ الگ رنگ رکھتا ہے۔ البتہ ساری جمہوری دنیا پر نظر ڈالنے سے نمایاں ممالک امریکہ، برطانیہ اور فرانس نظر آتے ہیں۔ اب ہم ان ممالک کے عملی صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں۔

امریکی قیادت

امریکی نظام حکومت میں قائد ریاست صدر ہوتا ہے جسے عوام براہ راست منتخب کرتے ہیں۔

ایچ۔ جے۔ لاسکی امریکی صدر کے متعلق لکھتے ہیں

صدر ایسا آدمی ہونا چاہیے جو لوگوں کو ضبط میں رکھ سکے۔ اس میں اتنی استعداد ہو کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے مطلوبہ اوصاف کے آدمیوں کو چن سکے۔ وہ اتنا معاملہ فہم اور زیرک ہو کہ فیصلوں کو جلد از جلد سرانجام دے سکے۔ اتنی قابلیت ہو کہ حکومت کے مختلف شعبوں اور مختلف کاموں کو ہم آہنگ کر سکے نیز اس میں اہم اور غیر اہم امور میں امتیاز کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔[۱]

معیاد عہدہ: صدر کو چار سال کے لئے منتخب کیا جاتا ہے اور اس عرصہ کے خاتمہ سے پیشتر وہ مستعفی ہو کر یا موت کی صورت میں عہدے کی معیاد ختم ہو جاتی ہے یا پھر اسے مواخذہ کے ذریعے عہدہ سے سبکدوش کیا جا سکتا ہے۔[۲]

خصوصی مراعات: سربراہ مملکت ہونے کی حیثیت سے صدر کو خاص مراعات حاصل ہوتی ہیں۔

۱۔ کسی بھی جرم کی پاداش میں گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ صدر کا مواخذہ کانگرس کر سکتی ہے۔

۳۔ صدر کے ذاتی تحفظ کا پورا پورا انتظام کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ بھاری تنخواہ اور دیگر مراعات دی جاتی ہیں۔

۵۔ سفر کے خرچ سرکاری تقریبات اور وائٹ ہاؤس کے اخراجات کے لئے سالانہ بجٹ سے بھاری رقم مختص کی جاتی ہے۔[۳]

امریکی صدر کے اختیارات

پروفیسر لاسکی امریکہ کے صدر کے متعلق لکھتا ہے۔

۱؎ Harold. J. Laski, The American Persidency; P.39-41

۲؎ محمد سرور، جدید حکومتیں، ص:۱۸۹

۳؎ Albert. B. Saye. Principles of American Government. P.233

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا صدر ایک بادشاہ سے زیادہ طاقتور بھی ہے اور کم بھی' اس طرح ایک وزیر اعظم سے ایک لحاظ سے زیادہ اختیارات کا حامل ہے اور ایک لحاظ سے کم۔ جتنا زیادہ اس منصب پر غور کیا جائے اتنا ہی اس کا انوکھا کردار ظاہر ہوگا۔ [۱]

مزید پروفیسر لاسکی امریکی صدر کے فرائض و وظائف کے متعلق لکھتے ہیں۔

صدر کے وظائف کا دائرہ بڑا وسیع ہے وہ رسمی طور پر ریاست کا سربراہ ہوتا ہے۔ قانون سازی کا اہم اور مرکزی سر چشمہ ہوتا ہے وہ تمام امور کا منبع اور قوم کی خارجہ پالیسی کا با اختیار مظہر اور نمائندہ ہوتا ہے وہ پوری قوم کا واحد نمائندہ اور اپنی سیاسی جماعت کا سربراہ کہلوانے کی وجہ سے ایسی حیثیت اور منصب کا حامل ہوتا ہے کہ رعایا کا کوئی آدمی اس پر فضیلت نہیں لے جا سکتا۔ [۲]

برطانوی قیادت

برطانوی نظام حکومت میں پارلیمانی نظام حکومت رائج ہے۔ حکمران (بادشاہ/ ملکہ) کو محض دستوری سربراہ کی حیثیت حاصل ہے۔ جب کہ تمام اختیارات جو کسی زمانہ میں تاجدار بذات خود استعمال کرتا تھا۔ بتدریج دوسرے اداروں کی طرف عملی طور پر منتقل ہوتے چلے گئے۔ یہ سب ادارے تاج ہی کے ایما پر ان اختیارات کا استعمال کرتے ہیں۔ یعنی آئینی اعتبار سے اب بھی حکومت کے تمام اختیارات کا سر چشمہ حکمران کی ذات ہے۔ تاج اور تاجدار کے فرق کی نوعیت اس مقولے سے واضح ہو جاتی ہے۔

The King is dead, Long live the king.

یعنی تاجدار کی وفات کے بعد بادشاہت بطور ایک ادارہ قائم و دائم رہتی ہے [۳]

برطانوی وزیر اعظم کے اختیارات و نوعیت

برطانیہ میں دوسرا سربراہ وزیر اعظم ہوتا ہے۔ وزیر اعظم تمام وزرا کا تقرر کرتا ہے۔ وہ کسی بھی وزیر کو مستعفی ہونے پر مجبور کر سکتا ہے اگر چہ قانونی طور پر تو تاجدار وزراء کی تقرری اور برطرفی کے احکامات جاری کرتا ہے۔ لیکن عملی طور پر اس اختیار کا استعمال وزیر اعظم کرتا ہے۔ جب وہ کسی وزیر کو برطرف کر کے کسی دوسرے فرد کو اس کی جگہ تعینات کرنا چاہے تو وہ دونوں متعلقہ افراد کو اطلاع کر دیتا ہے۔ یعنی اسے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں مثلاً ہیرلڈ میکملن (Harold Mecmillan) نے بیس ارکان میں سے سات وزراء کو برطرف کر دیا۔ عملاً برطانیہ کا وزیر اعظم انتہائی با اختیار ہے اور حکومتی امور میں فیصلہ کرنے میں اسے اجازت درکار نہیں ہوتی البتہ ایسے فیصلوں پر تاجدارِ برطانیہ کی رسمی توثیق ضروری ہے۔

فرانسیسی قیادت

فرانس کا نظام حکومت نہ تو خالصتاً پارلیمانی ہے اور نہ ہی صدارتی یا آمرانہ، پارلیمنٹ موجود ہے اسی طرح نظام حکومت کے بعض اصول تو جمہوری ہیں۔ لیکن کئی اصولوں کو جمہوری قرار نہیں دیا جا سکتا۔

آئین کی رو سے صدر کو قانون میں ترمیم کا اختیار نہیں ہے

جمہوریہ کے آئین کے تحت صدر جمہوریہ کی حیثیت دستوری سربراہ مملکت سے زیادہ نہیں۔

۱۔ H.J.Laski.The American Presidency.p.23

۲۔ Ibid, P.25　　۳۔ William Bemett Murro, The Government of Europe. P. 37-38

جمہوریہ کے آئین کے تحت صدر کو روایتی اختیارات حاصل ہیں۔یعنی وہ اعلیٰ سول اور فوجی حکام کا تقرر اوران کا خیر مقدم، وزارتی کونسل کی صدارت، حکم ناموں کا اجرا اور دفاعی افواج کی نگرانی کرتا ہے۔

نئے اختیارات کے تحت صدر وزیر اعظم کا تقرر کرتا ہے اور دیگر وزراء کا بھی تقرر کرتا ہے صدر وزیر اعظم کو برطرف بھی کرسکتا ہے وہ وزیر اعظم کے مشورے سے دوسرے ممالک سے معاملات کرتا ہے۔ملک کی مسلح افواج کے کمانڈر ان چیف کا عہدہ بھی اس کے پاس ہے اور قومی اسمبلی کی رضامندی سے اعلان جنگ کرسکتا ہے۔اصل اعلان جنگ اس کے دستخطوں سے ہوتا ہے۔

اسلامی قیادت

اسلامی نقطہ نظر سے تمام اختیارات کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ وہی ہر چیز کا مالک اور وہی قانون ساز ہے۔انسان کی حیثیت اس کائنات میں اس کے خلیفہ اور نائب کی ہے۔

۱۔　اسلامی سربراہ مملکت اللہ کے خلیفہ کی حیثیت سے حکومت کا نظام چلاتا ہے وہ خودسر نہیں ہوتا بلکہ اس کائنات کے خالق کے قوانین کا نفاذ اس کے نائب کی حیثیت سے کرتا ہے۔اس کے برعکس باقی نظاموں میں یہ بات نہیں ہے۔

۲۔　اسلامی سربراہ مملکت کے انتخاب میں تقویٰ کو معیار مقرر کیا گیا ہے۔

ان اکرمکم عند الله اتقکم[۱]

یعنی اسلام میں صرف وہ شخص ہی مسلمانوں کا سربراہ مملکت ہوسکتا ہے جو تقویٰ پرہیزگاری اور سمجھ بوجھ میں سب سے آگے ہو۔

۳۔　اسلامی سربراہ مملکت کو جواب دہی کا تصور دیا جاتا ہے کہ وہ قیامت کے دن پر اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں مسؤل ہے۔

۴۔　اسلامی سربراہ مملکت کی حیثیت قوم کے سردار کی نہیں خادم کی ہے۔

۵۔　اسلامی سربراہ مملکت اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکامات نظر انداز نہیں کرسکتا۔

۶۔　کتاب وسنت کی حدود وقیود کا پابند ہوتا ہے۔

۷۔　اسلام میں سربراہ مملکت کی اطاعت اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ مشروط ہوتی ہے یعنی وہ اسی وقت تک عوام کی اطاعت کا مستحق ہے جب تک وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے۔

۸۔　اسلامی سربراہ مملکت شریعت میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔

۹۔　اسلامی سربراہ مملکت کی حیثیت ایک امین کی سی ہے۔وہ اموال حکومت ذاتی تصرف میں نہیں لاسکتا۔

۱۰۔　اسلامی سربراہ مملکت اپنی مرضی سے قانون نہیں بناسکتا۔وہ اللہ کی حدود کا پابند ہوتا ہے۔

۱۱۔　مملکت اسلامیہ کا سربراہ اگر جرم کرے تو عام شخص کی طرح قابل مواخذہ ہے۔

۱۲۔　سربراہِ مملکت کو عدلیہ کے مقابلے میں کوئی تحفظ حاصل نہیں۔

۱۳۔　مملکت اسلامیہ کا سربراہ دین کے نفاذ کا پابند ہو۔

۱۴۔　مسلمانوں کا سربراہ پابند ہے کہ کفر کا انسداد کرے اور دین اسلام کی سچائی کو تمام ادیان پر غالب کرے

۱۵۔　عدل کا نظام قائم کرے

۱۔　الحجرات، ۴۹/۱۳

۱۶۔ معاشرے کی فلاح و بہبود کا خیال رکھے۔

جائزہ: اسلام کا پیغام انسانیت، ہر انسان کے لیے ہے اس سے قطع نظر کہ وہ کہاں پیدا ہوا ہے اور کس نے اسے جنم دیا، یہ پیغام مکمل مساوات اور انسانی رتبے کے احترام کو ملحوظ رکھتا ہے۔ قرآن کے مطابق ''پوری انسانیت ایک فرد واحد کے ذریعہ تخلیق ہوئی ہے'' [۱] اور ''اللہ کی نمائندہ اور زمین پر اس کی وارث ہے''۔[۲] ''یہ انسان کے نیک اعمال ہیں جو اللہ کے نزدیک معیاری اور پسندیدہ ہیں۔ رنگ، ذات، زبان وغیرہ محض انسان کی شناخت کا ذریعہ ہیں اور تفریق کی کوئی بنیاد نہیں''۔[۳] حجۃ الوداع کے موقع پر دیا ہوا حضور اکرم ﷺ کا خطبہ اللہ کے احکام کی مزید تشریح و توضیح کرتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اس پیغام کو انسان کی آنے والی نسلوں تک منتقل کیا جائے۔

> ''لوگو! سن لو، کسی عرب کو کسی غیر عرب پر کوئی فوقیت نہیں، کوئی غیر عرب، کسی عرب سے برتر نہیں، گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں۔ سب آدمؑ کی اولاد ہیں۔ یہ نیک عمل ہے جو انسان کو انسان سے ممیّز کرتا ہے۔ آپس میں انصاف اور نرمی کرو۔ جو خود کھاتے ہو، دوسروں کو کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو دوسروں کو پہناؤ''

تمام پیغمبروں نے انسانوں تک اللہ کا ایک ہی پیغام پہنچایا ہے کہ ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ قادر مطلق ہے، حکمت والا ہے''[۴] حضرت محمد ﷺ پوری انسانیت کے لئے پیغمبر تھے، صرف ان کے لئے نہیں جو آپؐ پر ایمان لائے: ''اے لوگو! میں تم سبھوں کے لئے رسول ہوں''[۵]

''قرآن ان کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے نازل ہوچکی ہیں اور یہ ان تمام کتابوں کی تفصیل ہے جو پہلے گزر چکی ہیں''[۶] رسول اکرم ﷺ نے کسی نئے مذہب کی تبلیغ نہیں کی۔ ''وہ حق لے کر آئے اور اگلے پیغمبروں کے پیغامات کی تصدیق کی''۔[۷] لہذا، اسلام، تسلسل، تصدیق اور تکمیل ہے، ان سارے پیغامات کی جو اس سے قبل دوسرے پیغمبر لے کر آئے۔ اس طرح اسلام کے ہمہ گیر پیغامِ انسانیت کی خبریں اللہ کے ان ہمہ گیر پیغامات کی خبروں سے مضبوطی سے جڑی ہوئی ہیں جو وقتاً فوقتاً انسانیت کو پہنچائے جاتے رہے۔

اخوت کا یہ اسلامی پیغام اپنے الفاظ و معانی میں اس قدر اثر انگیز اور انقلابی تھا کہ اس نے فارس و رومن تہذیبوں میں جو اسلام کے آغاز میں دنیا پر حاوی تھیں۔ ایک طوفان برپا کر دیا اور انسانی معاشرے کو پوری دنیا میں بشمول جزیرہ نمائے عرب بدل کر رکھ دیا۔ رومی سلطنت کے صوبوں میں ایک صوبہ شام میں تھا جو جزیرہ نمائے عرب کا ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ اس کے علاوہ بہت سارے قبائلی اتحاد اور حد بندیاں جو جزیرہ نمائے عرب کا حصہ تھیں شام کی سرحد سے لگی ہوئی تھیں۔ سلطنت فارس بھی عرب پر ایک مضبوط اور اہم قلعے عراق کے ذریعہ عرب پر اپنا مستحکم اثر رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ ایران کے لوگ بت پرستی میں عرب والوں کے شریک تھے۔ اس وقت دنیا کا بادشاہی نظام اپنے طور طریقوں سے ایک انتہائی ظالمانہ نظام تھا۔ جس میں معاشرے کی محدود اشرافیہ ساری مراعات پر قابض تھی۔ اور عوام کی اکثریت ان کی طاقت تلے دبی ہوئی تھی۔ جہاں چند لوگوں کی آسائش و آرام بہت سارے لوگوں کے خون پسینے کے عوض تھا۔ ایرانی معاشرہ ظالم ترین تفریق کے درمیان کراہ رہا تھا ریاست نے عوام پر شہزادوں اور رؤسا کی جائیدادیں خریدنے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ معاشرے کے عام آدمی اور رؤسا کے درمیان کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ معاشرے کے مختلف طبقات کے درمیان ایک نہ عبور کیا جانے والا پل حائل تھا۔

۱۔ النساء، ۴/۱	۲۔ الانعام، ۶/۱۶۵	۳۔ الحجرات، ۴۹/۱۳	۴۔ آلِ عمران، ۳/۶
۵۔ الاعراف، ۷/۱۵۸	۶۔ یونس، ۱۰/۳۷	۷۔ الصفت، ۳۷/۳۷

''ایران کے بادشاہوں کا دعویٰ تھا کہ ان کی رگوں میں خدا کا خون دوڑتا ہے، فارس کے لوگ اپنے بادشاہوں کو خدا مانتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ ان بادشاہوں کی سرشت میں کچھ مخصوص تقدس اور الوہیت ہے۔ وہ ان سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے تھے اور ان کی خدائی کی حمد وثنا گاتے تھے۔ یہ کس قدر انقلابی تبدیلی ہے جو اسلام میں نظر آتی ہے جہاں حکمران عوام میں سے ہوں اور ان کی اتباع اس وقت تک کی جائے جب تک وہ خود اللہ اور اس کے رسولؐ کی اتباع کرتے رہیں اور جب بھی حکمران اور عوام کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے تو معاملہ قرآن وسنت کے حوالے کر دیا جائے ۱

اسلام کے پہلے خلیفہ راشد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسی قرآنی فیصلے کا خلیفہ بنتے ہی اعلان کر دیا یعنی لوگ ان کی اتباع اسی وقت تک کریں جب تک وہ خود اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اتباع کرتے رہیں۔ انہوں نے خود کو عوام کے حقوق کا محافظ اور نگران قرار دیا۔

''رومن تہذیب کی بنیاد اس تعیش پر تھی کہ غلام جو آبادی کا تین چوتھائی تھے، امراء کی خدمت کے لئے ہیں قانون میں بھی غلام اور آقا کے درمیان، امراء اور غرباء کے درمیان تفریق تھی'' رومن قوانین جو باضابطہ طور پر دیوانی قوانین کی ایک مرتب دستاویز تھی اور جو Justinian Code کے نام سے مشہور تھی، اس نے بھی غلام اور آقا، امراء اور غرباء کے درمیان تفریق رکھی ہے، حالاں کہ Justinian ایک کٹر عیسائی تھا اور جس نے بازنطینی سلطنت سے لادینیت ختم کرنے کی کوشش کی اور جس نے قسطنطنیہ کا مشہور گرجا گھر صوفیہ تعمیر کرایا۔ رومن تہذیب کی معروف دستاویز Justinian Code تہذیب کا یہ اعلیٰ معیار پیش کرتی ہے:

> ''جو بھی کسی بیوہ یا کنواری دوشیزہ کی آبروریزی کرے، اس کی سزا امراء کے لئے یہ ہے کہ ان کی دولت کا نصف حصہ ضبط کر لیا جائے اور اگر کسی غریب نے یہ حرکت کی ہو تو اسے کوڑے لگائے جائیں اور ملک بدر کر دیا جائے''۲

اس سے فوری طور پر حضرت محمد ﷺ کی وہ اعلیٰ روایت ذہن میں ابھر آتی ہے جب ایک معزز خاندان کی خاتون چوری کی مرتکب ہوئی تو آپ کے بعض قریبی صحابہؓ نے مشورہ دیا کہ اس خاتون کو معاف کر دیا جائے کیونکہ اس کا تعلق ایک بڑے گھرانے سے ہے تو آپؐ نے اس تجویز کو رد کر دیا اور یہ فرمایا کہ اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہؓ بھی یہ جرم کرتی تو اسے بھی یہی سزا ملتی اور پھر آپ ﷺ نے ہمیشہ یاد رکھنے والا یہ قول ارشاد فرمایا کہ: ''ماضی میں دنیا کے بڑے بڑے معاشرے اسی لیے تباہ ہوئے کہ وہ سزا و جزا کے معاملے میں اعلیٰ اور ادنیٰ، مراعات یافتہ اور غیر مراعات یافتہ طبقات کے درمیان فرق رکھتے تھے۔

آفاقی انصاف کے اسی اصول پر اسلام کے دوسرے خلیفہ راشد حضرت عمرؓ سختی سے کاربند رہے، جب ایک فاتح اور مصر کے گورنر کے بیٹے کو سزا دینے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کی جس نے ایک قبطی عیسائی کو زدوکوب کیا تھا۔ بازنطینی سلطنت کے عوام نے جو معاشرے کے امراء کے ہاتھوں تفریق کا شکار چلے آ رہے تھے، یقیناً اسلام میں مجرموں کو سزا دینے کے اس معیار کو دیکھ کر دل کی انتہائی گہرائیوں سے اس انقلابی تبدیلی کو محسوس کیا ہوگا۔ عیسائی قبطی کو کہا گیا کہ وہ گورنر کے بیٹے کو اسی طرح مارے جس طرح اسے مارا گیا تھا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انصاف کے معاملے میں اسلامی قوانین میں ایک معمولی غیر مسلم بھی گورنر کے بیٹے سے کمتر نہیں۔

اسلام نے لوگوں کو کسی نسل، رنگ، زبان، وطن، یہاں تک کہ مشترکہ مفاد کی بنیاد پر مربوط نہیں کیا بلکہ اس کے عقیدے اور اپنے مالک اور خالق کے ساتھ اس کے تعلق کی بنیاد پر کیا۔ خدا لوگوں کے ایمان کی بنیاد پر ان کی قدر کرتا ہے، اس سے قطع نظر کہ وہ کس نسل و رنگ کے ہیں

۱　النساء ۴/۵۹　　۲　سید قطب، بحوالہ اسلام اور مغرب کا تصادم، ص: ۹۰

اور کون سی زبان بولتے ہیں۔ ایمان کی اساس پر رکھے گئے اسلام کے ہمہ گیر اتحاد کے اصول کو قرآن پاک میں اس آیت میں تفصیل سے درج کر دیا گیا ہے۔

''اے پیغمبرؐ! آپؐ یہ کبھی نہ دیکھیں گے کہ جو لوگ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ ایسوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی مخالفت کرتے ہوں، خواہ وہ ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی یا ان کے کنبے ہی کے کیوں نہ ہوں۔ یہی وہ پکے مسلمان ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک روح عطا کر کے ان کی مدد کی ہے''[1]

غیر مسلموں کے ساتھ منصفانہ اور رحم دلانہ سلوک مسلم روایت کا ایک حصہ رہا ہے جب تمام یورپ میں یہودیوں پر ظلم و ستم ڈھائے گئے اور انہیں وہاں سے نکال دیا گیا تو یہ اسلامی دنیا ہی تھی جس نے انہیں پناہ دی اور جہاں وہ اس قدر پھلے پھولے۔ ہندوستان کے سابق صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی مشہور کتاب India Divided میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ مسلمان حکمران ہندوؤں کے ساتھ اپنے سلوک میں منصف اور کشادہ دل تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ شہنشاہ اورنگزیب جو ایک سخت اور کٹر مسلمان تھا، اس کی افواج کا کمانڈر انچیف ایک ہندو تھا۔

اسلام میں گرجا گھروں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں کو اتنا ہی مقدس سمجھا جاتا ہے جتنا مسجد کو اور اسلام اپنے ماننے والوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ ان کی ایسی ہی حفاظت کریں، جیسی اپنی مسجدوں کی کرتے ہیں۔ مسلم حکمرانوں نے مندروں اور گرجا گھروں کے لئے سخاوت کے ساتھ چندہ دیا ہے۔ قاہرہ کے بہت سارے مشہور گرجا گھروں کی تعمیر مسلمان حکمرانوں کے دورِ حکومت میں ہوئی۔ غیر مسلموں کے ساتھ اسلام کی وسیع القلبی اس حقیقت سے پرکھی جا سکتی ہے کہ نجران کے عیسائیوں اور ملحقہ علاقوں کی حفاظت کا پیغمبرؐ نے خدا کی طرف سے اور اپنی طرف سے یوں وعدہ فرمایا: ''ان پر (عیسائیوں پر) کوئی سختی نہیں کی جائے گی، افواج کے لئے ان سے کوئی خوراک نہیں مانگی جائے گی''۔ اس لئے اس میں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ اس دور میں بھی غیر مسلم اسلام قبول کرنے میں سکون و اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ نیویارک ٹائمز نے رپورٹ کیا ہے کہ روانڈا میں اسلام تیزی سے پھیلتا ہوا مذہب ہے، حالانکہ وہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور حکومت غیر مسلموں کی ہے۔ نیویارک ٹائمز سے اقتباس ہے: ''بہت سارے لوگ بعض پادریوں اور راہبوں کے کردار سے جو انہوں نے تقریباً ۸۰۰۰۰۰ جانوں کے قتل میں حصہ لے کر ادا کیا، بددل ہو کر اتنے منظم مذہب کو ترک کر دیا ہے اور بہت سوں نے اسلام قبول کر لیا۔ The News IHT Service کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پندرھویں صدی عیسوی سے عثمانوی ترکی پر قبضے کے بعد، شہر سراجیو مختلف لسانی گروہوں کی پناہ گاہ اور نسلی رواداری کی ایک علامت بن گیا ہے، یہ ان قدروں کے لئے سینہ سپر تھا، جسے سربوں کی نسلی تعصب کی پالیسی نابود کرنا چاہتی ہے۔ یہ شہر سپین سے ۱۴۹۲ء میں نکالے گئے یہودیوں کے لئے ایک جائے پناہ تھی۔[2]

بہت سے دوسرے غیر مسلم جو اسلام اور مسلمانوں کی طرف موافق جھکاؤ نہیں رکھتے، مستند شواہد اور تاریخ کے تقابلی مطالعے کی روشنی میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ معاشرے کو انسان دوست اور مہذب بنانے میں اس مذہب اور اس کے ماننے والوں کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن مغرب میں عام تصور جس کی بنیاد متعصب پروپیگنڈے پر ہے، بالخصوص یہودیوں کی طرف سے زیادہ تر جانبدارانہ رہا ہے۔

پیغمبر اعظم و آخر ﷺ کے مشن کے مقصد اور اس کے دائرہ کار کو قرآن میں بار بار دہرایا گیا ہے جو ظلم و جبر سے کسی غیر مسلم کو اسلام میں داخل کرنے کو مسترد کرتا ہے قرآن کہتا ہے: ''بالکل سیدھی اور صاف صاف بات ہے کہ اللہ کی طرف سے جو عذاب شدید نازل ہونے والا

---

[1] المجادلہ، ۵۸/۲۲　　[2] اسرار الحق، اسلام اور مغرب کا تصادم، ص: ۸۷

ہے، اس سے (اللہ کا نبی) خبردار کر دے اور جو اہل ایمان ہیں اور نیک عمل بھی کرتے ہیں ان کو اجر کی خوش خبری سنا دے' [۱] اللہ کے رسول ﷺ کا مشن اسی حد تک ہے کہ وہ کافروں کو اللہ کے عذاب شدید سے خبردار کر دیں اور خود کسی طور پر انہیں سزا نہ دیں......

درج ذیل آیت میں اللہ نے وضاحت سے پیغمبرؐ کو کافروں کو طاقت کے ذریعہ مسلمان بنانے سے روکا ہے اور الٰہی مشن کو پورا کرنے کے لئے ان سے کہا گیا ہے کہ وہ صرف لوگوں کو خبردار کر دیں:

نحن اعلم بما یقولون و ما انت علیھم بجبارٍ فذکر بالقرآن من یخاف وعید [۲]

''یہ لوگ جو باتیں کر رہے ہیں، ہم انہیں خوب جانتے ہیں اور آپؐ ان پر جابر تو نہیں۔ آپ کا کام تو یہ ہے کہ آپؐ ہر اس شخص کو قرآن کے ذریعہ نصیحت کرتے رہیں جو ہماری تنبیہ سے ڈرتا ہے''

۱　الکھف، ۲/۱۸　　۲　ق، ۴۵/۵۰

پانچوار باب

قیادت کا معیار

اسلامی تعلیمات

فصل اول

قرآنی تعلیمات

قرآنی نظریات سیاست نہایت واضح اور قابل عمل ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ قیام امن وامان اور عدل وانصاف کا واحد ذریعہ بھی ہیں۔عصرِ حاضر میں انسانیت مختلف ازم میں بٹ کر رہ گئی ہے۔اور ہر گروہ دوسرے سے سبقت لے جانے کا خواہشمند ہے۔اس سیاسی تفوق کی خواہش نے انسان کو بالکل درندہ بنا کر رکھ دیا ہے۔قانون سازی کے اختیارات خود سنبھال کر انسان نے اپنے ہم جنسوں کیلئے عرصہ حیات تنگ کر کے رکھ دیا ہے۔اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن حکیم ان سیاسی مسائل کا کیا حل تجویز کرتا ہے جنہوں نے انسانیت کو ہلاکت کے گڑھے کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔نزول قرآن کے وقت بھی انسانیت ان سے ملتے جلتے مسائل سے دوچار تھی۔قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

كنتم علی شفاحفرة من النار فانقذ كم منها[1]

"تم آگ کے گڑھے کے بالکل کنارے پر پہنچ چکے تھے تم کو اللہ تعالیٰ نے اس سے نکالا"

فلسفہ سیاست کے نقطہ نظر سے اگر اس تصور کائنات کا جائزہ لیا جائے کہ جس پر قرآن کا نظریہ سیاست مبنی ہے تو درج ذیل نکات سامنے آتے ہیں۔اللہ تعالیٰ اس پوری کائنات کا اور خود انسان کا اور ان تمام چیزوں کا خالق ہے جس سے اس دنیا میں انسان فائدہ اٹھاتا ہے

قل الله خالق كُل شیء وهوالواحد القهار[2]

" کہو اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی یکتا ہے سب پر غالب

هوالذی خلق لكم ما فی الارض جميعا[3]

"وہی ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب چیزیں پیدا کیں جو زمین میں ہیں اللہ تعالیٰ مدبر کائنات ہے اپنی پیدا کردہ اس خلق کا مالک فرماں روا اور منتظم بھی اللہ ہی ہے۔"

له ما فی السموات والارض وما بينهما و ماتحت الثریٰ[4]

"اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور جو کچھ اُن کے درمیان ہے اور جو کچھ زمین کی تہ میں ہے۔"

وَله ما فی السمٰوات وما فی الارض كُل له قانتون[5]

"اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔سب اس کے مطیع فرمان ہیں۔"

حاکمیت اور بادشاہی اللہ کے سوا کسی اور کی نہیں

الم تعلم ان الله له ملك السموات والارض[6]

" کیا تم نہیں جانتے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے۔"

له الحمد فی الاولیٰ والاخرة وله الحكم واليه ترجعون[7]

"دنیا اور آخرت میں ساری تعریف اسی کیلئے ہے اور حکم کا اختیار اسی کو ہے اور اسی کی طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔"

---

۱ ال عمران،۳/۱۰۳　۲ الرعد،۱۳/۱۶　۳ البقرہ،۲/۲۹　۴ طہٰ،۲۰/۸

۵ الروم،۳۰/۲۶　۶ البقرہ،۲/۱۰۷　۷ القصص،۲۸/۷۰

ان الحکم الا للہ[۱]

"فیصلے کا اختیار کسی کو نہیں ہے سوائے اللہ کے۔"

مالھم من دونہ من ولی ولا یشرك فی حکمہ احدا[۲]

"بندوں کیلئے اس کے سوا کوئی ولی وسرپرست نہیں اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔"

یقولون ھل لنا من الامر من شیء قل ان الامر کلہ للہ[۳]

"وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اختیار میں بھی کچھ ہے؟ کہو اختیار سارا کا سارا اللہ ہی کا ہے۔"

للہ الامر من قبل و من بعد[۴]

"اللہ ہی کے ہاتھ میں اختیار ہے پہلے بھی اور بعد میں بھی۔"

لہ ملك السموات والارض والی اللہ ترجع الامور[۵]

"آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور سارے معاملات اسی کی طرف رجوع کیے جاتے ہیں۔"

افمن یخلق کمن لا یخلق افلا تذکرون[۶]

"کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اس کی طرح ہوسکتا ہے جو پیدا نہیں کرتا؟ تم ہوش میں نہیں آتے؟"

ام جعلو للہ شرکاء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیھم[۷]

"کیا ان لوگوں نے اللہ کے کچھ ایسے شریک بنالیے ہیں جنھوں نے اللہ کی طرح کچھ پیدا کیا ہو اور ان پر تخلیق کا معاملہ مشتبہ ہو گیا ہو؟"

حاکمیت کی تمام صفات اور تمام اختیارات اللہ ہی کی ذات کیلئے ہیں اس کائنات میں ان صفات واختیارات کا حامل سرے سے کوئی نہیں۔ اللہ سب پر غالب ہے۔ سب کچھ جاننے والا ہے۔ بے عیب اور بے خطا ہے۔ سب کا نگہبان ہے۔ سب کو امان دینے والا ہے۔ ہمیشہ زندہ اور ہر وقت بیدار ہے۔ ہر چیز پر قادر ہے۔ سارے اختیارات اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ ہر شے چار و نا چار اس کی تابع ہے۔ نفع اور ضرر سب اس کے اختیار میں ہیں۔ کوئی اس کے سوا اور اس کے اذن کے بغیر کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی اس کے آگے سفارش تک نہیں کرسکتا۔ وہ جس سے چاہے مواخذہ کرے اور جسے چاہے معاف کردے۔ اس کے حکم پر نظر ثانی کرنے والا کوئی نہیں۔ وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں اور سب اس کے سامنے جواب دہ ہیں۔ اس کا حکم نافذ ہو کر رہتا ہے اور کوئی اس کے حکم کو ٹالنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ حاکمیت کی یہ تمام صفات صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہیں اور ان میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

وھو القاھر فوق عبادہ وھو الحکیم الخبیر[۸]

"وہی اپنے بندوں پر غلبہ رکھنے والا ہے اور وہی دانا اور ہر چیز سے باخبر ہے۔"

عالم الغیب والشھادۃ الکبیر المتعال[۹]

"پوشیدہ اور ظاہر سب چیزوں کا جاننے والا، بزرگ، اور بالاتر رہنے والا۔"

---

۱ الانعام،۶/۵۷　۲ الکہف،۱۸/۲۶　۳ ال عمران،۳/۱۵۴　۴ الروم،۳۰/۴　۵ الحدید،۵۷/۵

۶ النحل،۱۶/۱۷　۷ الرعد،۱۳/۱۶　۸ الانعام،۶/۱۸　۹ الرعد،۱۳/۹

الملك القدوس السلام المومن المهيمن العزيز الجبار المتكبر۱

"بادشاہ، عیب ونقص سے پاک، غلطی سے مبرا، امن دینے والا، نگہبان، غالب، بزور حکم نافذ کرنے والا، کبریائی کا مالک۔"

الحی القیوم لا تا خذه سنة ولا نوم له مافی السموات و ما فی الارض من ذالذی یشفع عنده الا باذنه یعلم مابین ایدیهم وما خلفهم۲

"ہمیشہ زندہ، اپنے بل پر آپ قائم، نہ اس کو اونگھ آئے نہ نیند لاحق ہو، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے، کون ہے جو اس کی اجازت کے بغیر اس کے پاس سفارش کرے؟ جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔"

تبارك الذی بیده الملك وهو علی كل شیء قدیر ۳

"بڑا بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

بیده ملكوت كل شیء والیه ترجعون ۴

"جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جانے والے ہو۔"

وله اسلم من فی السموات والارض طوعاً و كرهاً۵

"آسمانوں اور زمین کے سب رہنے والے چار و ناچار اسی کے تابع فرمان ہیں۔"

ان العزة لِله جمیعاً هو السمیع العلیم۶

"طاقت بالکل اسی کے ہاتھ میں۔ وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔"

قل فمن یملك لكم من الله شیئاً ان ارادبكم ضراً او ارادبكم نفعاً ۷

" کہو، اگر اللہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے تو کون اس سے تمہیں کچھ بھی بچا سکتا ہے؟ یا اگر وہ تمہیں نفع پہنچانا چاہے (تو کون اسے روک سکتا ہے؟)"

وان یمسسك الله بضرٍ فلا كاشف له الا هو ان یردك بخیر فلا راد لِفضله یصیب به من یشاء من عباده وهو الغفور الرحیم ۸

"اگر اللہ تجھے ضرر پہنچائے تو اسے دور کرنے والا خود اللہ ہی کے سوا کوئی نہیں ہے اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کرنا چاہے تو اس کے فضل کو پھیر دینے والا بھی کوئی نہیں۔ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فضل فرماتا ہے اور بخشنے والا مہربان ہے"

وان تبدوا ما فی انفسكم او تخفوه ُیحاسبكم به الله فیغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء والله علی كل شیء قدیر۹

"تم خواہ اپنے دل کی بات ظاہر کر دو یا چھپاؤ، اللہ اس کا محاسبہ تم سے کر لے گا، پھر جسے چاہے وہ معاف کرے اور جسے چاہے سزا دے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

---

۱ الحشر، ۲۳/۵۹ ۲ البقرہ، ۲۵۵/۲ ۳ الملک، ۱/۶۷ ۴ یٰسین، ۸۳/۳۶ ۵ ال عمران، ۸۳/۳

۶ یونس، ۶۵/۱۰ ۷ الفتح، ۱۱/۴۸ ۸ یونس، ۱۰۷/۱۰ ۹ البقرہ، ۲۸۴/۲

ابصر به واسمع مالهم من دونه من ولی ولا یشرك فی حکمه احدا [1]

" کمال درجہ کا دیکھنے اور سننے والا اس کے سوا کوئی بندوں کا ولی وسرپرست نہیں، اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔"

قل انی لن یجیر نی من الله احد ولن اجد من دونه ملتحدا [2]

" کہو، مجھے کوئی اللہ سے بچا نہیں سکتا اور نہ اس کے سوا میں کوئی جائے پناہ پاسکتا ہوں۔"

وهو یجیر ولا یجار علیه [3]

"وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلہ میں پناہ نہیں دی جاسکتی۔"

انه هو یبدی ویعید وهو الغفور الودود ذوالعرش المجید فعال لما یرید [4]

"وہی ابتداء کرتا ہے اور وہی اعادہ کرتا ہے۔ اور وہی بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے۔ تخت سلطانی کا مالک اور بزرگ، جو کچھ چاہے کر گزرنے والا۔"

ان الله یحکم ما یرید [5]

"بے شک اللہ جو کچھ چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے۔"

لا یسئل عما یفعل وهم یسئلون [6]

"جو کچھ وہ کرتا ہے اس پر کسی کے سامنے وہ جواب دہ نہیں ہے اور دوسرے سب جواب دہ ہیں۔"

لا مبدل لکلماته ولن تجد من دونه ملتحدا [7]

"اس کے فرامین کو بدلنے والا کوئی نہیں اور تو اس کے مقابلہ میں کوئی جائے پناہ نہیں پاسکتا۔"

الیس الله باحکم الحاکمین [8]

" کیا اللہ سب حاکموں سے بڑھ کر حاکم نہیں ہے؟"

قل اللهم مالك الملك توتی الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء و تعز من تشاء وتذل من تشاء بیدك الخیر انك علی كل شیء قدیر [9]

" کہو، خدایا، ملک کے مالک، تو جسے چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے، جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے، ساری بھلائی تیرے اختیار میں ہے، تو ہر چیز پر قادر ہے۔"

ان الارض لله یورثها من یشاء من عباده [10]

"درحقیقت زمین اللہ کی ہے، اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔"

کائنات کے اسی تصور کی بنیاد پر قرآن کہتا ہے کہ انسانوں کا حقیقی فرماں روا اور حاکم بھی وہی ہے جو کائنات کا حاکم وفرماں روا ہے۔

۱۔ الکہف، ۱۸/۲۶ ۲۔ الجن، ۷۲/۲۲ ۳۔ المومنون، ۲۳/۸۸ ۴۔ البروج، ۸۵/۱۳۔۱۶ ۵۔ المائدہ، ۵/۱

۶۔ الانبیاء، ۲۱/۲۳ ۷۔ الکہف، ۱۸/۲۷ ۸۔ التین، ۹۵/۸ ۹۔ آل عمران، ۳/۲۶ ۱۰۔ الاعراف، ۷/۱۲۸

انسانی معاملات میں بھی حاکمیت کا حق اسی کو پہنچتا ہے اور اس کے سوا کوئی انسانی یا غیر انسانی طاقت بطور خود حکم دینے والا اور فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ البتہ فرق صرف یہ ہے کہ نظام کائنات میں تو اللہ کی حاکمیت وفرمانبرداری اپنے زور پر آپ قائم ہے جو کسی کے اعتراف کی محتاج نہیں ہے۔ اور خود انسان بھی اپنی زندگی کے غیر اختیاری حصے میں طبعاً اس کی حاکمیت وفرمانروائی کا اسی طرح مطیع ہے جس طرح ایک ذرے سے لے کر کہکشانی نظاموں تک ہر چیز اس کی مطیع ہے، لیکن انسان کی زندگی کے اختیاری حصے میں وہ اپنی اس حاکمیت کو بزور مسلط نہیں کرتا بلکہ الہامی کتابوں کے ذریعہ سے، جن میں آخری کتاب قرآن ہے، ان کو دعوت دیتا ہے کہ شعور وارادہ کے ساتھ اس کی حاکمیت تسلیم اور اس کی اطاعت اختیار کریں۔ اس اطاعت کے مختلف پہلوؤں کو قرآن میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ کہ کائنات کا رب ہی درحقیقت انسان کا رب ہے اور اسی کی ربوبیت تسلیم کی جانی چاہیے۔

قل ان صلوتی ونسکی ومحیایٰ ومماتی لله رب العالمین .... قل اغیر الله ابغی ربا و هو رب کل شیی ؑ[1]

"اے نبی ﷺ کہو، میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کیلئے ہے.......... کہو، کیا اللہ کے سوا میں کوئی اور رب تلاش کروں؟ حالانکہ ہر چیز کا رب وہی ہے۔"

ان ربکم الله الذی خلق السموات والارض[2]

"درحقیقت تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا"

حکم اور فیصلے کا حق اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، اسی کی بندگی انسانوں کو کرنی چاہیے اور یہی صحیح طریق کار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وما اختلفتم فیه من شییء فحکمه الی الله[3]

"تمہارے درمیان جو اختلاف بھی ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔"

ان الحکم الا لله امر الا تعبدوا الا ایاه ذالك الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون[4]

"حکم اللہ کے سوا کسی کیلئے نہیں ہے، اس کا فرمان ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، یہی صحیح دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔"

یقولون هل لنا من الامر من شییء قل ان الامر کله لله[5]

"وہ کہتے ہیں کہ ہمارا بھی کچھ اختیار ہے؟ کہو، اختیار سارا کا سارا اللہ ہی کا ہے۔"

حکم دینے کا حق اللہ کو اس لیے ہے کہ وہی خالق ہے:

الا له الخلق والامر[6]

"خبردار، اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے"

اللہ کا حکم اس لئے برحق ہے کہ وہی حقیقت کا علم رکھتا ہے اور وہی صحیح رہنمائی کرتا ہے۔

والله یعلم المفسدمن المصلح[7]

---

[1] الانعام، ۶/۱۶۳،۱۶۴ [2] الاعراف ۷/۵۴ [3] الشوریٰ، ۴۲/۱۰ [4] یوسف، ۱۲/۴۰

[5] آل عمران، ۳/۱۵۴ [6] الاعراف، ۷/۵۴ [7] البقرہ، ۲/۲۲۰

"اللہ ہی جانتا ہے کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون۔"

یعلم مابین ایدیهم وما خلفهم ولا یحیطون بشیئ من علمه الا بما شآء ۱

"جو کچھ ان کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ اور اس کے علم میں سے کسی چیز کا وہ احاطہ نہیں کر سکتے بجز ان چیزوں کے جن کا علم وہ دینا چاہے۔"

اسی طرح قرآن فیصلہ کرتا ہے کہ اطاعت خالصتاً اللہ کی پیروی اسی کے قانون کی ہونی چاہیے۔ اس کو چھوڑ کر دوسروں کی یا اپنی خواہشات نفس کی پیروی ممنوع ہے۔

انا انزلنا الیك الکتاب بالحق فاعبدالله مخلصا له الدین الا لله الدین الخالص ۲

"اے نبی ﷺ، ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے۔ پس تم دین کو اللہ کے لئے خالص کر کے اس کی بندگی کرو، خبردار، دین خالص اللہ ہی کیلئے ہے۔"

قل انی امرت ان اعبدالله مخلصا له الدین وامرت لا ن اکون اول المسلمین ۳

"کہو، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کیلئے خالص کر کے اس کی بندگی کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے سر اطاعت جھکا دینے والا میں ہوں۔"

وما امرو آالالیعبدوا الله مخلصین له الدین حنفاء ۴

"ان کو کوئی حکم اس کے سوا نہیں دیا گیا کہ یکسو ہو کر اللہ کی بندگی کریں دین کو اس کے لئے خالص کرتے ہوئے۔"

اتبعو ما اُنزل الیکم من ربکم ولا تتّبعوا من دونه اولیآء ۵

"پیروی کرو اس چیز کی جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے تمہارے رب کی طرف سے اور اسے چھوڑ کر دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔"

ولئن اتبعت اهواء هم بعد ما جاء ك من العلم مالك من الله من ولی ولا واق ۶

"اور اگر تو نے اُس علم کے بعد جو تیرے پاس آ چکا ہے اُن کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کے مقابلہ میں نہ تیرا کوئی حامی ہوگا نہ بچانے والا۔"

ثم جعلنا ك علی شریعة من الامر فاتبعها ولا تتّبع اهوآء الذین لا یعلمون ۷

"پھر ہم نے تجھ کو دین کے ایک خاص طریق پر قائم کر دیا پس تو اسکی پیروی کر اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کر جو علم نہیں رکھتے۔"

اللہ نے انسانی معاملات کو منضبط کرنے کیلئے جو حدیں مقرر کر دی ہیں ان سے تجاوز کرنے کا کسی کو حق نہیں دیا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

.... تلك حدود الله فلا تعتدو ها ومن یتعد حدود الله فأُولٰئك هم الظالمون ۸

---

۱ البقرہ، ۲/۲۵۵	۲ الزمر، ۳۹/۲،۳	۳ الزمر، ۳۹/۱۱،۱۲	۴ البینہ، ۹۸/۵

۵ الاعراف، ۷/۳	۶ الرعد، ۱۳/۳۷	۷ الجاثیہ، ۴۵/۱۸	۸ البقرہ، ۲/۲۲۹

"........ یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو، اور جو اللہ کی حدود سے تجاوز کریں وہی ظالم ہیں۔"

اللہ کے حکم کے خلاف جو حکم بھی ہے نہ صرف غلط اور ناجائز ہے بلکہ کفر وضلالت اور ظلم وفسق ہے۔ اس طرح کا ہر فیصلہ جاہلیت کا فیصلہ ہے جس کا انکار جزو ایمان ہے:

.... ومن لم یحکم بما انزل الله فاو لٰئك هم الكافرون ۱

"........ اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں"۔

......ومن لم یحکم بما انزل الله فاولٰئك هم الظالمون ۲

''......اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں''۔

.... ومن لم یحکم بما انزل الله فاولٰئك هوم الفٰسقون ۳

"........ اور جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں"۔

.... افحكم الجاهلية يبغون ط ومن احسن من الله حكما لقوم يوقنون ۴

"........ کیا وہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ یقین رکھنے والوں کیلئے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے"۔

گویا خدا اور رسولؐ کا حکم قرآن کی رو سے وہ بالاتر قانون ہے جس کو ماننا ہی اللہ کی فرمانبرداری کا اظہار ہے۔ جن معاملات میں خدا اور رسول فیصلہ دے دیں ان میں کوئی مسلمان خود آزادنہ فیصلہ کا مجاز نہیں۔

سورہ احزاب میں فرمایا:

وما كان لمومن ولا مومنة اذا قضٰى الله ورسوله امراً ان يكون لهم الخيرة من امر هم ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالاً مبينا ۵

"........ کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق حاصل نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کا فیصلہ کردیں تو اپنے اس معاملے میں ان کے لئے کوئی نصیحت باقی رہ جائے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑیگا۔"

قرآن مجید کے سیاسی نظریات میں اہم ترین اقتدار اعلیٰ کا نظریہ ہے۔ اس کی رو سے اقتدار اعلیٰ کسی انسان کے سپرد نہیں کیا گیا کیونکہ یہ ظلوم وجہول اتنی بڑی ذمہ داری کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ مقتدر اعلیٰ اسی ذات حقیقی کو قرار دیا گیا ہے۔ جو نہ صرف خالق کائنات ہے۔ بلکہ کائنات کی ربوبیت بھی اسی کیلئے مسلم ہے۔ یہی ذات عقائد واعمال، تدبیر وسیاست، دستور وقانون کا سرچشمہ ہے۔ اقتدار اعلیٰ کے لئے قرآن مجید نے لفظ "ملکوت" استعمال کیا ہے جس کے ذریعے واضح کیا گیا ہے۔ کہ دنیا کی ہر چیز اللہ ہی کے زیر اقتدار ہے۔

۱۔　من بیده ملکونت کل شی ۶ (وہ کون سی ہستی ہے جس کے زیرِ اقتدار تمام چیزیں ہیں)۔ دوسرے موقع پر مقتدر اعلیٰ کی بے باکی اور بے عیبی ان الفاظ میں مذکور ہے۔

۲۔　فسبحٰن الذی بیده ملکوت کل شیءٍ ۷ (وہ ذات پاک ہے جس کے زیرِ اقتدار سب چیزیں ہیں) یہی نہیں کہ روئے زمین ہی کی چیزیں اس کے زیرِ تصرف ہوں بلکہ آسمانوں پر بھی اسی کا حکم جاری وساری ہے حاکم اعلیٰ یا مقتدر اعلیٰ وہ ہوتا ہے جس کا ارادہ اور اس کی منشاء

۱　المائدہ، ۵/۴۴　　۲　المائدہ، ۵/۴۵　　۳　المائدہ، ۵/۴۷　　۴　المائدہ، ۵/۵۰

۵　الاحزاب، ۳۳/۳۶　　۶　المومنون، ۲۳/۸۸　　۷　یٰسین، ۳۶/۸۳

مرضی قانون کا سرچشمہ ہوتا ہے ماخذ قانون عقل انسانی نہیں بلکہ وحی خداوندی ہے اور بالادستی قرآن وسنت کو حاصل ہے۔ انسانی حکومت کی صحیح صورت قرآن کی رُو سے صرف یہ ہے کہ ریاست خدا اور رسول ﷺ کی قانونی بالادستی تسلیم کر کے اُس کے حق میں حاکمیت سے دست بردار ہو جائے اور حاکم حقیقی کے تحت خلافت کی حیثیت قبول کر لے۔

قرآن کریم کا موضوع ہی انسان ہے اور اس کی اصلاح مقصود الٰہی ہے۔ کائنات میں تخلیق کا عمل با مقصد ہے اور کوئی تخلیق بھی عبث نہیں۔ کچھ مخلوقات ایسی ہیں جن کا عمل تکوینی ہے یعنی قدرت الٰہی سے مکلّف ہے۔ چاند سورج ستارے آج جس گردش پر ہیں اسی گردش پر قائم کیے گئے تھے اور مستقبل میں بھی اسی گردش پر قائم رہیں گے۔ چرند، پرند، جانور، کیڑے اپنے محدود دوطیرہ حیات میں مکلف نہیں یعنی وہ اپنے کسی فعل کے جواب دہ بھی نہیں۔ یہ شرف صرف اشرف المخلوقات یعنی انسان ہی کو حاصل ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کا استعمال صرف اُن خطوط پر کرے جو اس کیلئے خداوند کریم نے مقرر فرمائے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں لذت نفسی کو اس انداز سے دویعت فرمایا کہ یہ عقل انسانی پر غالب آنے لگی۔ چنانچہ انسان کی راہنمائی کی ضرورت محسوس کی گئی اور خداوند کریم نے اسے ہدایت کا نام دیا۔ قرآن کریم میں اس لفظ کو انہی معنی کے ساتھ متعدد مرتبہ استعمال کیا ہے۔ خود قرآن کریم بھی مکمل ہدایت ہے لیکن انسانی فطرت میں کوئی عمل صرف قوت بیانیہ سے صحیح اور مکمل ممکن نہیں جب تک اس پر عمل کر کے نہ دکھایا جائے۔ لہٰذا خداوند تعالیٰ نے اپنی رحمتِ کاملہ سے انسان کی تخلیق سے پہلے ہدایت کا سامان کیا یعنی پہلا انسان ہی جو خلق ہوا وہ نبی تھا کہ بعد میں پیدا کئے جانے والے انسان یہ نہ کہہ سکیں کہ ہم جب پیدا ہوئے ہمارے لئے ہدایت دینے والا موجود ہی نہ تھا چنانچہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہدایت انسانی تخلیق کے منصوبے کے لئے اس کی مصلحت تھی تا کہ انسان ان اصولوں پر اپنی انفرادی اور معاشرتی زندگی بسر کرے جو خود خداوند تعالیٰ نے مقرر کئے۔ انہی اصولوں کا نام دین ہے۔

دین پر عمل اور اسکی قیادت کیلئے جن لوگوں کو من جانب اللہ تعالیٰ بھیجا گیا۔ ان انبیاء کے درجات متعین تھے کچھ مخصوص علاقوں سے تعلق رکھتے تھے کچھ الگ الگ اقوام سے متعلق تھے لیکن کوئی قوم ایسی نہ تھی جس کیلئے ہادی (قائد) مقرر نہ ہو۔

ولکل قومٍ ھاد [۱] ”اور وہ قوم کے لئے ہادی تھا“

جو انبیاء صاحبان شریعت یا صاحبان صحائف تھے انہیں رسول کہا جاتا تھا۔ انبیاء علیہ السلام کا سلسلہ آپ ﷺ پر ختم ہوا۔ آپ ﷺ پر ایمان اور آپ ﷺ کی اعانت کل انبیاء پر واجب ہوئی۔ اسی نسبت سے آپ ﷺ امام الانبیاء قرار پائے۔ قرآن کریم خداوند کریم کی آخری کتاب ہدایت تھی جو آنحضرت ﷺ پر نازل کی گئی اور یہ ہدایت قیامت تک کیلئے شمع ہدایت بنی۔ اسی طرح صاحب کتاب ﷺ بھی قیامت تک کیلئے رہنما قرار پائے۔

دوسری تہذیبوں اور اقوام کے برعکس اسلام میں قیادت زندگی کے کسی ایک شعبے سے متصف نہیں بلکہ زندگی کا کوئی شعبہ اس کی قیادت کے اصولوں اور رہنمائی سے خالی نہیں۔

قرآن کریم اور احادیث نبوی ﷺ نے قیادت کے اسلامی تصور کو ایک ایسی ہمہ گیر جہت بخشی جو صرف اسلام ہی سے وابستہ ہو سکی۔ کسی دوسرے مذہب میں اس کا تصور نہ تھا۔ خلفاء راشدین کے دور تک قیادت کا اسلامی تصور قائم رہا۔ لیکن ملوکیت کے فروغ کے بعد یہ نظام انتشار کا شکار ہو گیا اور اسلامی قیادت کئی جہتوں میں منقسم ہو گئی خصوصاً دینی علوم میں آئمہ فقہہ اور آئمہ احادیث کے اختلافات سے قیادت دینی کو اتنا ضعف پہنچا کہ اسلام میں بھی سیاسی افکار کو دینی فکری قیادت کا درجہ حاصل ہو گیا۔

---

[۱] الرعد، ۱۳/۷

اسلامی قیادت کا تصور اگر صرف قرآن کریم ہی سے اخذ کیا جائے تو رہنمائی کا ایسا عکس ابھرتا ہے جو آفاقی ہمہ جہتی اور ہر زمانے کیلئے لائق اطاعت وتقلید نظر آتا ہے۔قرآن مجید نے صاحبان ایمان کومخاطب کرتے ہوئے اس لئے فرمایا۔

لقد کان لکم فی رسول الله اسوة حسنة ۱

''کہ بیشک تمہارے لئے رسول اللہﷺ میں بہترین نمونہ ہے''

زندگی کا کونسا ایسا شعبہ ہے جس میں آپ کی رہنمائی مسلمانوں کوحاصل نہیں رہی۔اسلام کےظواہر ہوں یا باطن،عقائد ہوں کہ اعمال حسنہ، باہمی رشتے ہوں یا تعلق داری دنیا داری ہو کہ معاملات، معیشت ہو کہ معاشرتی اصلاح، مسلمان ہوں یا کہ غیر مسلمان، انفرادی فعل ہو یا اجتماعی آپ کی ہدایات اتنی جامع اور مفصل تھیں کہ ان پر عمل ہر مسلمان کا بالعموم شوق اور ایمان تھا۔

قرآن حکیم صراحت اور تکرار کے ساتھ اکثر مقامات پر یہ بات بھی کہتا ہے۔کہ نبی کریمﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے حاکم وفرمانروا تھے اور آپ گو یہ منصب بھی رسول ہی کی حیثیت سے حاصل ہوا تھا۔ارشاد ربانی ہے۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن الله ۲

''ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے اسکی اطاعت کی جائے اللہ کے اذن سے''

ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے۔

من یطع الرسول فقد اطاع الله ۳

''جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی''

پھر ارشاد فرمایا کہ:

ان الذین یبا یعو نك انما یبایعون اللّٰه ۴

''اے نبیؐ یقیناً جولوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں''۔

قرآن مجید میں سورۃ محمد میں خدا تعالیٰ فرماتے ہیں:

یا یهاالذین آمنوا اطیعو االله و اطیعو االرسول ولا تبطلوا اعمٰلکم ۵

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرلو''۔

سورۃ النساء میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

یا یهاالذین آمنوا اطیعو االله و اطیعو االرسول وأولی الامرِمنکم فان تنٰزعتم فی شیءٍ فردوه الی الله والرسول ان کنتم تؤمنون بالله والیوم الاخرِ ۶

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں پھر اگر تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اسکو پھیر دو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ اور روز آخر پر''۔

---

۱ الاحزاب،۳۳/۲۱　　۲ النساء،۴/۶۴　　۳ النساء،۴/۸۰　　۴ الفتح،۴۸/۱۰

۵ محمد،۴۷/۳۳　　۶ النساء،۴/۵۹

پھر اسی سورۃ میں فرمایا

انآ انزلنآ الیك الكتاب بالحق لتحكم بین الناس بمآ ارك الله ولا تكن للخآئنین خصیما ۱

''اے محمدؐ! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے۔ تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس روشنی میں حکم کرو۔ جو اللہ نے تمہیں دکھائی''۔

پھر سورۃ حشر میں مومنین کیلئے ارشاد فرمادیا کہ:

ومآ اٰتكم الرسول فخذوه وما نهكم عنه فانتهوا ۲

''اور جو کچھ رسول تم کو دیں اسے لے لو اور جس سے تم کو روک دیں اس سے رک جاؤ''

مندرجہ بالا قرآنی آیات صاف صاف بتا رہی ہیں کہ رسول کوئی ایسا حاکم نہیں جو خود اپنی قائم کردہ ریاست کا سربراہ بن بیٹھا ہو یا جسے لوگوں نے منتخب کر کے سربراہ بنایا ہو بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کیا فرمانروا ہے۔ اس کی فرمانروائی اسکے منصب رسالت سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ اس کا رسول ہونا ہی اللہ کی طرف سے اسکا حاکم مطاع ہونا ہے اس کی اطاعت میں اللہ کی اطاعت ہے۔ اسکی بیعت دراصل اللہ کی بیعت ہے۔ اس کی اطاعت نہ کرنے کے معنی اللہ کی نافرمانی کے ہیں اور اسکا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی کا کوئی بھی عمل اللہ کے ہاں مقبول نہیں ہوتا۔ اس کے مقابلے میں اہل ایمان کو قطعاً یہ حق حاصل نہیں کہ جس معاملہ کا فیصلہ وہ خود کر چکا ہو اس میں وہ کوئی فیصلہ کریں۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے نمائندے انبیاء علیہ الالسلام ہیں۔ یعنی جس ذریعے سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے شارع کا ہمارے لیے کیا حکم ہے اور کیا قانون ہے وہ ذریعہ انبیاء ہیں اور اسی بناء پر اسلام میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت ان کی بے چوں و چرا اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن کی طرف دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو نبی آیا اس نے یہی اعلان کیا کہ:

فاتقو الله واطیعون ۳

''پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو''۔

انبیاء علیہ السلام بالعموم اور حضرت محمدؐ بالخصوص اللہ تعالیٰ کی سیاسی وقانونی حاکمیت کے مظہر ہیں اس لئے اس کے حکم کی اطاعت اور ان کے طریقے کی پیروی اور ان کے فیصلوں کو بے چوں و چرا ماننا ہر اس فرد اور گروہ اور قوم کیلئے لازم ہے جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کرے۔

مولانا گوھر رحمٰن اپنی کتاب "اسلامی سیاست" میں لکھتے ہیں کہ:

قرآن کریم میں انبیاء علیہ السلام کا فرض منصبی اقامت دین قرار دیا گیا ہے یعنی دین اسلام کو قائم کرنا، دین صرف مابعد الطبیعیات اور ماورائے حس امور کا نام نہیں ہے بلکہ زندگی کے مکمل نظام کا نام دین ہے۔ جس کے کئی شعبے ہیں۔ عقائد وایمانیات، عبادات، معاملات، اخلاقیات، عقوبات، سیاسیات۔

دین کے اس جامع تصور سے نبوت ورسالت کا بھی جامع تصور سامنے آجاتا ہے۔ خدا کا نبی ترک دنیا فرار عن الدنیا اور رھبانیت کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ تعمیر دنیا اور اصلاح خلق کا جامع پیغام لے کر آتا ہے۔ نبی صرف مابعد الطبیعی امور کا معلم نہیں ہوتا بلکہ زندگی کے مکمل نظام کا بھی معلم ہوتا ہے۔ جس میں سیاست وحکمرانی کے اصول بھی شامل ہیں۔ ۴

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے نبی کی خصوصیات کا تجزیہ اس طرح کیا ہے۔ انسانی زندگی کی تعمیر کیلئے جن صداقتوں کی ضرورت ہوتی

---

۱ النساء،۴/۱۰۵ ۲ الحشر،۵۹/۷ ۳ الشعراء،۲۶/۱۵ ۴ اسلامی سیاست،ص:۱۴۱

ہے وہ سب کی سب بیک وقت نبی کی ذات میں دیگر تمام انسانوں سے بڑھ کر فطرتاً موجود ہوتی ہیں۔

الف) نبی ایک حکمران بھی ہوتا ہے جسے انسان مدنی کہا جاتا ہے۔ یعنی اجتماعی اور تمدنی زندگی کا ماہر انسان۔

ب) نبی ایک حکیم بھی ہوتا ہے جو علم اخلاق تدبیر منزل اور سیاست مدن کے اصول کا ماہر ہو۔

ج) نبی ایک فرشتہ کامل بھی ہوتا ہے جو عبادات اور اشغال وافکار کے ان تمام طریقوں سے بخوبی آگاہ ہو جو تزکیہ نفس کیلئے ضروری ہوتے ہیں۔ نبی کے یہ سب کمالات وہبی ہوتے ہیں۔ کسی تربیت گاہ اور خانقاہ کے رہین منت نہیں ہوتے [۱]

شاہ صاحب کے تجزیے کا حاصل یہ ہے کہ نبوت کے تین بنیادی ارکان ہیں۔

حکومت وسیاست، علم وحکمت، رشد وہدایت

نبی کے اندر یہ تینوں ارکان واوصاف بدرجہ کمال موجود ہوتے ہیں۔ وہ حکمرانی اور سیاست کی قابلیت بھی رکھتا ہے عملاً اسے اگر منظم حکمرانی کا موقع نہ بھی ملا ہو مگر وہ اپنی فقیری میں بھی امیری کے اوصاف سے متصف ہوتا ہے یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کہ تدبیر مملکت اور سیاست الناس کے اصول وضوابط نبی کی تعلیمات میں شامل نہ ہوں خدا کا نبی ہر لحاظ سے کامل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

واذقال ربك للملٰئكة انی جاعل فی الارض خليفة [۲]

''اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو بے شک میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک خلیفہ''

امام المفسرین ابن جریر الطبری (متوفی ۳۱۰ھ) خلیفہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

عن ابن مسعود و ابن عباس انی جاعل فی الارض خليفة منی يخلفنی فی الحكم بين خلقی و ذالك الخليفه آدم و من قام مقامه فی طاعة الله و الحكم بالعدل بين خلقه...... [۳]

''ابن مسعود ابن عباس نے خلیفہ ہونے کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ میں پیدا کر رہا ہوں زمین میں اپنا خلیفہ جو میری مخلوق کے درمیان فیصلہ کرنے میں میرا نائب ہوگا اور خلیفہ آدم ہر وہ شخص ہے جو خدا کی اطاعت اور اس کی مخلوق کے درمیان عدل وانصاف کے ساتھ حکم دینے میں اس کا (آدم کا) قائم مقام ہوگا''

ابن اثیر فرماتے ہیں۔

انه خليفة الله فی الارض وكذاكل نبی استخلفهم فی عمارة الارض وسياسة الناس و تكميل نفوسهم و تنفيذ امره فيهم [۴]

''آدم زمین میں اللہ کے خلیفہ تھے اور اس طرح ہر نبی کو اللہ نے اپنا خلیفہ بنایا تھا زمین کو آباد کرنے کیلئے لوگوں کی سیاست اور ان کی اصلاح کیلئے ان کے نفوس کی تکمیل اور تزکیہ کیلئے اور ان میں اللہ کا حکم نافذ کرنے کیلئے''

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے **حكم بالعدل، اقامة الاحكام تنفيذ احكام اور سياسة الناس** کے الفاظ نقل کئے ہیں ظاہر ہے کہ انصاف کے ساتھ فیصلے کرنا، خدا کے احکام کو نافذ کرنا اور سیاست الناس صرف تبلیغ وتعلیم کے کام نہیں بلکہ ایک حکمران کے فرائض ہیں۔

---

[۱] سراج الدین احمد قاضی، حقیقت خلافت، ص:۱۳۰ [۲] البقرہ، ۲/۳۰

[۳] تفسیر ابن جریر، ۱/۲۰۰ [۴] ابن اثیر: الکامل، ۱/۴۷

ضروری نہیں کہ حکومت کا نظم دور حاضر کی طرح ہمہ گیر ہو۔ خلافت آدمؑ کے دور میں فطری اور سادہ تھی۔ لیکن تھی بہر حال حکومت۔ ابن الاثیر اور ابن جریر کے حوالہ کے مطابق آدم کو نبوت کے ساتھ "**ملك الارض** "یعنی زمین کی حکومت بھی دی گئی تھی اور اس کی وفات پر اس کے بیٹے شیث علیہ کے سپرد ہوئی تھی۔ شیث کے بعد **سیاسة الملك** کی ذمہ داری اس کے بیٹے حضرت انوش کی ذمہ داری تھی۔ [1]

قرآن مجید سے حضرت آدم علیہ السلام کی سیاست و قیادت کے جو اصول واضح ہوتے ہیں ان کی مختصر سی تشریح اس طرح ہے۔ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

انی جاعل فی الارض خلیفة [2]

اس آیت کے پہلے حصہ 'انی جاعل' سے حاکمیت الیہ کا اصول ثابت ہوتا ہے یعنی حاکم اور مقتدر اعلیٰ اللہ کی ذات ہے۔ اور آدمؑ اس کے مقرر کردہ خلیفہ تھے۔ **فی الارض** دوسرے حصہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ آدمؑ کی خلافت و ریاست علاقائی و جغرافیائی حدود کے اندر محدود نہیں تھی بلکہ اللہ کی ساری زمین اس کا علاقہ تھا۔ تیسرا حصہ "خلیفہ "خلافت نیابتی حکومت تھی جو اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات کی پابند تھی۔ خود مختار اور مطلق العنان بادشاہت یا عوام کی مرضی کی حکومت نہ تھی۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو چیزوں کے نام سکھائے۔ خلافت کیلئے دینی علم کے ساتھ دنیوی علم بھی ضروری ہے۔ اور احکام شرعیہ کے علم کے ساتھ زمینی اشیاء کا علم بھی ضروری ہے۔ حضرت آدمؑ کو "عمارۃ الارض اور سیاسة الناس" کا کام بھی کرنا تھا اس لیے آپ کو علم الاحکام کے ساتھ علم الاشیا بھی دیا گیا ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی قیادت (۱۸۷۷ء ق م تا ۱۷۹۷ء ق م)

سورۃ یوسف میں ارشاد ربانی ہوتا ہے۔

وقال الملك ائتونی به استخلصه لنفسی فلما کلمه ، قال انك الیوم لدینا مکین امین ہ قال اجعلنی علی خزآئن الارض انی حفیظ علیم ہ وکذٰلك مکنا لیوسف فی الارض یتبوا منها حیث یشآء نصیب برحمتنا من نشآء ولا نضیع اجر المحسنین ہ ولا اجر الاخرة خیر للذین اٰمنوا وکانوا یتقون ہ [3]

"کہا بادشاہ نے لے آؤ اس کو میرے پاس تا کہ میں اسکو اپنے لئے مخصوص کرلوں پھر جب گفتگو کی اس سے تو کہا بادشاہ نے بے شک تم آج سے ہمارے ہاں معزز و معتمد ہو۔ یوسف نے کہا مقرر کرلو مجھ کو ملک کے خزانوں پر بہت حفاظت کرنے والا ہوں۔ خوب جاننے والا ہوں اور اس طرح اقتدار دیا تھا ہم نے یوسف کو مصر کی زمین میں جگہ بنا تا تھا اس میں جہاں چاہتا پہنچا دیتے ہیں ہم اپنی رحمت، جس کو چاہیں اور ضائع نہیں کرتے ہم بدلہ نیک لوگوں کا اور ثواب آخرت کا بہتر ہے۔ ان کے لیے جو ایمان لائے اور رہے پرہیز گاری میں"

ان آیات میں یوسفؑ کی حکومت کا ذکر ہے جو آپ نے مصر کی سرزمین پر کی تھی۔ ابراہیمؑ نے عراق سے ہجرت کر کے کنعان (فلسطین) کو اپنا لیا تھا اسی جدید مرکز اسلام میں ابراہیم کے پوتے حضرت یعقوبؑ کے ہاں یوسفؑ پیدا ہوئے۔ بھائیوں نے آپ کو کنویں میں ڈال دیا ایک تجارتی قافلہ نے کنویں سے نکال کر عزیز مصر کے پاس فروخت کر دیا۔ عزیز مصر کی بیوی نے آپ کو گناہ پر آمادہ کرنے کیلئے ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے لیکن حضرت یوسفؑ نے انکار کیا اور بالکل معصوم اور پاک دامن رہے۔ نا کردہ گناہ کے الزام میں جیل بھیج دیئے گئے۔ تقریباً دس سال جیل میں رہے۔ جیل کے اندر آپ کو نبوت ملی اور توحید کی دعوت جیل والوں کو دی۔ آپ کی امانت، صداقت، ضبط نفس،

---

[1] ابن جریر، تاریخ طبری، ۱/۸۱		[2] البقرہ ۲/۳۰		[3] یوسف ۱۲/۵۴۔۵۷

حلم و بردباری، ذہانت وفراست، عالی ظرفی اور معاملہ فہمی سے اہل مصر بے حد متاثر ہوئے۔ بادشاہ بھی متاثر ہوا۔ اور خواب کی تعبیر اور آنے والے قحط کی تدابیر بیان کرنے سے شان یوسفی اور کمال یوسفی کا مزید ظہور ہوا۔ بالمشافہ گفتگو سے تاثر میں اور اضافہ ہوا۔ بادشاہ نے کہا کہ آج سے تم میرے دربار میں معزز و معتمد ہو۔ یوسفؑ نے محسوس کیا کہ اقامت دین کیلئے اقتدار پر قبضہ کرنے کیلئے حالات ساز گار ہیں چنانچہ انہوں نے کہا کہ صرف معزز اور معتمد ہونے سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ ملک کے تمام خزانے، سارے وسائل ذرائع اور مکمل اختیارات میرے حوالے کر دو۔ بادشاہ نے یہ مطالبہ تسلیم کرلیا اور ملک کے سارے کام اس کے سپرد کر دیئے اور خود برائے نام بادشاہ رہ گیا

حضرت یوسفؑ نے اقتدار پانے کے بعد عدل وانصاف کے ساتھ ۸۰ سال تک مصر پر حکومت کی۔ عورتیں اور مرد سب کے سب ایمان لے آئے اور ملک کے سردار اور ذمہ دار لوگ تقریباً سب کے سب آپ کے تابعدار ہوگئے۔ یہ بادشاہ کون تھا جس نے حضرت یوسفؑ کو اقتدار دیا۔ عرب مورخین اور ہمارے مفسرین اس بادشاہ کا نام ریان بن الولید بتلاتے ہیں۔ جو عملاق بن لاوَز بن سام کی اولاد سے تھا۔

ابن جریر طبریؒ لکھتے ہیں:

ابن عباسؓ اور ابن اسحاقؒ سے مروی ہے کہ اس دور کے بادشاہ کا نام ریان ابن الولید تھا جو عمالقہ میں سے تھا۔[1]

ابن کثیر لکھتے ہیں:

وسلطه علیٰ جمیع ارض والبسه خاتمه وقال له لست اعظم منك اِلا بالكرسی وكان یوسف اذ ذاك الحاكم فی امور الدّیار المصریة دنیاً[2]

"اور بادشاہ نے حضرت یوسفؑ کو ساری زمین مصر کا حکمران بنا دیا اپنی انگوٹھی (مصر سلطنت) اسے پہنا دی اور کہا کہ میں تم سے صرف تخت اور کرسی میں اونچا ہوں۔ اس زمانے میں ممالک مصریہ کے حکمران یوسفؑ تھے"۔

دنیا کے اعتبار سے بھی اور دینی قیادت کے اعتبار سے بھی دوسروں نے اسکا نسب اس طرح نقل کیا ہے۔ ریآن بن ولید بن ثروان بن الارشد بن فاران بن عمرو بن عملاق بن لاوَز بن سام بن نوح۔ بعض نے کہا کہ بادشاہ نے اپنی موت سے قبل اسلام قبول کرلیا تھا اور یوسفؑ کی تابعداری اختیار کرلی تھی اور یوسفؑ کی زندگی میں ہی اس نے وفات پائی۔ "[3]

طالوت کی قیادت:

قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

وقال لهم نبيهم ان الله قد بعث لكم طالوت ملكاً قالو انّٰی یكون له الملك علینا ونحن احق بالملك منه ولم یوت سعة من المال قال ان اللهٰ اصطفٰه علیكم وزاده بسطة فی العلم والجسم والله یوتی ملكه من یشاء والله واسع علیم[4]

"اور پیغمبر نے ان سے (یہ بھی) کہا کہ خدا نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے وہ بولے کہ اسے ہم پر بادشاہی کا حق کیونکر ہوسکتا ہے۔ بادشاہی کے مستحق تو ہم ہیں اس کے پاس تو بہت سی دولت بھی نہیں۔ پیغمبر نے کہا کہ خدا نے اس کو تم پر فضیلت دی ہے اور بادشاہی کیلئے منتخب کیا ہے اس نے اسے علم اور جسم میں تم پر زیادہ فراخی دی ہے۔ اور خدا (کو اختیار ہے) جسے چاہے بادشاہی بخشے وہ بڑا فضل والا اور سب کچھ جاننے والا ہے"۔

موسیٰؑ اور ہارونؑ کے انتقال کے بعد جب یوشع بن نون کی قیادت میں فلسطین فتح ہوا تو بنی اسرائیل اپنی کوئی متحدہ حکومت قائم نہ کر

---

[1] الطبری، تاریخ الامم والملوک، ۱/۲/۱۷۲ [2] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۱/۲۱۰ [3] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۱/۲۱۱ [4] البقرہ، ۲/۲۴۷

سکے بلکہ قبائلی عصبیت میں مبتلا ہو گئے ساڑھے تین سو سال سے زائد مدت تک طوائف الملو کی کا دور رہا یہاں تک کہ عمالقہ کے سابقہ مشرک قبائل نے متحدہ محاذ بنا کر بنی اسرائیل کو فلسطین کے بڑے حصے سے بے دخل کر دیا اور تابوت سکینہ بھی چھین لیا۔ آخر کار طالوت ؒ نے ۳۱۳ مومنین وصالحین کی مختصر سی فوج کے ساتھ عمالقہ کا مقابلہ کیا اور جالوت کی فوجوں کو شکست دی۔

۱۰۲۰ ق م میں بنی اسرائیل کی متحدہ حکومت قائم ہوئی جو ۱۰۰۴ ق م تک قائم رہی۔ طالوت خود نبی نہیں تھے ان کی حکومت اصل میں حضرت شموئیلؑ کی زیر قیادت تھی۔ لیکن چونکہ وہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ اس لئے عملاً حکومت کا نظام طالوت کے ہاتھ میں تھا۔ وہ شموئیلؑ کی ہدایت کے مطابق کام کرتا اور اس کا تقرر بھی بذریعہ وحی ہوا تھا۔ طالوت اگرچہ بنی اسرائیل میں سے تھا مگر اس کے خاندان میں سے اس سے پہلے کوئی حکمران یا سردار نہیں گزرا تھا اور اس وقت بنی اسرائیل میں قبیلہ پرستی اور مادہ پرستی کے جراثیم پھیل چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے اللہ کے مقرر کردہ حکمران پر بھی اعتراض کیا اور دلیل یہ دی کہ اس کے پاس دولت نہیں ہے یعنی حکومت کرنا تو نوابوں، چوہدریوں اور وڈیروں کا حق ہے۔ غریبوں، مزدوروں، محنت کشوں کا کام تو سرمایہ داروں کی خدمت کرنا ہے۔ نہ کہ ان پر حکومت کرنے لگیں۔ خدا کے نبی نے فرمایا کہ قیادت و سیاست اور حکومت کیلئے نسب قبیلے اور دولت وثروت کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ اہلیت کو اہمیت حاصل ہے۔ طالوت جسمانی اور علمی قوت میں تم سب پر فائق ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو تم پر حکمرانی کیلئے مقرر کیا ہے۔ وہ لوگ تیار پھر بھی نہیں تھے مگر کرامت کے طور پر جب تابوت سکینہ (متبرک صندوق) طالوت کے پاس پہنچ گیا تو اس کے بعد کہیں جا کر اس کی قیادت قبول کی طالوت نے ملک کو عمالقہ کے مشرک قبائل سے آزاد کروانے کیلئے فوج تیار کی۔ اردن پر پانی پینے سے منع کر کے فوج کے صبر واستقامت اور ڈسپلن کا امتحان لیا۔ ہزاروں میں سے صرف ۳۱۳ یا کم وبیش لوگ امتحان میں کامیاب ہوئے۔ انہیں مٹھی بھر لوگوں میں داؤد بھی طالوت کی فوج میں شامل تھے۔ اس عظیم فتح کے بعد بنی اسرائیل کی متحدہ ومستحکم حکومت شام وفلسطین میں قائم ہوئی اور طوائف الملو کی کا دور ختم ہوا۔[۱]

داؤد علیہ السلام کی قیادت (۱۰۰۴ق م..........۹۶۵ق م تقریباً)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

یٰداؤد دانا جعلنٰك خليفة فی الارض فاحكم بين الناس بالحق ولا تتبع الهوٰى فيضلك عن سبيل الله ط ان الذين يضلون عن سبيل الله لهم عذاب شديد بما نسوا يوم الحساب[۲]

''اے داؤد ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے تو لوگوں میں انصاف کے فیصلے کیا کرو اور خواہش کی پیروی نہ کرنا کہ وہ تمہیں خدا کے رستے سے بھٹکا دے جو لوگ خدا کے رستے سے بھٹکتے ہیں ان کیلئے عذاب (تیار) ہے کہ انہوں نے حساب کے دن کو بھلا دیا''

وآتاه الله الملك والحكمة وعلمه ممّا يشاء[۳]

"اور خدا نے ان کو بادشاہی اور دانائی بخشی اور جو کچھ چاہا سکھایا۔"

طالوت کے بعد داؤد علیہ السلام کی خلافت قائم ہوئی تھی جو ۱۰۰۴ ق م تک تقریباً ۴۰ سال تک قائم رہی۔ ان آیات میں اسی خلافت کا ذکر ہے کہ جالوت کے قتل کے وقت ہی حضرت داؤدؑ کی شجاعت ظاہر ہو گئی تھی۔ نبوت اور حکومت ملنے کے بعد خدا کے فضل وکرم سے فتح ونصرت ہر وقت ان کے قدم چومتی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں شام، عراق، فلسطین اور اردن کے تمام علاقوں پر ان کی خلافت قائم ہو گئی۔

---

[۱] گوہر رحمٰن، اسلامی سیاست، ص: ۱۵۸	[۲] صٓ، ۲۶/۳۸	[۳] البقرہ، ۲۵۱/۲

سلیمان علیہ السلام کی قیادت

ارشادِ باری تعالیٰ ہے

واتّبعوا ما تتلوا الشیٰطین علی ملك سلیمان ۱؎

''اور یہودیوں نے اس جادو کی پیروی شروع کردی جسے سلیمان کی حکومت کے زمانے میں شیطان پڑھا کرتے تھے''

وکُلّا آتینا حکما وعلما ۲؎

''اور ہم نے دونوں (داؤد اور سلیمان) کو حکم (یعنی علم وحکومت) اور علم بخشا تھا''

قال ربی اغفرلی وھب لی ملکا لا ینبغی لِاحد من بعدی انك انت الوھاب ۳؎

''(اور سلیمان نے) دعا کی اے پروردگار مجھے بخش دے اور مجھ کو ایسی بادشاہی عطاء فرما کہ مناسب نہ ہو کسی کو میرے بعد بیشک تو ہی بخشنے والا ہے''۔

داؤد علیہ السلام کے بعد ان کی وسیع سلطنت ان کے بیٹے سلیمان کو منتقل ہوگئی۔ یہ ولی عہدی کا مروجہ طریقہ نہیں تھا بلکہ جس طرح داؤد علیہ السلام کو اللہ نے حکومت کیلئے مقرر کیا تھا۔ اسی طرح سلیمان کو بھی اسی نبوت کے ساتھ حکومت بھی دی۔ نبی خدا کا نامزد کردہ ہوتا ہے۔ حاکم اعلیٰ جب ماتحت عملے کا تقرر کرتا ہے تو اس کیلئے انتخاب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قرآن حکیم میں یہ نہیں کہا گیا کہ داؤد نے سلیمان کو وارث حکومت اور جانشین بنایا تھا۔ بلکہ وارث کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں ورث ہوا یعنی قائم مقام ہوا۔ کس نے وارث اور قائم مقام بنایا؟

اس کا جواب واضح ہے کہ جس نے داؤد کو خلیفہ بنایا تھا اس نے سلیمان کو بھی خلافت کا منصب عطا فرمایا تھا یعنی خود خدا نے دونوں کو یہ ذمہ داری سونپی تھی غیر انبیاء چونکہ خدا کے نامزد کردہ نہیں ہوتے اس لیے ان کا تقرر امت مسلمہ بذریعہ شوریٰ کرتی ہے۔ سلیمان کی دعا قبول کر کے اللہ تعالیٰ نے ان کو پرندوں کی بولیاں سمجھنے کی قوت دی تھی اور ہوا اور جنوں کو بھی ان کیلئے مسخر کردیا تھا۔ ملکہ سبا کی حکومت بھی ان ہی کے دائرہ اختیار میں آ گئی تھی۔ اس طرح داؤد کے مقابلے میں سلیمان کی حکومت زیادہ طاقتور اور وسیع تھی۔

واُوتینا من کل شی انّ ھذا لھوا الفضل المبین ۴؎

''اور ہم کو دی گئی ہر ضروری چیز اور یقیناً یہ اللہ کا صریح فضل واحسان ہے''

"یعنی اس عظیم الشان اور وسیع مملکت کیلئے جو چیزیں اور سامان درکار تھا وہ سب عطاء فرما دیئے گئے۔ دعاء سلیمانی سے ثابت ہوتا ہے کہ اقامت دین اور نفاذ شریعت کیلئے خدا سے مستحکم حکومت مانگنا نبوت اور تقوی کے خلاف نہیں۔ افسوس ہے کہ سلیمان کے بعد اس کے جانشینوں کی نالائقی اور قوم کی اخلاقی خرابی کی وجہ سے دوبارہ مخالفین نے سر اٹھایا اور حکومت کے زوال کا آغاز ہوا۔

۱؎ البقرہ، ۲/۱۰۲　　　۲؎ الانبیاء، ۲۱/۷۹

۳؎ صٓ، ۳۸/۳۵　　　۴؎ النمل، ۲۷/۱۶

ذوالقرنین کی قیادت

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

ویسئلونك عن ذی القرنین ط قل ساتلو اعلیکم منه ذکرا ہ انا مکنا له فی الارض واٰتینٰه من کل شیء سببا[1]

''اورتم سے ذوالقرنین کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ میں اس کا کس قدر حال تمہیں پڑھ کر سناتا ہوں ہم نے اس کو زمین میں بڑی دسترس دی تھی اور ہر طرح کا سامان عطا کیا تھا''

قرآن کریم نے سورۃ الکھف کی آیت ۸۲ سے لے کر ۹۸ تک ذوالقرنین کی حکومت اس کے جہاد عدل وانصاف اور خداترسی کا قصیدہ بیان فرمایا ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں ذوالقرنین کے نام سے خدا کا کوئی مقبول، عادل اور دیندار حکمران گزرا ہے۔ جس کے پاس وسیع وسائل تھے۔جس نے اپنے مرکز کے مغرب اور مشرق اور ایک تیسری سمت (شاید شمال میں) فتوحات حاصل کیں تھیں اور یاجوج ماجوج کے مظالم اور فساد کے انسداد کیلئے اور رعایا کی بہبود کے لئے ایک مضبوط آہنی دیوار بنائی تھی اس کی مملکت میں عدل وانصاف کا دور دورہ تھا۔ مجرموں کو سزائیں دیتے تھے اور باقی رعایا کے ساتھ انتہائی نرمی اور شفقت سے پیش آتے تھے۔اپنی اس وسیع وعریض حکومت اور عظیم مادی وسائل پر غرور وتکبر نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اس کو اللہ کی رحمت سمجھتے تھے۔

قرآن کریم اور احادیث مرفوعہ میں اس کا زمانہ اور دیگر تفصیلات بیان نہیں ہوئیں۔قرآن حکیم تاریخ کی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کا موضوع ہدایت کے احکام اور عبرت کے واقعات بیان کرنا ہے اور یہ مقصد تفصیلات جاننے کے بعد بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ ہمارا مقصد بھی صرف یہ بتانا ہے کہ ذوالقرنین ایک عادل حکمران تھا۔جس کی اللہ تعالیٰ نے تعریف کی ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ اقامت دین اور قیام عدل کیلئے حکومت اور سیاسی نظام کا قیام لازمی ہے۔

بعض مورخین کو یہاں تک کہ بعض مفسرینؒ کو بھی شدید غلط فہمی ہوئی تھی کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر یونانی مقدونی ہے۔جس کا زمانہ ۳۰۰ ق م ہے۔جس نے دارا کو قتل کیا تھا جس کا وزیر ومشیر مشہور فلسفی ارسطو تھا۔ابن کثیر نے البدایہ اور تفسیر دونوں میں اس قول کی سختی کے ساتھ تردید کی ہے سکندر یونانی مشرک تھا اور ذوالقرنین مذکورہ فی القرآن کا ایک مومن صالح ہونا خود قرآن حکیم سے ثابت ہوتا ہے۔

حضرت علیؓ کی ایک روایت میں آتا ہے کہ ذوالقرنین نہ نبی تھے نہ فرشتہ تھے بلکہ ایک صالح مسلمان تھے۔حافظ ابن کثیرؒ کی اپنی تحقیق یہ ہے کہ ذوالقرنین مذکورہ فی القرآن سکندر یونانی سے تقریباً ۲ ہزار سال قبل ابراہیم کے زمانے میں گزرا ہے اس نے پیادہ حج کیا تھا۔اور ابراہیمؑ کے ساتھ ملاقات بھی کی تھی اور مصافحہ بھی کیا تھا۔[2]

یہی قول بالعموم عربی تاریخوں اور عام تفاسیر میں ہے۔لیکن جدید محققین کی تحقیق یہ ہے کہ ذوالقرنین مذکورہ فی القرآن سے مراد مشہور حکمران سائرس ایرانی ہے جس نے ایران میں ھخامنشی خاندان کے دور حکومت کی بنیاد رکھی تھی اور یہ ایک عادل حکمران تھا جس پر ایرانی فخر کرتے ہیں۔یہودی خورس، یونانی، سائرس اور عرب اس کو کیخسرو کہتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے تفہیم القرآن میں اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوھاروی نے قصص القرآن میں اس جدید تحقیق کو ترجیح دی ہے۔مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوھاروی نے اس رائے پر بڑے تفصیلی اور وزن دار دلائل بیان کئے ہیں۔[3]

---

[1] الکھف،۱۸/۸۳۔۸۴ [2] ابن کثیر: البدایہ والنہایہ،۲/۱۰۶ [3] گوہر رحمٰن: اسلامی سیاست، ص:۱۶۵

فصل دوم

حضرت محمد ﷺ کی قیادت وسیادت (نبوی تعلیمات)

انبیاء ورسل کے سلسلے کی آخری کڑی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے دورنبوت کا آغاز سرزمین مکہ سے ہوا۔ پہلے خفیہ اور پھر علی الاعلان کلمۂ توحید کی تبلیغ کی۔ محدود تعداد نے حق کی آواز پر لبیک کہی جب کہ اہل مکہ کی دشمنی اور عملی مخالفت میں روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ خود آپ اور آپؐ کے صحابہ کرامؓ کو بڑے صبر آزما حالات سے گزرنا پڑا۔ مصائب وآلام اور اذیت ناک سزائیں جس طرح روا رکھی گئیں وہ تاریخ اسلام کا ایک نہایت دردناک باب ہے۔ بظاہر تمام کوششوں کے باوجود یہاں اسلام کے عالمگیر اصولوں کے مطابق مستقل بنیادوں پر اسلامی حکومت کا قیام ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ چنانچہ بیعت عقبہ اولی اور بیعت عقبہ ثانیہ کے بعد کچھ صحابہ کرامؓ ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے اور بعد ازاں سید دو عالم ﷺ بھی ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے آئے اور یہیں حضور ﷺ کی قیادت میں پہلی اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

اسلام کا مقصد اگر چہ دنیا میں حکومت وسلطنت کا قیام نہیں ہے، لیکن وہ حسن عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔ اللہ جل شانہ نے اپنے بندوں سے **استخلاف فی الارض** کا وعدہ کیا ہے جس کا ذکر اس آیۂ قرآنی میں موجود ہے۔

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعمِلُوا الصّٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم [۱]

''وعدہ کر لیا ہے اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے ہیں اور نیک عمل کیے ہیں کہ ان کو خلافت دے گا زمین میں جیسا کہ خلافت دی تھی اُن لوگوں کو جو پہلے گزر چکے تھے''

اسلام کے احکام وقوانین کا پورا قیام ونفاذ حکومت کے بغیر نہیں ہوسکتا، چنانچہ سید دو عالم ﷺ نے مدینہ میں قیام کے بعد ریاست مدینہ کو عملی شکل دینا شروع کر دی جس کی تکمیل خلافت راشدہ کے زمانے میں ہوئی اور عہد رسالت کے سادہ نظام حکومت نے آگے چل کر ایک عظیم الشان حکومت کی شکل اختیار کر لی، جس کا ایک سرا ہندوستان وچین سے ملتا تھا اور دوسرا جبرالٹر سے۔ کسی ایسی ریاست کو جس میں بسنے والے لوگ مختلف مذاہب، مختلف قبائل اور مختلف نظریات کے حامل ہوں ایک دستور کا پابند کئے بغیر مستحکم بنیادوں پر استوار کرنا یا عملی شکل دینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے ہجرت کے پہلے ہی سال ایک دستور مرتب فرمایا۔ جس میں حکومت رعایا اور دیگر تمام متعلقات کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ اس دستاویز کی باون دفعات ہیں۔ یہ دستاویز حضور ﷺ کی سیاسی بصیرت اور حکمت عملی کا شاہکار ہے۔ اس کی ایک ایک دفعہ سیاسی تدبر اور ریاست کے استحکام کی مظہر ہے۔

میثاقِ مدینہ:

مدینہ پہنچنے کے بعد آنحضرت ﷺ نے مدینہ میں بسنے والی اقوام نصاریٰ، یہود اور مسلمانوں کے درمیان ایک معاہدہ قلمبند کرایا جو تاریخ میں "میثاق مدینہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ اور یہ وہ پہلا تحریری دستور ہے جو آج تک تاریخ کے صفحات میں موجود ومحفوظ ہے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں "دنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور آنحضرت ﷺ نے تحریر کروایا" غرض عام قواعد وقوانین ملک کم وبیش تحریری صورت میں ہر جگہ ملتے ہیں لیکن دستور مملکت کو عام قوانین سے علیحدہ تحریری صورت میں لانا' اس کی نظیر باوجود بڑی تلاش کے عہد نبوی سے پہلے نہیں مل سکی ہے۔ [۲]

ہجرت کے پہلے ہی سال آنحضرت ﷺ نے یہ نوشتہ مرتب فرمایا اس دستور کی اہمیت کو غیر مسلم مؤرخین نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس

---

۱ النور، ۲۴/۵۵ ۲ ڈاکٹر حمید اللہ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، ص: ۷۵

دستور کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شروع دور اسلام میں قرآن کے علاوہ کوئی دوسری چیز لکھنے کی ممانعت تھی۔ لیکن اس دستور کو آنحضرت ﷺ نے خود قلمبند کروایا۔ اس معاہدے کی ہر دفعہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی ایسے مدبر اور ماہر قانون کا تیار شدہ ہے جو حالات کی جزئیات تک سے کلی طور پر واقف ہو۔ آپؐ نے میثاقِ مدینہ میں چونکہ ہر شخص کی مذہبی آزادی اور عدل وانصاف کے ساتھ ہر ایک کے یکساں حقوق کو تسلیم کیا تھا۔ لہٰذا مدینہ میں مقیم دو بڑے قبیلے اوس اور خزرج کو بھی اس دستاویز کو قبول کرنے کے بغیر چارہ نہ تھا۔ میثاق مدینہ صرف اپنے زمانے ہی میں اہمیت کا حامل نہیں بلکہ آنے والے تمام مسلمان حکمرانوں کے لئے بھی اس میں رہنما اصول مہیا کئے گئے ہیں۔ یہ ضمیر کی آزادی کا پہلا جائزاور انسانیت کا اولین دستور ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ مسلم مورخین سے کہیں زیادہ مستشرقین نے کیا ہے۔ [۱]

معروف مستشرق نکلسن لکھتے ہیں۔

> "بظاہر یہ محتاط اور دانشمندانہ اصطلاح ہے، حقیقت میں یہ ایک انقلاب ہے۔ محمد ﷺ نے قبائل کی بے راہ روی پر کھلم کھلا ضرب نہیں لگائی، لیکن اسے ختم کر ڈالا............ ہر چند اس وحدت میں یہودی، مشرکین اور مسلمان شریک تھے۔ لیکن آپؐ اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ اس نوزائدہ ریاست میں فعال اور بااثر حصہ دار مسلمان ہی ہیں۔ اس حقیقت کو آپ کے مخالفین پہلے نہ دیکھ سکے" [۲]

آنحضرت ﷺ نے ریاست کے استحکام کیلئے وہاں کے مروجہ نظام کو ہی اختیار فرمایا۔ قبائلی نظام جمہوری نظام کے بہت قریب تھا سردار، عمر، علم اور خاندانیت میں افضل ہونے کی بناء پر منتخب کیا جاتا تھا اور وہ قبیلہ کے دیگر افراد کے مقابلے میں (First among equal) کی حیثیت رکھتا تھا۔ آئین مدینہ نے اس نظام کو قبول کیا اور اس طرح علاقائی جمہوریت کا نظام بھی مہیا کیا گیا۔ علاقائی جمہوریت سے مراد یہ کہ مرکزی حکومت وفاق پر اپنی "Will" کو مسلط نہیں کرتی۔ تاہم کسی وفاقی اکائی کو بادشاہت، جاگیردارانہ نظام، اشرافیہ یا استبدادیت قائم کرنے کی اجازت نہ تھی۔

ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن نے جمہوریت سے متعلق اسلامی رویہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جانشینی کا سوال ایک سیاسی ہنگامہ کی شکل میں اُٹھا، بات یہ تھی کہ آنحضرت ﷺ نے اس کا فیصلہ اپنی زندگی میں نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ آپ عربوں کے جمہوری نظام کو پسند فرماتے تھے، اس لئے آپؐ کو اعتماد تھا کہ مسلمان جمہوری طریقہ انتخاب سے ایک شخص کو اپنا حاکم بنالیں گے۔ [۳]

جزیرہ نمائے عرب نے اسلام سے پہلے کبھی ایک منظم حکومت کی شکل اختیار نہیں کی، اس دستاویز کو قبول کرنے کے بعد پہلی مرتبہ یہاں کے باشندگان حضور ﷺ کی سیادت وقیادت میں متحد ہوئے۔

اسلامی حکومت کے قیام یعنی قوانین الٰہیہ کے مکمل نفاذ کے لئے سرکار مدینہ ﷺ کو میدان کارزار میں دشمنان اسلام سے نبرد آزما بھی ہونا پڑا۔ حضورؐ کی زندگی کا یہ پہلو بھی اپنا انفرادی اور امتیازی مقام رکھتا ہے۔ آپؐ کی زندگی مقدسہ کے اس پہلو پر اہل علم نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ "الرسول القائد" کے مصنف لکھتے ہیں۔

> "سیرت سے متعلق بہت سی کتابوں کا میں نے امعان نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اس مطالعہ کا نتیجہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی حیات عسکری مجھے بہت زیادہ گراں بہا اور گراں مایہ نظر آئی، تاریخ حربیات

۱۔ قادری شمیم حسن سید، اسلامی ریاست قرآن وسنت کی روشنی میں، ص: ۱۵

۲۔ Nicholson, A Literary History of the Arabs,P173

۳۔ حسن ابراہیم، مسلمانوں کا نظم مملکت، ص: ۲۰

میں آپ کا مقام قدیم و جدید تمام سپہ سالاروں اور امیران عسا کر سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے
البتہ یہ بات ضرور ہے کہ آپ کی حیات عسکری کے لازوال اور غیر فانی پہلوؤں کو اب تک اجاگر
کرنے کی کوشش نہیں کی گئی.......... آپ ؑ کی حیات طیبہ کا یہ پہلو جو حد درجہ عظیم اور وقیع ہے،
چشم دنیا سے ابھی تک پنہاں ہے یا کم ازکم اپنے اصل آب و رنگ کے ساتھ نظروں کے سامنے
نہیں آیا"[۱]

حضورؐ کی زندگی کے عسکری پہلو پر نظر ڈالیں تو تین باتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔

۱۔ ایک تو یہ کہ آپؐ حد درجہ بلند ہمت اور صاحب عزم وثبات قائد افواج تھے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ آپؐ کی ساری جنگیں، حمایت حریت عامہ، نشر اسلام اور ارکان اسلام کی صیانت و حفاظت کیلئے تھیں نہ کہ اعتصاب واستقلال، ظلم و جور، قتل و غارت اور بندگان خدا کی غلامی کیلئے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ بالعموم تمام سپہ سالاروں کو اپنی قوم کی حمایت اور پشت پناہی حاصل ہوتی تھی، جب کہ آپ کو ایک نئی قوم کی تشکیل کرنا پڑی جس کے اجزاء مختلف مقامات سے حاصل کئے گئے تھے۔

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انسانی جان بہت زیادہ محترم ہے۔ ناگریز اسباب و وجوہ کے بغیر انسانی جان کی حفاظت کو ہر حال میں لازم قرار دیا گیا ہے۔

سیدنا دو عالم ﷺ نے ہمیشہ انسانی جان کے احترام کی تلقین کی ہے۔ صرف دو مثالیں پیش خدمت ہیں۔

عن انس بن مالك عن النبی ﷺ قال اکبر الکبائر الاشراك بالله وقتل النفس و حقوق الوالدین و قول الزور

"انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بڑے گناہوں میں سے سب سے بڑا
گناہ اللہ کے ساتھ شریک کرنا ہے، پھر قتل نفس، پھر والدین کی نافرمانی کرنا اور پھر جھوٹ بولنا"[۲]

"ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

عن ابن عمر قال قال رسول ﷺ لن یزال المومن فی فسحةٍ من دینهٖ مالم یصب دماً حراماً

''مومن اپنے دین کی وسعت میں اس وقت تک برابر رہتا ہے، جب تک وہ کسی حرام خون کو نہیں بہاتا''[۳]

انسانی معاشرت میں سب سے مقدم اور مقدس شئے انسان کی جان ہے، دنیا کے تمام مہذب قوانین اور شریعتوں میں احترام نفس کا یہ اصول موجود رہا ہے۔ اسی اصول کی بنیاد پر انسانی معاشرت منظم ہوتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فکر انسانی کو نیا رخ دیا۔ انسان کا مرنا اور جینا اللہ کے لئے قرار دیا اور اس فکر و عقیدہ کی آبیاری کی کہ مومن کی تلوار صرف اور صرف اعلائے کلمۃ الحق کے لئے بے نیام ہو سکتی ہے۔ گویا اسلامی نقطہ نظر سے بقول مصنفِ ''الرسول القائد''

"جنگ صرف اس صورت میں جائز ہے کہ وہ دعوت اسلام کی آزادی اور امن وامان برقرار رکھنے کیلئے
لڑی جائے اور دوران قتال شجاعت و شرافت کے اصولوں کی مراعات ملحوظ خاطر رکھی جائیں"[۴]

۱۔ محمود شیث خطاب، الرسول القائد، ص:۵
۲۔ صحیح بخاری، کتاب الدیات، حدیث رقم:۱۷۶۵
۳۔ صحیح بخاری، کتاب الدیات، حدیث رقم ۱۷۵۷
۴۔ محمود شیث خطاب، الرسول القائد، ص:۱۹

سید دو عالم ﷺ کو ریاست مدینہ کے استحکام کے ضمن میں یہودیوں کی طرف سے کی جانے والی سازشوں سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا اور صلح حدیبیہ کے بظاہر تلخ مرحلے کو بھی سر کرنا پڑا۔اس تناظر میں جب آپ صلح حدیبیہ اور اس کی شرائط پر غور کریں تو یہ معاہدہ آنحضرت ﷺ کی سیاست خارجہ کا شاہکار نظر آتا ہے۔اس معاہدے پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کمال حکمت عملی سے اس معاہدہ میں باندھ کر ان تینوں فریقوں کو اس بات کا پابند بنا دیا کہ وہ مسلم ریاست پر متحد حملہ آور نہ ہوں۔ڈاکٹر حمید اللہ لکھتے ہیں۔

"حدیبیہ میں قریش کو یہودیوں کے متعلق غیر جانبدار رہنے پر آمادہ کر دینا وہ زبردست سیاسی اور سفارتی (ڈپلومیٹک) کامیابی تھی۔کہ اس کے متعلق قرآن مجید کا دیا ہوا نام "فتح مبین" ذرا بھی مبالغہ آمیز نظر نہیں آتا ہے"[۱]

معاہدہ حدیبیہ میں عرب کے دیگر قبائل کو اپنی مرضی پر چھوڑ دیا گیا تھا کہ وہ جس کا حلیف بننا چاہیں بن جائیں۔معاہدہ حدیبیہ کی رو سے ان میں سے کسی کو بھی دوسرے پر ہاتھ اُٹھانے کا حق نہ تھا لیکن قریش اور اس کے حلیف قبیلہ نے معاہدہ کی پاسداری نہ کی۔بنو بکر نے خزاعہ کے آدمیوں پر حملہ کیا۔انہوں نے حرم میں پناہ لینا چاہی مگر وہاں بھی خون بہایا گیا۔اس حملے میں قریش نے اپنے حلیف قبیلہ کی اسلحہ و افراد کے ساتھ مدد کی۔اس صورت حال کی اطلاع دینے کیلئے خزاعہ کا ایک وفد بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوا اور جملہ حالات بیان کئے۔ آنحضرت ﷺ کو قریش کی طرف سے یہ بدعہدی بہت ناگوار گزری۔دس برس کی شبانہ روز جسمانی اور روحانی کاوشوں کے بعد بالآخر ۸ ہجری کو آپؐ کی قیادت میں دس ہزار جاں نثار مکہ آئے لیکن آنحضرت ﷺ کا مکہ میں داخلہ کسی جبار فاتح کی طرح نہیں تھا آپؐ کا یہ فاتحانہ داخلہ نبی اور ایک بادشاہ کے داخلے میں فرق کو نمایاں کر رہا تھا آپؐ عجز و انکسار کے ساتھ حرم میں جب داخل ہوئے تو انکسار سے گردن اس قدر جھکی ہوئی تھی کہ ریش مبارک کجاوہ کی لکڑی سے مس کر رہی تھی۔اس موقع پر آپؐ نے درج ذیل خطبہ ارشاد فرمایا۔

" اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔اس کا کوئی شریک نہیں۔اس نے اپنا وعدہ سچا کیا۔اپنے بندے کی امداد کی اور سارے گروہوں کو اکیلے ہی شکست دی! خبردار ہر قسم کا خواہ وہ خون کا مطالبہ ہو یا مال کا وہ میرے ان پاؤں کے نیچے ہے۔البتہ بیت اللہ کی دربانی اور حاجیوں کو پانی پلانے کی خدمت کے مناصب جوں کے توں ہیں۔اے گروہ قریش آج کے دن اللہ نے تم سے جاہلیت کا غرور لیا اور آباء و اجداد کے بل پر بڑائی غلط قرار دے دی، سارے انسان آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدمؑ مٹی سے بنے ہیں۔"[۲]

پھر رحمتہ اللعالمین کی زبان وحی ترجمان حرکت میں آتی ہے اور یہ الفاظ ادا ہوتے ہیں۔

" لاتثریب علیکم الیوم، اذهبوا، فانتم الطلقاء" [۳]

آج تم پر کوئی مواخذہ نہیں، جاؤ تم سب آزاد ہو۔

فتح مکہ کے بعد قبائل جوق در جوق اسلام میں داخل ہونا شروع ہو گئے۔عمرہ بن سلمہ مشہور صحابی کا کہنا ہے۔عرب قریش کے قبول اسلام کا انتظار کر رہے تھے، وہ کہتے تھے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کو ان کی قوم پر چھوڑ دو، اگر محمد ان پر غالب آ گئے تو بلا شبہ وہ سچے پیغمبرؐ ہیں۔پس جب مکہ فتح ہوا تو ہر قبیلہ نے اسلام کی طرف پیش قدمی کی۔

۱۔ رسول اکرم کی سیاسی زندگی، ص: ۱۱۴ ۲۔ ابن ہشام، سیرت، ۴/۸۴ ۳۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ۴/۸۹، ۹۰

سیرت نبوی ﷺ کا سب سے اہم واقعہ "حجتہ الوداع" ہے جو سیرت نبویؐ کے سیاسی پہلو کا روشن باب ہے اور واضح کرتا ہے کہ کس فہم وفراست، کمال تدبر اور حکمت عملی سے آپؐ نے اتنا عظیم الشان انقلاب برپا کیا۔

اس ضمن میں سب سے اہم اور ضروری بات جو پیش نظر رکھنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ وہ مشن اور مقصد کیا تھا جس کیلئے آنحضرت ﷺ کو ان کٹھن مراحل سے گزرنا پڑا، جنگیں، لڑیں، صلح کی، معاہدے کئے، الغرض پوری زندگی ہر دم متحرک رہے۔ایک نبی کی حیثیت سے آپ کا پہلا فرض منصبی یہ تھا کہ آپ دعوت الی اللہ کو لوگوں تک پہنچائیں۔حق پرستوں پر مشتمل ایک امت مسلمہ تشکیل دیں۔اس امت کو دستور حیات کے طور پر اللہ کا عطا کردہ نظام "دین اسلام" سپرد کریں، اس کے تمدن کی اساس قرآن وسنت پر ہو، اس کے لئے منبع رشد وہدایت اللہ اور اس کا رسولؐ ہوں۔یہ امت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے۔اور ساری دنیا کی رہنمائی کا سامان کرے۔مختصر ترین الفاظ میں یہ تھا وہ عظیم الشان مقصد اور مشن جس کے حصول کے لئے رسول اللہ ﷺ نے تیئس سال کی جاں گسل جدوجہد کی، دنیا بھر کی باطل قوتوں سے پنجہ آزمائی کی اور ہر طرح کی تکالیف کو برداشت کیا۔اس ضمن میں حضور ﷺ کا طریقہ کار اور مخالفین اسلام کے ساتھ آپؐ کا رویہ ایک فاتح کی بجائے ایک داعی کا تھا، آپؐ کی تمام جنگوں اور مدبرانہ اقدامات میں ایک جنگجو کمانڈر کے بجائے ایک معلم کی رحمدلانہ شان پائی جاتی ہے۔اس تناظر میں جب خطبہ حجتہ الوداع کی جزئیات پر نگاہ ڈالیں تو فکر اسلامی کی تکمیل کے ساتھ ساتھ یہ انقلاب عملی شکل میں بھی اپنی انتہا کو سر کرتا نظر آئے گا۔حجتہ الوداع کو سیرت نبوی ﷺ میں نہایت اہم حیثیت حاصل ہے اس لئے کہ اس موقع پر آنحضرت ﷺ نے ایک انقلاب آفرین خطبہ ارشاد فرمایا۔بلاشبہ یہ خطبہ اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔

اے لوگو! میری بات غور سے سنو

> ''ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے بہت سے خاندان اور قبیلے بنا دیئے۔تاکہ تم پہچانے جا سکو، یعنی باہم ایک دوسرے کو شناخت کرسکو اور خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی برتری نہیں ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے فضیلت اور برتری صرف پرہیزگاری کی بناء پر ہے''۔

اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا:

اے گروہ قریش!

> ''قیامت کے دن ایسا نہ ہو کہ تم دنیا کا بوجھ اپنی گردنوں پر اٹھائے ہوئے آؤ اور لوگ آخرت کا سامان لے کر آئیں۔(یاد رکھو) اگر ایسا ہوا تو میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکوں گا''۔
>
> ''خبردار! زمانہ جاہلیت (قبل از اسلام) کی تمام رسمیں میرے قدموں کے نیچے روندی گئی ہیں۔زمانہ جاہلیت کے تمام خون (خواہ وہ کسی کے بھی ہوں) سب معاف ہیں۔اس سلسلے میں سب سے پہلے اپنے ہی خاندان کا ایک خون جو کہ ربیعہ بن الحارث کے بیٹے کا ہے معاف کرتا ہوں''۔
>
> ''لوگو! تمہارے اموال اور تمہاری عزت وآبرو قیامت تک ایک دوسرے پر حرام ہیں جس طرح تمہارے پر اس دن، اس مہینے اور اس شہر کی حرمت واجب ہے اور تم سب عنقریب اپنے پروردگار

سے جاملو گے جہاں تم سے تمہارے اعمال کا محاسبہ ہوگا‘‘۔

’’اے لوگو! تمہاری عورتوں پر تمہارے کچھ حقوق ہیں اور اسی طرح تم پر تمہاری عورتوں کے حقوق ہیں۔تمہارا ان پر یہ حق ہے کہ وہ کسی ایسے آدمی کو تمہارے بستر پر نہ بیٹھنے دیں جسے تم پسند نہ کرتے ہو نیز ان پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ کھلی بے حیائی کا کوئی کام نہ کریں،لیکن اگر وہ ایسا کریں تو تمہارے رب نے یہ اجازت دی ہے کہ ان کے سونے کی جگہ اپنے سے الگ کردو، اگر اس پر بھی باز نہ آئیں پھر تمہیں اجازت ہے کہ ایسی ہلکی مار مارو جس سے بدن پر نشان نہ پڑیں۔اور اگر وہ اپنی نازیبا حرکتوں سے باز آجائیں تو حسب دستور ان کا کھانا اور کپڑے تمہارے ذمے ہیں‘‘۔

’’خبردار! کسی عورت کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر کسی کو کچھ دے،عورتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کیلئے ہمیشہ پابند رہو، کیونکہ وہ تمہاری زیر نگرانی ہیں اور اس حیثیت میں نہیں کہ اپنے معاملات خود چلا سکیں۔عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔تم نے ان کو اللہ تعالیٰ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے اور اللہ کے کلمات کے ذریعے ان کو اپنے لئے جائز وحلال کیا ہے‘‘

’’لوگو! اللہ تعالیٰ نے (میراث کا قانون نازل کرکے) ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے اس لئے اب کسی وارث کے حق میں کوئی وصیت جائز و نافذ نہیں، بچے کا نسب اسی مرد سے ثابت ہوگا جس کی وہ بیوی ہے۔جس نے بدکاری کی اس کے لئے سزا ہے (بچہ اس کا نہیں کہلائے گا اور ان کا حساب کتاب اللہ کے ذمے ہے) جس نے اپنے باپ کے علاوہ کسی کی طرف نسبت کی یا کسی غلام نے اپنے کو کسی دوسرے مالک کی طرف منسوب کیا اس پر خدا کی لعنت ہے‘‘۔

’’قرض ادا کیا جائے گا، عاریت واپس کی جائے، ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے،خبردار! جرم کرنے والا خود اپنے جرم کا ذمہ دار ہے۔باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں اور بیٹے کے جرم کا ذمہ دار باپ نہیں‘‘۔

’’کسی شخص کے لئے بھائی کی کوئی چیز لینا جائز نہیں، البتہ اس صورت میں جائز ہے کہ وہ خوشدلی کے ساتھ دے، پس تم لوگ اپنے اوپر ظلم وزیادتی نہ کرو‘‘۔

’’لوگو! ہر مسلمان، دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور سب مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔تمہارے غلام،تمہارے غلام ہیں تم جو کچھ کھاتے ہو ان کو بھی کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو وہی انہیں پہناؤ‘‘۔

’’خبردار! میرے بعد گمراہ (یا کافر) نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔جس شخص کے پاس کسی کی امانت ہو اس پر لازم ہے کہ وہ امانت والے کو ٹھیک ٹھاک طریقے سے لوٹا دے‘‘۔

’’اگر کوئی نکٹا اور سیاہ فام حبشی بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے اور وہ کتاب اللہ (قران مجید) کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو تم پر اس کی اطاعت لازم ہے‘‘۔

''اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور تمہارے بعد کوئی نئی امت نہیں ہے۔ میں تم میں ایک نعمت چھوڑے جا رہا ہوں، اگر تم مضبوطی سے اسے تھامے رہو گے تو گمراہ نہ ہو گے اور وہ نعمت اللہ کی کتاب (قرآن مجید) ہے''۔

کوئی بھی ریاست مضبوط و مستحکم نظام کے بغیر دیر تک اپنے وجود کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ اس کیلئے ایک سیاسی تنظیم بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے مدینہ طیبہ ہجرت کے بعد اسلامی ریاست کی جو داغ بیل ڈالی اس کو مستقل بنیادوں پر استوار کیا۔ عقائد اور فکر کے ساتھ سیاسی اداروں کو عملی شکل دی اور وہ جملہ امور جو کسی ریاست کے وجود اور بقاء کیلئے ناگزیر ہیں انہیں عملی شکل دے کر ریاستی ضرورتوں کو پورا کیا۔ یہاں ایک بنیادی اہمیت کی حامل بات کی جانب توجہ دلانا نہایت ضروری ہے۔ جس طرح یہ کہنا مبنی بر حقیقت نہیں ہے کہ عہد نبوی کے تمام ادارات جاہلی ورثہ تھے اور ریاست مدینہ کا تمام نظم و نسق عرب جاہلیہ میں اس وقت رائج سیاسی نظاموں سے اخذ کر لیا گیا تھا۔ اسی طرح یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے رائج تمام نظاموں کو بالکلیہ مسترد فرما دیا۔ کیونکہ بعض سیاسی، سماجی اور مذہبی انتظامات ایسے ہیں جو عہد نبوی سے قبل بھی پائے جاتے تھے۔ مثلاً مشورہ کا اصول، صوبوں میں گورنروں کا تقرر، مذہبی رسوم بھی کسی قدر ملتی جلتی موجود تھیں۔ عہد نبوی کے مشہور سیاسی اداروں عرافہ اور نقابہ کا وجود بھی عہد جاہلیہ میں موجود ملتا ہے۔ علاوہ ازیں وصیت، میراث، ترکہ کے اسلامی اصولوں سے کسی قدر مماثل معاشرتی نظام کے خدوخال بھی جاہلی دور میں نظر آتے ہیں۔

بعض آفاقی اصول ایسے ہوتے ہیں، جنہیں کسی بھی نئی ریاست کا بانی نظر انداز نہیں کر سکتا اور اس مماثلت کے سبب انہیں ایک دوسرے کا چربہ قرار دینا قرین انصاف نہ ہوگا۔ یہاں ابن الطقطقی کا قول نقل کرنا زیادہ مناسب ہوگا لکھتے ہیں۔

"اسلامی حکومت، اپنی غایت اپنی سادگی اور اپنی عمومیت کے اعتبار سے ایک مستقل اور جداگانہ شئے ہے وہ ایک ایسی حکومت ہے جو عام دنیاوی حکومتوں سے بالکل الگ اور پیغمبرانہ اوصاف سے مستفید ہے"[1]

ریاست نبوی میں اقتدار اور حاکمیت اعلیٰ کا منصب اللہ رب العزت کیلئے مختص ہے اسلامی نظریہ سیاست میں طاقت کا سرچشمہ اللہ رب العزت کی ذات وحدہ لاشریک ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حاکمیت الٰہی کا نظریہ پیش بھی کیا اور اسے اپنی ریاست میں بہ تمام و کامل نافذ بھی فرمایا۔ اسلام کا موقف یہ ہے کہ ہر قسم کی حاکمیت کا مبدا اور مرکز ذات واحد ہے وہ کائناتی، سیاسی، قانونی، اخلاقی و اعتقادی، جملہ اقسام کی حاکمیت کا سرچشمہ اللہ کو ٹھہراتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

ذٰلکم اللہ ربکم له الملك لا اله الا هو فانّٰی تصرفون[2]

''یہی اللہ تمہارا رب ہے، بادشاہی اسی کو ہے، کوئی الٰہ اس کے سوا نہیں، پھر تم کدھر پھرے جا رہے ہو''

اسلام کے سیاسی نظام میں کسی کو بھی خواہ فرد ہو یا اجتماع یا پارلیمنٹ حتمی اتھارٹی حاصل نہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اس کا مجاز نہیں کہ وہ خداوند قدوس کے اٹل اصولوں میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی لا سکے۔ اسلامی قوانین اور حاکمیت کا مرجع و منبع صرف اللہ کی ذات ہے اور احکم الحاکمین کی تمام ہدایات آخری نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید میں محفوظ ہیں۔ اسی اقتدار اعلیٰ میں ایک پہلو سنت کا بھی ہے۔ اس کو ایک پہلو قرار دینے سے مقصد یہ ہے کہ **"وما ینطق عن الهوی ان هوالا وحی یوحیٰ"**[3] کے فرمان الٰہی کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کی

---

[1] محمد بن علی بن طباطبائی الطقطقی، الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ، ص: ۵۲　[2] الزمر، ۳۹/۶　[3] النجم، ۵۳/۳،۴

سنت بھی درحقیقت احکام الٰہیہ کا ہی حصہ ہے اور "**وما اتکم الرسول فخذوہ وما نھا کم عنه فانتھوا** "[۱] کے حکم دے کر سنت رسول ﷺ کو قانون اسلامی کا بنیادی ماٰخذ قرار دے دیا ہے۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اقتدار اعلیٰ اللہ کی ذات کو حاصل ہے لیکن اس کی عملی شکل کی صورت کیا ہوگی، یعنی نیابت الٰہی کا فریضہ کون سرانجام دے گا۔ شیعہ کے نزدیک '' خلافت بھی دین کا ایک رکن ہے اور اس کیلئے امت کا مشورہ ضروری نہیں[۲] ان کے نزدیک خلافت کا منصب آنحضرت ﷺ کے خاندان کے ساتھ خاص ہے۔ یہ اہل بیت کے حامی تھے اور ان کا خیال تھا کہ خلافت کا حق اہل بیت تک اور وہ بھی صرف حضرت علیؓ کی اولاد میں محدود رہنا چاہیے۔

خوارج کا ابتداء میں نظریہ یہ تھا کہ خلافت پر عربی النسل تنفس کا حق ہے، خوارج کے زاویہ نگاہ سے خلیفہ کا معزول کرنا حتی الامکان جائز نہ تھا لیکن اگر خلیفہ جبر و استبداد کا مرتکب ہو تو نہ صرف معزول کرنا جائز تھا بلکہ مصلحت وقت کے لحاظ سے اس کا قتل کر دینا بھی ان کے اعتقاد میں معیوب نہ تھا۔[۳]

معتزلہ یا قدریہ کے نزدیک امامت امت مسلمہ کا حق ہے، دلیل یہ تھی کہ خدا نے اس منصب کے لئے کسی خاندان یا فرد کی تعین نہیں کی، امت کو اختیار ہے کہ تنفیذ احکام کے لئے وہ اپنا فرمانروا یا خلیفہ جس کو چاہے منتخب کر لے[۴] سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ نیابت کا یہ مقام کسی فرد واحد، یا کسی خاندان یا کسی خاص مخصوص طبقے کا حق نہیں ہے بلکہ تمام ان لوگوں کا حق ہے جو اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کریں اور رسول کے ذریعے سے پہنچے ہوئے قانون کو بالاتر قانون مان لیں..... اہل مغرب جس چیز کو لفظ جمہوریت کہتے ہیں اس میں جمہور کو حاکمیت قرار دیا جاتا ہے اور مسلمان جسے جمہوریت کہتے ہیں اس میں جمہور صرف خلافت کے حامل ٹھہرائے جاتے ہیں۔ ریاست کے نظام کو چلانے کے لئے ان کی جمہوریت میں بھی عام رائے دہندوں کی رائے سے حکومت بنتی اور بدلتی ہے۔ اور ہماری جمہوریت بھی اس کی متقاضی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ اس کے تصور کے مطابق جمہوری ریاست مطلق العنان اور مختار مطلق ہے اور ہمارے تصور کے مطابق جمہوری خلافت اللہ کے قانون کی پابند۔[۵]

قرآن مجید میں جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کا حکم دیا گیا وہاں اس سے متصل ''اولی الامر'' کی اطاعت کا حکم بھی دے دیا گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

یا ایھا لذین آمنوا اطیعو اللہ واطیعو الرسول وأولی الأمر منکم فان تنازعتم فی شئی فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الآخر ذالك خیر وأحسن تأویلا [۶]

''اے ایمان والو! حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسولؐ کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں، پھر اگر نزاع ہو جائے تمہارے درمیان کسی چیز میں تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو، اگر مانتے ہو اللہ کو اور قیامت کے دن کو یہی روش اچھی ہے اور بہت بہتر ہوگا اس کا انجام''

امام ابن جریر نے صحابہ تابعین سے **اولی الامر** کی تفسیر میں دو قول نقل کئے ہیں ایک یہ کہ '' **ھم الامراء** '' یعنی مسلمانوں کے حکمران اور امراء ہیں جن کی اطاعت کا حکم ہے اور دوسرا یہ کہ '' **الا فقه والدین** '' یعنی یہ فقہاء اور دینی سربراہ ہیں۔ یہ دونوں آراء نقل کرنے کے

۱۔ الحشر، ۵۹/۷ ۲۔ ابن خلدون، مقدمہ، ص: ۱۵۴،۱۵۳ ۳۔ المسعودی: مروج الذھب، ۲/۱۱

۴۔ المسعودی، مروج الذھب، ۲/۱۹۱ ۵۔ اسلامی ریاست، ص: ۱۹۸ ۶۔ النساء، ۴/۵۹

بعد ابن جریر اپنی رائے یہ بیان کرتے ہیں۔

واولی الاقوال فی ذالك قول من قال هم الا امراء والولاة ۱

یعنی بہترین قول ان حضرات کا ہے جو کہتے ہیں کہ ان سے مراد امراء اور حکام ہیں۔

امام فخر الدین رازی نے **اولیٰ الامر کی تفسیر اهل الحل والعقد** سے کی ہے یعنی ''وہ لوگ جو مسلمانوں کے معاملات کے ذمہ دار اور مستند نمائندے ہوں اور فیصلے کرنا ان کے ہاتھ میں ہو۔ ۲

آنحضرت ﷺ اطاعت امیر سے متعلق ارشاد فرماتے ہیں۔

من اطاعنی فقد اطاع الله ومن عصانی فقد عصی الله ومن اطاع امیری و فی روایة من اطاع الامیر فقد اطاعنی ومن عصی أمیری وفی روایة من عصی الامیر فقد عصانی ۳

''جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے میرے امیر یا مسلمانوں کے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر یا مسلمانوں کے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی''۔

آنحضرت ﷺ نے حجتہ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا۔

''اگر تم پر ناک کٹا ہوا سیاہ فام غلام بھی امیر مقرر کیا گیا ہو جو تمہاری قیادت کتاب اللہ کے مطابق کر رہا ہو تو اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو'' ۴

اس حدیث طیبہ میں ''جو تمہاری قیادت کتاب اللہ کے مطابق کر رہا ہو'' ارشاد فرما کر اطاعت امیر کو محدود کر دیا گیا۔ یعنی اگر وہ حدود اللہ سے تجاوز کر رہا ہو تو ان حالات میں اطاعت امیر جائز نہیں۔ خلیفہ اول سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بار خلافت سنبھالنے کے بعد اپنے اولین خطبہ میں اسی نکتہ کا برملا اظہار فرمایا تھا۔

''تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں'' ۵

ایام جاہلیہ میں عربوں کے ہاں بالخصوص اہل مکہ کے ہاں شوریٰ کا نظام عملاً موجود تھا۔ اس ضمن میں **''دار الندوہ''** کو بہت شہرت حاصل ہے۔ آنحضرت ﷺ کی ہجرت کے موقع پر اسی دار والندوہ میں آپ کے قتل کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا (**نعوذ باللہ من ذالک**)

ابن ہشام لکھتے ہیں۔

آنحضرتؐ کے ہجرت کر جانے سے قریش خوفزدہ ہو گئے اور انہوں نے خیال کیا کہ آپؐ ان سے جنگ کی تیاری کر رہے ہیں پس وہ دار الندوہ یعنی قصی بن کلاب کے گھر پر مشورہ کے لئے جمع ہوئے اور قریش کسی اہم معاملے کا فیصلہ اس مقام پر جمع ہو کر مشورہ کئے بغیر نہیں کرتے تھے۔ ۶

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قریش ایک شورائی نظام حکومت سے واقف تھے۔ مکہ کی حکومت میں شورائیت کا عنصر موجود تھا۔

---

۱ تفسیر طبری، ۵/ ۱۴۷
۲ تفسیر کبیر، ۱۰/ ۱۴۴
۳ البخاری، الجامع، حدیث رقم: ۶۷۱۸
۴ ابن کثیر، جامع الاصول، ۴/ ۶۲
۵ محمد حسین ھیکل، ابوبکر صدیق، ص: ۸۶
۶ ابن ھشام، سیرت، ص: ۸۰

چنانچہ اسلام نے اس سے بھر پور فائدہ اُٹھایا۔ اس ادارہ کو قائم ہی نہیں رکھا بلکہ اسکی اصلاح وتہذیب کر کے دینی سیاست میں اس کو غیر معمولی اہمیت دی۔

اسلام میں امیر جہاں قرآن وسنت کا پابند ہوتا ہے، وہاں اسے ایمان والوں سے مشورہ کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ اجتماعی امور کو حل کرنے اور بنیادی معاملات کے فیصلے کا حق کسی خاص فرد کے حوالے کرنے کے بجائے ساری امت کے حوالے کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا!

وامرھم شوریٰ بینھم[1]

''ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں''

علامہ ابوبکر جصاص حنفی اس آیہ کریمہ کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

''ایمان واقامت صلوٰۃ کے ساتھ شوریٰ کا تذکرہ اس کی جلالت شان پر دلالت کرتا ہے اور ساتھ ہی اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ امت مسلمہ مشورہ کرنے پر مامور اور اس کی پابند ہے''[2]

امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

''صحابہ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کے روبرو کوئی معاملہ پیش ہوتا تو وہ جمع ہوتے اور مشورہ کے ذریعے اسے طے کرتے۔ اللہ نے ان کی اس صفت کی تعریف کی کہ وہ کسی معاملہ میں انفرادیت نہیں برتتے، بلکہ اس کے برعکس جب تک کسی معاملہ پر متفق نہیں ہوجاتے اقدام نہیں کرتے''[3]

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ استصواب رائے کی صورت میں حق رائے دہی کے لئے صرف دو شرطیں ہیں۔ اسلام اور اسلامی شعور، اس کے علاوہ نہ کسی علمی ڈگری کی ضرورت ہے نہ ثروت مندی کی، نہ کسی خاص قیمت کی جائیداد کے مالک ہونے کی، نہ رنگ ونسل کی، نہ قوم ووطن کی۔ اس صورت میں مرد عورتیں، بوڑھے، بچے، شہری اور دیہاتی مقیم اور مسافر سب حق رائے دہی رکھتے ہیں۔

عہد نبویؐ میں اقتدار اعلیٰ کے عقیدہ کے ساتھ حضورؐ کا اپنا مقام ومرتبہ اور پھر شوریٰ کا نظام بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ عہد نبوی میں اگر چہ تمام اختیارات آنحضرتﷺ کی ذات میں مرکوز تھے، تاہم آپؐ نے اپنی مدد اور نظم ونسق کو چلانے کے لئے مختلف لوگوں کو مختلف ذمہ داریاں سونپیں۔

آنحضرتﷺ جب مدینہ طیبہ سے باہر کہیں تشریف لے جاتے تو کسی کو اپنا جانشین مقرر فرماتے تھے۔ یہ جانشین رسول محض نماز کے لئے آپ کا نائب نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ آپ کا بحیثیت سربراہ مملکت کے جانشین وخلیفہ ہوتا تھا اور وہ آپ کی غیر موجودگی میں مدینہ میں موجود ومقیم امت مسلمہ کی فلاح وبہبود اور اسلامی ریاست کے امور کی نگرانی کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

وشاورھم فی الامر کے حکم الٰہی کے مطابق آنحضرتﷺ نے ہمیشہ مشورہ کو بہت اہمیت دی اور اہم سیاسی معاملات کا فیصلہ صحابہ کرام کے مشورہ کی روشنی میں ہی کیا۔ مکہ میں ایک ایسا نظام قائم تھا جس میں مشیروں اور وزیروں کو مختلف ذمہ داریاں سونپی گئی تھیں اور دس ارکان پر مشتمل کابینہ کا تفصیلی ذکر بھی موجود ہے جو دس بڑے خانوادوں کے سرداروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ آنحضرتﷺ مشاورت کے اصول پر ہمیشہ کاربند رہے اور مشیران نبوی کا تقرر بھی عمل میں لایا گیا۔ ان مشیران نبوی ﷺ کو وزراء کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ وزیر کا لفظ قرآن وسنت

---

۱ الشوریٰ، ۴۲/۳۸		۲ احکام القرآن، ۳/۴۷۵		۳ تفسیر کبیر، ۷/۴۱۵

میں مذکور ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے ضمن میں ہے۔

" واجعل لی وزیرا من اهلی ہ هارون اخی ہ اشدد به أزری ہ وأشرکه فی امری ہ"[۱]

موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے میرے رب دیجئے مجھ کو ایک وزیر میرے گھر کا، ہارون میرا بھائی، اس سے مضبوط کر میری کمر اور شریک کر اس کو میرے کام میں۔

حدیث طیبہ میں عبداللہ ابن مسعود سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"ثم نظر فی قلوب العباد بعد فاختار له اصحابا فجعلهم انصار دینه ووزراء نبیه "[۲]

"پھر اللہ نے محمدؐ کے بعد اپنے بندوں کے دلوں کو دیکھا تو اس کے لئے ایسے ساتھی پسند کر لئے، جو اس کے دین کے مددگار تھے اور اس کے نبی کے وزیر تھے"۔

ایک حدیث میں مذکور ہے۔

"ہر نبی کے دو وزیر آسمان میں اور دو زمین پر ہوتے ہیں۔ میرے آسمان کے وزیر تو جبرائیل اور میکائیل ہیں جبکہ زمین پر میرے دونوں وزراء ابوبکرؓ و عمرؓ ہیں۔[۳]

مشیران نبوی یا وزراء رسالتمآبؐ میں جن حضرات کے اسماء گرامی نمایاں نظر آتے ہیں، ان میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سرفہرست ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت حباب بن منذرؓ، حضرت سعد بن عبادہ، حضرت سعد بن معاذؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ وغیرہ متعدد بڑے صحابہ کرامؓ شامل تھے۔ شوریٰ کا رکن بننے کے لئے کسی رسمی طریقہ کار کی ضرورت نہ تھی البتہ صلاحیت ولیاقت ناگزیر تھی۔ دارالندوہ کے ضمن میں یہ بات بیان کی جا چکی ہے کہ بعثت اسلام سے قبل اہل مکہ کے ہاں جو شورائی نظام تھا اس میں بھی شمولیت کے لئے کوئی رسمی کاروائی تو نہ کی جاتی تھی البتہ عمر رسیدہ ہونا، بالغ نظر ہونا، قبیلہ میں ممتاز مقام کا حامل ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ البتہ بعض لوگوں کو اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے سبب صغرسنی میں ہی شوریٰ کا رکن بنا لیا گیا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے اس ادارہ کو قائم رکھا اور ان مذکورہ صفات کے ساتھ دینی وابستگی کو بھی ملحوظ رکھا۔

کاتب کے لغوی معنی لکھنے کے ہیں اور اس کا کام وہی ہوتا ہے جو آج کے تنظیمی ڈھانچہ میں سیکرٹری سرانجام دیتا ہے۔ مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد کاتبوں کے قیام کی نوعیت مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی رنگ بھی اختیار کر گئی تھی۔ وہ کاتبین جنہیں عہد نبوی میں اس کام کے کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، مؤرخین نے ان کی تعداد مختلف بتائی ہے۔ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں محض چند کے نام گنوائے ہیں جبکہ واقدی نے متعدد کاتبوں کا ذکر کیا ہے۔ ابن سعد نے سولہ کاتبوں کا ذکر کیا ہے۔[۴]

یہ بات تو واضح ہے کہ اسلام ایک منظم معاشرہ کا قیام چاہتا ہے۔ جہاں ایک مستقل حکومت ہو، حاکم بھی ہوں، محکوم بھی اور ہر ایک کے حقوق وفرائض متعین ہوں اور دائرہ کار واضح ہو۔ اس ضمن میں یہ ضروری تھا کہ قرآن وحدیث میں صداقت کے ساتھ ایسے احکام موجود ہوں جو امور ملکی کی تنظیم وتنسیق اور حکومتی ذمہ داریوں کی ادائیگی سے براہ راست تعلق رکھتے ہوں۔

چنانچہ جب ہم قرآن وسنت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں بنیادی سیاسی اصول پوری طرح روشن نظر آتے ہیں جن کی روشنی میں کسی

۱　طٰہٰ، ۲۰/ ۲۹ـ۳۲
۲　مسعود الفراء البغوی، شرح السنۃ، ۱/ ۲۱۴
۳　ترمذی، جامع، حدیث رقم: ۳۶۸۰
۴　ساجد الرحمٰن، اسلامی معاشرہ کی تاسیس وتشکیل، ص: ۱۲۶

ریاست کی بنیادوں کو مستحکم کیا جاسکتا ہے۔اور پھر اسلام کا یہ اعجاز پوری آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہے کہ اس نے صرف خوبصورت و دلکش اصول پیش کرنے پر اکتفانہیں کیا بلکہ ان پاکیزہ اصولوں کو،ہم عہد نبوی میں عملی صورت میں بھی دیکھتے ہیں۔

عہد نبوی کے اس سیاسی نظام کا یہ وہ مختصر خاکہ ہے جس کی مستحکم بنیادوں پر اسلام کی وسیع ترین اسلامی ریاست وجود میں آئی جس نے امور جہاں بانی کو نئی جہتیں دیں' تہذیب وتمدن کے نئے چراغ روشن کئے' عدل وانصاف کے اعلیٰ معیارات قائم کئے اور دنیا کے نقشے پر ایک ایسی عظیم ریاست وجود میں آئی جو اپنی مثال آپ تھی۔

فصل سوم

خلفائے راشدین کا نمونہ عمل

عہد نبوی ﷺ میں تمام امور کا مرجع ذات رسالت مآب تھی۔ وحی الٰہی امت مسلمہ کی راہنمائی کے لئے موجود تھی آپ کا تئیس سالہ دور نبوت اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں جتنے بھی امور طے پاتے تھے وہ بلا واسطہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے مطابق طے پاتے تھے۔ آپؐ نے نظام حکومت کا بنیادی نقشہ تو ریاست مدینہ کی صورت میں پیش کر دیا، امور مملکت کو نمٹانے کے بنیادی اصول بھی عطا کر دیئے۔ حاکم و محکوم کے تعلقات رعایا کے حقوق مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کس حد تک تمیز روا رکھی جا سکتی ہے۔ نیز ریاست کے مالی امور اور ریاست کی خارجہ پالیسی کے خدوخال بھی متعین فرما دیئے۔ آپؐ کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد خلافت و امامت کا مسئلہ کس طرح طے کیا گیا۔؟ جغرافیائی توسیع کی صورت میں پیش آمدہ مسائل کو کس طرح حل کیا گیا؟ نظام حکومت کو نئے تقاضوں کے مطابق کس طرح استوار کیا گیا، عہد جاہلیہ کی جو سیاسی روایات چلی آ رہی تھیں، ان سے تجاوز کیا گیا یا نہیں اور اگر کیا گیا تو کس حد تک؟ یہاں اس کی وضاحت سب سے پہلے خلفائے راشدین (حضرت ابوبکرؓ تا حضرت علیؓ) کے تقرر کے طریقہ کار کو پیش کیا جائے گا۔

بہتر سے بہتر طرز حکومت جس میں ہر اچھے طرز حکومت کی جملہ خوبیاں، اخلاقی ہوں یا عمرانی، سیاسی ہوں یا تمدنی، قانونی ہوں یا اقتصادی' پائی جائیں اور حکومتوں کے قلب و قالب میں جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں سب اس کے دائرہ عمل سے خارج ہوں، ایسے طرز حکومت کا نام ''خلافت راشدہ'' ہے۔ اس تناظر میں علماء کے نزدیک حضرت صدیق اکبرؓ سے لے کر حضرت علی المرتضیٰؓ کا دور حکومت ''خلافت راشدہ'' کہلایا۔ چوتھی صدی ہجری کے بلند پایہ عالم اور حنفی فقہ کے ماہر ابوبکر جصاص لکھتے ہیں کہ ''خدا سے براہ راست الہام کی قوت سے فیض یاب ہونے والے نمائندوں کے بعد خلفائے راشدین امامت و حکومت کے اعلیٰ مرتبے پر فائز ہیں''۔[۱]

چونکہ خلیفہ رسول اللہ ﷺ کا نائب اور قائم مقام ہوتا ہے، اس بناء پر پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ آپؐ کا منصب کیا تھا، اور آپ کے فرائض و واجبات کیا تھے؟ آنحضرت ﷺ کے جو فرائض تھے اصولی طور پر دو قسم کے تھے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعے احکام و ہدایات لینا اور ان کو امت تک پہنچانا۔

۲۔ امت کے لئے ایک ایسا مرکز اطاعت و فرماں برداری بننا کہ خواہ کسی قسم کا کوئی معاملہ ہو جو معاد سے متعلق ہو یا معاش سے، مادی زندگی سے اس کا تعلق ہو یا روحانی زندگی سے، کوئی سیاسی مسئلہ ہو یا سماجی' کوئی اخلاقی مسئلہ ہو یا اقتصادی ہر ایک میں آپ کا قول ایک آخری اور قطعی حکم کا مرتبہ رکھتا ہے۔ جس سے انحراف و سرتابی جائز نہیں۔ قرآن مجید کا اعلان ہے

''وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھکم عنہ فانتھوا''[۲]

''اور جو کچھ رسول تمہیں دے دیں اسے لے لو اور جس سے منع کریں رک جاؤ''

ظاہر ہے کہ پہلا فرض صرف آنحضرت ﷺ کی ذات بابرکات کے ساتھ مخصوص تھا۔ آپ خاتم النبیین تھے، جب آپ کی وفات ہوئی تو وحی کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا اور اب کسی شخص کو بھی یہ مرتبہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ البتہ دوسرا فرض برابر قائم ہے اور قائم رہے گا۔ آنحضرت ﷺ کی جب وفات ہوئی تو ''**الیوم اکملت لکم دینکم**'' کے ارشاد کے مطابق شریعت کی تکمیل ہو چکی تھی۔ احکام و مسائل کی قانونی **تنقیحات**

۱۔ احکام القرآن، ۱/ ۹۷ ۲۔ الحشر، ۵۹/ ۷

متعین ہو چکی تھیں اور اب آپ کے بعد آنے والوں کا یہ فرض تھا کہ وہ اس قانون کی روشنی میں امت کی راہنمائی کریں۔ پھر اس دوسرے فرض کے دو پہلو ہیں ایک احکام الٰہی کی تبلیغ و اشاعت اور دوسرے ان احکام کا اجراء اور ان کی تنفیذ، تبلیغ و اشاعت ہر صحابی کا فرض تھا لیکن احکام کی تنفیذ اور ان کا اجراء بغیر سیاسی طاقت و اقتدار کے ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اس سیاست شرعیہ کا جو مرکز ہوگا وہی خلیفہ یا امام کہلائے گا۔ خلیفہ اپنے عہد میں پوری امت کا مرکز اطاعت ہوتا ہے اور اس کو مسلمانوں پر روحانی اور جسمانی، سیاسی اور اخلاقی ہر قسم کا اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ اس کا ہر قول اور ہر حکم واجب الاتباع ہوتا ہے اس سے بغاوت کرنا یا اس کی نافرمانی ایسا ہی گناہ ہے جیسا خود آنحضرت ﷺ کی۔ چنانچہ قرآن میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ جن " **اولـــو الامـــر** " کی اطاعت کا حکم ہے ان سے مراد وہی لوگ ہیں جو منصب خلافت پر سرفراز ہوں۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

"من اطاعنی فقد اطاع الله ومن عصانی فقد عصی الله ومن یطع الامیر فقد اطاعنی و من یعصی الامیر فقد عصانی "[۱]

ابن خلدون کے نزدیک اس مرتبہ جلیلہ کے لئے چار شرائط ہیں۔

۱۔ علم۔ جب تک خلیفہ کو احکام و مسائل شریعت اور ان کے منابع و ماخذ کا علم نہ ہوگا وہ احکام خداوندی کا اجراء کیسے کر سکتا ہے۔

۲۔ عدالت۔ چونکہ خلافت ایک منصب دینی ہے۔ اس بناء پر خلیفہ میں عدالت یعنی راست بازی و نیکوکاری کا ہونا ضروری ہے۔

۳۔ کفایت۔ اس سے یہ مراد ہے کہ خلیفہ میں شرعی حدود کو قائم کرنے، مملکت اسلامی کی سرحدوں کی حفاظت اور دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنے کیلئے جس سمجھ بوجھ، حسن تدبیر، عزم و ہمت اور استقلال و جفاکشی کی ضرورت ہے، یہ سب اس میں پائے جائیں۔

۴۔ سلامت حواس و اعضاء۔ جس کی وجہ سے اس کی کسی رائے اور عمل پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔ ہر جسمانی عضو و جارح کے اعتبار سے تندرست و توانا اور صحیح و سلامت ہونا چاہیے۔ اس طرح باطنی قوتوں یعنی ذہانت، حسن تدبیر اور اعتدال مزاج و طبیعت کے زیور سے بھی آراستہ ہونا چاہیے۔[۲]

الماوردی نے انہی شرائط کو مزید پھیلا دیا۔

ماوردی نے خلافت کے لئے جو شروط معتبرہ تحریر کی ہیں۔ ان میں ساتویں شرط قریشیت بیان کی ہے اور اس کو متفق علیہ کہا ہے۔[۳]
علامہ ابن خلدون بھی اس شرط کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس کو مختلف فیہ کہتے ہیں۔

"واختلف فی شرط خامس و هو النسب القرشی "[۴]

اور پانچویں شرط یعنی قریشی النسل ہونا اس میں اختلاف کیا گیا ہے۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک خلیفہ کا قریشی ہونا ضروری نہیں ہے۔ مولانا انور شاہ کشمیری لکھتے ہیں۔

"انها لیست بشرط عند امامنا"

قریشیت ہمارے امام صاحب کے نزدیک امامت کے لئے شرط نہیں ہے۔

انور شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ امام یوسف کی بھی یہی رائے ہے۔[۵]

خلیفہ کا انتخاب کیسے ہو اس کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے؟ آج یہ سوال ہر ذی شعور مسلمان کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ

۱۔ البخاری، الجامع، باب السمع والطاعة حدیث رقم: ۲۷۹۷ ۲۔ ابن خلدون، تاریخ، ۱/۱۶۱ ۳۔ احکام السلطانیہ، ص: ۴
۴۔ مقدمہ ابن خلدون، ۲/۱۶۱ ۵۔ فیض الباری، ۴/۴۹۸

اسلامی سیاسی نظام جمہوریت سے قریب تر ہے یا ڈکٹیٹرشپ سے۔ خلیفۃ المسلمین کا انتخاب عام مسلمانوں کی رائے سے ہوگا یا ارباب حل وعقد کا فیصلہ معتبر ہوگا؟

اسلام میں اپنی رائے کے اظہار کے لئے ''بیعت'' کا لفظ استعمال کیا گیا۔ بیعت ایک آئینی عہد ہے۔ جس کا تعلق عوام اور امام ہے۔ جس کے بغیر ریاست عامہ کے رئیس عام کا انتخاب قانون تقرر کی صورت اختیار نہیں کرسکتا۔ بیعت عملی سیاست کے دائرہ میں وہ قطعی سند ہے جس کی رو سے عوام امام کی اطاعت کا عہد کرتے ہیں اور امام عوام کے سامنے اچھے طرز پر نظام حکومت چلانے کا عہد کرتا ہے۔

اسلامی سیاسی نظام میں ''اہل حل وعقد'' جسے مختلف اوقات میں مختلف نام دیئے گئے، اولوالامر، اہل الشوری، اہل الاجماع اور اہل الشوکہ وغیرہ۔ اہل حل وعقد کی اصطلاح ڈاکٹر محمد خالد مسعود کی تحقیق کے مطابق سب سے پہلے امام ابوالحسن علی اشعری نے استعمال کی، انہوں نے پہلی مرتبہ اسے اہل الشوری کے بدل کے طور پر استعمال کیا۔ اشعری کی عبارت مندرجہ ذیل ہے۔

''وثبت امامة علی بعد عثمان بعد من عقله من الصحابة من اهل الحل والعقد ولانه لم یدع احد من اهل الشوری غیره فی وقته''۱؎

''حضرت عثمانؓ کے بعد حضرت علیؓ کی امامت صحابہ میں سے اہل حل وعقد حضرات کی بیعت سے ثابت ہوتی ہے اور اس لئے بھی کہ اہل شوریٰ نے حضرت علیؓ کے سوا کسی کو خلافت کے لئے دعوت نہیں دی''

اہل حل وعقد کا دائرہ ہر دور میں وسیع ہوتا رہا، لیکن حضرت ابوبکرؓ کا انتخاب سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوا اور حضرت عمرؓ نامزد ہوئے۔ ان دونوں خلفاء کا انتخاب کرنے والے لوگ مدینہ کے ممتاز مہاجر اور انصار تھے۔ لیکن انتخاب کا باقاعدہ ادارہ پہلے پہل حضرت عمرؓ نے ہی تجویز کیا، حضرت علیؓ کا انتخاب انتہائی نازک حالات میں ہوا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد لوگ حضرت علیؓ کے پاس خلافت کی پیش کش لے کر آئے۔ حضرت علیؓ نے ان کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کردیا کیونکہ ان میں اصحاب شوریٰ شامل نہیں تھے۔ ابن قتیبہ اس واقعہ کو تفصیلاً بیان کرتے ہوئے حضرت علیؓ کی یہ گفتگو نقل کرتے ہیں۔

> ''لوگ حضرت علیؓ کے گھر آئے اور کہا ہم آپ کی بیعت کرنا چاہتے ہیں، ہاتھ بڑھائیے، ایک نہ ایک امیر ہونا ضروری ہے اور آپ سب سے زیادہ اہل ہیں۔ آپ نے فرمایا یہ تمہارا کام نہیں، یہ کام اہل شوریٰ اور اہل بدر کا ہے، جس کی خلافت پر یہ لوگ رضامند ہوجائیں وہی خلیفہ ہوگا۔''۲؎

اگر خلفائے راشدین کے عہد کو سامنے رکھتے ہوئے غور کیا جائے، تو اہل حل وعقد کے یہی معانی سمجھ میں آتے ہیں کہ وہ حضرات جنہیں عامۃ المسلمین قابل اعتماد واعتبار اور لائق عزت واحترام سمجھتے تھے انہیں اہل حل وعقد کا مقام ومرتبہ حاصل تھا۔ اس اسلامی روح کی روشنی میں آج اس بات پر غور کیا جاسکتا ہے کہ کون سے لوگ لائق اعتبار اور قابل عزت واحترام ہیں اور یہ جاننے کے لئے کون سے ذرائع اختیار کئے جاسکتے ہیں۔

سب سے پہلے اس امر پر مختصر بحث ضروری ہوگی، کہ اسلام کا نظام حکومت شخصی تھا، جمہوری تھا یا تھیا کریسی کی بنیادوں پر استوار ہوا۔

ہر ملک کا نظام حکومت اس کے تمدنی ماحول سے مناسبت رکھتا ہے بلکہ بالعموم وہ اسی کی تخلیق ہوتا ہے۔ قدیم قبائلی تمدن میں معمولات زندگی مختصر اور سادہ تھے۔ لہٰذا لوگوں کی ضروریات اور حکومت سے توقعات بھی محدود تھیں۔ معاشی نظام بھی سادگی سے عبارت تھا، امور مملکت میں بھی اسی سادگی کی جھلک نظر آتی تھی۔ حکومتی نظام کے جدید ڈھانچہ اور اس سے منسلک اداروں کا ایک ایسے وقت کے حوالے سے تصور کرنا

۱؎ تاریخ اسلام میں اہل حل وعقد کا تصور، فکر ونظر جنوری، فروری ۱۹۶۴ء ۲؎ الامامة والسیاسة، ص: ۴۵

جب تمدنی زندگی بالکل سادہ تھی نامناسب بات ہوگی۔ درحقیقت ہر دور کے تمدنی ماحول اوراس کے تقاضوں کے مطابق حکومت کے ڈھانچے اور اس کے فرائض اور سرگرمیوں کا تصور کیا جاتا ہے۔ جوں جوں معاشی اور معاشرتی ترقیاں رونما ہوتی جاتی ہیں، حکومتی نظام بھی اس کے مطابق وسیع بنیادوں پر استوار ہوتا چلا جاتا ہے، الغرض کسی سیاسی نظام کی نوعیت کو پورے مروجہ نظام کے حوالے کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں۔ نبی ﷺ کے دور مبارک میں عربوں کا قبائلی نظام ہی اس سیاسی نظام کی اساس تھا۔ اسلام نے اس کے بنیادی اصول، دائرہ کار، اور مقاصد کا بتدریج نئے سرے سے تعین کر دیا۔

نبی ﷺ کے دور میں، مدینہ کی اسلامی ریاست کا نظام حکومت سادہ تھا اور نئے سیاسی نظام میں فکری مقاصد کے حصول پر زیادہ توجہ صرف کی گئی، خلفائے راشدین کے دورِ حکومت میں جوں جوں اسلامی ریاست کی حدود میں وسعت آتی چلی گئی اوراس کے دائرہ کاراور وسائل میں بھی اضافہ ہونا شروع ہوا تو حکومتی ڈھانچہ کی نشوونما بھی وسیع تر بنیادوں پر استوار ہونا شروع ہوئی۔ حتیٰ کہ ریاست کی قوت اور وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اسلامی انقلاب متعدد ممالک تک نفوذ کر گیا۔ اس نظام حکومت کا تجزیہ کیا جائے تو تین ستون نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔

۱۔ عاملہ ۲۔ مقننہ ۳۔ عدلیہ

یہ تینوں ادارے موجود تھے لیکن ان کی اپنی منفرد صورت تھی۔ چنانچہ عاملہ کی شکل خلافت کے ادارے کی صورت میں قائم تھی۔ جبکہ خلیفہ کی معاونت کے لئے مشاورت کا ادارہ موجود تھا۔ یہ ادارہ جدید کابینہ اور مجلس قانون ساز دونوں کا متبادل تھا۔ جبکہ اسی دور میں عدلیہ یعنی قضاء کا محکمہ بھی قائم کیا گیا تھا۔

رہی یہ بات کہ یہ دور جمہوری تھا یا شخصی اس کا فیصلہ کرنے کے لئے سب سے پہلے خلفاء کے انتخاب یا تقرر پر غور کرنا ہوگا اور پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ حکومت کا میلان ذاتی اختیارات پر تھا یا عام رائے پر۔ خلیفہ اول کے انتخاب سے حضرت عمرؓ کی نامزدگی، حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے لئے مجلس مشاورت کے قیام اور پھر حضرت علیؓ کے عمومی انتخاب تک نظر ڈال لیجئے ایک بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ رائے عامہ ان کی ہمنوا تھی۔ چاروں خلفاء کا چناؤ اس وقت کے سیاسی تمدن کے مسلمہ جمہوری اصولوں کے مطابق تھا، یعنی خلافت کے منصب کے لئے اپنے جانشین کا تقرر کرانے کے لئے خلفاء نے قرابت داری یا ذاتی پسند کو مدنظر رکھنے کی بجائے امت کے وسیع تر مفادات کو مدنظر رکھا۔ جس کی تائید وحمایت عامۃ الناس سے حاصل کی۔ یہ عمل ایک نوزائیدہ فکری مملکت کے تقاضوں کے مطابق نظر آتا ہے۔ موجودہ دور کے ہمہ گیر طریق انتخاب سے اس دور کی تہذیب آشنا نہ تھی بلکہ بالغ رائے دہی کے اصولوں کی بناء پر قائم انتخابی نظام تو برطانیہ میں بھی موجودہ صدی میں رائج ہوا۔ الغرض خلفائے راشدین کے تقرر میں اہلیت اوراس دور کے سیاسی رواجات یعنی قبائلی روایات کو پوری طرح مدنظر رکھا گیا۔ ابن خلدون نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اوران کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انتخابی اصول کو ترجیح حاصل تھی۔ علاوہ ازیں تقرری کے بعد بیعت لی جاتی تھی جو دوطرفہ معاہدہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ [1]

دوسری بات پر اس پہلو سے غور کیا جا سکتا ہے کہ جمہوری اور شخصی طریق حکومت میں جو چیز سب سے بڑھ کر مابہ الامتیاز ہے وہ عوام کی مداخلت اور عدم مداخلت ہے۔ یعنی حکومت میں جس قدر رعایا کو دخل دینے کا زیادہ حق ہوگا اسی قدر اس میں جمہوریت کا عنصر زیادہ ہوگا۔ اس اعتبار سے خلفائے راشدین کے طرز عمل کو دیکھ لیجئے کہ عوام کس قدر بااختیار تھے، انہیں امور ملکی میں کس حد تک دخل اندازی کی اجازت تھی۔ واقعات سے کتب سیر بھری پڑی ہیں، حضرت عمرؓ نے مختلف موقعوں پر صاف صاف فرما دیا تھا۔ ''لاخلافة الاعن مشورة''۔ مشورہ کے بغیر خلافت سرے سے جائز ہی نہیں۔ [2]

---

[1] ابن خلدون، مقدمہ، ص: ۴۳۰ [2] شیخ علی المتقی، کنز العمال، ۱۳۹/۳

ہمارے مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ خلفائے راشدین کو یہ جمہوری طرز سیاست، عرب جاہلیہ سے ملا تھا۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں۔

''عرب میں مدت سے تین وسیع حکومتیں قائم تھیں لخمی، حمیری، غسانی لیکن یہ سب شخصی تھیں۔ قبائل کے سردار جمہوری اصول پر منتخب کئے جاتے تھے لیکن ان کو کسی قسم کی ملکی حکومت حاصل نہ تھی''۔ ۱؎

خلفاء نے تہذیب وترمیم کر کے اس نظام کو اعلیٰ قدروں کا حامل بنا دیا، لیکن یہ امر بھی واضح ہے کہ موجودہ دور میں مروجہ جمہوری نظام کو بالکلیہ اسلامی نظام حکومت قرار دینا بھی درست نہیں۔ مثلاً اسلامی سیاسی نظام حکومت کا مرکز ومحور قرآن وسنت ہیں۔ اگر ملک کا ہر فرد بھی قرآن وسنت کے فیصلے کے خلاف ووٹ دے پھر بھی خلیفہ، یا امیر المومنین ان کی رائے کے پابند نہیں، یہ وہ بنیادی فرق ہے جو مروجہ جمہوری سیاست اور اسلامی نظام سیاست میں مابہ الامتیاز ہے۔ البتہ اس سے انکار نہیں کہ جمہوریت کی یہ بنیادی روح کہ حکمران کو عوامی تائید حاصل ہونا چاہیے، اسلام میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے ایسے حالات میں عنان حکومت سنبھالی کہ اسلامی حکومت ابھی مستقل بنیادوں پر استوار نہ ہو پائی تھی۔ وفات رسالت مآب ﷺ سے طرح طرح کی **عصبیتیں** اور فتنے سر اٹھا رہے تھے، کہیں مدعیان نبوت کا فتنہ تھا تو کہیں **مانعین** زکوٰۃ کا۔ الغرض عہد صدیقی پر نظر ڈالیں تو یہ داخلی امن وامان کے قیام پر صرف ہوا۔ یہ جناب صدیق اکبر کا کمال تھا کہ ان داخلی ریشہ دوانیوں سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اسلامی ریاست کی حدود کو بھی توسیع دی۔ چنانچہ ۱۳ھ میں اسلامی حکومت ایران وشام تک پہنچ گئی۔ عراق، حیرہ سے انبار تک اور شام اجنادین تک اسلامی مملکت کا جزو بن گیا۔

آپ کے انتقال کے بعد عہد فاروقی کا آغاز ہوتا ہے اور پھر فاروق اعظمؓ کے تدبر، حکمت عملی اور جرأت نے فتوحات اسلامی کے جھنڈے اس طرح لہرائے کہ آج بھی تاریخ کا طالب علم جب ان پر نظر ڈالتا ہے تو انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

عہد عثمانی میں ممالک محروسہ کا دائرہ بھی نہایت وسیع ہوا، افریقہ میں طرابلس، برقہ اور مراکش (افریقہ) فتح ہوئے۔ ایران کی فتح تکمیل کو پہنچی۔ ایران کے متصلہ ملکوں میں افغانستان، خراساں اور ترکستان کا ایک حصہ زیر نگیں ہوا، دوسری سمت ارمینیہ اور آذربائیجان مفتوح ہو کر اسلامی سرحد کوہ قاف تک پھیل گئی۔ اسی طرح ایشیائے کوچک کا ایک وسیع خطہ ملک شام میں شامل کر لیا گیا۔ حضرت عثمانؓ نے ہی بحری بیڑہ تیار کر کے جزیرہ قبرص (سائپرس) پر اسلامی پھریرا بلند کیا۔

جناب علی المرتضیٰؓ کی خلافت کا پورا زمانہ خانہ جنگی اور شورش کی نذر رہا۔ اور پانچ سالہ دور حکومت کا ایک لمحہ بھی سکون نصیب نہ ہوا۔ اس لئے آپ کے زمانہ خلافت میں فتوحات کا سلسلہ تقریباً بند ہو گیا۔

عہد خلفائے راشدین میں جب اسلامی ریاست کو اس قدر وسعت حاصل ہوئی تو اس سے بہت سے مسائل بھی پیدا ہوئے جن سے اسلامی حکومت کو نبرد آزما ہونا پڑا۔ سب سے پہلی چیز تو یہ سامنے آئی کہ جوں جوں اسلامی ریاست میں توسیع ہوتی گئی، انتظامی معاملات بھی بڑھتے گئے، مثلاً پہلے جو کام ایک ہی شخص کرتا تھا محکمہ قضاء بھی اس کے پاس تھا۔ پولیس کی کاروائی بھی خود ہی کرتا تھا۔ جب کبھی فوجی ذمہ داری نبھانا پڑتی اسے بھی سر انجام دیتا تھا۔ اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ چنانچہ عہد صدیقی سے ہی اس جانب توجہ شروع ہو گئی تھی اور دور فاروقی میں تو مستقل ادارے وجود میں آ گئے، پھر خلافت جناب عثمان میں ان اداروں کو مزید ترقی ملی۔ اس کے علاوہ جہاں فتوحات ہوئیں وہاں ذمیوں سے متعلق معاملات میں بھی اضافہ ہوا۔

۱؎ الفاروق، حصہ دوم، ص: ۱۸۸

پھیلتی ہوئی اسلامی ریاست کے نظم و نسق کے لئے خلفائے راشدین کے دور حکومت میں دونوں طرح کے انداز اختیار کئے گئے یعنی ایک طرف تو وہ ادارے جو اسلامی سیاسی روح کے مطابق تھے اور عربوں کے ہاں مروج وہ موجود تھے ان کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ ان کو مزید تقویت دی ۔لیکن ساتھ ہی ساتھ نئی تشکیلات بھی کیں ،نئی طرحیں بھی ڈالیں ، اور مفید انتظامی اداروں کو وجود بخشا ۔ ذیل میں اجمالاً ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

عدلیہ کو انتظامیہ سے باقاعدہ الگ کر دینے کا کام عہد فاروقی میں ہی تکمیل کو پہنچا،لیکن عہدہ قضاء سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے قائم کیا اگر چہ اس کی بنیاد عہد نبوی ہی میں پڑ چکی تھی۔

بیت المال کا قیام

حضرت عمرؓ نے بیت المال کے باقاعدہ قیام کا حکم دیا،اس کے لئے علیحدہ عمارت بنوائی اور عبداللہ بن ارقم کو افسر خزانہ مقرر کیا۔[۱]

۱۵ھ میں جناب فاروق اعظم نے ایک زر کثیر حاصل ہونے پر اکابر صحابہ کی مجلس شوریٰ منعقد کی اور ان سے رائے طلب کی کہ اس رقم کا مصرف کیا ہونا چاہیے ۔یہاں پھر ولید بن ہشام نے یہ رائے دی کہ شام کے والیان کو دیکھا ہے کہ ان کے ہاں فوج کا دفتر اور رجسٹر مرتب رہتا ہے۔حضرت عمرؓ کو یہ رائے پسند آئی اور اس کے مطابق عمل درآمد ہوا۔

رسد کا مستقل محکمہ

حضرت عمرؓ نے رسد کا ایک مستقل محکمہ قائم کیا جس کا نام اہراء تھا [۲] شبلی کی تحقیق کے مطابق یہ طریقہ یونانیوں سے لیا گیا تھا۔

محکمہ پولیس

صدر اسلام میں پولیس کے لئے عربی زبان کا لفظ ''شرطہ'' بولا جاتا تھا۔شرطہ کا لفظ شرط سے بنا ہے،اس کی جمع شروط اور شرائط ہے۔ اسی سے شرطہ (پولیس) بنا ہے۔

حضرت عمرؓ پہلے خلیفہ ہیں جن کے عہد میں ''الشرطہ'' پولیس باقاعدہ ایک ادارہ کی صورت میں وجود میں آئی اور پھر حضرت علیؓ کے دور خلافت میں اس کو زیادہ ترقی ملی ۔مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں۔

''پولیس کا صیغہ مستقل طور پر قائم ہو گیا تھا اور اس وقت اس کا نام احداث تھا۔ چنانچہ افسران پولیس کو'' صاحب الاحداث'' کہتے تھے۔بحرین پر حضرت عمرؓ نے قدامہ بن مظعونؓ اور حضرت ابو ہریرۃؓ کو مقرر کیا تو قدامہ کو تحصیل مالگزاری کی عزت دی اور حضرت ابو ہریرۃؓ کو تصریح کے ساتھ پولیس کے اختیارات دیئے'' [۳]

ادارہ احتساب کا قیام

احتساب اور حسبہ کے معنی خالصتہً اللہ کے لئے کام کرنے کے آتے ہیں ۔نیکی کا جو کام خالص اللہ کے لئے اور صرف اجر و ثواب کی امید پر کیا جائے تو کہا جاتا ہے کہ یہ کام '' **حسبة الله** ''اور'' **احتساباً** '' کیا گیا ہے۔چنانچہ مشہور حدیث جس کو امام بخاری اور امام مسلم دونوں نے روایت کیا ہے اس میں احتساب کا لفظ اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔حدیث یہ ہے۔

---

۱ شبلی،الفاروق،ص:۲۲۹ ۲ ابن جریر،تاریخ طبری،ص:۲۶۳۵ ۳ شبلی،الفاروق،حصہ دوم،ص:۲۲۷

من صام رمضان ایماناً و احتساباً غفرله ما تقدم من ذنبه[۱]

''جس شخص نے پورے ایمان ویقین کے ساتھ اور خالصتہً اللہ کے لئے رمضان کے روزے رکھے اس کے تمام گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں''

امام غزالی نے احتساب کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

> ''احتساب سے مراد یہ ہے کہ حقوق اللہ سے متعلق کسی منکر سے یعنی ناپسندیدہ کام کے ارتکاب سے روکا جائے تاکہ جس کو روکا جا رہا ہے وہ اس برائی کے ارتکاب سے باز رہے''[۲]

علامہ ابن خلدون نے نہایت جامع تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

ھی وظیفة دینیة من باب الامر بالمعروف والنھی عن المنکر[۳]

''یہ ایک دینی منصب ہے جس تعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے''

اس سے انکار ممکن نہیں کہ اسلامی ریاست میں موجود اداروں کو مستقل شکل جناب فاروق اعظمؓ کے دور حکومت میں ہی ملی، اور پھر بعد کے دونوں خلفاء نے اس نظم کو قائم رکھا۔ جناب فاروق اعظمؓ نے اسلامی روح کے مطابق ''الحکمة ضالة المومن'' کے اصول پر عمل پیرا ہوتے ہوئے جہاں سے بھی کوئی ایسی چیز ملی جو امت کے لئے نفع بخش تھی، اسے قبول کر کے اسلامی نظام کا حصہ بنا دیا اور قطعاً کسی تعصب کو خاطر میں نہیں لائے، اور یہی انداز فکر رہا جس کو آنحضرت ﷺ نے روشناس کرایا تھا۔

خود آنحضرت ﷺ نے عرب جاہلیہ کے بعض قوانین اور رسومات کو اور پہلی شرائع کو من وعن قبول فرمایا اور آپ کے صحابہ نے بھی یہی طرز عمل اختیار کیا۔

علی ہذا القیاس خلفائے راشدینؓ نے ہر کام اور امور ملکی سے متعلق انتظام جو اپنے اندر خیر کا پہلو رکھتا تھا اسے بغیر کسی تعصب کے قبول کیا۔ اس کی واضح مثالیں، عرافہ، نقابہ، حلف اور ولاء کے سیاسی ادارے ہیں۔ وہ عہد جاہلیہ میں موجود تھے، آنحضرت ﷺ نے بھی انہیں باقی رکھا اور پھر خلفائے راشدین نے بھی انہیں قبول کیا۔ لیکن اسلام نے اس طرز سیاست کو مسترد کر دیا جو اسلام کے عالمگیر اصول سیاست میں رکاوٹ تھیں۔ مثلاً عربوں کی سیاست کا مرکز ومحور قبیلہ تھا۔ وہ مجموعی طور پر اس قوت جامعہ سے محروم تھے جس کو آج کل حکومت وسلطنت کا نام دیا جاتا ہے، کوئی مرکزی نظام موجود نہیں تھا۔ عہد خلفائے راشدین میں اسی قبائلی طرز سیاست کو ختم کر کے ایک وسیع البنیاد حکومت کی بنیاد ڈالی گئی۔ جس میں خلیفہ کا چناؤ عوام کی مرضی کے تابع تھا اور انتخاب کے بعد خلیفہ قبائلیت کی سطح سے بلند ہو کر امت مسلمہ کے مفاد کے نقطہ نظر سے غور وفکر کرتا تھا۔

عہد خلفائے راشدین میں انصاف کے لئے باقاعدہ ادارے منظم کئے گئے، محکمہ پولیس ہو یا قضا واحتساب کے محکمے، ان کا بنیادی مقصد صرف یہی تھا کہ لوگوں کو بے لاگ انصاف مہیا ہو۔ بعینہ بیع وشرائع کے وہ طریقے جن میں دھوکہ کا عنصر شامل تھا انہیں رد کر دیا اور باقی کو قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا۔ معاشرے کو لیجئے تو وہاں بھی نکاح وطلاق کے بعض اسالیب کو مسترد کیا اور بعض کو قائم رکھا۔

---

۱ البخاری، الجامع، کتاب الایمان، ۳۸ باب الصوم ۶ ۲ احیاء العلوم الدین، ۲/۳۲۳

۳ مقدمہ ابن خلدون، ص: ۲۲۵

فصل چہارم

نامور مسلمان مفکرین کا نقطۂ نظر

فارابی: فارابی دنیائے اسلام کا مشہور ترین فلسفی اور مفکر تھا، اس کا پورا نام محمد بن محمد تر خان اور کنیت ابونصر ہے۔ ترکستان کے ضلع فاراب کے مقام واسج میں 870ء میں پیدا ہوا۔ فاراب ہی کی نسبت سے ابونصر فارابی کے نام سے مشہور ہوا۔

فارابی نے تقریباً تمام علوم پر خامہ فرسائی کی ہے البتہ اس کی فلسفہ و منطق کی تصانیف نے جو شہرت حاصل کی وہ دوسری کتابوں کو نصیب نہیں ہوئی۔ فارابی ارسطو کے شارح کی حیثیت سے بہت مشہور ہے اور اسی وجہ سے وہ معلم ثانی کہلایا۔ معلم اول خود ارسطو تھا۔ فارابی نے ارسطو کی کتاب ''اخلاقیات'' پر بھی تبصرہ لکھا۔ افلاطون کی کتاب ''قانون'' کا خلاصہ تیار کیا۔ [۱] فارابی کی منطق پر شہرہ آفاق کتاب ''شرح الیساغوجی'' ہے نیز طبعیات، موسمیات، فلکیات، نفسیات، جیسے خشک مضامین پر بھی اس کی گراں مایہ تصانیف ہیں۔ یہاں موضوع سیاست ہے۔ سیاست پر اس کی، السیاسۃ المدینہ، آراء اہل المدینۃ الفاضلہ، جوامع السیاسۃ اور اجتماع المدینہ اہم تصانیف ہیں۔

ان تصانیف میں السیاسۃ المدینہ اور آراء اہل المدینۃ الفاضلہ نے زیادہ شہرت حاصل کی ہے ان ہی کتب میں فارابی نے اپنے تمام سیاسی افکار و نظریات بیان کر دیئے ہیں۔ فارابی کے سیاسی نظریات بیان کرنے سے پہلے یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ فارابی کی تمام تر کوشش ایک طرف شریعت اور فلسفہ کی تطبیق ہے دوسری طرف خود ارسطو اور افلاطون کے نظریات میں مطابقت پیدا کرنا ہے۔ فارابی کے نظریات بڑی حد تک تصوراتی و خیالی ہیں۔ معیاری ریاست کے مقابلے میں غیر معیاری ریاست کا نظریہ پیش کیا ہے۔ جو تمام کا تمام اس کے اپنے زمانے کے حالات کا صحیح آئینہ دار ہے۔

فارابی مملکت کو انسانوں کے ایک معاہدہ عمرانی (Social Contract) کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کی جنگجو فطرت کے باعث اجتماع کا وجود عمل میں آیا۔ اس کا کہنا ہے کہ مملکت کے قیام سے پہلے طاقتور کمزور پر زیادتیاں کرتا تھا۔ جس کی وجہ سے آئے دن جھگڑے ہوتے اور فتنہ و فساد پیدا ہوتے تھے۔ اس مسلسل خلفشار سے انسان عاجز آ گیا اور اس سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے ہر شخص نے اپنی مرضی سے اپنے حقوق کا ایک حصہ مرکزی قوت کے سپرد کر دیا اس طرح فارابی اس نظریہ مملکت کا بانی ہے جس نے اس کے انتقال کے تقریباً سات سو سال بعد انگلینڈ اور فرانس میں شرف قبولیت حاصل کیا۔ اگرچہ اہل یورپ اس ترکِ حقوق باہمی کے نظریے پیش کرنے کا سہرا ہابس کے سر باندھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فارابی نے ہابس، لاک اور روسو سے بہت پہلے کسی حد تک خامیوں سے پاک نظریہ مملکت پیش کیا۔ ہابس کے نزدیک انسان فطری طور پر شکّی واقع ہوا ہے۔ قانون، پولیس اور فوج کی موجودگی میں بھی ایک دوسرے پر شک کرتا ہے اور اسے ہم جنسوں پر کوئی اعتماد نہیں۔ اسے خارجی حملے کا ہر وقت خطرہ رہتا ہے اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمام افراد اپنے آپ کو ایک حاکم کے سپرد کر دیں اس کی اطاعت کو اپنا وطیرہ بنالیں۔ [۲]

ہابس اور فارابی کے نظریات میں کئی فرق ہیں فارابی نے اس معاہدہ کی بنیاد انسان کی جنگ جویانہ فطرت پر رکھی ہے۔ ہابس کے نزدیک جنگ و جدل کی بجائے ایک دوسرے پر شک و شبہ کے باعث یہ معاہدہ وجود میں آیا۔

---

۱ Hamid A. K. Rai. History of Political Philosophy, P:639

۲ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار: ۶۲

ہابس کا نظریہ شخصی حکومت کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور فارابی اس کے ذریعے ایک جمہوری نظام کو وجود میں لانا چاہتا ہے۔ یہ فرق بانیانِ نظریات کے زمانے کے سیاسی حالات نیز ان کے ذاتی عقائد کے باعث پیدا ہوا۔ ہابس کے زمانے میں چارلس اول اور پارلیمنٹ برسرِ پیکار تھے۔ ہابس بادشاہت کا طرف دار تھا۔ اس کے نزدیک بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنا اس کی شکایت کرنا زمانہ قبل مملکت کی طرف لے جانا ہے۔ فارابی کے زمانے میں بھی مختلف حکومتیں باہمی جنگ و جدل میں مصروف تھیں اس لڑائی کو ختم کرنے کی واحد صورت یہ تھی کہ یہ حکومتیں ایک مرکزی حکومت کو تسلیم کرلیں۔ اور اپنے حقوق کا ایک حصہ اس کے حوالے کردیں۔ ۱

فارابی کا نظریہ قیادت افلاطون سے زیادہ واضح ہے فارابی کہتا ہے کہ تمام انسان بلحاظ عقل مساوی درجہ نہیں رکھتے۔ بعض لوگ نتائج اخذ کرنے میں زیادہ ملکہ رکھتے ہیں اور دوسرے کم یا بالکل ہی اہلیت نہیں رکھتے۔ یہ قوت استنباط ہی قیادت اور اقتدار کی جان ہے صرف نتائج اخذ کرنا ہی کافی نہیں بلکہ ان نتائج کو دوسروں تک پہنچانا بھی ضروری ہے۔ ۲ فارابی نے متمدن شہریت پر جو عالمانہ کتاب ''آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ'' مرتب کی ہے۔ اس میں خدا کے اقتدار اعلیٰ، عظمتِ عامہ، جلالت مرتبہ کے علاوہ ان تمام اوصاف کا ذکر کیا ہے جو اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات ہیں۔ ۳

فارابی کا بیان ہے کہ تمام دنیا سے پہلے ایک پہلا وجود ہے جو مکمل ہے سب سے اوپر اور سب سے پہلے ہے اور تمام پابندیوں سے آزاد۔ اس کی مثال لانا ناممکن ہے اس کے برابر کسی کا درجہ ہونا ناقابل قبول ہے۔ یہ وجود اقتدار کی وحدت کا مالک ہے زندہ ہے اور بطور خود زندگی ہے۔ اپنے وجود کے لحاظ سے اتم ہے۔ زندگی کا منبع ہے عظمت عامہ اور جلالت کا مالک ہے۔ ۴

فارابی، آراء المدینۃ الفاضلہ میں لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے۔ اس کی ذات میں کسی قسم کی خامی یا کمی نہیں ہے۔ جب کہ دیگر تمام مخلوقات میں خامیاں ہیں اس کتاب میں اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات ہیں جن کو یورپ کے دماغوں میں غلطی سے دنیاوی اقتدار اعلیٰ کے لئے خاص کردیا ہے۔ ۵

چونکہ اسلامی حکومت کا مقتدر اعلیٰ خدا ہے اور وہ اپنی خدائی کے عرش سے اپنے اقتدار کا مظاہرہ کرتا ہے اس لئے قرآن میں ملکوت کا لفظ خدا تعالیٰ کے نام سے خاص طور پر مربوط ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے۔

من بیدہٖ ملکوت کل شیءٍ ۶

''کس کے ہاتھ میں ہے تمام اقتدار''

فسبحن اللہ الذی بیدہ ملکوت کل شئیً ۷

''وہ ذات پاک ہے جس کے زیر اقتدار تمام چیزیں ہیں''

کذلک نری ابراھیم ملکوت السمٰوٰت والارض ۸

''ہم نے اسی طرح ابراہیمؑ کو آسمان اور زمین کے درمیان اقتدار اعلیٰ کے عجائبات کا نظارہ دکھایا''

---

۱ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص:۶۳
۲ صلاح الدین، افکار سیاسی، ص:۱۷۴
۳ حامد انصاری، اسلام کا نظام حکومت، ص:۱۶۶
۴ ابونصر الفارابی: آراء اہل المدینۃ الفاضلۃ، ص۔۵
۵ ایضاً
۶ المومنون، ۲۳/۸۸
۷ یٰسین، ۳۶/۸۳
۸ الانعام، ۶/۷۵

قرآن مجید میں مملکت کے لئے الملک کا لفظ استعمال ہوا ہے لیکن یہ مملکت علاقائی نہیں ہے بلکہ آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے وہ اس کی مملکت میں داخل ہے۔

تبٰرک الذی له ملك السمٰوٰت والارض وما بینهما [۱]

''برکت والا ہے جس کے لئے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کی بادشاہت ہے''

غرض کہ زمین اور آسمان کی بادشاہت اللہ کے لئے ہے وہ مالک الملک ہے۔

فارابی کا خیال ہے کہ رئیس اول ایسا ہونا چاہیے جسے دوسروں سے کچھ سیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو اور اس میں مشاہدہ اور تبلیغ کی قوت ہو اور مملکت کے تمام امور پر کنٹرول رکھنے کا ملکہ رکھتا ہو۔ پختہ کار فلسفی ہو۔ وہ امور سلطنت کے نشیب وفراز سمجھ سکتا ہو۔ تصویر کے سب پہلو اس کے سامنے ہوں۔ معمولی مسئلوں پر غیر ضروری فکر نہ کرے۔ مسائل کو حل کرے پریشان نہ ہو۔ بالکل صحت مند ہو متانت اور سنجیدگی سے انتظامی مسائل حل کرے۔ [۲]

قوت بیانیہ اس قدر تیز ہو کہ جو کچھ کہے اس کا نقشہ سننے والے کے سامنے کھینچ جائے لہو ولعب سے متنفر ہو۔ سچ سے محبت اور جھوٹ سے نفرت کرتا ہو۔ وسیع القلب ہو اور عدل وانصاف سے خصوصی لگاؤ ہو۔ جس چیز کو بہتر سمجھتا ہو اسے بلاخوف وتردد نافذ کر سکے۔ اس کا خزانہ معمور ہو۔ [۳] فارابی کے بقول ان صفات کا حامل انسان کا ملنا محال ہے تاہم ان میں سے پانچ یا چھ خوبیوں کا حامل شخص بھی مل جائے تو بہت حد تک عمدہ حکمران ثابت ہو سکتا ہے۔

فارابی نے رئیس الاول کے اوصاف میں ایک چیز کو شامل کیا ہے وہ ہے اس کی مالی آسودگی۔ اس مالی آسودگی میں وہ رئیس الاول کے نجی املاک اور ذرائع آمدن کو شامل کرتا ہے وہ اس کے لئے اس حد تک مشاہرہ کا تعین بھی چاہتا ہے کہ وہ کسی فکر اور پریشانی کے بغیر امورِ مملکت انجام دے سکے۔ جبکہ افلاطون سربراہِ مملکت کے لیے نجی املاک کا قائل نہیں اور اسے سربراہ کا دشمن قرار دیتا ہے۔ فارابی نے اشراکیت کے نظریے کی تردید کی ہے بلکہ وہ محدود ذاتی املاک کو ضروری سمجھتا ہے۔ وہ صرف ان چند چیزوں پر افراد کی مشترکہ ملکیت کو تسلیم کرتا ہے جو ریاست کے مفاد کے ساتھ ساتھ خود افراد کے مشترکہ مفاد میں ہیں۔ [۴]

ماوردی: ابوالحسن علی بن محمد حبیب الماوردی ۹۷۴ء میں عراق میں پیدا ہوا تحصیل علم سے فراغت پانے کے بعد بغداد اور کوفہ میں معلّمی کے فرائض انجام دینے لگا۔ درس وتدریس کا سلسلہ زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ کیونکہ نیشاپور میں قاضی کا عہدہ سنبھالنا پڑا۔ بعد ازاں بغداد میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی [۵]۔ بغداد پر آل بویہ کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ابتدا میں آل بویہ سے ماوردی کے تعلقات خوشگوار تھے لیکن جونہی فرمانروا جلال الدولہ نے خلیفہ سے ملک الملوک کا خطاب دینے کی درخواست کی تو ماوردی نے اس کی شدید مخالفت کی اور فتوی دیا کہ باری تعالیٰ کے سوا اس خطاب کا کوئی مستحق نہیں ہے۔ اس واقعہ کے بعد آل بویہ ماوردی کے مخالف ہو گئے۔

۱۰۵۸ء میں، زوال بغداد سے پورے دو سال قبل ماوردی نے ۸۶ سال کی عمر میں وفات پائی۔ ماوردی کا اسلوب بیان اور طرز استدلال اسلامی ہے وہ قرآن اور حدیث کو سرچشمہ ہدایت سمجھتا ہے اپنے خیالات کی توضیح وتائید حتی الامکان قرآن کریم کے ذریعہ کرتا ہے۔ مثلاً اس امر کی وضاحت کے لئے کہ فرمانروا کو عیش وآرام کی زندگی سے احتراز کرنا چاہیے وہ ان آیات کو پیش کرتا ہے جن میں اللہ تعالیٰ نے

---

۱ زخرف، ۴۳/۸۵ ۲ وثیق احمد، مشرق ومغرب کے سیاسی افکار، ص:۱۶۲ ۳ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص:۶۶

۴ صلاح الدین ناسک، افکار سیاسی، ص:۴۷۶ ۵ Hamid A. K Rai: History of Political Philosophy, P. 659

حضرت داؤدؑ کو تفویض خلافت کے وقت ہدایات دی تھیں۔ مصارف زکوٰۃ کو متعین کرنے کے لئے آیت زکوٰۃ کو بطور دلیل پیش کرتا ہے۔لیکن اگر کسی مسئلے کے متعلق قرآن خاموش ہو تو احادیث نبویؐ سے استدلال کرتا ہے۔مثلاً اس نے امام کو اپنا جانشین مقرر کرنے کے ثبوت میں جنگِ موتہ کا واقعہ نقل کیا ہے جس میں آپؐ نے یکے بعد دیگرے تین سپہ سالار نامزد فرمائے۔ ماوردی کے نزدیک صحابہ کرامؓ کے اقوال وافعال بھی قابل حجت ہیں۔ماوردی نے صحابہؓ کے علاوہ تابعین اور تبع تابعین کے طرزِ عمل سے بھی سیاسی احکامات کا استنباط کیا ہے۔

ماوردی نے اپنی تصنیف ''الاحکام السلطانیہ'' کی ابتدا امامت سے کی ہے۔ پہلا باب امامت پر مبنی ہے اس میں اس نے امامت کی اہمیت، اس کی ضرورت، مقصد و وجوب سے بحث کی ہے[۱] امامت کو قرآن وحدیث سے ضروری ثابت کرنے کے بعد ماوردی کہتا ہے کہ منصبِ امامت عقلاً بھی ضروری ہے اسی طرح نقلی دلائل کے ساتھ ساتھ عقلی دلائل بھی پیش کرتا ہے۔ماوردی کی رائے میں امامت وہ بنیاد ہے جس پر قانون واحکام کی عظیم عمارت کھڑی ہے اس لئے اس کے نزدیک امامت کے دو مقاصد ہیں اول یہ کہ حق وانصاف کا بول بالا ہو اور دوم نیک وبد، خیر وشر، مامورات ومنہیات میں تفریق پیدا کرے[۲] امامت کی ضرورت کو ماوردی نے تاریخ وروایات کے ذریعہ ثابت کرنے کے بعد کہا کہ امامت عقلاً بھی ضروری ہے کیونکہ تمام دانا وسمجھدار آدمی اپنے معاملات ایک قائد کے سپرد کر دیتے ہیں تاکہ وہ ان کو ذلت وتوہین سے بچائے اور ان کی باہمی زندگی میں انصاف کر سکے۔رسول اللہ ﷺ کے وصال کے فوراً بعد مسلمانوں میں جو سب سے پہلے اختلاف پیدا ہوا وہ اسی بات پر تھا کہ جانشین رسول ﷺ کسی خاص خاندان یا قبیلے سے ہونا ضروری ہے یا کسی بھی خاندان سے ہو سکتا ہے۔یہی وہ سوال ہے جس نے امت مسلمہ کو آج بھی فرقوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔سب سے پہلے وہ گروہ جو خلافت کو کسی خاندان ہی میں محدود کرنے کے خلاف تھا وہ انصار مدینہ کا تھا۔ان کے نزدیک خلافت کے لئے اولین شرط خدمت اسلام تھی۔تقریباً ایک چوتھائی صدی کے بعد اسی رائے کا حامی لیکن زیادہ متشدد خارجیوں کا گروہ پیدا ہوا جس کے نزدیک خلیفہ ہر نیک اور صالح مسلمان ہو سکتا تھا۔جو لوگ نیابت رسول ﷺ کو کسی خاندان ہی میں محدود کرنے کے حامی تھے وہ بھی کسی ایک رائے پر متفق نہ تھے۔جمہور کے نزدیک خلیفہ کا صرف خاندان قریش سے ہونا کافی تھا خواہ اس خانوادے کا تعلق کسی بھی شاخ سے ہو۔لیکن ایک فرقہ جو آگے چل کر شیعان علی کہلایا اس بات کا دعویدار تھا کہ خلافت کے مستحق صرف بنو ہاشم ہیں بلکہ ان میں بھی صرف آل فاطمہ ہیں۔اول الذکر گروہ وقتی سیاست کے پیش نظر قریش کی خلافت کا قائل تھا جیسا کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا تھا کہ اہل عرب قریشی فرمانروا کے سوا کسی کو بھی حکمران تسلیم نہیں کریں گے۔اور مؤخر الذکر گروہ یعنی شیعان علی وراثت کے اصول پر خلافت کو خاندان رسول میں محدود کر دینے کا حامی تھا۔آگے چل کر جو لوگ قریش میں سے خلیفہ مقرر کرنے کے حامی تھے ان کے بھی دو گروہ ہو گئے۔ایک گروہ کا خیال تھا کہ'' **الائمہ من القریش** '' کا اشارہ محض وقتی اور عارضی تھا جب اہل عرب سے قریش اور غیر قریش کا فرق مٹ گیا تو یہ شرط بھی ختم ہو گئی لیکن دوسرا گروہ ہمیشہ کے لئے اس شرط کو ضروری سمجھتا تھا ماوردی کا تعلق اسی آخری گروہ سے ہے۔[۳]

ماوردی کا خیال ہے کہ امام پوری قوم کے مشورہ سے چنا جانا چاہیے لیکن ہر کس و ناکس کو رائے دینے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ ماوردی نے اس سلسلہ میں رائے دینے والوں کی اہلیت سے بحث کی ہے اس نے ووٹر کے لئے بجائے عمر، دولت، رہائشی قیود کے، ان کے نیک، صالح، متقی، عاقل اور دانا ہونے کی شرط لگائی ہے۔[۴]

ماوردی نے امام کے انتخاب کے دو طریقے بتائے ہیں۔مذکورہ بالا قسم کے رائے دینے والے کسی کو منتخب کریں یا سابق امام کسی کو نامزد کرے۔

۱　رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص:۷۲　　۲　Hamid A. K Rai: History of Political Philosophy, P. 660

۳　ایضاً، ص:۷۵　　۴　Ibid,P:660

ماوردی نے امام کے اوصاف پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے نزدیک امام کا مرد ہونا، عاقل و بالغ اور آزاد ہونا ضروری ہے کردار کا بہت بلند ہو، عدالت، سخاوت، شجاعت، تواضع، اولوالعزمی اور ثابت قدمی کا مالک ہو۔ حواس واعضاء صحیح سلامت ہوں۔ اتنا علم ہو کہ اجتہاد کر سکے۔ اس کا نسبتاً قریشی ہونا ضروری ہے۔ اصابت رائے اس حد تک ہو کہ موقع محل کے لحاظ سے کام کرے اور لوگوں سے مشورہ کر لے لیکن ان مشوروں کو اپنی عقل کے ترازو پر تولے۔

ماوردی نے امام کی صفات کی ایک طویل فہرست تو تیار کر دی لیکن فارابی کی طرح اس نے ان صفات کے اشخاص کے دستیاب نہ ہونیکی صورت میں متبادل حل پیش نہیں کئے۔ ماوردی چونکہ ایک منتخب امام کا قائل ہے اسلئے وہ راعی اور رعایا کے باہمی تعلقات کو 'عقد' یا معاہدہ کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ عوام نے چونکہ امام کی اطاعت کرنے کا عہد کیا ہے اس لئے اس باہمی معاہدہ کی رو سے امام پر بھی چند فرائض عائد ہوتے ہیں۔ امام کے فرائض کے بارے میں ماوردی کا کہنا ہے کہ اس پر دس فرائض عائد ہوتے ہیں۔

1۔ دین کی حفاظت کرنا اور اس بات کا خیال رکھنا کہ رعایا اس کے احکامات پر عمل پیرا ہو اور ممنوعات سے پرہیز کرے۔
2۔ عدل وانصاف کا بول بالا کرنا۔
3۔ ملک میں امن وامان قائم کرنا۔
4۔ مجرمین کو سزا دینا۔
5۔ حدود مملکت کی حفاظت کرنا۔
6۔ اسلام کی تبلیغ واشاعت کرنا۔
7۔ عوام پر زیادتی کئے بغیر زکواۃ وصدقات وصول کرنا۔
8۔ مستحقین کو باقاعدہ وظیفے دینا۔
9۔ ایماندار اور قابل لوگوں کے سپرد انتظام حکومت کرنا بالخصوص والی و عامل نہایت قابل اور لائق لوگوں کو مقرر کرنا اور خزانہ کو نہایت دیانتدار اشخاص کے سپرد کرنا۔
10۔ امور سلطنت پر کڑی نظر رکھنا۔ لوگوں کے حقوق کی نگہداشت کرنا۔ نیز امور سلطنت کے سوا کسی کام میں خواہ عبادت وزہد ہی ہو اس طرح مشغول نہ ہونا کہ کاروبار خلافت میں خلل واقع ہو۔[1]

نظام الملک طوسی: نظام الملک طوسی کا نام حسن اور کنیت ابوعلی ہے۔ ۴۰۸ھ بمطابق ۱۰۱۷ء طوس کے ایک کاشتکار گھرانے میں پیدا ہوا۔ زندگی کے ابتدائی ایام ہی میں ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ والد غریب تھے اور بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلانے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ ان نامساعد حالات میں بھی اس ہونہار بچے نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر لی۔ سات برس کی عمر میں ہی پورا قرآن پاک حفظ کر لیا۔ عربی زبان سیکھنے کے علاوہ مذہبی امور میں مہارت پیدا کی۔[2] طالب علمی کے زمانے میں دو شخص اس کے ہم سبق تھے جنہوں نے آگے چل کر ابدی شہرت حاصل کی۔ ان میں سے ایک مشہور شاعر وفلسفی عمر خیام اور دوسرا باطنیہ کی حشیشین شاخ کا بانی حسن بن صباح ہے۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد نظام الملک متعدد حکومتوں میں معمولی عہدوں پر فائز رہا۔ اس نے بلخ کے حاکم ابوعلی بن شاذان کی ملازمت اختیار کی لیکن بوعلی کی درشت مزاجی سے تنگ آ کر بلخ چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ اس کے بعد اس نے مرو میں سلجوق کے پوتے

1۔ الماوردی، احکام السلطانیہ، ص: ۲۸ 2۔ نظام الملک طوسی، سیاست نامہ، (مترجم شاہ حسن عطا) ص ۷

جعفری بیگ تک رسائی حاصل کر لی۔ جعفری بیگ، نظام الملک کے علم وفضل اور اسکی ذہانت سے متاثر ہوا۔ اسی کی سفارش پر اس کے بیٹے الپ ارسلان نے نظام الملک کو اپنا کاتب مقرر کرلیا۔ طغرل کے انتقال کے بعد الپ ارسلان جب بادشاہ ہوا تو اس نے نظام الملک کو وزیر بنا کر سارے امور مملکت نظام الملک کے سپرد کر دیئے۔[1] الپ ارسلان کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ بادشاہ ہوا۔ اس نے نظام الملک کو اتابک اور عماد الدولہ کے القاب عطا کئے اور سلطنت کا مختار کل بنا دیا۔ نظام الملک کی بلند شخصیت اور دوسروں کے دلوں میں اس کے احترام کا اندازہ خطابات کی طویل فہرست سے لگایا جا سکتا ہے۔ وزیر کبیر، خواجہ بزرگ، تاج الحضرتین، قوام الدین جیسے خطابات خلفا اور سلاطین نے دیئے جب کہ ہم عصر علما نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے سید الوریٰ، مؤید الدین جیسے القاب سے نوازا۔

حکمران کے بارے میں نظام الملک کا کہنا ہے کہ جب لوگ شرعی احکامات کی خلاف ورزی شروع کر دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ناراضگی کا اظہار ظالم بادشاہ کو مسلط کر کے فرماتے ہیں۔ خون ریزی اور لوٹ مار بڑے پیمانے پر ہوتی ہے۔ طاقت ور آدمی سیاہ وسفید کا مالک بن بیٹھتا ہے اور من مانی طریقہ سے حکمرانی کرنے لگتا ہے۔ اس عذاب میں متقی و فاسق دونوں مبتلا ہو کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ کا رحم جوش میں آتا ہے اور وہ کسی نیک وفرمانبردار آدمی کو بادشاہت عطا کرتا ہے۔

نظام الملک کے اس نظریہ اقتدار اعلیٰ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ وہ بادشاہ کے خداداد حقوق "Devine Right of King" پر یقین رکھتا ہے سخت غلطی ہوگی۔ جہاں تک بادشاہ اور عوام کا تعلق ہے وہ بادشاہ کو مطلق العنان سمجھتا ہے لیکن دوسری طرف وہ بادشاہ پر بے شمار پابندیاں عائد کر کے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی مطلق العنانی کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہتا۔ سب سے بڑی پابندی بادشاہ پر شرعی احکامات کی تعمیل ہے۔ پھر قیام عدل پر اس نے بہت زور دیا ہے۔ جس میں شاہ وگدا اور آقا وغلام کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ وہ سلطان کو قانون سے بالاتر نہیں رکھتا۔ نظام الملک بادشاہ کے اوصاف کی طویل فہرست پیش کرتا ہے۔ حسن صورت، جذبہ انصاف، شجاعت و بلند حوصلگی کو لازمی عنصر تصور کرتا ہے۔ نیز اس کے راسخ العقیدہ اور قوی الایمان ہونے کے ساتھ شرعی احکامات پر پابند ہونا بھی لازمی ہے۔[2]

نظام الملک کے نظریے میں جس بات پر صحیح معنوں میں زور دیا گیا ہے وہ یہ نہیں کہ کون حکومت کرے بلکہ یہ ہے کہ کس طرح حکومت کی جائے۔[3] نظام الملک کے نام سے دو کتابیں منسوب ہیں ایک ''سیر الملوک'' جو ''سیاست نامہ'' کے نام سے مشہور ہوئی دوسری ''مجمع الوصایا'' یا ''دستور الوزراء''۔ ''سیر الملوک'' نظام الملک کی وفات سے چند ماہ پہلے تحریر کی گئی۔ اس میں سیاست کے ہر پہلو پر بحث کی گئی ہے۔ بادشاہ کے اوصاف وفرائض کا تفصیلی ذکر ہے۔ نظام الملک سیاسی مفکر کی حیثیت سے اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔ اس کی عمر کا بیشتر حصہ سیاسی گتھیاں سلجھانے میں صرف ہوا۔ نظام الملک کے نزدیک بادشاہ مامور من اللہ ہوتا ہے اور اسی لئے بادشاہ عوام کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا اور نہ عوام کو کسی حالت میں یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ بادشاہ کو معزول کر سکیں۔

امام غزالی: امام غزالی کا نام محمد کنیت ابو حامد، لقب وخطاب حجۃ الاسلام اور غزالی عرف ہے اور سلسلہ نسب کچھ یوں بیاں کی جاتا ہے۔ محمد بن محمد بن محمد بن احمد ہے۔ ایران کے ایک صوبہ خراسان کے ایک ضلع طوس میں دو شہر طاہران اور طوقان ہیں، امام غزالی ۴۵۰ھ/ ۱۰۵۸ء میں طاہران میں پیدا ہوئے۔[4]

ان کی پیدائش فردوسی کی پیدائش سے سو سال بعد اور نظام الملک طوسی کی پیدائش کے چالیس سال بعد ہوئی اور انسائیکلوپیڈیا آف فلاسفی

۱۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ۳/۹۳۲
۲۔ نظام الملک طوسی، سیاست نامہ (مترجم شاہ حسن عطا)، ص ۱۳۸
۳۔ سجاد رضوی، مسلمانوں کے سیاسی نظریے، ص ۴۵
۴۔ شبلی نعمانی، ''الغزالی''، ص: ۸

میں ان کی پیدائش کا تذکرہ کچھ یوں ہے:

Ghazali was born in 450 or 451 H. (A.D. 1058 or 1059) in Ghazaleh, a village on he outskirts of tus, in khorason north-eastern Iran. His name is the same as that of his birth place, which should be described as Ghazalie, not as Ghazzali 1

امام غزالی کے والد صاحب سوت فروش تھے اور اسی وجہ سے ان کا خاندان غزال کہلایا ۲ علامہ سبکی ''طبقات الشافعیہ'' میں لکھتے ہیں ''غزالی کے والد درویش صفت، صوفی منش، پارسا اور نہایت غیور انسان تھے اپنے ہاتھ سے اون اور ریشم کاتتے اور اس سے جو کچھ ملتا صرف اسی میں گزارا کرتے'' ۳

علامہ سمعانی نے اپنی کتاب ''انساب'' میں لکھا ہے کہ غزالہ طوس کے ایک گاؤں کا نام ہے، امام صاحب وہیں کے رہنے والے تھے اس لئے غزالی کہلائے۔ لیکن پہلی روایت معتبر ہے اور بڑی دلیل اس کی یہ ہے کہ طوس کے ضلع میں غزالہ کوئی گاؤں نہیں ہے ۴

امام غزالی کے والد صاحب تعلیم سے محروم رہ گئے تھے مگر انہیں اپنی اولاد کو تعلیم دلوانے کا بڑا شوق تھا۔ انہوں نے اپنی موت کے وقت اپنے ایک دوست سے کہا کہ ان دونوں لڑکوں کو تعلیم دلائی جائے تا کہ میری جہالت کا کفارہ ادا ہو سکے'' ان کے والد کی خواہش پر امام صاحب کو تعلیم دلانی شروع کی گئی۔

امام صاحب نے فقہ کی کتابیں احمد بن محمد رافکانی سے پڑھیں یہ بزرگ امام صاحب کے شہر ہی میں مقیم تھے۔ اس کے بعد جرجان کا قصد کیا اور امام ابونصر اسماعیلی کی خدمت میں تحصیل شروع کی۔ اس زمانے میں درس کا قاعدہ یہ تھا کہ استاد مطالب علمیہ پر جو تقریر کرتا تھا، شاگرد اس کو قلم بند کرتے جاتے تھے۔ چنانچہ امام صاحب نے بھی ان یادداشتوں کا ایک مجموعہ تعلیقات تیار کیا تھا۔ اتفاق سے راہ میں ڈاکہ پڑا اور امام صاحب کے پاس جو کچھ تھا لٹ گیا۔ اس میں وہ تعلیقات بھی تھیں جو امام ابونصر نے لکھوائی تھیں۔ امام صاحب کو اس کے لٹنے کا بے حد صدمہ ہوا چنانچہ ڈاکوؤں کے سردار کے پاس گئے اور کہا کہ میں اپنے اسباب اور سامان سے صرف اس مجموعہ کو مانگتا ہوں کیونکہ انہی کے سننے کے اور یاد کرنے کے لئے سفر کیا تھا۔ وہ ہنس پڑا اور کہا کہ ''تم نے خاک سیکھا جب کہ تمہاری یہ حالت ہے کہ ایک کاغذ نہ رہا تو تم کورے رہ گئے۔ امام صاحب پر اس کے طعنہ آمیز فقرے نے اتنا اثر کیا کہ انہوں نے وطن پہنچنے کے بعد وہ یادداشتیں زبانی یاد کرنا شروع کر دیں یہاں تک کہ پورے تین برس صرف کر دیئے اور ان مسائل کے حافظ بن گئے۔ ۵

امام غزالی نے ۱۲ سال تک شام، مصر، مکہ اور مدینہ کی سیاحت کی اور پھر طوس میں اقامت پذیر ہوئے۔ امام صاحب نے ۱۴ جمادی الثانی ۵۰۵ھ میں بمقام طاہران انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔ ۶

امام غزالی مسلم مفکرین میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے سیاسیات کی اہمیت پر بحث کی ہے وہ جملہ علوم کی صفات میں سیاسیات کو اعلیٰ مقام دیتے ہیں۔ انہوں نے علوم کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ پہلی قسم میں وہ علوم شامل ہیں جو دین سے تعلق نہیں رکھتے وہ اس قسم میں ریاضی، منطق اور طبیعات کو شامل کرتے ہیں۔ دوسری قسم کے علوم جو شرع سے متعلق ہیں مثلاً ماوراء طبیعات، سیاسیات، علم الاخلاق اور علم نفس وغیرہ۔ گویا

---

۱ The Encyclopedia of Philosophy, P. 326-327 ۲ شبلی نعمانی، ''الغزالی'' ص:۸ ۳ طبقات الشافعیہ، ۴/۱۰۲

۴ شبلی نعمانی، ''الغزالی'' ص:۹ ۵ شبلی نعمانی، ''الغزالی'' ص:۲۰ ۶ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص:۱۲۰

کہ امام صاحب کے نزدیک سیاسیات ایک دینی علم ہے اور بہت اہم ہے۔

آپ نے سیاسیات کو ایک بڑی سائنس قرار دیا اور یوں تعریف کی ہے کہ:

''ایسا علم جو دنیاوی قسم کے ملکی حالات کی مناسب ترتیب سے تعلق رکھتا ہو''

''وہ علم جو مملکت کے نظم ونسق کے مذہبی اور روحانی امور سے بحث کرتا ہو'' ۱

''علم سیاسیات میں ان سارے اقوال کا مرجع وہ حکمتیں اور مصلحتیں ہیں جو امور دینوی اور کاروبار جہانبانی سے متعلق ہیں اور ان کو فلاسفہ نے انہی کتب سے اخذ کیا۔ جو انبیاء پر نازل ہوئیں یا ان حکمتوں سے اخذ کیا جو اولیاء سلف نے پرکھی ہوں''۔ ۲

امام صاحب کے نزدیک انسانی زندگی کے لئے چار چیزیں ابدی وضروری ہیں۔ غذا۔ لباس، مکان اور باہمی تعلقات۔ ان چاروں کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ غذا کے لئے زراعت۔ لباس کے نوربافی اور مکان کے لئے علم تعمیر اور باہمی تعلقات کے لئے سیاست کی ضرورت ہے۔ ان چاروں فنون میں بھی وہ سیاست کو اہم ترین کہتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک سیاست پر ہی باہمی تعلقات اور خوشگوار زندگی کا دارومدار ہے اسی لئے وہ ماہر سیاست کے لئے اعلیٰ اوصاف سے متصف ہونے کی شرط لگاتے ہیں اور دیگر فن کار صُناع اور معماروں کے ان تعلقات کو ضروری نہیں سمجھتے ان کا دعویٰ ہے کہ سیاست دان اپنی انہیں صفات کے باعث دوسروں سے خدمت لیتا ہے اور سب کو اپنا تابع اور مطیع سمجھتا ہے۔ ۳

مقتدر اعلیٰ کے لئے غزالی کا استدلال نہایت منطقی ہے انکے مطابق انسان کو کشت وخون، تنازعات سے بچانے، تحفظ جان ومال اور نظم ونسق کے قیام کے لئے قدرتی طور پر دانش مند لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بہت سے لوگ ہوتے ہیں پھر ایک نہایت ذی فہم اور تمام علوم وفنون کے آشنا شخص کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ شخص خلیفہ یا امام ہوتا ہے۔ امام غزالی امام یا خلیفہ کو زمین پر خدا کا نائب تسلیم کرتے ہیں ۴

امام غزالی نے مقتدر اعلیٰ (یعنی ربِ کائنات) کی درج ذیل خصوصیات بیان کیں

۱۔ وہ ایک ہے، لاشریک ہے، یکتا ہے۔ اس جیسا کوئی نہیں۔ ازل سے ہے ابد تک رہے گا۔ اس کے لئے فنا نہیں ہر ایک اس کی طرف محتاج ہے وہ کسی کا محتاج نہیں ہے اس کا وجود اس کے ساتھ ہے ہر چیز کا وجود اسی سے قائم ہے۔ ۵

۲۔ بے مثل وصورت ہے نہ وہ کسی قلب میں حلول کرتا ہے، کمیت وکم، کیوں اور کیا سے منزہ ہے نہ وہ کسی کے مشابہ ہے نہ کوئی چیز اس کے مشابہ ہے۔ وہم، خیال وفکر میں اس کے بارے میں جو کچھ تخیل، تمثیل وتکیف آتا ہے وہ ان سب چیزوں سے بری ہے۔ لہٰذا ان کے اوصاف کے ساتھ کیسے متصف ہوسکتا ہے۔ اور وہ ان کا خالق ہے۔ نہ وہ کسی مکان میں ہے نہ کسی مکان پر ہے کیونکہ مکان اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ ۶

۳۔ اللہ تعالیٰ ہر معلوم کو جانتا ہے اس کا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے ثریا سے لے کر ثریٰ تک اس کا علم احاطہ کئے ہوئے ہے کیونکہ تمام اشیا اس کے علم سے ظاہر ہوئیں اور اس کے ارادہ سے پیدا ہوئیں اس کی قدرت سے ان کا وجود ہے وہ صحراؤں کے ذرات بارش کے قطرات اور درختوں کے پتوں تک کا علم رکھتا ہے پوشیدہ افکار کو بھی جانتا ہے جن چیزوں پر

---

۱ رشید احمد، ''مسلمانوں کے سیاسی افکار'' ص:۱۲۴
۲ الغزالی: المنقذ من الضلال'' ص:۸۲
۳ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص:۱۲۵
۴ صلاح الدین ناسک، سیاسی افکار، ص:۵۱۰
۵ الغزالی، نصیحۃ الملوک، ص:۳
۶ الغزالی، نصیحۃ الملوک، ص:۴۵

ہوائیں چلتی ہیں ان کو بھی جانتا ہے جو اس نے چاہا ہوا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔ اس کی مشیت کو کوئی رد نہیں کر سکتا ہے۔ جو کچھ ہوا جو کچھ ہوگا۔ اسی کی تدبیر اور حکم اور تسخیر سے ہے''۔ ؎۱

۴۔ جس طرح کہ وہ تمام معلومات کا عالم ہے اسی طرح وہ ہر چیز کا سننے والا ہے اور ہر چیز کا دیکھنے والا ہے وہ ایک ہی سماعت اور بصارت سے تاریک رات میں چیونٹی تک کی حرکت کو دیکھ لیتا ہے۔ اور طبقات ارض میں کیڑے کے رینگنے کی آواز کو سن لیتا ہے اس کی سماعت و بصارت چشم و گوش کی پابند نہیں ہے جس طرح کہ اس کا علم کسی غور و فکر کا محتاج نہیں ہے۔ اسی طرح کے کام بغیر آلات و سامان کے ہیں۔ اشیاء سے کہتا ہے کہ ہو جاؤ تو وہ ہو جاتی ہیں۔ ؎۲

۵۔ اللہ کا حکم تمام مخلوقات پر نافذ ہے خواہ از قسم وعدہ ہو یا از قسم وعید کیونکہ وہ حق ہے اور اس کا کلام اس کا حکم ہے جس طرح وہ عالم و قدیر اور سمیع و بصیر ہے اسی طرح وہ متکلم بھی ہے اس کا کلام بغیر زبان و حلق دانتوں اور منہ کے ہے قرآن، توریت، زبور، انجیل اور تمام کتب منزلہ کہ سب اس کا کلام ہیں۔ اس کا کلام اس کی صفت ہے اور اس کی تمام صفات قدیم ہیں جس طرح کلام آدمیوں کے ہاں صرف اور صورت سے مرکب ہے اس کا کلام ایسا نہیں ہے۔ ؎۳

۶۔ عالم میں جو کچھ ہے سب اسی کا پیدا کردہ ہے نہ کوئی اس کا شریک ہے نہ خالق بلکہ وہ خالق واحد ہے اس نے جو کچھ از قسم تائب مرض، فقر، عجز و جہل وغیرہ پیدا کیا ہے وہ عدل ہی عدل ہے اس کے افعال میں ظلم نہیں ہے کیونکہ ظالم وہ ہے جو کسی دوسرے کی ملکیت میں تصرف کرے۔ اور اللہ تعالیٰ تو اپنی ہی ملکیت میں تصرف کرتے ہیں۔ اس کے سوا کوئی مالک نہیں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہوگا وہ اس کی ملکیت ہے وہ بلاشبہ مالک ہے کسی کو اس پر اعتراض کرنے کا حق نہیں نہ کوئی چوں و چرا کر سکتا ہے تمام افعال میں اسی کا حکم چلتا ہے کسی کو تسلیم و رضا کے سوا چارہ کار نہیں ہے۔ ؎۴

حقیت یہ ہے کہ امام غزالی نے جو اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات بیان کی ہیں وہ تمام اسلام میں اقتدار اعلیٰ یعنی اللہ کی ذات کی خصوصیات ہیں اصل میں فرق مغربی اور اسلامی مقتدرِ اعلیٰ کا ہے۔ مغرب میں مقتدرِ اعلیٰ وہاں کی حکومت کا سربراہ ہوتا ہے کسی ملک میں اقتدار اعلیٰ کی قوت کی پارلیمنٹ کو اور کسی میں اقتدار اعلیٰ کی قوت افراد کو حاصل ہوتی ہے۔ مگر اسلام میں اقتدار اعلیٰ حقیقی کا حقدار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے اور امام غزالی کے خیال کے مطابق دنیا میں حکمران یا خلیفہ اللہ کے نائب ہوتے ہیں اور وہ صرف اللہ کے نازل کردہ احکامات کو عملی جامہ پہناتے ہیں اور ان کے پاس کوئی اختیار نہیں ہوتے صفت میں تمام اختیارات کی مالک اللہ کی ذات ہے۔

امام غزالی نے سیاست کو انتہائی اہمیت دی ہے۔ گو فرد کا مقصدِ عظیم دین ہے لیکن حصول دین کے لئے حکومت اور سیاست دونوں ہی کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بات کا ذکر وہاں آتا ہے جب وہ کہتے ہیں کہ نفاذ شریعت کے لئے مادی استحکام اولیں ضرورت ہے۔ ؎۵ متعدد امورِ شرعی کی مادی حیثیت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ شرع کے نفاذ کے لئے ایک معاشرتی اور مذہبی ادارہ قائم ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ سیاسی اقتدار کا ہونا بھی لازم آتا ہے۔ لہٰذا خلافت و امامت کو وہ انتہائی ذمہ دار عہدہ قرار دیتے ہیں۔ وہ امامت کو نظام دین کے لئے اشد ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس کی دلیل وہ یہ دیتے ہیں کہ نظام دین کا دارومدار نظام دنیا پر ہے۔ اور نظام دنیا امام کے بغیر محال ہے۔ الغزالی صاف صاف بتاتے ہیں کہ امام کا ہونا اس قدر ضروری ہے کہ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اگر کوئی اور طریقہ نہ ہو تو شرائط اہلیت میں تبدیلی کر دیں۔ ؎۶

؎۱ نصیحۃ الملوک، ص:۴　؎۲ نصیحۃ الملوک، ص:۵　؎۳ نصیحۃ الملوک، ص:۵
؎۴ نصیحۃ الملوک، ص:۵،۶　؎۵ الاقتصاد فی الاعتقاد، ص:۱۰۵　؎۶ الاقتصاد فی الاعتقاد، ص:۱۰۷

دراصل الماوردی اس سے پہلے ان امیروں کی حکومت جائز قرار دے چکے تھے جنہوں نے فتح حاصل کر کے ملک پر قبضہ کیا ہو۔ ان کے نزدیک وہ خلیفہ بھی جائز تھا جسے اس کے فوجی سرداروں نے زبردستی قبائے خلافت اوڑھنے پر مجبور کر دیا ہو۔ اگر چہ وہ صاف صاف بتا دیتے ہیں کہ خلافت کی وجوبی حیثیت اس بات سے پیدا ہوتی ہے کہ خلیفہ احکام شریعت پر عمل درآمد کراتا ہے۔[۱]

بہر حال غزالی اس بات پر آمادہ ہیں کہ خلافت کو برقرار رکھنے کے لئے خلیفہ کی شرائطِ اہلیت نرم کر دیں۔ صرف ایک چیز پر مصر ہیں کہ خلیفہ کو قریشی نسل سے ہونا چاہیے۔ غزالی کا خیال ہے کہ خلیفہ کی عدم موجودگی میں کسی قاضی کا کوئی فیصلہ، کوئی معاہدہ، کوئی وصیت جائز نہیں ہو سکتی۔ دوسرے لفظوں میں تمام قاضیوں اور تمام سرکاری اہلکاروں کو اقتدار خلیفہ سے حاصل ہوتا ہے۔[۲]

ابن طقطقی: اس معروف شیعہ عالم کا پورا نام صفی الدین بن علی بن طباطبا المعروف ابن طقطقی تھا جو سقوط بغداد کے چار سال بعد ۱۲۶۲ء میں پیدا ہوا۔ اس کا سلسلۂ نسب حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ملتا ہے۔ علوی تحریک میں ابن طقطقی کے آباؤ اجداد بہت پیش پیش رہے۔ یہ وہ دور تھا جب منگولوں کی تباہ کاریوں نے اسلامی دنیا کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا ابن طقطقی کے والد تاج الدین علی بن محمد دریائے فرات کے ساحلی شہر حلہ میں علویوں کے راہنما تھے۔ ۱۲۸۱ء میں ان کے قتل کے بعد ابن طقطقی نے بغداد سے تبریز جاتے ہوئے موصل میں قیام کیا اور موصل کے حاکم فخر الدین عیسیٰ بن ابراہیم کا مہمان ہوا۔

یہاں اس نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''الفخری'' لکھی اور میزبان کے لئے اظہار تشکر کے طور پر اس کتاب کا نام ''الفخری'' رکھا۔ ابن طقطقی اگر چہ شیعہ عالم و مورخ تھا لیکن یہ بات کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اس نے اپنی تصانیف اور اقوال میں نہایت فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔ تصانیف میں اس نے قرآن مجید اور قوی احادیث کے ساتھ اقوال اسلاف کو حوالوں کا ذریعہ بنایا اور جا بجا خلفائے راشدین کے اقوال کو ثبوت کے طور پر پیش کیا۔ ایک اور چیز جس نے ابن طقطقی کو دیگر مسلم مفکرین سے ممتاز کر دیا ہے وہ اس کا ادبی ذوق ہے وہ جا بجا برمحل اشعار پیش کرتا ہے جن کی وجہ سے 'الفخری' محض ایک تاریخ کی کتاب ہونے کے علاوہ تاریخ ادب میں بھی ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ وہ زمانۂ جاہلیت کے شعراء کے کلام کے اقتباس پیش کرتا ہے۔ جن میں امراء القیس اور نابغہ ذبیانی جیسے چوٹی کے شاعر شامل ہیں۔ اور عہد اسلام کے شعراء کے بھی بے شمار شعروں کے ذریعے اپنے افکار کی توضیح میں مدد لیتا ہے۔ ان شعراء میں فرزدق، ابونواس اور متنبّی شامل ہیں۔ کبھی وہ غیر معروف اور نامعلوم شعراء کے شعر بھی نقل کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس قسم کے اشعار اس کے اپنے ہوں۔ اس طرح 'الفخری' میں نظم ونثر کا عجیب وغریب امتزاج پایا جاتا ہے۔[۳]

ابن طقطقی کے زمانے میں مختلف طبقے وجود میں آ گئے تھے۔ مذہبی طبقے کی گرفت عرصے سے رفتہ رفتہ ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ وہ قرآن واحادیث کے سوا کسی اور بات کی طرف کان دھرنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ دوسرا پڑھا لکھا طبقہ تاریخ کا دلدادہ تھا۔ تاریخی نظائر کے بغیر وہ کسی بات کے ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ شعر وادب کا دلدادہ گروہ اشعار اور ضرب الامثال ہی کے ذریعے کسی بات کو تسلیم کرتا ہے۔ ابن طقطقی نے اپنی کتاب میں تینوں طرح کے دلائل مہیا کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تصنیف آج تک ہر طبقۂ خیال اور فرقے میں مقبول ہے۔

ابن طقطقی اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ اسلامی مملکت میں ہر دور میں صرف خلافت کے بارے میں سوچنا درست نہیں۔ نہ ہی ہر دور میں خلافت قابل عمل ہو سکتی ہے۔ خلافتِ راشدہ مشعلِ راہ ضرور ہے مگر اب خلفائے اربعہ کی طرح کے باوصف خلیفہ کا ملنا مشکل ہے۔ ابن طقطقی کے خیال میں خلفائے اربعہ کے دور پر دورِ پیغمبری کی خصوصیات اور نعمتوں کا غلبہ تھا۔ ابن طقطقی خلیفہ کے احترام کا پوری طرح قائل ہے۔ مگر وہ خلیفہ کے لئے غیر محدود اختیارات کو نامناسب سمجھتا ہے اور انہیں مذہب تک محدود کرتا ہے۔ خطبے میں خلیفہ کے نام اور سکہ پر اس کے

[۱] الماوردی، احکام السلطانیہ، ص:۱۶ [۲] الغزالی، الاقتصاد فی الاعتقاد، ص:۱۰۴ [۳] رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص:۱۴۴

نام کی اجازت دیتا ہے۔ البتہ بادشاہ کو مادی و اخلاقی اصلاح اور ان قدروں کی حفاظت سونپتا ہے۔ بادشاہ کے معاملے میں اس نے مسلم، مومن یا کافر کی کوئی پابندی عائد نہیں کی۔

ابن طقطقی کی حقیقت پسندی نے اسے بادشاہ کے اوصاف سے تفصیلی بحث کرنے پر مجبور کیا۔ وہ ایک کامل بادشاہ جسے وہ ''الملک الفاضل'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اس کے اوصاف اور شرائط بیان کرنے میں بہت زیادہ زور بیان صرف کر دیتا ہے۔ وہ اس امر کی توجیہہ بھی کرتا ہے کہ بادشاہ میں ان اوصاف کا ہونا کیوں ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''بادشاہ میں چند ایسی صفات کا ہونا ضروری ہے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتیں۔ کیونکہ حیثیت اور رتبہ میں بھی وہ دوسروں سے مختلف اور اعلیٰ ہے۔ وہ کہتا ہے ''بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو فرمانروا کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں اور اسے عام رعایا سے ممتاز کرتی ہیں۔ ان میں ایک بات یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو لوگ بھی اسے پسند کرنے لگتے ہیں وہ کسی چیز سے نفرت کرے تو عوام بھی نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ:

''الناس علی دین ملوکھم''[1]

اس لئے بادشاہ چاہے تو رعایا کو اچھائی کی راہ پر گامزن کر دے۔ چاہے تو تباہی و بربادی کی راہ پر لے نکلے۔ ابن طقطقی بادشاہ کی اولین صفت عقل بتاتا ہے کیونکہ اس کے بغیر بادشاہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ کم عقل بادشاہ اس عہدے کے قابل ہی نہیں ہے۔

عدل بادشاہ کے لئے دوسری لازمی شرط ہے عدل سے مملکت اور عوام دونوں دولت مند ہو جاتے ہیں۔ عدل کے بارے میں ابن طقطقی نے رضی الدین علی بن طاؤس کی مثال پیش کی ہے بغداد پر قبضہ کے بعد ہلاکو نے علماء سے پوچھا کہ ''کون بہتر ہے۔ انصاف کرنے والا کافر بادشاہ یا جابر سلطان''؟ علماء جواب جانتے تھے مگر ہچکچا رہے تھے تو رضی الدین علی بن طاؤس نے فتویٰ لکھا اور سب سے پہلے اس پر خود دستخط کر دیئے۔ ان کے بعد دیگر تمام علماء نے بھی فتویٰ پر دستخط کر دئے۔ فتویٰ تھا ''کافر عادل غیر عادل مسلمان سے بہتر ہے''[2]

ابن طقطقی نے بادشاہ کے لئے علم و فضل کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ کیونکہ علم بادشاہ کو غلطیوں کے ارتکاب سے روکتا ہے نیز علم ہی اسے رعایا میں محترم بنا دیتا ہے بنیادی طور پر وہ بادشاہ کے لئے اتنا علم ہر حال میں نہایت ضروری خیال کرتا ہے۔ کہ کسی بھی علم پر عبور رکھنے والے عالم سے اس بارے میں بات کر سکے اور اپنی رائے پیش کر سکے۔

بادشاہ کے لیے خدا سے خائف رہنے کی ہر وقت ضرورت ہے۔ اسی میں فضیلت ہے اور اسی میں بادشاہ کے لئے کامیابی ہے۔ ابن طقطقی نے بادشاہ کے لئے رعب و دبدبہ کو بھی ضروری قرار دیا ہے تاکہ رعایا ہی نہیں بلکہ بیرون ملک دشمن بھی اس سے خائف و مرعوب رہ سکیں۔

تدبر کو ابن طقطقی نے نہایت ضروری وصف قرار دیا ہے کیونکہ بادشاہ کا اصل سرمایہ ہی تدبر ہے۔ ابن طقطقی نے بادشاہ کے لیے ایفائے عہد کو ضروری قرار دیا ہے۔ اگر بادشاہ ایسا نہیں کرتا تو وہ لوگوں میں کم ظرف کہلاتا ہے وہ کوئی وعدہ عوام سے کرے، یا معاہدہ دشمن سے کرے اس پر لازم ہے کہ اس کا پاس کرے۔

یہ وہ مثبت صفات ہیں جنہیں ابن طقطقی نے ایجابی اوصاف کہا ہے دیگر صفات کو وہ سلبی صفات کا نام دیتا ہے۔

فرمانروا کو جو چیز زیب نہیں دیتی اور جسے ترک کرنے سے ہی اس کا فضل تکمیل حاصل کرتا ہے وہ یہ ہے کہ فرمانروا بلند ہمت ہو، کشادہ دل ہو، قیادت سے اسے محبت ہو اور اس کے اسباب مہیا کرنے کی فکر میں لگا رہے اور اس مطمع نظر کے ساتھ اپنی مملکت کی توسیع اور وقار بلند کرنے کی دھن میں لگا رہے تعیش میں نہ پڑا رہے۔ آسودہ حالی میں حد سے تجاوز نہ کرے اور لذات میں انہماک نہ رکھے۔[3]

---

1. ابن طقطقی ''الفخری الاداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ'' (مترجم محمد جعفر)، ص: ۲۹
2. ابن طقطقی، الفخری، ص: ۱۸
3. ایضاً، ص: ۴۵

ابن تیمیہ: ساتویں صدی ہجری تاریخ اسلام کا تاریک ترین زمانہ ہے اسی صدی میں عباسی خلافت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو گیا۔ جس کے باعث مسلمانوں کی رہی سہی مرکزیت ختم ہو گئی اور خون خوار تاتاری عذاب الٰہی بن کر عالم اسلام پر چھائے رہے جن کے ہاتھوں متعدد سلطنتیں صفحۂ ہستی سے مٹ گئیں تباہی و بربادی کے اس دور نے مسلمانوں میں لاتعداد بدعات اور تفرقوں کو جنم دیا۔ قرآن مجید میں عجیب وغریب تاویلیں پیش کی جانے لگیں تا کہ فلسفیانہ تصورات اور اللہ و رسول ﷺ کے فرمودات میں مطابقت کی راہ نکالی جا سکے۔ اسلامی اصولوں میں ایسی موشگافیاں کی جانے لگیں کہ ان کا سمجھنا عوام کے لئے تو درکنار خواص کے لئے بھی بہت مشکل ہو گیا اللہ کی مرضی ہمیشہ یہی رہی ہے کہ وہ ایسے حالات میں کوئی مجدد و مصلح ایسا پیدا کرتا ہے جو غیر معمولی جرأت و ہمت اور خداداد قابلیت سے کام لے کر معاشرے میں ایک ایسا عظیم انقلاب برپا کرتا ہے اسی انقلاب سے وہ لوگوں کے عقائد کی اصلاح کر کے ان میں قوت عمل کو ایک بار پھر زندہ کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ کی رضا سے مسلمانوں کو اس موذی مرض سے نجات دلانے کے لئے حرّان کے مقام پر شیخ احمد تقی الدین ابوالعباس احمد امام ابن تیمیہ کی ولادت باسعادت ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ کو ہوئی۔ جس نے ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے نہ صرف قلم کا جادو جگایا بلکہ اس کے کلام میں جادو قلم میں زندگی اور تلوار میں بجلی بھری ہوئی تھی۔[۱]

امام تقی الدین ابوالعباس احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام ابن تیمیہ الحرانی الدمشقی (۶۶۱۔۷۲۸) (۱۲۶۶۔۱۳۲۷) بلاشبہ اپنے زمانے کے ایک جلیل القدر مجتہدانہ امام تھے۔ انہوں نے نہ صرف قرآن وحدیث وفقہ واصول وعقائد پر عبور حاصل کیا تھا بلکہ اپنے زمانے تک کے عقلی علوم، علم الکلام وفلسفہ ومنطق وتصوف میں بھی پوری مہارت حاصل کی تھی۔ اسی لئے شیخ بدرالدین ماردینی نے اپنے مرثیے میں ان کی تعریف کرتے ہوئے ٹھیک ہی لکھا تھا۔

> ''یعنی وہ علوم کا سمندر اور ہر بزرگی کا خزانہ ہیں وہ دہر میں یکتا اور زمانے کے امام ہیں۔ اگر وہ آٹھویں صدی میں سب سے پیچھے آئے تو کیا ہوا۔ مگر وہ علوم میں سب سے آگے ہو چکے ہیں۔ اور وہ سب کے امام ہیں''[۲]

امام ابن تیمیہ ایک حنبلی خاندان میں پیدا ہوئے مگر فقہی مسائل میں انہوں نے اس کی اتباع کی جو انہیں سب سے اچھا معلوم ہوا۔[۳] قرأت خلف الامام کے مسئلہ میں ان کے دادا نے فتویٰ دیا تھا کہ جہری نماز میں مقتدی کو سورۂ فاتحہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سری نماز میں نہ صرف سورۂ فاتحہ پڑھے بلکہ ضم سورہ بھی کرے۔ کیونکہ چپ کھڑے رہنے سے قرآن کا پڑھنا بہتر ہے۔

ان کی بے شمار تصانیف میں سے ایک تصنیف حکومت وسیاست کے بارے میں بہت مقبول ہوئی۔ جس کا نام الامامۃ والسیاسۃ ہے۔ اور دوسری کتاب جس نے شہرت پائی اس کا نام ''السیاست الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعایا'' ہے۔ انہوں نے ایک کتاب سیاسی و مذہبی منہاج النبوۃ تحریر کی جس میں سیاست بھی زیر بحث آئی۔ اہل تشیع کے عقائد کی تردید بھی کی وہ صرف کتاب وسنت پر ہی مسلمانوں کو عمل کرتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔[۴] یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف میں جدت وانفرادیت ہے۔ تحریر کی زبان سادہ سلیس اور آسان ہے۔ جہاں عقائد کی تردید کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہاں ان کا انداز بیان بہت بلند ہو جاتا ہے۔ اور ثبوت پر ثبوت اور دلیل پر دلیل دیتے چلے جاتے ہیں جو عقلی اور نقلی

---

۱ یوسف کوکن عمری، ابن تیمیہ، ص: ۵۵
۲ ضیاء الحسن فاروقی، فکر اسلامی کی تشکیل جدید، ۳۱۴
۳ محمد یوسف کوکن عمری، ابن تیمیہ، ص: ۷۴
۴ محمد یوسف کوکن عمری، ابن تیمیہ، ص: ۴۹۱

بھی ہوتی ہے۔ جن کے سامنے بڑے سے بڑے حریف کو سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے کہیں طنز کا گہرا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔

آج سے چودہ سو سال پہلے جس دین کی بنیاد حضور اکرم ﷺ نے رکھی تھی۔ ان کے بعد خلافت راشدہ اس پر کاربند رہے لیکن ان کے بعد جو بھی لوگ حکمران بنتے چلے آئے۔ احکام شرعیہ سے دور ہی ہوتے چلے گئے۔ جوں جوں حکمران شرعی قوانین سے دور ہوتے گئے اسی رفتار سے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے اس لئے ایسے سیاسی مفکرین جنہوں نے اپنے نظریات کی بنیاد ہی شرعی قوانین پر رکھی ان کے لئے یہ بات بڑی مشکل تھی کہ وہ اسلامی شرعی قوانین اور اس زمانے کے حالات میں مطابقت کیسے پیدا کریں یہاں آ کر ہی بہت سوں نے ٹھوکر کھائی اور حکمرانوں کی صفات اور ان کے فرائض کی لمبی چوڑی فہرستیں مرتب کر دیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ جو حاکم وقت اپنے فرائض منصبی بہتر طور پر نہیں سنبھالتے تھے۔ ان کی اصلاح کے لئے کچھ بھی نہ کرتے یہی مشکل مرحلہ ابن تیمیہ کو بھی پیش آیا۔ لیکن انہوں نے اپنی تمام تر توجہ شرعی احکامات کی تشریح و توضیح میں صرف کر دی۔

ابن تیمیہ کسی صورت میں بھی سیاست کو دین سے جدا نہیں کرتے لیکن ان واشگاف الفاظ کے ساتھ ابن تیمیہ سیاست اور مذہب کو مختلف افراد کے سپرد کرنے کے حق میں ہیں اور انہیں اولی الامر قرار دیتے ہیں۔ اگر رعایا کے یہ دونوں طبقے درست ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ عوام سکھ کی نیند نہ سوئیں اور انہیں خوشحالی نصیب نہ ہو۔ بلکہ وہ ان دونوں طبقوں میں تعاون کی خاطر انہیں تاکید کرتے ہیں کہ۔ ہر قول و فعل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا پورا پورا اہتمام کریں۔ بلکہ وہ مشکل وقت میں تاکید کرتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو جہاں تک ممکن ہو اس پر عمل پیرا ہوں۔ وہ کہتے ہیں جہاں تک ممکن ہو وہاں تک احکام شرعیہ پر عمل پیرا ہوں۔

مفکرین میں سے کسی نے بھی امام کی تفصیل اس طرح بیان نہیں کی جیسے کہ ابن تیمیہ نے تحریر کی ہے وہ 'السیاست الشرعیہ' میں لکھتے ہیں کہ چونکہ انسانوں کو اپنی حاجات میں ایک دوسرے سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور اجتماع کے بغیر بنی آدم اپنی حاجتیں اور مصلحتیں پوری نہیں کر سکتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اجتماع کی حالت میں عوام پر کوئی حاکم یا آمر موجود ہو۔ یہ قدرتی تقاضا ہے کیونکہ حاکم اس معاشرے کا نگران اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ابن تیمیہ اس حدیث کا حوالہ دیتے ہیں [۱]

"جب تین آدمی سفر کو نکلیں تو ان کو چاہیے کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں" [۲]

وجوب امام کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر یا دوسرے لفظوں میں تبلیغ کو واجب قرار دیا ہے۔ اور یہ فریضہ قوت اور امارت کے بغیر انجام نہیں دیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر حج کرنا، جہاد کرنا، نماز جمعہ، نماز عیدین پڑھنا، انصاف کرنا، غریب و مساکین کی خبر گیری کرنا یہ سب حاکم یا امام کے بغیر ناممکن ہیں۔

روایت ہے "سلطان زمین پر خدا کا سایہ ہے" [۳] اور کہا گیا ہے کہ ساٹھ برس جابر و ظالم سلطان کا ہونا زیادہ مناسب اور اصلح ہے ایک رات بغیر سلطان کے گزارنے سے۔ اور تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ بلا سلطان زندگی گزارنے سے ظالم بادشاہ، جابر سلطان کا وجود زیادہ مناسب ہے۔ [۴]

ابن تیمیہ کے نزدیک امام کا انتخاب کرنا کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے وہ اپنے زمانے کے سلاطین کو بھی جائز قرار دیتے ہیں۔ اور امت کیلئے ان کی اطاعت کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ تاکہ اصلاح دین میں کسی قسم کا خلل واقع نہ ہو۔ تاہم انتخاب کے بارے میں کہتے ہیں کہ امام کا انتخاب نازک عہدے پر تقرر کا سوال ہے یہ ان کے خیال کے مطابق یہ کہ امام کا تقرر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ عوام تو محض اس کے انتخاب کا ذریعہ ہیں۔

۱　ابن تیمیہ، السیاسۃ الشرعیۃ، ص: ۱۸۷
۲　مسلم، الجامع الصحیح (بشرح نووی) ۱۲/۲۲۹
۳　شیخ علی المتقی، کنز العمال، حدیث رقم: ۱۴۵۷۶
۴　ابن تیمیہ۔ السیاسۃ الشرعیۃ، ص: ۲۸۸

خواہ امام کسی بھی طریق سے برسر اقتدار آیا ہو لیکن اس کا قرآن وسنت کے راستوں پر گامزن ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کے ظاہری اوصاف خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں لیکن دین اور دنیا کیلئے اس کے فرائض کی کماحقہ تکمیل ضروری ہے۔ ایسے امام کے بارے میں انکا خیال ہے کہ ایسا امام عوام کے لئے باعث رحمت ہوتا ہے۔ اگر امام کا انتخاب اس کے برعکس کیا جائے تو بجائے عوام کو فائدہ پہنچانے کے الٹا عوام کے لئے مصیبت کا باعث بن جاتا ہے۔ جو حکومت وعوام کے لئے نقصان دہ بھی ثابت ہوتا ہے۔

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

ریاست وامارت اور سرداری کے طالب کی انتہا فرعون جیسی ہوتی ہے اور مال جمع کرنے والے کی حالت قارون کی سی ہوتی ہے۔[۱]

خدا نے قرآن حکیم میں فرعون اور قارون کا حال بیان کیا ہے۔

اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبة الذین کانوا من قبلھم کانوا ھم اشدّ منھم قوة واٰثاراً فی الارض فاخذھم الله بذنوبھم و ما کان لھم من الله من واق[۲]

''اور کیا ان لوگوں نے ملک میں چل پھر کر نہیں دیکھا کہ جو لوگ اس سے پہلے ہو گزرے ہیں ان کا کیا انجام ہوا وہ لوگ کیا بل بوتے کے اعتبار سے اور کیا ان نشانوں کے اعتبار سے جو زمین پر چھوڑ گئے ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھے جو خدا نے ان کو ان کے گناہوں کی سزا میں پکڑا اور ان کو خدا سے بچانے والا کوئی نہ تھا''

ابن تیمیہ نے امام کے فرائض پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی ہے لیکن امام کے فرائض میں سے پہلا فرض اس امانت کی نگہداشت ہے جو بطور حکومت اس کے سپرد کی گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ولایت اور حکومت ایک امانت الٰہی ہے۔ امانت میں خیانت نہ کرے۔ جس کا ادا کرنا اس کے مواقع ومحل میں واجب ہے۔

ایک اور جگہ پر آپؐ نے فرمایا:

> ''کوئی شخص ایسا نہیں جس کو احکم الحاکمین نے کوئی حکمرانی بخشی ہو اور وہ ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہو کہ رعیت سے خیانت کرتا رہا ہو اور خالص اور بے لوث خیر خواہی نہ کی ہو تو حق تعالیٰ اس پر قیامت کے دن جنت کی خوشبو حرام کر دے گا''۔[۳]

ابن تیمیہ مذہبی فرائض کی بجا آوری پر بہت زور دیتے ہیں۔ وہ راعی اور رعایا کو اسی بات کی تاکید کرتے ہیں۔ کہ شریعت کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہ کریں اور اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کسی قسم کی کوتاہی کو روا نہ رکھیں۔ وہ قیام امن کو اہم ترین بتلاتے ہیں جس کے بغیر اخروی فلاح کا حصول ہی محال ہے۔ اس لئے وہ عوام کو مشورہ دیتے ہیں کہ امن وامان کی خاطر ہر قسم کے فرمانرواؤں کی اطاعت کریں۔ خواہ وہ قانونی طور پر برسر اقتدار آئے ہوں۔ یا ناجائز ذرائع سے انہوں نے حکومت حاصل کی ہو۔ اگر وہ معصیت الٰہی کا حکم دیں تو اس حکم کا ماننا رعایا پر فرض نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود بغاوت کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

ابن تیمیہ ظالم حکام کے حقوق کی ادائیگی کا بھی رعایا کو حکم دیتے ہیں اور رسول ﷺ کا یہ ارشاد گرامی پیش کرتے ہیں ''ان کے حقوق ادا کرو اللہ تعالیٰ ان سے اس سلوک کے متعلق خود باز پرس کرے گا جو انہوں نے رعایا کے ساتھ کیا ہوگا''۔

---

۱ ابن تیمیہ۔ السیاسۃ الشرعیۃ، ص: ۲۹۰　۲ المومن، ۴۰/۲۱　۳ البخاری، الجامع، حدیث رقم: ۶۶۱۸

راعی پر رعایا کے حقوق ابن تیمیہ کے نزدیک ادائے امانت اور قیام عدل ہیں وہ سورہ نساء کی یہ آیت پیش کرتے ہیں۔

ان اللـه یأمر کم ان تودوا الامنت الیٰ اھلھا واذاحکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان الله نعما یعظکم به ان الله کان سمیعاً بصیراً [۱]

''اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں ان کے مالکوں کو لوٹا دو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو اللہ تعالیٰ تم کو اچھی نصیحت کرتا ہے بے شک اللہ تعالیٰ سننے اور دیکھنے والا ہے۔''

اور کہتے ہیں کہ اس آیت میں راعی پر رعایا کے حقوق کی نشاندہی کی گئی ہے کہ فرمان رواؤں کو رعایا کی جان و مال کا امین بنایا گیا ہے اس لئے ان کو چاہئے کہ رعایا کی امانتیں ان کے حوالے کردیں۔ اور دوسرے یہ کہ جب وہ لوگوں کے نزاعوں کا فیصلہ کریں تو عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں اس کے بعد ایک آیت میں رعایا کے فرائض بتلائے گئے ہیں کہ:

یا ایھاالـذین اٰمنوا اطیعواالله واطیعو الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شئیٍ فردوه الی الله والرسول ان کنتم تومنون بالله والیوم الاخر ذالك خیر و احسن تاویلا [۲]

''اے ایمان والو! اللہ کا حکم مانو اور رسول اللہ کا حکم مانو اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں اگر جھگڑا ہو جائے تمہارے درمیان کسی امر پر تو تم اللہ اور رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔ اگر تم واقعی اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ بات اچھی ہے اور اس کا انجام بہتر ہے''۔

حکمران کے فرائض تو جو ہیں وہی رہیں گے لیکن انکے علاوہ بھی ایک فرض حکمران پر عائد ہوتا ہے وہ ہے حاکم کا کردار اور اخلاق اس کا اخلاق و کردار بلند ہونا چاہیے۔ چند اخلاق ایسے ہیں جن کا بلند رکھنا اس کے لئے ضروری ہے جن میں مشکلات میں صبر سے کام لینا۔ غصہ کے وقت غصہ کو پینا۔ لوگوں کو معاف کرنا غرور و تکبر سے بچنا خاص اوصاف ہیں لیکن ابن تیمیہ کے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ انتخاب کے وقت بھی اس میں یہ اوصاف پائے جاتے ہوں البتہ انتخاب کے بعد اسے ان اوصاف کو ضرور اپنانا چاہیے ان اوصاف میں جرأت وسخاوت کی اہمیت پر ابن تیمیہ نے بار بار تفصیل سے بیان کیا ہے جسے وہ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں۔

''خلق خدا کی رعایت اور لوگوں کی سیاست عطا' بخشش اور عالی حوصلگی کے بغیر ممکن نہیں ہوتی بلکہ ان کے بغیر دنیا کی اصلاح بھی مشکل ہے یہی وجہ ہے کہ جو حکمران ان دونوں اوصاف سے متصف نہ ہوں اس سے حکومت اور عمل داری چھین کر دوسرے کے حوالے کردی جاتی ہے۔

علاوہ ازیں ابن تیمیہ والیان حکومت کو مشورہ دیتے ہیں کہ ملک کے متعلقہ امور کی انجام دہی نصرت الٰہی کے بغیر ممکن نہیں۔ اس کے حصول یابی کے تین طریقے ہیں۔ پہلا یہ کہ تمام کام ہی اللہ کے لئے کئے جائیں اور دعا کے لئے اللہ ہی پر بھروسہ کیا جائے۔ اور پانچ وقت کی نماز پابندی سے ادا کرے۔ دوسرا رعایا کو نفع پہنچایا جائے۔ اور ان پر احسان کیا جائے۔ اور زکواۃ غریبوں کو دے کر ان کی دست گیری کی جائے۔ تیسرا اور آخری یہ کہ مصیبتوں اور تکلیفوں میں صبر کرنا چاہیے۔

ابن خلدون: ابن خلدون کی تاریخ ولادت یکم رمضان ۷۳۲ھ مطابق ۲۷مئی ۱۳۳۲ء ہے ابتدائی تعلیم دستور کے مطابق اپنے والد محمد سے حاصل کی پھر قرآن مجید حفظ کیا۔ حدیث وفقہ کے علاوہ عربی زبان وادب میں مہارت تامہ حاصل کی۔ سترہ سال کی عمر میں والدین اس طاعون سے فوت ہو گئے جس نے افریقہ کے اکثر ممالک کو ویران کر کے رکھ دیا۔ اس کے بعد بھی ابن خلدون نے تین سال تک اپنی تعلیم جاری رکھی اور بیس سال کی عمر میں وہ فارغ التحصیل ہو گیا۔ [۳]

---

[۱] النساء۴/۵۸　[۲] النساء۴/۵۹　[۳] Hamid A.K. Rai, History of Political Philosophy, P.676

ابن خلدون نے سلطان ابو اسحاق دوم کی ملازمت اختیار کر لی۔ شاہی فرامین و احکامات پر طغریٰ درج کرنے کا کام اس کے سپرد ہوا۔ یہ عہدہ ''کتابت علامت'' کہلاتا تھا۔ پھر ابن خلدون مراکش چلا گیا۔ جہاں وہ سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوا۔ بعد ازاں پھر طیونس آ گیا طیونس کے بادشاہ نے اس کی خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اس زمانے میں ابن خلدون نے سیاست سے بالکل کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں ہمہ تن مصروف ہو گیا۔ طیونسی علماء نے ابن خلدون کی موجودگی کو اپنے لئے خطرہ سمجھا۔ اس لئے اس کو جلا وطن کرنے کی غرض سے سازشیں شروع کر دیں۔ اور اس کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے لگے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ابن خلدون کو طیونس چھوڑ دینے ہی میں اپنی خیر دکھائی دی اور وہ بادشاہ سے حج کے بہانے سے اجازت لے کر قاہرہ پہنچا۔ اس وقت اس کی عمر ۵۲ سال تھی۔ مصر میں بھی ابن خلدون کے حریفوں کی بڑی تعداد پیدا ہو گئی جس نے اسے کبھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ وہ سات آٹھ مرتبہ قضاء کے عہدے پر بھی فائز ہوا۔ لیکن ہر بار حاسدوں کی ریشہ دوانی اس کے عزل کا باعث بنی۔

ابن خلدون کی تصانیف کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ فلسفہ و منطق، فقہ و ادب حتیٰ کہ ریاضی پر بھی اس نے کتابیں لکھیں۔ منطق پر ایک رسالہ لکھا۔ ابن رشد کی کتابوں کی تلخیص کی۔ لیکن ان کتابوں کے نام ہی مل سکتے ہیں کیونکہ یہ کتابیں زمانے کے ہاتھوں ضائع ہو گئیں [۲] البتہ اس کی شہرہ آفاق تاریخ، تاریخ العبر موجود ہے۔ یہی کتاب ہے جس پر ابن خلدون کی شہرت کا انحصار ہے اس میں آفرینش عالم سے لے کر آٹھویں صدی کے اختتام تک عرب بربر اور دیگر اقوام کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ تاریخ العبر سے پہلے ایک حصہ بطور مقدمہ لکھا گیا ہے جو ''مقدمہ ابن خلدون'' کے نام سے چار دانگ عالم میں مشہور ہوا۔ اس مقدمہ میں مطالعۂ تاریخ کے اصول بتلائے گئے۔ اور تمدن و معاشرت کی ترقی و زوال کے اسباب سے بحث کی گئی ہے۔ مقدمہ، ابن خلدون کے سیاسی افکار کا بہترین ذخیرہ ہے۔

ابن خلدون دیگر مسلم مفکرین کی طرح (بجز فارابی کے) انسانی معاشرہ کو اقتضائے فطرتِ انسانی کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اور اسے ''مجتمع'' کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔ وہ ہابس کے برخلاف سلامتی اور امن کی ضرورت پر مجتمع کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اس کی ضروریاتِ زندگی کی نوعیت ہی کچھ اس طرح کی ہے کہ وہ تنہا اس کے حصول کے لیے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے مگر پوری نہیں کر سکتا ہے۔ اور الگ تھلگ رہنے کے لئے لاکھ جتن کرے لیکن اس میں کامیابی ممکن نہیں۔

انسانی ضروریات کے علاوہ اجتماع انسانی کا محرک ابن خلدون کے نزدیک دفاع بھی ہے وہ کہتا ہے کہ حیوانات اپنی مدافعت آپ کر سکتے ہیں قدرت نے ان کی جسمانی ساخت کچھ اس قسم کی رکھی ہے۔ کہ حملوں سے اپنی حفاظت کر سکتے ہیں۔ ان کی موٹی کھال، سینگ پنجے اور ناخن آلاتِ حرب کا کام دیتے ہیں۔ جبکہ انسان ان تمام چیزوں سے محروم ہے۔ اسے ان کے بدلے میں دو چیزیں عطا ہوئی ہیں ایک ہاتھ اور دوسری عقل ان دونوں کی مدد سے وہ آلات تیار کرتا ہے محض آلات اسے حملوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا اس لئے وہ ایسے گروہ کا محتاج ہے۔ جس کے ساتھ مل کر دفاع کر سکے۔

ابن خلدون کا یہ بھی کہنا ہے کہ انسانی اجتماع ضروری ہے کیونکہ ان کے بغیر انسان کا وجود نامکمل ہے نیز خداوند تعالیٰ کی یہ مشیت ہے کہ روئے زمین کو بنی نوع انسان کے ذریعے آباد کرے۔

ابن خلدون صرف مجتمع کی ضرورت اور اس کے وجود کے اسباب سے بحث نہیں کرتا۔ بلکہ ان عوامل کا بھی ذکر کرتا ہے جو مجتمع پر اثر انداز ہوتے ہیں اس کے نزدیک جغرافیائی حالات سب سے زیادہ انسانی معاشرہ کو متاثر کرتے ہیں۔ ابن خلدون قدیم جغرافیہ دانوں کی طرح کرہ ارض کو سات اقالیم میں منقسم کرتا ہے اس کا دعویٰ ہے کہ اقلیم اول و ہفتم بہت زیادہ سرد اور بے حد گرم ہونے کے باعث غیر آباد ہیں۔ اس

---

۲ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص: ۲۰۱

لئے انسانی آبادی اور تمدن کا گہوارہ نہیں بن سکتے۔ البتہ اقلیم سوم و پنجم نسبتاً معتدل ہیں اور سب سے زیادہ معتدل اقلیم چہارم ہے۔ اسی لئے یہ اقلیم سب سے زیادہ آباد ہے۔ اور علوم وفنون، تمدن وثقافت، صنعت وحرفت کا ہی گہوارہ ہے۔ ایک طرف قدرت نباتات کی فراوانی میں بے حد فیاض ہے تو دوسری طرف انبیائے کرام کا مہبط بھی یہی خطہ ہے۔ ابن خلدون کا دعویٰ ہے کہ جنوب کے بے حد گرم اور شمال کے بے حد سرد خطوں میں ایک بھی پیغمبر مبعوث نہیں ہوا۔ یہ خطے تمدنی لحاظ سے بے حد پسماندہ اور اخلاقی اعتبار سے گھٹیا ہیں۔

ابن خلدون کا یہ بھی خیال ہے کہ مسائل کی کمی وزیادتی بھی معاشرے پر بہت اثر انداز ہوتی ہے۔ وسائل زندگی کی کثرت انسانی جسم و دماغ پر برا اثر ڈالتی ہے۔ ایسے لوگوں میں ذہن کی صفائی ونفاست نہیں پائی جاتی۔ جہاں وسائل کم ہوں وہاں کے باشندوں کو زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ وہ محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ ذہن میں نکھار اور اخلاق میں پاکیزگی ہوتی ہے۔ ابن خلدون اس کی توجیہہ یہ بیان کرتا ہے کہ کھانے پینے کی زیادتی فاسد رطوبت پیدا کرتی ہے جو جسم وذہن پر اثر ڈالتی ہے۔

ابن خلدون کہتا ہے کہ نظام کے اعتبار سے کوئی قبیلہ کتنا ہی سادہ کیوں نہ ہو لیکن اس میں بھی حکومت کے حصول کی قدرتی خواہش ہوتی ہے۔ اسی خواہش پر حکومتیں قائم ہوتی ہیں اور مجتمع وجود میں آتا ہے یہی خواہش قبیلہ کا دفاع کرتی ہے اور اسے فتح اور جنگ پر آمادہ کرتی ہے ابن خلدون قبائل کی اسی خواہش یا خاصہ کو عصبیت کا نام دیتا ہے۔[1]

ابن خلدون کا دعویٰ ہے کہ اہل بادیہ یعنی دیہات میں عصبیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ کیوں کہ اس کے ذریعے سے بدوی قبائل بیرونی حملوں سے اپنی مدافعت کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ شہری آبادی میں فتنہ وفساد روکنے کے احکام ہوتے ہیں۔ جو داخلی بدامنی سے مجتمع کو محفوظ رکھتے ہیں اور بیرونی حملوں کے لئے فوج ہوتی ہے۔ ابن خلدون کے نزدیک عصبیت نسب ورشتہ کے علاوہ دین کے ذریعے بھی حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ دینی عصبیت قبائلی ونسبی عصبیت کے مقابلے میں زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ سیاست وتمدن میں زبردست تعلق ہے جس قدر عصبیت قوی ہوگی عیش کی زندگی بسر کرنے کی خواہش ہی اتنی ہی شدید ہوگی۔

خلافت کے بارے میں ابن خلدون کا کہنا ہے کہ خلیفہ اللہ کا نہیں بلکہ رسول کا نائب ہوا کرتا ہے۔ ابن خلدون ان لوگوں سے بھی اختلاف کرتا ہے کہ جو خلافت کو مطلوب بالسنات نہیں کہتے بلکہ اسے قیام عدل اور نفاذ احکامات شرعیہ کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ انتخاب خلیفہ کے طریقہ پر ابن خلدون نے اظہار خیال کیا ہے وہ اس انتخاب میں عوام کو رائے دینے کا حق نہیں دیتا اس کا کہنا ہے کہ خلیفہ کے انتخاب میں صرف ارباب حل وعقد ہی حصہ لے سکتے ہیں۔ عوام پر خلیفہ کے احکام کی پیروی فرض ہے۔ انہیں خلیفہ کے تقرر سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے۔

ابن خلدون کے نزدیک خلیفہ میں چار صفتوں کا پایا جانا اشد ضروری ہے۔

۱۔ علم ۲۔ عدالت ۳۔ کفایت ۴۔ اعضاء وحواس کی سلامتی

علم کے سلسلے میں وہ ماوردی کا ہم نوا ہے۔ ابن خلدون نے بھی خلیفہ کے علم کا معیار اجتہاد واستنباط قرار دیا ہے۔ وہ امام غزالی سے اس امر میں اختلاف کرتا ہے کہ جو خلیفہ میں مجتہدانہ صلاحیت کو ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔ ابن خلدون خلیفہ کے دامن کو تقلید کے داغ سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک تقلید ایک بڑا عیب ہے۔ عدالت سے مراد خلیفہ کی عملی اور نظری زندگی کا اسلامی اصول کے مطابق ہونا ہے۔ ابن خلدون نہ تو خلیفہ کو غیر شرعی کاموں میں مشغول رہنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ اس کے خیالات واعتقادات میں بدعت کی راہ پالینے کو برداشت کرنے کے لئے تیار نظر آتا ہے۔ کفایت سے ابن خلدون کی مراد خلیفہ کا ایسی مادی اور روحانی قوتوں کا مالک ہونا ہے۔ جو عوام کو اس کی عزت

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، ص: ۱۰۷

کرنے پر آمادہ کریں خلیفہ کا شجاع اور دلیر ہونا ضروری ہے تاکہ سرحدات کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اقامت حدود پر قدرت رکھے جنگ میں وہ نہ صرف حصہ لے سکے بلکہ فنون جنگ میں مہارت تامہ بھی رکھتا ہو۔ سیاست کا ماہر ہو، سیاست دانوں کی بڑی سے بڑی چال کو سمجھ سکتا ہو اور اس کا جواب دینا جانتا ہو۔ خلیفہ کے لئے سلامتی حواس واعضاء کو بھی ابن خلدون ایک ضروری وصف قرار دیتا ہے۔ اگر اس قسم کا کوئی نقص خلیفہ میں ہوگا تو وہ اپنے فرائض منصبی سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ ابن خلدون وہ پہلا مفکر ہے جس نے ایک ہی وقت میں دو یا دو سے زائد خلفاء کے وجود کو جائز قرار دیا ہے۔ اس سے پہلے تمام مفکرین اس بات کے معتقد تھے کہ پوری مملکت اسلامیہ ایک ہی خلیفہ کے زیر فرمان ہونی چاہیے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ خلافت اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک لوگوں کے دلوں میں دین کا احترام باقی رہے۔ لیکن یہ احترام ہمیشہ نہیں رہتا۔[1]

شاہ ولی اللہ: شاہ قطب الدین المعروف شاہ ولی اللہ ۱۷۰۳ء (مطابق ۱۱۱۴ھ) میں دلی کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو علم وفضل اور صداقت میں مثالی تھا۔ آپ کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم معروف عالم تھے۔ اور دلی میں مدرسہ رحیمیہ (جو انہوں نے خود قائم کیا تھا) میں درس دیتے تھے۔ جب شاہ ولی اللہ کی پیدائش ہوئی تو حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ نے خواب میں ان کے والد شاہ عبدالرحیم کو بشارت دی۔ اسی کے تحت آپ کا نام شاہ قطب الدین رکھا گیا۔ پانچ سال کی عمر میں شاہ ولی اللہ نے اپنے والد ہی سے ابتدائی تعلیم اور قرآن کا سبق لینا شروع کیا۔ سات سال کی عمر میں وہ حافظ قرآن ہو گئے۔ پندرہ سال کی عمر میں وہ فلسفہ، منطق، حدیث، فقہ، ریاضی، ادب، طب اور کلام جیسے علوم حاصل کر چکے تھے۔ اسی سال انہوں نے اپنے والد کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔ ۱۷ برس کے ہوئے تو ان کے والد وفات پا گئے اور مدرسہ رحیمیہ کا چارج انہوں نے سنبھال لیا۔ آپ کا وصال چالیس سال کی عمر میں ۱۷۶۳ء (مطابق ۱۱۷۶ھ) میں ہوا۔

شاہ ولی اللہ نے بڑے پُر آشوب دور میں زندگی گزاری۔ تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ ہندو پاک کے مسلمانوں کو جب بھی مصائب سے دوچار ہونا پڑا اور اسلام کے دشمنوں نے سر اٹھایا اور بچ نکلنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تو حضرت عمر فاروقؓ کی اولاد ہی نے کمر ہمت باندھی اور مسلمانوں کو عذاب سے بچایا ایک بار جب شہنشاہ اکبر نے دین الٰہی کا فتنہ اٹھایا تو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اصلاح احوال کے لئے جہاد کیا اور دوسری بار اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد جب حکومت کا چراغ ٹمٹمانے لگا، سکھوں اور مرہٹوں نے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ ادھر انگریزوں اور فرانسیسیوں نے قدم جمائے۔ اس وقت بھی مسلمان ایرانی و تورانی کے چکر میں ایک دوسرے کے خون میں ہاتھ رنگ رہے تھے۔ فرقہ پرستی عام تھی اور علماء مسلمانوں میں تفرقہ سے پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مناظرہ روزمرہ کا معمول تھا۔ اس انتہائی بحرانی دور میں فاروقی نسل ہی سے شاہ ولی اللہ میدان عمل میں اترے اور انہوں نے مسلمانوں میں اتحاد پیدا کیا۔ علماء کے خلاف بلا امتیاز مذہب وفرقہ جہاد کیا اور حالات پر قابو پالیا۔ علاوہ ازیں شاہ ولی اللہ نے خطہ پاک وہند میں لاتعداد بحرانی کیفیات کا مشاہدہ کیا۔ اسی لئے مسلمانوں کے عقائد بری طرح مجروح ہو رہے تھے۔ آخر کار شاہ ولی اللہ حقیقتاً مسلمانوں کے لئے ایک نعمت بن کر آئے اور انہوں نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ آپ نے لاتعداد کتب لکھیں۔ آپ نے قرآن کریم کا فارسی ترجمہ "فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن" بھی کیا۔ وہ پہلی شخصیت تھے جنہوں نے کلام اللہ کا ترجمہ دوسری زبان میں کیا۔ مگر کچھ مفاد پرست علماء کو ان کی یہ خدمت ایک آنکھ نہ بھائی۔ اس لئے کہ بعض علماء چاہتے ہی نہ تھے کہ لوگ قرآن کریم اور شرع کو پوری طرح سمجھ سکیں۔ کیونکہ اس طرح علماء کی اجارہ داری ختم ہو سکتی تھی۔ اسی خدمت کے صلے میں شاہ ولی اللہ پر بار بار نہ حملے ہوئے۔ اس کے بعد آپؒ نے فوز الکبیر کے نام سے قرآن کریم کے اصول تفسیر قلم بند کئے۔ تصوف پر آپ نے سطعات، درالثمین، سمعات، القول الجمیل اور لمعات سپردِ قلم کیں۔ حجۃ اللہ البالغہ ان کی وہ مایۂ ناز تصنیف ہے جو آج تک مقبول عام ہے۔ یہ تصنیف سیاست پر ہے

[1] ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون، ۱/۱۶۱

اسی طرح سیاست کے موضوع پر ان کی دوسری تصنیف 'الخیر الکثیر' ہے۔شرع وسیاست پر مخلوط کتاب البدور البالغۃ ہے۔خلافت سے متعلق ان کی ایک زندۂ جاوید تصنیف ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء ہے۔[1]

شاہ ولی اللہ کے مطابق معاشرے اور سیاست کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جونہی اجتماع ہوتا ہے۔یعنی معاشرہ وجود میں آتا ہے اس کے ساتھ ہی حکومت بھی نمودار ہو جاتی ہے۔جس رفتار سے معاشرے کا ارتقاء ہوتا ہے۔اسی رفتار سے سیاسی نظام میں ترقی ہوتی جاتی ہے اور اس میں پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں۔ابتدائے حکومت میں تو ایک ''سردار'' قسم کے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جو لوگوں کی ضروریات کے لئے سامان فراہم کرے اور کمزور کو تحفظ دے سکے۔انسان کی نسل کی بقاء کے لئے ہر مرد کے لئے ایک عورت مخصوص کرے۔ شاہ ولی اللہؒ کے مطابق اسی ''سردار'' میں حوصلہ، قلبی قوت اور قوت فیصلہ کا ہونا ضروری ہے۔ نیز اس کا اپنا عمل ایسا ہو کہ دوسرے اس کی پیروی کر سکیں۔

اس کے بعد مملکت کا قیام عمل میں آتا ہے یعنی مدینہ، مدینہ کا مطلب شہر یا قلعہ نہیں لیتے بلکہ اسے اجتماع کا نام دیتے ہیں ان کے خیال میں دراصل مدینہ ہی انسانی جماعتوں کا نام ہے۔ مدینہ کی تعریف کے بعد شاہ ولی اللہ نے سیاست کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ علم جو اجتماع کے باہمی رابطہ یا تعلق کو مخلوط رکھنے کا طریقہ بتلاتا ہے۔اور چونکہ شہر مختلف جماعتوں سے مرکب ہوتا ہے اس لئے یہ ممکن نہیں کہ تمام اجزا اور افراد اپنے باہمی تعلقات میں عدل وانصاف کو پیش نظر رکھیں اور نہ یہ ممکن ہے کہ قیام امن کے سلسلے میں ان میں سے کسی خاص منصب کے امتیازات حاصل نہ ہوں۔ اس لئے شہری نظم کی درستی کا ایک ہی طریقہ ہے کہ کوئی شخص ایسا ہو جس کی اطاعت پر اربابِ حل وعقد نے سمجھوتہ کر لیا ہو۔ اجتماع میں ایک بڑی تعداد اس کے قیام نظم میں معاون ومددگار رہو۔ یہی شخص سلطان ہوتا ہے۔[2]

شاہ صاحب نے سلطان کے اوصاف تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

۱۔ سلطان بلند اخلاق ہو جس میں نرمی کا ہونا غالب ہو اور وہ احسانات کے ذریعے عوام کو اپنا گرویدہ بنا سکے کیوں کہ احسانات محبت پیدا کرتے ہیں اور محبت کی زنجیریں لوہے کی بیڑیوں سے بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہیں۔اس لئے بادشاہ اپنے عالی اخلاق، کریمانہ اوصاف، عام ہمدردی اور محبت کے ذریعے رعایا کو یہ یقین دلا دے کہ اس کی ذات ان کے لئے نعمت ہے تا کہ وہ ہر ایک کے دل میں گھر کر لے۔ وہ حلیم و بردبار ہو کیوں کہ سلاطین کی تندیٔ مزاج ملک کی بربادی کا باعث ہوتی ہے۔

۲۔ شاہ صاحب بادشاہ کو صرف رحم دل اور حلیم نہیں دیکھنا چاہتے۔ وہ اس میں شجاعت وبہادری کا وصف بھی ضروری سمجھتے ہیں تا کہ وہ دشمنوں کا مقابلہ کر سکے اور رعیت پر رعب قائم رکھ سکے۔

شاہ صاحب مزید فرماتے ہیں کہ انسانوں میں حفاظتِ نفس اور بقائے نسل جیسی حیوانی بنیادی خواہشات کے علاوہ کچھ اس کی خصوصی ضروریات بھی ہوتی ہیں جن سے دیگر حیوانات عاری ہوتے ہیں۔ایسی خواہشات شاہ صاحب کے نزدیک تین ہیں۔

۱۔ کسی اصولی نظریہ پر غور وخوض کرنے کے بعد اس کے لئے جدو جہد کرنے کی قوت صرف انسان ہی میں موجود ہے۔ وہ نقصانات صرف اس لئے برداشت کرتا ہے اور مصائب اس لئے جھیلتا ہے کہ اسے آگے چل کر کوئی بڑا فائدہ پہنچے گویا کوئی نصب العین متعین کر کے اس کے حصول کے لئے کوشش کرنا صرف انسانوں کا خاصہ ہے۔

۲۔ انسان نفاست پسند واقع ہوا ہے۔اس میں عمدگی اور بہتری کی خواہش موجزن ہے۔ وہ بنیادی خواہشات کی معمولی تکمیل پر قناعت

---

[1] صلاح الدین ناسک، افکار سیاسی، مشرق ومغرب، ص:۵۴۶ [2] رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص:۲۳۳

نہیں کرتا بلکہ اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ خوراک ولباس اور بود و باش کی بہتر سے بہتر صورت حاصل ہو سکے۔ اس کی فطرت میں تنوع ہے۔

۳۔ انسانی فطرت میں اشیا کے خواص کی تحقیق کا شوق ودیعت کیا گیا ہے۔ حیوانات اپنی خواہشات کو پورا کرنے کا طریقہ فطری الہامات سے سیکھتے ہیں لیکن انسان کی رہنمائی ان الہامات کے علاوہ عقل و وحی بھی کرتی ہے۔ جن کی مدد سے وہ اپنی خواہشات پوری بھی کرتا ہے اور اس کے لئے نت نئے طریقے بھی تلاش کرتا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں انسانی خصوصیات تعامل وتعاون کو اور بھی لازمی بنا دیتی ہیں۔ یہ بھی انسانی معاشرے کے وجود کا باعث بنتی ہیں۔

سرسید احمد خان: برِ صغیر پاک و ہند صدیوں سے بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ رہا اور غالب ومغلوب کے طویل باہمی تعلقات کے دوررس نتائج مرتب ہوئے لیکن جب مغربی اقوام یہاں وارد ہوئیں اور انگریزوں نے اپنا سیاسی تسلط قائم کر لیا تو جدیدیت اور قدامت پرستی کی یہ دیرینہ کشمکش بامِ عروج تک جا پہنچی۔ اس سے کم وبیش ہر شعبۂ زندگی متاثر ہوا۔ ان حالات میں محکوم افراد تین نمایاں طبقوں میں بٹ گئے۔ کچھ لوگوں نے نئی اقدار اپنانے سے گریز کیا۔ جبکہ کچھ لوگ اپنی بیشتر روایات چھوڑ کر نئے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال بیٹھے۔ افراط وتفریط کے اس عمل کے ساتھ ساتھ ایک ایسا طبقہ بھی سامنے آیا جو متوازن رویہ اختیار کرتے ہوئے درمیانی راستہ اختیار کرتا ہے۔ اس تاریخی موڑ پر سرسید احمد خان جیسی اہم شخصیت منظر عام پر آتی ہے۔ جس کی تمام تر مذہبی، تعلیمی، اصلاحی اور سیاسی کوشش کا مرکز ومحور قدیم وجدید کے امتزاج سے حاکم ومحکوم کے مابین ہر سطح پر بہتر تعلقات استوار کرنا تھا۔[۱]

سرسید ایک متوسط مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت حسینؓ تک پہنچ جاتا ہے۔ سرسید احمد کی تعلیم کی ابتدا قرآن کی تعلیم سے ہوئی۔ پھر انہوں نے دیگر علوم حاصل کئے۔ سرسید نے بے شمار کارنامے سرانجام دیئے۔ ان کی گراں مایہ تصانیف ان کے علمی وادبی کارناموں پر گواہ ہیں۔[۲] سرسید نے اَسّی سال کی عمر میں ۲۸ مارچ ۱۸۹۸ء میں علی گڑھ میں وفات پائی۔

سرسید احمد خان نے مذہب وسیاست کے بارے میں جن نظریات کا اظہار کیا وہ ہمارے لئے باعث حیرت اجنبی اور غیر مانوس ہیں۔ انہوں نے اس ضمن میں خدیو مصر اسماعیل پاشا، تیونس کے وزیر سید خیر الدین اور متعدد دیگر حکومتوں اور شخصیات کے حوالے دیئے ہیں۔ اور تعریف کی ہے کہ انہوں نے سیاست کو مذہب سے الگ رکھتے ہوئے لادینی حکومتیں قائم کیں۔[۳] حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ تنازعات نے مسلمانوں کے اذہان کو بے حد الجھا دیا تھا۔ لہٰذا ایسے میں جن مسلمانوں نے لادینی حکومت قائم کی یا سرسید نے جو نظریات قائم کئے وہ بلاشبہ اس دور کے ماحول کی عکاسی کرتے ہیں۔ سرسید احمد خان خلافت کو حجت شرعی کے طور پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ خلافت کو وہ محض دنیاوی حکومت کے انداز میں لیتے ہیں۔ اور خلیفہ کو خلیفۃ اللہ تسلیم کرتے ہیں نہ کہ خلیفۃ الرسول۔ کیونکہ ان کے خیال میں رسول کریم ﷺ کے بعد کوئی شخص من حیث النبوۃ ان کا جانشین نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا خلفائے راشدین نے بھی اپنی اپنی خلافت کے دوران جو کچھ کیا اس کی ذمہ داری اسلام پر عائد نہیں ہوتی بلکہ خدا کے سامنے خلفاء خود اپنے افعال کے ذمہ دار ہوں گے۔ اسی بنا پر سرسید احمد خان ازروئے دین یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ کسی شخص کی خلافت کو تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ وہ منصف وعادل خلیفہ کی وضاحت یوں کرتے ہیں۔ کہ جو خلیفہ انصاف سے حکومت کرے۔ دینی فرائض میں مداخلت نہ کرے یا مخل نہ ہو حقوق، جان اور مال کو تحفظ دے۔ وہ یقیناً منصف وعادل ہے۔ سرسید حکمران کو اعلیٰ اوصاف سے متصف دیکھنا چاہتے ہیں وہ حکمران میں وہ تمام اوصاف دیکھنا چاہتے ہیں جن سے ذات الٰہی متصف ہے۔ کیونکہ ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ نے اپنی حقیقی

۱۔ سی، ڈبلیو۔ ٹرول (مترجم محمد اکرام چغتائی) سرسید احمد خان، ص: ۷　　۲۔ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص: ۲۵۳

۳۔ رشید احمد، مسلمانوں کے سیاسی افکار، ص ۲۶۱

سلطنت کا نمونہ اس دنیا میں بادشاہوں کی صورت میں پیدا کیا ہے۔ تاکہ لوگ بادشاہ کو دیکھ کر سب سے بڑے بادشاہ اور حکمران حقیقی، یعنی ذات خداوندی کے اوصاف پہچان کر اس کا شکر بجالاسکیں۔ وہ اس قدیم خیال سے اختلاف کرتے ہیں کہ رعایا پر حکمران کی اطاعت فرض ہے۔ اور جو اس کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے۔ انہوں نے سخاوت، عفوودرگزر اور انصاف کو نہایت اہمیت دی ہے۔ حکمران جس قدر سخی ہوگا۔ اس قدر رفائدے اس کے لئے مقدر ہوں گے۔ یوں نہ صرف حکمران طاقتور رہوتا ہے بلکہ عوام کا حوصلہ بھی بلند ہوجاتا ہے۔

سرسید کے زمانے میں مسلمانوں کی برائے نام حکومت باقی رہ گئی تھی۔ سرسید ان حقائق سے بخوبی آگاہ تھے۔ ان کی تمام تر کوشش اس امر پر صرف ہوئی ہے کہ اسلامی سیاسی تصورات کو جدید نظریات سے مسابقت دے دی جائے اور اسلامی قانونِ سیاست کو اس طرح پیش کیا جائے کہ اس میں اور یورپی طرزِ فکر میں ہم آہنگی پیدا ہوجائے۔

سرسید احمد خان کے مطابق حکومت اسی صورت میں مستحکم ہوسکتی ہے جب کہ قائد میں غرور نہ ہو اور وہ اپنے دبدبے کو قائم رکھتے ہوئے اپنی مہربانیوں سے عوام کے دل اپنی مٹھی میں لے لے۔ وہ انہیں مکمل مذہبی آزادی دے۔ ان کے حقوق نہ سلب کرے۔ ان کے جان و مال کا مکمل تحفظ کرے۔ اقتصادی خوشحالی پیدا کرے۔ رحم کرے اور عفوودرگزر سے کام لے۔ سرسید احمد خان حکمران کا دبدبہ بھی چاہتے ہیں۔ مگر اس کے لیے سخی اور متواضع، منکسر المزاج اور حلیم الطبع ہونا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

جمال الدین افغانی: سید جمال الدین ۱۸۳۹ء میں جلال آباد، افغانستان کے ایک قریبی موضع کونٹر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سید صفدر اپنے دور کے ممتاز عالم تھے ان دنوں امیرِ افغانستان دوست محمد خان تھا۔ جمال الدین افغانی ابھی صرف آٹھ برس کے تھے کہ امیرِ افغانستان نے ان کے والد سید صفدر کو ان کے گاؤں سے بلایا اور کابل میں نظر بند کر دیا۔ ان کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایک ممتاز عالم ہونے کے ساتھ عوام میں مقبول تھے۔ اس لئے امیر افغانستان کی شخصی حکومت خطرہ محسوس کر رہی تھی۔ جمال الدین افغانی کی تعلیم کا آغاز کابل میں ہوا۔ اپنے والد کی نظر بندی کے دوران دیگر علماء کی صحبت بھی نصیب ہوئی۔ انہوں نے حدیث، فقہ، فلسفہ، نجوم، ریاضی، اور تاریخ کی تعلیم حاصل کی۔ والد کی وفات کے بعد حصول علم کی جستجو میں جمال الدین افغانی ہندوستان آئے۔ یہاں سے حج پر گئے۔ اور مشرق وسطیٰ کی سیاحت کرتے ہوئے ساڑھے تین سال بعد افغانستان پہنچے۔ یہاں امیر افغانستان کے بیٹے کے استاد مقرر ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد پھر ہندوستان چلے گئے۔ انگریز جمال الدین افغانی کے وجود کو خطرہ سے کم نہ سمجھتے تھے۔ انگریزوں نے ان پر پابندیاں عائد کر دیں اور کڑی نگرانی کرنے لگے۔ آخر وہ مصر چلے گئے۔ مگر وہاں بھی رہنے نہ دیا گیا۔ مصر سے قسطنطنیہ آئے جہاں ترکوں نے انہیں گلے لگا لیا۔ ترکوں کے دلوں میں اتنی جلدی گھر کر لینے کے باعث متعدد علمائے ترکی ان کے خلاف ہوگئے۔ ان پر کفر کے فتوے لگانے لگے اور انہیں ترکی سے بھی نکلوادیا وہ پھر مصر آگئے اور تعلیمی اصلاحات کا بیڑا اٹھایا۔ جامع ازہر کے نصاب پر نظر ثانی کر کے متعدد ترامیم کیں۔ خود بھی متعدد لیکچر دیئے۔ سماجی خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ انجمن محفل وطنی کے نام سے ادارہ کی تشکیل کی۔ مصر کی صحافت میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اخبارات کا اجراء کیا اور تبصروں کے ذریعہ سیاسی حالات کا جائزہ لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عوام نے ایک نئی کروٹ لی اور اسی کی بنیاد پر خدیو مصر اسماعیل پاشا کو تخت وتاج چھوڑنا پڑا۔

سید جمال الدین افغانی نے اپنی زندگی مسلمانوں کی اصلاح احوال کے لئے وقت کر دی تھی۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ مسلمانوں میں اتحاد قائم ہو اور وہ قیام دین کے بعد دینی و دنیاوی سرخروئی حاصل کریں۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے مصائب برداشت کیے اور پوری زندگی سفر میں گزاری۔ افغانی کی زندگی مختلف اسلامی ملکوں، ہندوستان، روس، یورپ اور انگلینڈ میں مسلسل سفر اور اپنے افکار کی تبلیغ یا ۱۸۸۴ء سے ۱۸۹۴ء تک اتحادِ اسلامیہ کے تصور کو عملی جامہ پہنانے کی ناکام کوششوں میں گزری، انہوں نے مسلم

حکمران طبقہ، علماء، طالب علموں اور نوجوانوں کو (جن میں عیسائی اور یہودی بھی شامل تھے) اپنا ہم خیال بنانے کی جدو جہد کی۔ افغانی دینی مسائل کی تشریح معتزلہ یا اشاعرہ کی طرح یونانی فلسفے یا اسلامی دینیات کے سہارے نہیں بلکہ خالصتاً معروضی اور عقلی انداز سے کرنے کے قائل تھے اور یہ انداز علماء کے لئے بدعت سے کم نہ تھا۔ اس پر ان کا آتشیں مزاج اور تلوار کی کاٹ رکھنے والی زبان نے ان کے لئے مسائل پیدا کئے۔[۱]

سید جمال الدین افغانی اجتماعی زندگی کے لئے اقتدار کو بے حد ضروری خیال کرتے تھے ان کے خیال میں قومی نظام کا تحفظ اور اس کی ترقی ونشوونما، اقتدار کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ وہ اس بات سے غافل نہیں تھے کہ اقتدار کا حصول بے حد مشکل کام ہے۔ لیکن جب عزت حاصل کرنے اور الہام خداوندی کے تقاضوں کو پورا کرنے کا عزم کر لیا جائے تو اقتدار حاصل ہو کر ہی رہتا ہے۔ حکومت کو انہوں نے محض جان طلبی وآرام وآرائش کا مقصد قرار نہیں دیا۔ بلکہ حکومت دین کی حفاظت کا بہترین ذریعہ ہے۔

جمال الدین افغانی نے شخصی حکومت کو نہایت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا ہے انکے خیال میں شخصی حکومت قوم کے لئے صرف زوال کے اسباب پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ ایسی حکومت میں عوام اپنے ہی معاملات میں بے بس ہوتے ہیں۔ اور ایک شخص کے حکم کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔

جمال الدین افغانی جمہوریت ہی کو بہترین طرز حکومت قرار دیتے ہیں مگر اس کے لئے ارباب حکومت کی دیانتداری اور فرض شناسی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ورنہ ان کے خیال میں جمہوریت بھی ناکام ہو جاتی ہے۔ انہوں نے اشتراکی طرز حکومت کی شدید مخالفت کی ہے۔ وہ اشتراکیوں کے اصولوں پر مبنی مساوات کو تسلیم نہیں کرتے۔[۲]

جمال الدین افغانی نے مقتدر اعلیٰ کے بارے میں اسی نظریے سے اتفاق کیا ہے جو ابن خلدون کا نظریہ تھا۔ مسلمان مفکرین میں صرف یہی دو مفکر ایسے ہیں جو ہم خیال ہیں۔ یعنی یہ کہ بیک وقت دو یا زائد مقتدر بھی ہو سکتے ہیں۔ جمال الدین افغانی من حیث القوم مسلمانوں کو ایک سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ ضروری قرار نہیں دیتے کہ اس پوری قوم کا سربراہ بھی ایک ہو۔ انہوں نے اسلام کو مسلمانوں کی قومیت قرار دیا وہ مختلف مملکتوں کے مسلمان سربراہوں کو قطعی طور پر مختلف قبائل کے سرداروں یا امراء کی حیثیت دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں عالم اسلام کی سربراہی ایک شخص کے پاس ہونا ناممکن العمل بات ہو سکتی ہے۔ مگر ان سب پر بیک وقت متحد رہنا۔ اسلام کو ذریعہ اتفاق بنالینا احکام قرآنی کو خود پر غالب رکھنا۔ اور اپنی مملکت کے ساتھ ساتھ دیگر مسلمان مملکتوں کے مکمل دفاع میں کوشاں رہنا قطع طور پر ناممکن العمل نہ تھا۔

جمال الدین افغانی سربراہ مملکت کو سیاسی تدبر کا حامل، عادل، علم کی قدر کرنے والا، بلند اخلاق، نرم طبیعت، غیرت منداور شجاع دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے مطابق جاہل اور بد اخلاق، بزدل اور بے وقوف، بخیل اور بے تدبیر، گمراہ یا فضول خرچ سربراہ مملکت قوم کو زوال کی طرف لے جاتا ہے۔ جمال الدین افغانی سربراہ مملکت کو ہر حال میں احکام الٰہی کی اطاعت کی تاکید کرتے ہیں۔ اور ایسے مشاورت پر کاربند رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جو سربراہ مملکت مشاورت کو اپنے لئے باعث شرم سمجھتا ہے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

علامہ اقبال جمال الدین افغانی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''عصرِ جدید کے مسلمان کو ایک بہت بڑا کام درپیش ہے۔ اسے ماضی سے رشتہ منقطع کئے بغیر اسلام کے پورے نظام پر غور کرنا ہے۔ وہ شخص جسے اس کام کی اہمیت اور وسعت کا پورا پورا احساس تھا اور جسے اسلامی فکر وتاریخ میں گہری بصیرت نصیب ہوئی اور جوان اوصاف کے علاوہ انسانوں اور انسانی آداب کا نہایت وسیع تجربہ رکھنے کی بدولت ہمارے ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک

۱۔ صلاح الدین ناسک، افکار سیاسی، ص: ۵۸۵　　۲۔ Nikki R.Keddie, Syed Jamal-ud-Din Afghani, P.58,80

زندہ تعلق کا کام دے سکتا تھا۔ جمال الدین افغانیؒ تھا۔ اگر اس کی انتھک مگر منقسم توانائی اسلام کو بطور ایک انسانی نظام فکر وعمل کے پیش کرنے کی خاطر وقف ہو جاتی تو آج دنیائے اسلام دینی اعتبار سے زیادہ مضبوط قدموں پر کھڑی ہوتی''۔[1]

علامہ محمد اقبال: علامہ محمد اقبال نے برصغیر کے غلامانہ ماحول میں آنکھ کھولی اور عمر عزیز کے مختلف مراحل میں ملت اسلامیہ کی معاشی ابتری، معاشرتی انتشار، سیاسی زوال اور تہذیبی انحطاط کے نقشے دیکھے۔ کتاب وسنت کے مطالعہ نے ان میں وہ حکمت وبصیرت پیدا کی کہ انہوں نے احیائے ملت کے ذریعہ اسلامی ریاست کی تشکیل اور اتحاد عالم اسلامی کو اپنی منزل ٹھہرالیا۔ اس مقصد وحید کے لئے انہوں نے جہاں نثر میں اپنے افکار کی توضیحات پیش کیں وہاں اشعار کے ذریعے ملت اسلامیہ کے تن مردہ میں خون دوڑانے کی سعی کی۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی قوم کے عروج وزوال کی ترقی کا انحصار اس کی سیادت وقیادت اور اقتدار وقوت پر ہے۔ جو قوم بھی برسرِ اقتدار رہی وہ زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کرتی رہی۔ لیکن جوں ہی عنان حکومت اس کے ہاتھ سے نکل کر دوسرے کے ہاتھوں میں جا پہنچی عام تباہ کاریوں نے اسے گھیر لیا۔ دینی اور دینوی زندگی کا کوئی پہلو بھی بری طرح متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مسلمان اس قانون سے مستثنیٰ نہ تھے۔ ہندوستان میں وہ جب تک برسر اقتدار رہے شاہراہِ ترقی پر گامزن تھے۔ اور جب ان کے اقتدار کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تو سیاسی، سماجی، تمدنی اور ثقافتی میدانوں میں پستی اور درماندگی کے ساتھ ساتھ خالص دینی اور مذہبی زندگی میں بھی زوال کے اثرات نمایاں ہو گئے۔ علامہ اقبال نے ملتِ اسلامیہ کی حیات مستقبلہ کے اس طویل اور کڑے سفر میں 'حدی خواں' بن کے ملی ترانے سنائے۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا
توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا[2]

کتاب وسنت کی روشنی میں اسلامی ریاست کی ہیئت، تنظیم اور اس کے تاریخی وتدریجی ارتقاء کے بارے میں اقبال مکمل آگہی رکھتے تھے۔ خلافت اسلامیہ سے متعلق ان کے مباحث قیام انگلستان (۰۸۔۱۹۰۵) کے دوران شائع ہونا شروع ہوئے۔ لندن سے شائع ہونے والے علمی اور تحقیقی مجلّے سوشیالوجیکل ریویو (Sociological Review) میں ۱۹۰۸ء میں ان کا مضمون Political Thought in Islam کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون کا اردو ترجمہ اخبار 'وکیل' امرتسر میں شائع ہوا۔ اقبال نے اسے ناپسند کیا تو آپ کی فرمائش پر اس کا ترجمہ چوہدری محمد حسین نے ۱۹۲۳ء میں کیا جو ''خلافتِ اسلامیہ'' کے عنوان سے شائع ہوا اور اب مقالات اقبال کے مجموعوں میں شامل ہے۔ اس مضمون میں اقبال نے اسلام میں خلیفہ کے انتخاب اور اسلامی ریاست کی سیاسی قیادت کی تنظیم وتشکیل پر واضح انداز میں گفتگو کی ہے۔ اقبال شریعت اسلامی کے مطالعہ سے اپنی یہ رائے پختہ کر چکے تھے۔ کہ حکومت واقتدار کی تشکیل ملت اسلامی کا حق ہے۔ جو جمہوری اور شورائی اسلوب سے کسی ایک معتبر اور مستحق شخصیت کو منتقل ہوتا ہے جسے وہ ایک حق امانت کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اس مقالے میں علامہ اقبال نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا وہ خطبہ بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے اپنے انتخاب اور تقرر کے بعد مجمع عام

[1] انگریزی خطبات، ص:۱۳۶ (ماخوذ ''نواز محمد عثمان، فکر اسلامی کی تشکیل''، ص:۱۰۱)
[2] بانگ درا: کلیات اقبال، ص:۱۹۷

میں دیا تھا۔ اس خطبے سے اسلام کے تصور قیادت کے بعض اہم اور اصول مباحث کی توضیح ہو جاتی ہے۔ خطبے کے یہ الفاظ توجہ طلب ہیں

''آج سے میں تمہارا حکمران ہوں اگر چہ تم سب میں قابل ترین نہ ہوں، اگر میں شریعت کے مطابق عمل کروں تو میری مدد کرو اور میرا ہاتھ بٹاؤ۔ اگر شریعت کے خلاف جاؤں مجھے روکو اور میری اصلاح کرو۔ حق کی اطاعت کرو کیونکہ حق ہی میں ہدایت وایمان ہے۔ باطل سے بچو کیونکہ باطل ضلالت و منافقت کا سر چشمہ ہے۔ تم میری اطاعت کرو جب تک میں خدا اور رسول کی اطاعت کرتا رہوں۔ جس معاملہ میں مَیں خدا اور رسول کی اطاعت سے انحراف کروں تم میری اطاعت ترک کردو۔[۱]

سربراہ مملکت کے انتخابی طریق کار کے بارے میں اقبال لکھتے ہیں۔

'ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام ابتداء ہی میں اس اصول کو تسلیم کر چکا تھا کہ فی الواقع اور عملاً سیاسی حکومت کی کفیل و امین ملت اسلامیہ ہے نہ کہ کوئی خاص فرد واحد، ہاں جو عمل انتخاب کنندگان اس معاملہ میں کرتے ہیں اس کے معنی صرف یہی ہیں کہ وہ اپنے متحدانہ وآزادانہ عمل انتخاب سے اس سیاسی حکومت کو ایک ایسی مختصر و معتبر شخصیت میں ودیعت کردیتے ہیں جس کو وہ اس امانت کا اہل تصور کرتے ہیں۔ یوں کہو کہ تمام ملت کا خمیر اجتماعی اس ایک فرد یا شخصیت منفردہ کے وجود میں عمل پیرا ہوا ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حقیقتاً اور صحیح معنوں میں فرد تمام کی تمام قوم کا نمائندہ کہلا سکتا ہے۔ البتہ اس کو ان افراد پر جن کا وہ نمائندہ ہے سوائے اس حکومت کے جو شرعاً آئین کے نافذ کرنے کی غرض سے اسے حاصل ہے اور کوئی اختیار واقتدار نہ ہوگا۔[۲]

ان اقتباسات سے اسلام کے تصور قیادت کے خدوخال واضح ہو کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب اور تہذیبوں میں حکمرانی اور قیادت کو جو شکلیں ہمارے سامنے آتی ہیں وہ مطلق العنان بادشاہوں اور سلاطین کی ہیں لیکن اسلامی قیادت کا تصور اور نقشہ ان سب سے بہت مختلف ہے۔ اسلامی ریاست میں اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ قیادت اور حکمرانی کے مسئلہ پر علامہ اقبال کے افکار اور آراء آیات قرآنی اور احادیث نبوی پر مشتمل ہیں۔ قیام انگلستان سے ہندوستان واپسی تک اقبال نے اس موضوع کو اپنے غور وفکر کا حصہ بنایا اور اس پر نظم ونثر میں متعدد مواقع اور مقامات پر تذکرہ کیا ہے۔ حکمرانی اور اس کے آداب پر اسلامی لٹریچر میں بیسیوں کتابوں اور تالیفات کا تذکرہ ملتا ہے۔ علامہ نے لٹریچر کو بخوبی دیکھا اور پڑھا اور گاہے گاہے اس کے نتیجے میں امت مسلمہ کی رہنمائی کے لئے اپنے نتائج افکار کو پیش کیا ہے۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری[۳]

---

۱ بحوالہ خلافت اسلامیہ، مقالات اقبال، ص۔ ۸۸ ۲ بحوالہ ''خلافتِ اسلامیہ'' مقالات اقبال: ص، ۸۹، مرتبہ، سید عبدالواحد

۳ کلیاتِ اقبال، ص: ۲۹۹

علامہ اقبال اسلامی ریاست کے لئے ایک ایسی قیادت کے خواہاں تھے جو مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کر سکے۔ان کے نزدیک ایسے عالمگیر نظام کا قائم ہونا انفرادی سلطنتوں کے حقوق اقتدار کے منافی نہیں ہے۔[۱] اس سلسلے میں علامہ اقبال نے سید جمال الدین افغانی کے اس تصور کو بھی قبول کیا کہ مکہ المکرّمہ مذہبی اعتبار سے مسلمانوں کا مرکز رہے گا۔لیکن اقبال نے اتحاد اسلامی کی مرکزیت کے لئے تاریخ اسلام کے قرون اولی کے نظام خلافت کا تصور پیش نہیں کیا۔اپنے عہد کے دیگر قائدین کے مقابلے میں خلافت کے متعلق اقبال کا اپنا علیحدہ نقطہ نظر تھا۔[۲]

عرب خود را بہ نور مصطفیٰ سوخت
چراغ مردہ مشرق بر افروخت
ولیکن آں خلافت را گم کرد
کہ اول مومناں را شاہی آموخت
خلافت بر مقام ما گواہی است
حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ
حفظ ناموس الٰہی است [۳]

علامہ اقبال کے نزدیک یہ تمام مملکت خدا کی ہے۔اقتدار اعلیٰ اور حق حکمرانی بھی صرف اسی کو ہے۔اہل زمین کے پاس یہ اقتدار ایک امانت ہے جسے شریعت کی حدود و قیود میں استعمال ہونا چاہیے۔یہ افکار اقبال کے ہاں شعر کی زبان میں یوں ڈھلے ہیں

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کاز تو بہ نگاہِ خرد خطاست
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم؟
ترک سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست [۴]

خدا کی حکمرانی کے اس تصور کو علامہ اقبال نے ''جاوید نامہ'' کی تین نظموں، خلافت آدم، حکومت الٰہی، اور ''افکار ملک خدا است'' میں پیش کیا ہے۔

مدہ خلافت ، فقر با تاج و سریر است
زہے دولت کہ پایاں ناپذیر است
جواں بختا مدہ از دست ایں فقر
کہ بے او پادشاہی زود میر است [۵]

---

۱ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی، اسلامی ریاست، ایک تاریخی جائزہ، ص:۴۲۔۵۱ ۲ ڈاکٹر معین الدین، اقبال اور جدید دنیائے اسلام، ص:۲۰۶۔۲۰۵

۳ اقبال، ارمغان حجاز، ص:۱۲۶ ۴ پیام مشرق، کلیات اقبال، ص:۲۹۹ ۵ ارمغانِ حجاز، ص:۹۴۱

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است
نظامش خام و کارش نا تمام است
غلام فقر آں گیتی پناہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است ۱

اسلامی تعلیمات کے مطالعے کے بعد اقبال یہ بخوبی جان چکے تھے کہ اسلام میں حکمرانی کا تصور عوامی خدمت کے ساتھ وابستہ ہے۔ 1923ء میں ''پیام مشرق'' شائع ہوئی اس کی ابتداء میں جو اشعار کہے ہیں ان میں درج ذیل اشعار سروری اور خدمت گری کے تصور کی وضاحت کرتے ہیں۔

سروری در دین ماخدمت گری است
عدلِ فاروقی و فقر حیدری است ۲

فقر و شاہی کا یہ حسین امتزاج اسلام کے تصور قیادت کی امتیازی شان ہے۔ اسلامی قیادت کی یہی وہ خصوصیت ہے جس سے خلافت راشدہ کا تاریخی عہد تابندہ ورخشندہ ہے۔

فقر و شاہی کے موضوع پر اقبال کے اردو کلام میں بھی فکر انگیز مضامین بیان ہوئے ہیں۔

نگاہِ فکر میں شان سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

☆☆☆

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ

☆☆☆

مانگنے والا گدا ہے، صدقہ مانگے یا خراج
کوئی مانے یہ نہ مانے ، میرو سلطان سب گدا ۳

اقبال کے اردو کلام میں بھی اسلامی حکمرانی کے طریق، فرائض اور شرائط پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کار جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا ۴

☆☆☆

سبق پڑھ پھر صداقت کا ، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا ۵

---

۱ اسرار و رموز، ص:۴۴۔۴۵ ۲ پیام مشرق، کلیات اقبال، ص:۱۹۰ ۳ کلیات اقبال، ص:۴۰۱
۴ کلیاتِ اقبال، ص:۳۱۹ ۵ کلیاتِ اقبال، ص:۳۲۰

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے
حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے
ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق
جو تجھے حاضر و موجود سے بے زار کرے [1]

علامہ اقبال کے ہاں تصور قیادت پر بہت بھرپور انداز میں علمی اور تاریخی حوالے سے بحث ملتی ہے۔ اسلامی حکمرانی کا مقصد، خلافت کی حقیقت، دین و سیاست فقر و شاہی، اخوت و مساوات، اقتدار کی فنا پذیری، قیادت کی صفات، حکمرانوں کے مستقبل کا منشور اور طرز حکومت کی مختلف شکلوں اور صورتوں جیسے اہم موضوعات پر اقبال کے ہاں نظم و نثر میں واضح خیالات ملتے ہیں۔ اقبال اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کے قائل تھے۔ اللہ تعالیٰ کی حقیقی حکمرانی کے علاوہ باقی سب کو وہ بتان آزری قرار دیتے ہیں۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری
ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری [2]

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی: مولانا مودودی نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا میں ایک تاریخ ساز انسان کی حیثیت سے معروف و متعارف ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے فکر و عمل کو اسلام کے تقاضوں کے مطابق صحیح سمت عطا کی ہے۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جدوجہد کے نئے رخ متعین کئے ہیں۔ فکر و نظر کا کوئی گوشہ، سعی و عمل کی جولانگاہ ایسی نہیں جو مولانا کے افکار و نظریات سے متاثر نہ ہو۔ سیاست بھی چونکہ دین کا ہی ایک حصہ ہے۔ اس لئے مولانا نے سیاسی اور دستوری مسائل پر بھی بڑی شرح و بسط کے ساتھ فکر انگیز بحث کی ہے۔ وہ اس صدی کے بلند پایہ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ عظیم سیاسی مفکر بھی تھے۔ انہوں نے اسلام کے سیاسی نظریات کو اپنی مختلف تصانیف میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مولانا مودودی نے اپنی کتاب ''اسلامی ریاست'' میں اسلامی ریاست کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے قرآنی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ دین اور سیاست دو جداگانہ چیزوں کا نام نہیں۔ بلکہ ایک ہی چیز اور لازم و ملزوم ہیں وہ لکھتے ہیں۔

> ''ہر وہ حکومت اور ہر وہ عدالت باغیانہ ہے جو خداوند عالم کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے قانون کے بجائے کسی دوسری بنیاد پر قائم ہے'' [3]

مولانا مودودی قرآنی دلائل سے ثابت کرتے ہیں کہ مقتدر اعلیٰ اللہ ہی کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے اور خلق اسی کی ہے اسی لئے مالک حقیقی کے ہوتے ہوئے اس دنیا کا کوئی دوسرا مالک نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہی کسی کو حکم جاری کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا مقتدر اعلیٰ اور بادشاہ ہے، اس کے حکم اور اختیار میں کوئی شریک نہیں۔ قانون سازی کا اختیار صرف اور صرف اللہ ہی کو حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں جن امور میں اللہ اور اس کے رسول نے کوئی صریح حکم نہ دیا ہو اس میں شریعت اور مزاج اسلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے قانون بنانے کا حق اہل ایمان کو حاصل ہے۔ قانون الٰہی کی حدود کے اندر استنباط و اجتہاد سے تفصیلات فقہی مرتب کرنے کی اجازت ہے۔ البتہ قرآن و سنت سے متضاد و متصادم کوئی قانون نہیں بنایا جاسکتا۔

---

[1] کلیات اقبال: ص:۵۵۳ [2] کلیاتِ اقبال، ص:۳۱۲ [3] اسلامی ریاست، ص:۴۹

مولانا مودودی کہتے ہیں کہ زمین کا مالک اللہ ہے اس کی زمین میں رہنے اس کی ملکیت میں تصرف کرنے کا حق صرف اسی کو ہے جو اس کا مطیع فرمان ہو اور اس کے قانون فطری وشرعی کا اتباع کرتا ہو۔ مولانا کا خیال ہے کہ خلافت وقیادت کے حقدار بالخصوص انبیائے کرام ہیں پھر عمومی طور پر مسلمان۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں۔ اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ اسی طرح جس طرح پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا'' [۱]

مولانا مودودی کہتے ہیں کہ یہاں خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ ان میں سے کس کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام مومن خلافت کے حامل ہیں۔ ہر وہ شخص جو اللہ کے احکام کی پیروی کرتا ہے وہ اس کا عمومی خلیفہ بن جاتا ہے۔ کسی شخص یا طبقہ کو عام مومنین کے اختیاراتِ خلافت سلب کر کے انہیں اپنے اندر مرکوز کر لینے کا حق نہیں ہے۔ نہ کوئی شخص یا طبقہ اپنے حق میں خدا کی خصوصی خلافت کا دعویٰ کر سکتا ہے یہی چیز اسلامی خلافت کو ملوکیت، طبقاتی حکومت اور مذہبی پیشواؤں کی حکومت سے الگ کر کے اسے جمہوریت کے رخ پر موڑتی ہے۔ لیکن اس میں اور مغربی جمہوریت میں اصولی فرق یہ ہے کہ مغربی تصور کی جمہوریت عوامی حاکمیت کے اصول پر قائم ہوتی ہے اور اس کے برعکس اسلام کی جمہوری خلافت میں عوام خدا کی حاکمیت تسلیم کرتے ہوئے اپنے اختیارات کو برضا ورغبت قانونِ خداوندی کی حدود میں محدود کر لیتے ہیں [۲] یعنی تمام عمومی خلفاء مل کر ایک خاص خلیفہ چن لیں تو خلافت وجود میں آتی ہے۔ گویا ان کے نزدیک خلافت اور عام دنیاوی ریاست میں یہ فرق ہوا کہ دنیاوی ریاست کے اپنے بنائے ہوئے قوانین اور رسوم ورواج پر عمل کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس اسلامی ریاست وہ نظام حکومت ہے جس میں قوانین الٰہی پر عمل کیا جاتا ہے۔ دنیاوی ریاست کا ایک مقتدر اعلیٰ (بادشاہ) ہوتا ہے جو مطلق العنان ہوتا ہے اور کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا، جب کہ اسلامی ریاست کا مقتدر اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے۔ خلیفہ صرف اللہ تعالیٰ کا نائب ہوتا ہے جو انسان کے سامنے بھی جوابدہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی۔

مولانا مودودیؒ کا خیال ہے کہ رئیس مملکت کا انتخاب عام لوگوں کی رضامندی پر منحصر ہے۔ کوئی شخص خود زبردستی امیر بن جانے کا حق نہیں رکھتا اور کسی خاندان یا طبقے کی اس منصب پر اجارہ داری نہیں۔ انتخاب کسی جبر کے بغیر مسلمانوں کی آزادانہ رضامندی سے ہونا چاہیے۔ اسی طرح مولانا نے قرآن وسنت سے ثابت کیا ہے کہ اولی الامر کی اطاعت صرف معروف میں ہے۔ معصیت میں نہیں۔ اگر اولی الامر قرآن وسنت کے خلاف کام کرے یا فلاح عامہ یا ریاست کے خلاف کام کرے تو اسے برطرف کیا جا سکتا ہے۔

---

[۱] النور، ۲۴/۵۵　　[۲] مودودی، خلافت وملوکیت، ص: ۳۶

فصل پنجم

اسلامی اور غیر اسلامی معیارات کا تقابلی جائزہ

اسلام میں قیادت کا مفہوم اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ نظام زندگی کا مکمل نفاذ ہے۔ ایسا نفاذ کہ کوئی مزاحمت باقی نہ رہے اور دین پورے کا پورا اللہ کے لئے خالص ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو اسی لئے بھیجا ہے کہ دین کا کامل نفاذ ہو۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ھوالذی ارسل رسوله بالھدیٰ و دین الحق لیظھره علی الدین کله و لو کره المشرکون[1]

وہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کا سیدھا طریقہ اور اطاعتِ حق کا صحیح ضابطہ دے کر بھیجا ہے تا کہ تمام دوسرے ادیان کی اطاعتوں کو مٹا کر ایک خدا کی اطاعت کو سب پر غالب کر دے خواہ وہ مشرک اس بات پر راضی نہ ہوں جو خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتے ہیں۔

سورۃ توبہ کی اس آیت سے اسلام کے تصورات میں غلبہ کے مفہوم سے مراد دین کے غلبہ سے ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کی بادشاہت کا قیام ہے۔

اسلام کے نزول اور مسلمان کے وجود کا تقاضا ہی یہ ہے کہ وہ غیر اسلامی نظام کی حکمرانی مٹانے کی کوشش کرے اس کے مقابلے میں اس معتدل اور متوازن ضابطۂ حیات کی حکمرانی قائم کرے۔ جسے قرآن کلمۃ اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔

دین اسلام تمام انسانیت کو ایک رشتے میں منسلک کرنے کے لئے آیا ہے۔ اور اس کا بنیادی مقصد اطاعتِ خداوندی ہے۔ قرآن پاک کی مندرجہ ذیل آیت مسلمانوں کو تمام انسانوں کے ساتھ انس اور محبت کے پیغام کا درس دیتی ہے

> ''اے لوگو! ہم نے تم کو مرد اور عورت کے ایک جوڑے سے پیدا کیا اور پھر تم کو قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا، تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک اللہ کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو تم میں سے زیادہ پرہیز گار ہے اور اللہ سب کچھ جانتا اور سب خبریں رکھتا ہے''[2]

ایک مسلمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ سارے پیغمبروں پر ایمان لائے اور ان کے درمیان کوئی تفریق نہ کرے قرآن پاک کا فرمان ہے:

> ''اے نبیؐ ان سے کہہ دیجیے کہ ہم تو اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اس پر جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور جو کچھ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور آل یعقوبؑ پر نازل ہوا ہے، اس پر جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو دیا گیا ہے ان سب پر ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے تابعدار ہیں''[3]

اس طرح اہل ایمان اللہ کی طرف سے پابند ہیں کہ وہ اللہ کی مرضی کے اس عالمگیر واحد معاشرے کو قائم کریں، جس کی بنیاد امن، محبت اور مساوات پر ہو اور جہاں اللہ کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے اور لوگوں کی ذات، زبان اور قومیت محض ان کی شناخت کا ذریعہ ہے، آدمی اور آدمی کے درمیان تفریق کا نہیں۔

انسانی مساوات اور اس کی تکریم کے بارے میں خدائی دستور العمل بڑی وضاحت سے قرآن پاک کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے:

۱　التوبہ، ۹/۳۳　　۲　الحجرات، ۴۹/۱۳　　۳　الِ عمران، ۳/۸۴

''یہ وہ ہے جس نے تمہیں اپنا نمائندہ بنایا ہے۔ زمین پر اس کا وارث تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلے میں بلند درجہ عطا کیا ہے، تا کہ تمہاری آزمائش کرے، ان نعمتوں سے جو اس نے تمہیں عطا کی ہیں''۔ ۱

اللہ کے اعلان کے مطابق، پوری انسانیت، مذہب، نسل، ذات، رنگ، علاقے اور ملک کی تمیز کے بغیر اللہ کی نمائندہ ہے اور زمین پر اس کی وارث ہے۔ اللہ کا یہ تخلیقی منصوبہ آدمی اور آدمی میں کوئی تفریق نہیں رکھتا، لیکن اس مساوات میں بعض کو درجے میں بلند کیا گیا ہے اور دنیا کے کاروبار میں رنگارنگی اور تنوع پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات ذہن نشین کرنے کی ہے کہ کسی کی دوسرے پر حیثیت میں برتری اس کے لئے کوئی رعایت یا من مانی کرنے کا پروانہ نہیں ہے بلکہ ایک آزمائش ہے۔ حیثیت اور درجے میں کسی کی برتری، ذمہ داری اور اللہ کے آگے جواب دہی سے مشروط ہے اور اس طرح اللہ نے انسانی معاشرے کو متوازن رکھنے کے لئے ایک طرف مساوات و انصاف کو رکھا ہے تو دوسری طرف بہتر کارکردگی اور پیداواری صلاحیت کو۔ مغرب میں اسلام کی بنیاد پرستی کے خلاف ایک زبردست پروپیگنڈہ مہم چلائی گئی ہے، اس بناء پر کہ مسلمان ممالک جنہوں نے اسلامی بنیاد پرستی کو اپنا لیا ہے انہوں نے غیر مسلموں کے ساتھ فساد اور تصادم کا ایک مستقل رویہ اپنایا ہوا ہے۔ اس کے بالکل برعکس جب تک اسلامی ممالک غیر اسلامی ملکوں کے درمیان اور بین الاقوامی معاملات میں قرآن و سنت کے احکامات کی پیروی کرتے رہیں گے، ایسے کسی خدشے کی کوئی وجہ نہیں۔ بین الاقوامی تعلقات سے متعلق انتہائی اہم اور واضح حکم قرآن میں یوں درج ہے:

''اللہ تمہیں (اس بات سے) نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کرو جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور جنہوں نے تمہیں گھروں سے نہیں نکالا اور اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔ ۲

یہ آیت بین الاقوامی تعلقات قائم کرنے کے لئے ایک تفصیلی خاکہ مہیا کرتی ہے یہ مسلمانوں پر لازم کرتی ہے کہ ان تمام لوگوں اور ممالک کے ساتھ مروت اور انصاف کا معاملہ رکھیں، جنہوں نے اسلام کے خلاف اعلان جنگ نہ کیا ہو اور نہ مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کے درپے رہے ہوں۔ اس اساس کے ہوتے ہوئے جو ممالک یا اقوام، اسلام یا مسلمانوں کے خلاف جنگ کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے انہیں کسی خدشے کی ضرورت نہیں۔ بین الاقوامی معاملات کو چلانے کے لئے اس اسلامی حکم کی موجودگی میں جنگ اور دشمنی کو ہوا دینے کی کوئی گنجائش نہیں۔

اسلامی معیار قیادت کی وضاحت سے پہلے دنیا کے دیگر نظام ہائے حکومت کے ارتقاء اور انکی اصل کارکردگی پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے کہ انسان کی ترقی و تمدن میں ان کا حصہ کس قدر رہے۔

جمہوریت Democracy جو ایک یونانی لفظ ہے اور تاریخی ریکارڈ کے مطابق اس کا خیال پہلی بار یونان کی شہری ریاستوں کو ہوا اور وہیں اس پر عمل بھی ہوا۔ لیکن یہ وہ جمہوریت تھی جس میں لوگ براہ راست حصہ لیتے تھے، غلاموں اور غیر ملکیوں کے سوا۔ ریاست کا خاص ادارہ جنرل اسمبلی ہوتی تھی جس میں ہر شہری شامل ہوتا تھا اور وہ ریاست کے کاموں میں حصہ لے سکتا تھا۔ اس اسمبلی کی صدارت باری باری اسمبلی کا ہر رکن کرتا تھا۔

یہ ایتھنز Athens کی مقبول اور منتخب اسمبلی تھی جس میں آبادی کے تمام بالغ مرد رکن تھے۔ یہی اسمبلی تھی جس نے سقراط کو موت کی سزا دی۔ اس کے بعد رومن سلطنت کا دور آیا، جس میں سارا مہذب یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بعض حصے شامل تھے جدید نمائندہ حکومتیں بہت

---

۱ الانعام، ۶/ ۱۶۵ ۲ الممتحنہ، ۶۰/ ۸

عرصہ بعد وجود میں آئی ہیں۔ جس کے لئے برطانوی پارلیمنٹ کو تاج برطانیہ کے خلاف اختیارات کے کامل اختیارات کے خلاف جدوجہد کرنی پڑی۔ لیکن بیسویں صدی کے شروع کے تین عشروں تک پارلیمنٹ کے نمائندوں کو منتخب کرنے کا حق صرف مراعات یافتہ طبقے کو تھا، غیر تعلیم یافتہ، کوئی جائیداد نہ رکھنے والے اور عورتوں کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ اپنے نمائندے منتخب کریں۔ جمہوریت نے صدیوں میں تدریجاً ترقی کی ہے اور نمایاں طور پر اپنی روح اور ہیئت میں مختلف رہی ہے اور کہا جاتا ہے کہ لوگوں کے منتخب نمائندوں کی حکومت تمام جدید جمہوریتوں میں اہم ترین قدر مشترک ہے۔ شعوری طور پر اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ لوگوں کی مرضی ہے جو سیاسی قوت کا ذریعہ بنتی ہے۔ بادشاہت کا منصب وراثتی ہے، جب کہ ایوان بالا کے اراکین حکومت نامزد کرتی ہے اور زمانۂ حال تک یہ اپنی نشستیں وراثت میں پاتے رہے ہیں۔ برطانوی باشندوں پر پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین کی حکمرانی نہیں ہوتی بلکہ ججوں کے بنائے ہوئے قوانین اور روایتی فیصلوں کے ذریعہ حکومت کی جاتی ہے۔ ''انقلاب فرانس'' جو مساوات، آزادی اور اخوت کے جھنڈے تلے متحرک ہوا اور کامیابی سے ہم کنار ہوا، اسے حال ہی میں ایک سخت چیلنج کا سامنا کرنا پڑا کہ اس انقلاب کا جمہوری اداروں کو قائم کرنے اور ان کو چلانے میں حقیقتاً کتنا حصہ ہے اور کیا کردار ہے؟ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ اس انقلاب نے یورپ کے تمام دوسرے حصوں اور امریکہ کو مساوات اور آزادی کی راہ دکھائی ہے اور انہیں قوت عطا کی ہے تو یہ بھی تو ہوا ہے کہ اس نے ایک مضبوط آمریت کو جنم دیا جو ساری دنیا کو فتح کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور ڈکٹیٹر اور اس کے جانشینوں نے ایشیا اور افریقہ کے بہت سارے ممالک میں کالونیاں قائم کرلیں۔ ان ساری نو آبادیوں کو آزادی حاصل کرنے کے لئے فرانس کی جمہوری حکومت کے خلاف سخت جنگ لڑنی پڑی۔ آج فرانس میں، صدر اور پارلیمنٹ دونوں کو عوام براہِ راست منتخب کرتے ہیں اور پارلیمنٹ وزیر اعظم کا انتخاب کرتی ہے۔ اکثر پارلیمنٹ اور صدر کا دو مختلف جماعتوں سے تعلق ہوتا ہے۔ جس کے سبب اکثر و بیشتر نظریات اور پروگرام کے درمیان ایک کشمکش جاری رہتی ہے۔ جیسا کہ آج بھی ہے۔ یہاں ریاست کا انتظامی ادارہ صدر اور وزیر اعظم کے درمیان منقسم ہے۔ اس آئینی صورت حال میں یہ کہنا مشکل ہے کہ دونوں میں کون عوام کی مرضی اور ان کے دیئے ہوئے اختیارات پر حقیقتاً کام کررہا ہے۔ امریکہ میں عوام کی مرضی نہ صرف یہ کہ صدر اور کانگریس کے درمیان بٹی ہوئی ہے اور دونوں ہی عوام کی براہِ راست نمائندگی کرتے ہیں، اکثر اوقات یہ دونوں باہم دست و گریبان رہتے ہیں۔ صدر امریکہ کو اہم تعیناتیوں اور دوسرے ممالک سے معاہدے کرنے پر اپنے حکومتی اختیار میں سینٹ کو بھی حصہ دار بنانا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سپریم کورٹ ہے جو قانونی جائزہ لینے کا اختیار رکھتی ہے۔ اس کے پاس یہ اختیار ہوتا ہے کہ کانگریس اور صدر سے منظور شدہ کسی بھی قانون کو کالعدم کرسکتی ہے۔

لاسکی (Laski) کہتا ہے کہ دنیا کا کوئی آئین اپنے طور پر مکمل نہیں ہے۔ اس کا زیادہ دارومدار اس پر ہے کہ کس پر اس کا عمل درآمد ہورہا ہے اور کون اس پر عمل درآمد کرارہا ہے۔ یہ لوگوں کا اخلاق و کردار ہے جن پر اور جن کے ذریعہ کسی آئین پر عملدرآمد ہوسکتا ہے اور یہ لوگوں کی اس مرضی سے زیادہ اہم ہے کہ جو آئین سازی کا ذریعہ بنتی ہے اس کی ایک بہت اچھی مثال مغربی نمونے کی جاپانی جمہوریت میں ملتی ہے۔ جہاں ایک دور میں جمہوریت کرپشن بن گئی جب لبرل ڈیموکریٹک پارٹی ایک طویل عرصے تک ملک پر حکمرانی کرتی رہی [1]

''نیورک کے سہ ماہی جریدے Foreign Affairs نے اپنے ایک مضمون میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے آزاد اور شفاف انتخاب کے ذریعہ برسرِ اقتدار آنے والی اکثریت کا سیاسی نظام ایک آزاد اور تخلیقی معاشرے کے قیام اور بقا کے لئے حسب منشا حالات مہیا نہیں کرتا اور یہ کہ کالے اور ایشیائی امریکی باشندے امریکی جمہوریت کی مراعات بہت کم پاتے ہیں۔ بارہا شخصی اقتدار لوگوں کے حالات میں بہتر تبدیلی لانے کا سبب بنا ہے جب کہ منتشر جمہوری اقتدار ناکام ہوگیا ہے۔ مثال کے طور پر زار کے تحت پرتگال، ماؤ کے تحت چین، یہاں تک کہ کاسترو کے تحت

---

1. Hamid A. K. Rai, History of Political Philosophy, P536

کیوبا کی حکومتوں کو دیکھیں۔ کاسترو کی حکومت کچھ لوگوں کی نظروں میں ناپسندیدہ رہی مگر ایک غیر جانبدارانہ نظر ڈالیں تو بہت ساری مفید اصلاحات اور عام آدمی کے مفاد میں کیئے گئے بہت سارے کام کی خوبیوں کو ہمیں تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔

اگر عوام سے پوچھا جائے کہ وہ جمہوری اداروں کو خوشحالی اور معاشی تحفظ پر ترجیح دیں گے تو تاریخی ریکارڈ کے پیش نظر کوئی بہادر شخص ہی ہوگا جو اس سوال کا جواب اثبات میں دے گا۔ جو اس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں۔ تو اس کا سبب وہ رقوم ہیں۔ جو سوئس بینک یا اسی طرح کے اداروں میں بڑی مقدار میں محفوظ ہیں۔ یہ ادارے مغرب نے اپنے ایجنٹوں کی دولت کی حفاظت کے لئے مغربی دنیا میں بنائے ہیں۔ جمہوری حکومت قائم کرنے یا ان کو دوبارہ وجود میں لانے کے نام پر ان ایجنٹوں نے اپنے اپنے ملک کو معاشی طور پر تباہی کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔

جب کہ اسلام میں شرکت اقتدار کے نظریے کی بنیاد اختیار، آزادی، محاسبہ اور انصاف پر رکھی گئی ہے۔ جو انتہائی خوب صورتی سے قرآن پاک کی درج ذیل آیات میں سمو دیئے گئے ہیں:

۱۔ ''اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، اس کے رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم پر حاکم بنائے گئے ہیں (ان دنیاوی حکمرانوں کے ساتھ) کسی اختلاف یا تنازع کی صورت میں معاملہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے سپرد کردو''[۱]

۲۔ ''جب بھی اہل ایمان کو زمین پر اقتدار حاصل ہو، وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے، برائی سے منع کریں گے''[۲]

۳۔ ''اہل ایمان ہمیشہ باہم مشورے سے اپنا کام چلاتے ہیں''[۳]

۴۔ پیغمبرؐ کو بھی کہا گیا ہے کہ اپنے ساتھیوں کے مشورے سے کام کریں'' [۴]

۵۔ ''وہ ان کا بوجھ ہلکا کرے گا اور انہیں ان پھندوں سے نکالے گا جن میں وہ گرفتار ہیں''[۵]

۶۔ ''جب بھی تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، انصاف سے کرو''[۶]

۷۔ ''تم سب کی امت (دراصل) ایک ہی امت ہے اور ہم ہی تم سب کے رب ہیں، پس ہماری ہی عبادت کرو''[۷]

۸۔ ''اس نے زمین پر تم کو اپنا خلیفہ بنایا، اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں بلندی دی تاکہ وہ تمہیں آزمائے''[۸]

۹۔ ''سارے معاملات کا فیصلہ قرآن کے مطابق کیا جائے''[۹]

۱۰۔ اللہ نے تم کو اس سے منع نہیں کیا ہے کہ ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور انصاف سے پیش آؤ، جو تمہارے دین کے خلاف تم سے نہیں لڑے اور نہ جنہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکالا۔[۱۰]

ان احکامات کی پیروی کو رسول اللہ ﷺ کے مندرجہ ذیل اقوال سے آگے بڑھایا گیا:

''جو بھی اللہ کی اطاعت نہ کرے، اس کی اطاعت نہ کی جائے۔
خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں''۔[۱۱]

ایک اسلامی ریاست میں فلاح و بہبود کے کام میں مسلمان اور غیر مسلمان کی تمیز نہیں ہونی چاہیے اور یہی ایک اسلامی ریاست کا

---

۱ النساء۴/۵۹　۲ الحج۲۲/۴۱　۳ الشوریٰ۴۲/۳۸　۴ آل عمران۳/۱۵۹　۵ الاعراف۷/۵۸
۶ النساء۴/۵۸　۷ الانبیاء۲۱/۹۲　۸ الانعام:۱۶۵　۹ المائدہ۵/۴۴　۱۰ الممتحنہ۶۰/۸
۱۱ البخاری، الجامع، حدیث رقم:۷۲۹۷

بہترین طرۂ امتیاز ہے۔

چوتھے خلیفہ حضرت علیؓ نے مصر کے گورنر کو ہدایت کی کہ حکومت کے اہلکاروں کو، نسل اور مذہب کی بنیاد پر عوام میں تفریق نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ قرآن اور سنت کے مطابق جہاں ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا دینی بھائی ہوتا ہے، وہیں وہ غیر مسلموں سے انسانیت کے رشتے میں بندھا ہوا ہے۔ اسلام میں شرکت اقتدار کے اس طرح کے نظریے سے جس پر تمام خلفاء نے عمل کیا، غیر مسلموں کے معاملے میں کسی تفریق کی گنجائش نہیں۔

اسلامی حکومت، الٰہی احکامات کے دائرے میں رہتے ہوئے، مساوات، آزادی، محاسبہ اور انصاف جیسا کہ قرآن نے بتایا کہ اصولوں پر قائم شورائی نظام ہے۔ قرآن پاک کا حکم ہے کہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے آپس میں مشورہ کر لیا جائے۔

اسلامی مملکت میں شورائیت محض ضابطے کی ایک کاروائی نہیں ہے بلکہ کسی بھی سیاسی یا سماجی فیصلے کی قانونی حیثیت کے لئے لازمی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اہل ایمان اپنے معاملات باہم مشورے سے چلاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام فیصلے مشورے سے کرتے ہیں۔ اس لئے ایک اسلامی مملکت میں حکومت اور مقننہ مشاورت کے نتائج کی پابند ہوں گی۔ اسے صرف اس صورت میں ایک باضابطہ قائم کی ہوئی عدالت میں چیلنج کیا جا سکتا ہے اگر یہ فیصلہ اسلامی احکامات سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اسلامی حکومت میں مشاورت زیادہ تر اس متفقہ فیصلے پر پہنچی ہے کہ شوریٰ کا ہر رکن قرآن وسنت کی روشنی میں اپنی رائے ظاہر کرے گا۔ اور اس کی یہ کوشش ہوگی کہ اس کی رائے اسلامی اصولوں اور قاعدے کے مطابق ہو۔ ایک اسلامی پارلیمنٹ کے اراکین پارٹی کی بنائی ہوئی راہ پر آپس میں تقسیم نہیں ہوں گے۔ اور نہ ہی وہ پارٹی کے نگران کی پیروی کرنے کے پابند ہوں گے۔ وہ اپنے علم اور اپنے ضمیر کے مطابق ووٹ دینے میں آزاد ہوں گے۔ پارٹی کے مطابق نہیں۔

اگر باضابطہ قائم کئے ہوئے کسی مقتدر ادارے اور معاشرے کے کسی فرد کے درمیان کسی معاملے میں اختلاف یا تنازعہ ہو جائے تو معاملہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹایا جائے گا۔ یعنی ایک غیر جانبدار عدالت قرآن وسنت کے مطابق فیصلہ دے گی۔

یہ ہے اصل فرق، اللہ کے اقتدارِ مطلق پر بنائی ہوئی اسلامی قیادت اور انسانی اقتدارِ اعلیٰ کی بنیاد پر بنائی ہوئی جدید تصور قیادت کا اسی طرح جدید نظام میں ملک کا سربراہ بلکہ حکومت کا سربراہ عدالتی جواب دہی سے مستثنیٰ ہوتا ہے جب کہ ایک اسلامی نظام میں ایسا نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک کی 'سورہ ص' میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی جنہوں نے ایک پیغمبر کی صورت میں اس وقت کی پوری مہذب دنیا، فلسطین، اردن، شام اور عراق پر چالیس سال تک حکومت کی، تورات میں دیئے گئے احکامات کی پیروی کرنے کو کہا گیا اور اپنی حکومت کے معاملات چلانے کے لئے اپنی ذاتی پسند و ناپسند کو اثر انداز نہ ہونے دینے کا حکم دیا۔ یہ بات انتہائی اہم ہے کہ کاروبار مملکت چلانے میں ایک پیغمبر کو بھی اجازت نہیں کہ وہ ذاتی خواہشات کو اثر انداز ہونے دے۔ یہ کس قدر متضاد ہے افلاطون کے اس خیالی بادشاہ کے تصور سے جو کوئی غلطی نہیں کر سکتا اور جو عوامی مفاد کا نگرانِ مطلق ہے اور جس کی ہر حالت میں پیروی کرنی ہوگی۔

سیاسیات کے موجودہ لٹریچر میں حاکمیت کے تصور نے اختیارات کے مرکز کے نظریے کی راہ ہموار کی جو ریاست کے مختلف اداروں میں منتقل ہوتے رہتے ہیں۔

اللہ کی حاکمیت کا تصور دنیاوی حاکمیت کے تصور سے بنیادی طور پر یوں مختلف ہے کہ اللہ کی حاکمیت پوری کائنات کا احاطہ کرتی ہے اور اس کی کوئی متعین حد نہیں ہے۔ نہ ہی اس میں کوئی اور شریک ہے۔ اس کے مطابق مملکت پر حکومت کرنے کا منتخب نمائندوں کا حق ایک مقدس

امانت ہے جو ان حدود کے اندر استعمال ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے تجویز کر دیئے ہیں۔ قرآن پاک اعلان کرتا ہے:

''اے نبی! آپ کہہ دیں کہ اے سارے ملکوں کے مالک، تو جسے چاہے سلطنت عطا کرے، جس سے چاہے سلطنت چھین لے، تو جسے چاہے عزت دے، جسے چاہے ذلیل کردے۔ (ہر طرح کی) بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے، بے شک تو ہی ہر چیز پر قادر ہے''[1]

مندرجہ بالا آیت میں اللہ کی حاکمیت کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ کسی ریاست یا لوگوں کے کسی گروہ میں نہیں پائی جاتیں۔ اللہ نے اپنی حاکمیت اور اقتدار اعلیٰ کی صفات کسی کو بھی کبھی بھی منتقل نہیں کیں۔ نہ ہی اس نے لوگوں کو یا ریاست کو یہ اختیار دیا ہے کہ جب چاہیں کسی کو طاقتور بنا دیں اور جب چاہیں اس سے طاقت واپس لے لیں۔ نہ ہی ساری کائنات میں کوئی ایسی قوت ہے جس کے بارے میں یہ کہا جائے'' یقیناً سب چیزوں پر تیرا اختیار ہے''

کوئی بھی دنیاوی اقتدار اللہ کی حاکمیت کے اوصاف میں شریک نہیں بن سکتا زیادہ سے زیادہ اپنے اختیار کو اللہ کے احکامات کی اتباع کرتے ہوئے یا ان کی تکمیل کے لئے استعمال کرسکتا ہے۔ حکومت کرنے کے اس اختیار کو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے دائرے کے اندر ایک مقدس امانت رہنا چاہیے۔ ایک سچا حکمران ان حدود سے باہر کوئی حکم جاری نہیں کرسکتا۔

اسلامی ریاست کی پارلیمنٹ اسلامی دستور کی شقوں کی اسی طرح پابند ہے جس طرح ریاست کا کوئی دوسرا ادارہ اور یہ کہ اس کا دائرہ کار ان حدود کے اندر رہے گا۔ جسے آئین نے بنایا ہے۔

دوسری جدید جمہوریتوں میں بھی جو ترقی پسند اور روشن خیالی کے نمونے پیش کرتی ہیں اور جہاں یہ باور کیا جاتا ہے کہ لوگ خودمختار ہیں اور کوئی بھی طرزِ زندگی اختیار کرنے میں آزاد ہیں عدالتی رہنمائی اہم کردار ادا کرتی ہے کیوں کہ اقدار اور معیار کی بدلتی ہوئی دنیا میں یہ ضروری ہے کہ عدالتی جائزے اور فیصلے تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا کو قابو میں رکھ سکیں۔ امریکی آئین میں یہ شق موجود ہے کہ قانون اور آئین کے سلسلے میں اٹھائے گئے کسی بھی معاملے کا فیصلہ سپریم کورٹ کرے گی۔ اس شق نے عدالتی ریویو کے بہت سارے سنہرے اصول قائم کر دیئے ہیں اور کانگریس کا بنایا ہوا قانون بھی عدالت کے دائرے اختیار میں آتا ہے جس کا جائزہ لینے کے بعد سپریم کورٹ کسی بھی قانون کو کالعدم قرار دے سکتی ہے، اگر یہ قانون ماورائے آئین ہو یا قانون سازی کے تقاضوں کو پورا نہ کرتا ہو۔ امریکہ کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مارشل (Marshall) نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ'' بلاشبہ ہم کانگریس کے بنائے ہوئے قانون کے پابند ہیں لیکن قانون وہ ہے جسے ہم قانون کہیں''

جاپان جو ایشیا میں ترقی اور خوشحالی کا ایک جزیرہ ہے اور فرانس جو مساوات، آزادی اور اخوت کی سرزمین ہے، دونوں نے سماجی اور سیاسی استحکام حاصل کرنے کی کوشش یوں کی ہے کہ انہوں نے آئین کے بنیادی ڈھانچے میں ردوبدل کرنے کا حق پارلیمنٹ کے منتخب نمائندوں سے لے لیا ہے۔ فرانس میں آئین کے بنیادی ڈھانچے میں کوئی بھی تبدیلی استصواب رائے کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ جاپان میں آئین میں تبدیلی کا اختیار بادشاہ کے پاس ہے، جو ملک کی علامت ہے، پارلیمنٹ کی نہیں۔

اسطرح سیکولر جمہوریتوں نے بھی یہ ضروری سمجھا ہے کہ بنیادی ڈھانچے اور اقدار کو پارلیمنٹ کی ترمیم سے محفوظ رکھا جائے۔ یوں سیکولر اور جدید جمہوریتوں کو بھی جہاں پارلیمنٹ عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے غیر محدود حاکمیت میسر نہیں اور جو بھی اقتدار انہیں حاصل ہے وہ عدالتی جائزے سے مشروط ہے۔ اسلامی حکومت میں یہ ضروری ہے کہ قرآنی احکامات کی پیروی کرتے ہوئے تمام معاملات قرآن وسنت کی روشنی میں طے کئے جائیں۔

---

[1] ال عمران، ۳/۲۶

اس سلسلے میں قرآن کی درج ذیل آیت رہنمائی کرتی ہے

> ''قرآن کا صحیح مطلب اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، مگر جو لوگ علم میں پختہ ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اس کتاب پر ان کا ایمان ہے اور یہ سب کچھ ہمارے رب ہی کی طرف سے ہے۔ اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو دانشمند ہیں'' [۱]

جو لوگ شریعت کا ضروری علم رکھتے ہوں، ضروری نہیں کہ وہ لوگوں کے نمائندے بھی منتخب ہو جائیں دوسری طرف محض پارلیمنٹ کے لئے منتخب ہو جانے والا کوئی فرد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ قرآن وسنت کی تشریح کرنے کا اہل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ

> ''وہ ان کے درجات بلند کرے گا جو ایمان والے ہیں اور علم رکھتے ہیں'' [۲]

یہی نہیں بلکہ اللہ نے اپنے بندوں کو یہ دعا سکھائی ہے۔

> ''اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما'' [۳]

اسلامی حکومت اور لوگوں کی بنائی ہوئی حکومت کے تقابلی جائزے پر ایک آخری سوال یہ اٹھتا ہے کہ ان معاملات اور سوالات کے جواب جن کے بارے میں قرآن وسنت میں کوئی ہدایت نہیں ملتی، پیغمبر ﷺ نے ایسے معاملات میں امت سے اجتہاد کرنے کو کہا ہے۔ اجتہاد کے اصول وقواعد اسلام میں وضاحت سے بیان کر دئے گئے ہیں۔

اجتہاد کے اصول سپریم کورٹ نے اتنی وضاحت سے بیان کر دیئے ہیں کہ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شریعت جو صدیوں سے ارتقائی منازل طے نہیں کر سکی ہے، اس قابل نہیں کہ جدید دور کے بدلتے ہوئے تقاضوں پر پورا اتر سکے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹے بغیر، اسلامی حکومت جدید دور کے چیلنجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ولولۂ تازہ اور توانائی کے ساتھ وسعت اختیار کرتی ہوئی نظر آ سکتی ہے۔

یہ حیرت کی بات نہیں کہ Samuelson Huntington اپنی تصنیف "Third Wave of Democracy" میں بنے بنائے نظریے پر جم کر اس بات کو سرے سے مسترد کر دیتا ہے کہ فطری طور پر اسلامی حکومت آزاد جمہوریت کے مقابل آ سکتی ہے۔ ساری دنیا میں، اسلامی حکومت کے ظہور میں لوگوں کی آزاد مرضی ایک بڑھتا ہوا کردار ادا کر رہی ہے۔ مغرب میں ہونے والے بہت سارے مطالعات میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ جب بھی مسلمان ممالک میں شفاف اور آزادانہ انتخابات ہوئے تو اس امر کا قوی امکان ہے کہ وہاں اسلامی حکومتیں ابھریں گی، جہاں ابھی آمرانہ حکومتیں ہیں۔

اسلامی حکومت میں مذہب کا تعلق زندگی کے تمام سیاسی، معاشی، اخلاقی اور تمدنی شعبوں سے ہے۔ مذہب محض عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ حیاتِ اجتماعی کا نظام ہے۔ جس کا تعلق روح کی اصلاح اور جسم کی فلاح' دونوں سے ہے جب کہ زمانۂ حال کا قطعی میلان یہ ہے کہ سیاسی اور اجتماعی حقوق پوری طرح مذہبی اعتقاد سے آزاد ہیں اور مذہب کا تمام تعلق دل سے ہے۔

---

[۱] آل عمران، ۳/ ۷ [۲] المجادلہ، ۵۸/ ۱۱ [۳] طٰہٰ، ۲۰/ ۱۱۴

چھٹا باب

اسلامی تصورِ قیادت کے اثرات

اسلامی تصورِ قیادت کے اثرات

اسلامی تاریخ کے مطالعہ کے دوران یہ عجیب منظر دکھائی دیتا ہے کہ مختلف نسلوں اور قوموں کے فرزند' اسلام کا پرچم اٹھائے فاتحانہ انداز میں قدم بڑھائے چلے جاتے ہیں، ہاشمی، اموی، عباسی، سلجوقی، ترکان، عثمانی، ال بویہ، افغان، مغل، اور نہ جانے کتنے خانوادے اسلامی اقدار وتہذیب کی پاسبانی کا فرض انجام دیتے رہے۔ ایک قوم تھک ہار کر بیٹھ جاتی ہے تو دوسری قوم آگے بڑھتی ہے اور اسلام کی مشعل درخشاں کو تھام لیتی ہے۔ دنیا کی دیگر اقوام صرف ایک قوم یا ایک نسل کے سپوتوں کے کارناموں پر فخر کر سکتی ہیں لیکن مسلمان ان گنت قوموں اور نسلوں کے ان تمام مشاہیر پر فخر کر سکتے ہیں جنہوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں کلمۃ اعلائے اللہ کے لئے یعنی دین کی سر بلندی کے لئے بے شمار کارنامے سرانجام دیئے یہ ایک حقیقت ہے کہ تہذیب انسانی آج جس بلند مقام پر فائز ہے اسے یہاں تک پہنچانے میں اسلامی تہذیب نے نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ یہ بات بلاخوف کہی جا سکتی ہے کہ موجودہ علمی، فکری، سائنسی، فنی، اور ثقافتی ترقی کی اساس وہ شاندار تہذیب ہے جو تیسری صدی ہجری (نویں صدی عیسوی) اور آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) کے درمیانی عرصہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں معرض وجود میں آئی۔

عین اس وقت جب اسلامی تہذیب کا سورج نصف النہار پر چمک رہا تھا تو یورپ خواب غفلت میں محو تھا وہ ہر طرف سے وحشت، بربریت، اور جہالت میں گرفتار تھا۔

ڈاکٹر ڈریپر نے یورپ کی جہالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

> ''یورپ کا بیشتر حصہ لق ودق بیابان یا بے راہ جنگل تھا کہیں کہیں راہبوں کی خانقاہیں اور چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد تھیں جا بجا دلدلیں اور غلیظ جوہڑ تھے۔ لندن اور پیرس میں لکڑی کے ایسے مکان تھے جن کی چھتیں گھاس کی تھیں۔ چمنیاں روشندان اور کھڑکیاں مفقود تھیں امراء فرش پر گھاس بچھاتے اور بھینس کے سینگ میں شراب ڈال کر پیتے تھے''۔[1]

صفائی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ آدمی اپنے مویشیوں سمیت ایک ہی کمرے میں سوتے تھے نہانا اتنا بڑا گناہ تھا کہ جب پاپائے روم نے سسلی اور جرمنی کے بادشاہ فریڈرک ثانی پر کفر کا فتویٰ لگایا تو فہرست الزامات میں یہ بھی درج تھا کہ وہ ہر روز مسلمانوں کی طرح غسل کرتا ہے۔

قرون وسطیٰ میں یورپ وحشت، بربریت اور جہالت میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگ گارے اور گھاس کی جھونپڑیوں میں رہتے، پتے کھاتے اور کھالیں پہنتے تھے۔ ان کی گلیاں غلیظ' جا بجا گندے جوہڑ اور کوڑے کے ڈھیر، سڑکیں ندارد ہر طرف بے راہ جنگل، جن میں ڈاکوؤں اور آدم خوروں کا بسیرا تھا۔ سیاست، حکومت، تمدن، تہذیب اور علوم وفنون کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ گویا یورپ اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں جکڑا ہوا تھا۔

اسی زمانۂ جاہلیت میں عرب جو گلہ بان وحشی' ترش رو اور درشت خو تھے ہر شخص کے دماغ میں رعونت وخود سری کا جنون تھا کوئی قبیلہ دوسرے کا محکوم ومغلوب رہنا پسند نہ کرتا تھا مختلف قبیلوں کے درمیان اتفاق واتحاد ناممکن تھا۔ ضد کے ایسے پکے جو کہہ دیتے اس پر اڑ جاتے جو کر گزرتے تو اس کے نتائج سے یکسر بے پرواہ ہوتے۔

حضرت محمد ﷺ کے تشریف لانے کے بعد جب یہ سخت گیر قوم ظن وقیاس اور شک وارتیاب کی کٹھن گھاٹیوں سے گزر کر مشرف بہ اسلام

[1] ڈریپر، معرکہ، مذہب وسائنس (مترجم ظفر علی خان) ص:۳۲۱۔۳۲۵

ہوئی تو اسے زندگی کی طرف ایک مثبت زاویہ نگاہ ملا اور ایک آفاقی نظریۂ حیات، اسلام نے قوم کو متحد و متفق بنا دیا اس کے اخلاق ذمیمہ کو اخلاق حسنہ سے بدل ڈالا۔ اسلامی قائد نے نظام اخلاق کی بنیادیں اس طرح کھڑی کیں کہ یہ قوم ایک عظیم سلطنت قائم کرنے کے قابل ہو گئی۔

۷۰۰ء سے لے کر ۱۲۰۰ء تک پانچ صدیوں کے دوران اسلام نے طاقت، نظام حکومت، انداز و اطوار کی شائستگی' معیار حیات، انسانیت پسندانہ قانون سازی اور مذہبی بردباری، ادب، علم وفضل، سائنس، طب اور فلسفہ میں ساری دنیا کی قیادت کی، اسلامی تعلیمات کی ایک اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے ماننے والوں میں خودداری' اعتماد و یقین اور توکل کی روح پھونکتا ہے۔ یہی عقیدہ انہیں آگاہ کرتا ہے کہ ان کے کاندھوں پر پوری انسانیت کی ذمہ داری ہے۔ ان کا فرض منصبی ہے کہ وہ بھٹکے ہوئے انسانی گلہ کی پاسبانی کریں اور انسانوں کی دین محکم اور صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کا فرض انجام دیں۔ اور اس روشنی وہدایت کے ذریعہ جو خدا کی طرف سے عطا کردہ ہے انسانیت کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تومنون باللہ[۱]

''تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں کے لئے ظہور میں آئی ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''

سورہ بقرہ میں فرمایا:

وکذالك جعلنکم امة وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیھم شھیدا[۲]

''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک اعتدال والی جماعت بنا دیا ہے تاکہ تم گواہ رہو لوگوں پر اور رسول ان پر گواہ رہیں''۔

تمدنی انقلاب برپا کرنے کے لیے مذہب ایک موثر قوت ہے۔ موسیو لیبان اگرچہ مذہب کو اوھام اور خرافات کا مجموعہ سمجھتا ہے تاہم وہ اس کی سحر آفرینی سے بھی انکار نہیں کر سکا۔ وہ اپنی کتاب (Les lois psycologeguis Delevolution Despeuples) میں ایک مقام پر لکھتا ہے۔

> ''مذہب کی عظیم الشان قوت کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ ایک زمانے میں قوم کے فوائد، قوم کے احساسات اور قوم کے خیالات کو متحد کر دیتا ہے۔ اس لئے وہ ان تمام عناصر کا جن سے قومی روح پیدا ہوتی ہے دفعتاً قائم مقام ہو جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ مذہبی قوت کے استیلاء سے قوم کا مزاج عقلی نہیں بدل سکتا تاہم تمام قوتوں کا رخ صرف ایک مقصد کی طرف ہو جاتا ہے یعنی تمام طاقتیں اس جدید مذہب کی حمایت میں کھڑی ہو جاتی ہیں اور مذہب کی عظیم الشان طاقت کا راز اسی اصول کے اندر مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی جن قوموں نے کارہائے نمایاں کئے ہیں اسی قسم کے مذہبی انقلابات کے زمانے میں کئے ہیں۔ اور دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کی تاسیس اسی دورِ انقلاب میں ہوئی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے الہامی خیالات نے اسی طریقہ سے قبائل عرب میں اتحاد پیدا کیا اور ان لوگوں نے تمام قوموں کو زیر وزبر کر کے عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی''[۳]

مسلمانوں کی طبیعتوں کا یہ زبردست انقلاب جو رسول کریم ﷺ کے دست مبارک پر انجام پایا اور مسلمانوں کے ذریعہ سے انسانی

۱　ال عمران، ۳/۱۱۰　　۲　البقرہ، ۲/۱۴۳　　۳　(اصل کتاب فرانسیسی زبان میں ہے اسے احمد فتحی زغلول پاشا نے عربی زبان میں منتقل کیا اور جناب عبدالسلام ندوی نے انقلاب الامم کے نام سے اس کا اردو ترجمہ پیش کیا'') انقلاب الامم، ص: ۱۵۷

معاشرہ میں پیش آیا۔ انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ تھا۔ اس انقلاب کی ہر چیز نرالی تھی۔ اس کی سرعت، اس کی گہرائی، اس کی وسعت وہمہ گیری، اس کی وضاحت اورفہم انسانی سے قرب، یہ سب اس محیر العقول واقعہ کے نرالے پہلو تھے۔ آپؐ ان مصلحین میں سے نہ تھے جو اپنی قوم یا اپنے زمانے کی چند اجتماعی کمزوریوں یا اخلاقی خرابیوں کے مٹانے کے درپے ہوتے ہیں اور وقتی طور پر ان عیوب کے ازالے میں کامیاب ہوتے ہیں یا اس دنیا سے ناکام سدھار جاتے ہیں جبکہ نبی اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی سے دعوت واصلاح کا کام شروع کیا۔ آپؐ کا مقصد بعثت دنیا کو جنت کی بشارت اور عذاب آخرت کی وعید پہنچانا تھا۔ آپؐ داعی الی اللہ اور سراج منیر بن کر آئے تھے اسی لئے آپؐ کے مخاطب اسی قیادت کی بنا پر صرف نوے برس میں مسلمان ملتان سے بحیرہ اسود اور سمرقند سے ساحل اطلس اور وسط فرانس تک چھا گئے۔ اس قوم نے جا بجا مساجد بنائیں۔ علم وفن کے بڑے بڑے مرکز قائم کئے دنیا بھر کے علماء وحکماء کو اپنے درباروں میں جمع کیا۔ تمام رومی ویونانی علوم کو عربی میں منتقل کیا۔ جا بجا دارالکتب اور دارالعلوم قائم کئے۔ شفا خانے بنوائے سڑکیں نکالیں۔ نہریں کھودیں۔ باغات لگائے، گلیوں کو پختہ کیا، رات کو روشنی کا انتظام کیا، پل اور تالاب بنائے اور دنیا کو حسین تعمیرات سے بھر دیا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمان سپین پہنچے اور نویں صدی عیسوی میں سسلی میں داخل ہوئے یوں تو وہ محض تجارت کی غرض سے داخل ہوئے لیکن اپنے ساتھ تاریخ، فلسفہ، طبیعات، کیمیا، طب، ریاضی، شعر وادب اور علم الکلام جیسے درجنوں علوم لئے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ علوم یورپ کے مختلف ممالک جن میں اٹلی، جرمنی، فرانس دیگر کئی ممالک شامل ہیں پھیلنا شروع ہو گئے۔ اسی طرح ایشائی ممالک میں چین، ہندوستان بھی اسلامی تہذیب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ قانون قدرت کے مطابق جاہلیت متمدن ومہذب قوم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس سلسلے میں فرانس کے مشہور محقق اور مؤرخ ڈاکٹر گستاؤلی بان کا بیان درج کرنا مناسب ہوگا۔ مؤرخ موصوف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

> ''اس سات سو سال کے عرصے میں جب سے مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں رہی ہے، مختلف فاتحین نے اس ملک کو زیر کیا جن میں عرب، افغان، ترک اور مغل شامل ہیں۔ لیکن ان سب کا مذہب اسلام تھا اور ان کے کل نظامات شریعتِ محمدی پر مبنی تھے۔ ان فاتحین نے نہ صرف ہندوستان کو فتح کیا بلکہ اپنا مذہب، اپنی زبان اور اپنی صنعت اس ملک میں پھیلائی اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ عظیم الشان تغیرات جوانہوں نے پیدا کئے وہ اس وقت بھی موجود ہیں اور کروڑوں ہندو اسلام کے پیروکار ہیں''[۱]

یورپ نے ایک نئی کروٹ لی یہاں تک کہ سولہویں صدی تک ایک عام بیداری کی لہر پیدا ہوگئی۔ اور یورپ مائل بہ علم ہو گیا۔ تہذیب و تمدن کے متعلق اسلامی نظریے کی وضاحت پکھتال (Pickthal) نے بڑی خوبی کے ساتھ کی ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

> "The Culture of Islam aimed not at beautifying and refining the accessories of human life. It aimed at beautifying and exalting human life itself." **2**
>
> ''اسلامی تمدن کا ہرگز مقصد نہیں کہ وہ حیاتِ انسانی کے حشو وزوائد کو حسین وجمیل بنائے، اس کا مقصدِ خاص تو یہ ہے کہ خود انسانی زندگی کو حسین ورعنا بنائے اور بلند تر کردے''

۱۔ تمدن ہند، (مترجم علی بلگرامی)، ص: ۳۰۷

۲۔ Mohammad Marmaduke Pickthal, Islamic Culture,P.3

فصل اول

معاشرتی اثرات

مسلمانوں نے تہذیب پر زبردست اثرات مرتب کیے اوران کی معاشرت کی کایا پلٹ دی ان کے خیالات وافکار میں انقلاب برپا کر دیا۔ وہی لوگ جوحیوانوں کی طرح اوڑھتے اور بچھاتے تھے مہذب ومتمدن ہو گئے۔

مسلمانوں نے جس طرح فتوحات کے دوران ہمت وشجاعت اور جرأت وبسالت کا ثبوت دیا اسی طرح انہوں نے فتوحات مکمل کرنے کے بعد زیرنگین علاقوں میں امن وامان، عدل وانصاف اوراخوت ومساوات قائم کرنے میں بھی بلندنظری فیاضی اور سیاسی تدبر کا ثبوت دیا۔ تھامس کارلائل (Thomas Carlyle) اسلامی مساوات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

Islam, like any Great... and insight into the essence of man in a perfect equaliser of man. 1

''اسلام ایک انسانی جوہر شناس کی طرح انسانی مساوات کا مکمل علمبردار ہے''

اسلامی رواداری کا ذکر کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے۔

On the whole, unbelievers have enjoyed under Muhammadan rule a measure of tolerence the like of which is not to be found in Europe untill quite modern time. 2

''مسلمانوں کی حکمرانی میں غیر مسلم رعایا کو بالعموم ایسی رواداری میسر تھی جوترقی یافتہ یورپ بھی نہ دے پایا''۔

اگراس زمانے میں اسلامی سلطنتوں کا جائزہ لیا جائے تو غیر جانبدارانہ طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہاں غیر مسلم اقوام کو مکمل آزادی حاصل تھی۔ ان کے ساتھ فیاضانہ اور روادارانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ کوئی غیر مسلم، غیر مسلم ہونے کی بنا پر ظلم وتشدد کا نشانہ نہ بنتا تھا۔

یورپ کے اکثر محققین مسلمانوں کے یورپ پر اثرات کا کھل کر اعتراف کرتے ہیں۔ جان ولیم ڈریپر (John William Draper) لکھتا ہے

Injsutice founded on religious rancour and national conceit can not be prepetuated for ever ..... The Arab has left his intellectual impress on Europe, as, before long, christendom will have to confess.3

''مذہبی کینہ اور قومی تکبر ہمیشہ قائم نہیں رہتا۔ عیسائی دنیا کو جلد ہی تسلیم کرنا پڑے گا کہ عربوں نے یورپ پر علم وفراست کے گہرے اثرات نقش کیے ہیں۔''

رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے

۱۔ Thomsas Carlyle, Heroes,Hero Worship and the Heroic in History,P.99

۲۔ Thomas, Arnold. The Preaching of Islam. P.420

۳۔ Intellectual Development of Europe, Vol:II, P.42

It was under the influence of Arabian and Moorish revival of culture, and not in the 15th century, that the real renaisance took place. Spain and not Italy, was the cradle of the rebirth of Europe. **1**

''یورپ کی نشاۃ ثانیہ درحقیقت پندرھویں صدی عیسوی میں نہیں بلکہ عربوں اور شمالی افریقہ کے مسلمانوں کی مرہون منت ہے اس کا گہوارا اٹلی نہیں سپین تھا''

رابرٹ بریفالٹ کا یہ قول بھی اپنی جگہ بڑا وقیع ہے وہ لکھتا ہے

.... there is not a single aspect of European growth in which the decisive influence of Islamic culture is not Traceable. **2**

''یورپ کی ترقی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں اسلامی تہذیب کا فیصلہ کن کردار نہ نظر آتا ہو''

موسیو لیبان کا قول ہے

''یورپ نے عربوں سے تہذیب حاصل کی اگر عربوں کا نام یورپ کی تاریخ سے نکال دیا جائے تو یورپ کی حیات ثانیہ کئی سو سال پیچھے جا پڑتی ہے'' ۳

یہ ایک بین اصول ہے کہ جب دو مختلف انسان آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے سے کچھ سیکھتے ہیں اور سکھاتے ہیں طاقتور اور فاتح اقوام عموماً مفتوح پر اثر انداز ہوتی ہیں اگر یہ رفاقت صدیوں پر محیط ہو تو اثر بھی اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔ مسلمان سپین میں آٹھ سو سال، جنوبی فرانس میں دو سو سال، سسلی میں دو سو تریسٹھ سال اور جنوبی اٹلی میں ڈیڑھ سو سال تک حاکم رہے اور ہندوستان میں سات سو سال رہے۔ محکوم پر حاکم کا اثر اتنا شدید ہوتا ہے کہ تہذیب و تمدن تو رہے ایک طرف بعض اوقات مذہب تک بدل دیا جاتا ہے۔

اس کی بڑی مثال انگریز کی ہندوستان پر حکومت ہے۔ ڈیڑھ سو برس حکومت کی اور پچاس کروڑ انسانوں کا تمدن' لباس' طرز حیات اور نقطۂ نگاہ تک بدل گئے۔ مسلمان جب مشرق وسطیٰ' افریقہ۔ بحرالکاہل جزائر، ملایا اور چین میں تجارت کی غرض سے گئے تو وہاں کا نقشہ بدل آئے۔ یہاں تک کہ چین کے مشہور ہیئت دان کوشو چنگ نے ۱۲۸۰ء میں علی ابن یونس مصری (۱۰۰۹ء) کی کتاب الھیئت کو چینی زبان میں منتقل کیا۔

انڈونیشیا، ملایا، چین، شرقی و وسطیٰ افریقہ اور ہندوستان کے کروڑوں مسلمان اُن تاجروں کی یاد دلاتے ہیں جو آج سے چودہ سو سال پہلے ان علاقوں میں بغرض تجارت گئے تھے۔ کتنی ہی ایسی منڈیاں ہیں جہاں عیسائی اور مسلمان صدیوں ملتے رہے۔ مثلاً مصر، تونس، کریٹ، قبرص، جزائر یونان واندلس ،شام، انطاکیہ، آرمینیا قبرص، عراق وغیرہ۔

موسیو لیبان لکھتے ہیں کہ عرب تاجر دریائے والگا کے راستے فن لینڈ تک جاتے تھے۔ بحیرہ بالٹک کے جزائر (Got land) گاٹ لینڈ، بارن ہوم (Born Holm) اور آلینڈ (Aland) سے ہو کر سویڈن، ڈنمارک اور پرشیا کو نکل جاتے تھے۔ ان جزائر سے کئی سو عرب سکے ملے ہیں اور یہ اسی بات کا ثبوت ہے کہ عرب وہاں تجارت کے لئے گئے تھے۔ یہ سکے پولینڈ میں بھی دستیاب ہوئے ہیں ۴

---

۱ The Making of Humanity,P:298

۲ Ibid. P.202　　۳ تمدن عرب، (مترجم علی بلگرامی) ص:۵۱۳　　۴ تمدن عرب، (مترجم علی بلگرامی) ص:۵۰۸

ڈاکٹر ڈریپر لکھتا ہے۔

''بارسلونا کی بندرگاہ خلفائے اندلس کی بحری تجارت کا مرکز تھی یہاں سے سینکڑوں جہاز مال تجارت سے لدے ہوئے اکناف عالم میں جاتے تھے۔مسلمانوں نے یہودی تاجروں کی مدد سے تجارت کے بہت سے اصول اختراع کیے۔ جو رفتہ رفتہ یورپ کی تاجر جماعتوں تک پہنچے۔ حساب میں ڈبل انٹری سسٹم مسلمانوں کی ایجاد ہے'' ۔[۱]

رابرٹ بریفالٹ کہتا ہے

''عربوں کے سپین اور سسلی کی تجارتی وصنعتی سرگرمیوں نے یورپ کی تجارت وصنعت کو جنم دیا''[۲]

ایک اور مقام پر لکھتا ہے۔

''یورپ کے افلاس کی یہ حالت تھی کہ اٹلی کے تاجروں کے پاس عربوں کا مال خریدنے کے لئے کچھ نہیں ہوتا تھا وہ عموماً اردگرد کے دیہات سے بچے چرالاتے ۔انہیں غلام بنا کر بیچتے اور اس طرح رقم ادا کرتے تھے ۔۔۔۔عربوں نے ہند' چین ملاکا اور ٹمبکٹو تک خشکی کے راستے کھول دیئے اور سوڈان وسقوطرہ سے مڈغاسکر تک تجارتی منڈیوں کا ایک سلسلہ قائم کر دیا جہاز سازی کے فن کو ترقی دی ۔ دنیا کو بحر پیمائی کا درس دیا۔ ہنڈیوں کا طریقہ رائج کیا اور بحری تجارت کے لئے انتظامیہ کونسلیں قائم کیں'' ۔[۳]

اسلامی تہذیب کو پھیلانے میں صلیبی جنگوں نے بڑی مدد کی اندازاً دوسو برس تک لاکھوں صلیبی مصر،فلسطین، وغیرہ میں آکر اسلامی تہذیب وتمدن سے متاثر ہوتے رہے صلیبیوں نے پہلی جنگ ۱۰۹۶ء میں یوروشلم لے لیا تھا وہ یہاں اسی برس تک حاکم رہے ۔ پہلا بادشاہ بالڈون تھا یہ عربی لباس پہنتا تھا۔اس نے مسلمانوں کی طرح جابجا حمام قائم کیے اور شفاخانے بنائے ۔ یورپی مشنری عربی سیکھنے لگے۔ساز جنگ میں گھوڑوں کی زرہ،طبل اور باردد کا اضافہ ہوا۔کبوتروں کے ذریعے پیغام رسانی شروع ہوئی محاصرہ کے عربی طریقے ، نیز مشرق کے پودے اور کاشت کے طریقے ،لذیز کھانے مثلاً پلاؤ،قورمہ،حلوہ، چٹنیاں اور اعلیٰ لباس عطریات ،مسالے مشروبات ،نیشکر سے شکر نکالنے کی ترکیب اور دیگر متعدد اشیاء مشرق سے مغرب میں پہنچیں ۔وہاں فرنیچر، برتن اور عمارات مشرقی طرز کی بننے لگیں۔ آرٹ ،نقاشی، یہاں تک کہ جلد بندی پر بھی اسلامی رنگ چڑھ گیا۔دمشق اور صور(شام کے شہر) کی صنعت شیشہ سازی وینس میں قائم ہوئی ۔فرانس اور اٹلی میں ریشم بافی ہونے لگی۔

یورپ کی طرح ہندوستان کی تاریخ کا اسلامی زمانہ گیارھویں صدی عیسوی سے شروع ہوکر اٹھارویں صدی عیسوی تک رہتا ہے۔اس سات سوسال کے عرصہ میں مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں رہی ۔مختلف فاتحین نے اس ملک کو زیر کیا جن میں عرب، افغان، ترک اور مغل شامل ہیں اور سب مسلمان تھے۔ان فاتحین نے نہ صرف ہندوستان کو فتح کیا بلکہ اپنا مذہب اپنی زبان ، اپنی صنعت ملک میں پھیلائی ، اس طرح اخلاق ومعاشرت اور قانون سازی میں اسلامی ذہنیت اور اسلامی شریعت کے اثرات نظر آتے ہیں۔عورت کا احترام' اس کے حقوق کا اعتراف 'مختلف انسانی گروہوں کے درمیان مساوات کا اصول' اسلامی فتوحات اور مسلمانوں کے اختلاط کے بعد سے روز بروز زیادہ تسلیم کیا جانے لگا۔

۱　(مترجم ظفر علی خان) معرکہ مذہب وسائنس،ص:۴۲۷　　۲　(مترجم عبدالمجید سالک) تشکیل انسانیت،ص:۲۶۵

۳　تشکیل انسانیت،ص:۲۶۷

ان کے عظیم الشان تغیرات جوانہوں نے پیدا کئے اس وقت بھی موجود ہیں اور آج بھی ہند میں بیس کروڑ سے زیادہ مسلمان آباد ہیں اور ملک کے ایک بڑے حصہ میں ایک ایسی زبان رائج ہے جو فاتحین کی زبان سے مشتق ہوئی ہے ۱؎

مسلمان فاتحین نے ان تمام ممالک میں جہاں ان کی فتوحات کا جھنڈا گڑھا ہے ایک عظیم الشان اثر اپنی حکومت کا چھوڑا ہے۔ مثلاً مصر کے ملک میں انہوں نے وہ نتیجہ پیدا کیا جو کبھی یونانیوں اور رومیوں کو نصیب نہ ہوا یعنی انہوں نے اس بڑی مخلوق کی زبان اور اس کے مذہب اور اس کے صنائع اور اس کے سارے تمدن کو جو ہزار ہا سال سے چلا آتا ہے بالکل بدل دیا اسلامی تمدن کی وجہ سے فراعنہ کی اولاد اپنی قدیم تاریخ کو بھول گئی۔ البتہ ہندوستان میں مسلمانوں نے ویسا گہرا اثر نہیں ڈالا جیسا کہ مصر میں، یہاں مفتوحین کا اثر فاتحین پر بہت زیادہ پڑا جس کی مثال اسلامی دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی ۲؎ مسلمانوں نے اپنی دینی رواداری اور فیاضی سے برصغیر کے کٹر اور سخت گیر لوگوں کو اسلام کی طرف مائل کیا۔ اپنے اعلیٰ کردار اور حسن اخلاق، کاروباری مہارت اور تجارت کے ذریعہ مقامی باشندوں پر اپنے گہرے اور انمٹ نقوش مرتب کئے۔ اشاعت و تبلیغ اسلام کے لئے جو کام بھی ہوا وہ حکمرانوں کے بجائے صوفیائے کرام نے کیا اور وہ بھی اس طرح کہ انہوں نے اپنے کردار اور طور طریقوں سے مقامی آبادی کے دل جیت لئے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام سے پہلے معاشرہ مختلف طبقات میں بٹا ہوا تھا۔ ایک حکمران طبقہ دوسرا امراء وزراء کا طبقہ، تیسرا، محکوم اور رعایا کا طبقہ، ہندوستان میں سماج پیشہ کے لحاظ سے منقسم تھا۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر چار ذاتوں کا ظالمانہ نظام رائج تھا۔ یہی حال ایران اور روم کا تھا۔ ایک حکمران اور مذہبی مراعات یافتہ طبقہ تھا۔ جنہیں ہر قسم کی آرام و آسائش میسر تھی جبکہ عوام کا طبقہ بدترین معاشی و معاشرتی استحصال کا شکار تھا۔

اسلام نے ہر قسم کے نسلی، لسانی اور طبقاتی امتیازات کا خاتمہ کر کے ہر انسان کو مساوی حقوق دیئے اسلام نے تمام بنی آدم کو ایک اصل کی مختلف شاخیں قرار دیا۔ اور روئے زمین کے تمام انسانوں کو وحدت نسل انسانی کی بنیاد پر اخوت کی لڑی میں پرو دیا۔ الخلق عیال اللہ یعنی تمام انسان خدا کا کنبہ ہیں۔ سب بھائی بھائی اور یکساں حقوق کے حامل ہیں۔ اسلام نے برتری اور عظمت کے دنیاوی امتیازات کا خاتمہ کر کے سیرت اور تقویٰ کو برتری کا معیار قرار دیا۔ کالے گورے اور آقا و غلام کا فرق مٹا دیا۔ پیدائش کے لحاظ سے تمام انسان برابر ہیں۔ **خلقکم من نفس واحدۃ** (یعنی اللہ نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا ہے) ۳؎ تمام انسان عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ لہٰذا وہ حقوق کے لحاظ سے برابر ہیں ہر شخص کو اپنی جان، حریت فکر اور ذاتی تحفظ کا حق حاصل ہے۔

اسلام سے قبل معاشرہ میں عورت کا مقام نہایت پست تھا قانون کی نظر میں عورت کا کوئی حق یا مرتبہ نہ تھا۔ دیگر مذاہب اور تہذیبوں میں بھی عورت کا مقام بہت پست تھا۔ اسلام نے معاشرتی طرز زندگی سنوارنے کے لئے عورت کے مقام کو بلند کیا۔ عورت کے علاوہ دنیا میں ایک اور طبقہ مظلوم تھا جو غلام کہلاتا تھا۔ اسلام نے غلامی کی زنجیروں کو ہمیشہ کے لیے کاٹ دیا۔ غلامی کو بتدریج ختم کرنے کے لئے اول ترغیب کا طریق یعنی اپنے مال سے غلاموں کو خرید کر آزاد کرنے کی ترغیب دی۔ مصارف زکواۃ میں غلام کو آزاد کرانا بھی ایک مصرف رکھا۔ دوسرا طریقہ گناہوں کے کفارہ میں غلام کو آزاد کرنے کا حکم دیا۔ مثلاً قتل خطا، ظہار، اور قسم توڑنے کا کفارہ علاوہ ازیں آپ ﷺ نے کسی انسان کو آئندہ کے لئے غلام بنانا حرام قرار دیا۔ اسی طرح اسلام نے غلامی کا خاتمہ کیا جو انسانیت پر احسان عظیم ہے۔

۱؎ ڈاکٹر گستاؤلی بان: تمدن ہند؛ (اردو ترجمہ علی بلگرامی) ص ۳۵۳

۲؎ ایضاً۔ ص ۳۵۴ ۳؎ النساء، ۴/۱

فصل دوم

مذہبی اثرات

دنیا میں بہت سے معلم، ہادی اور پیغمبر آئے۔لیکن تاریخ شاہد ہے کہ کسی کو اپنی زندگی میں اتنی کامیابی نہیں ہوئی جو حضرت محمد ﷺ کو ہوئی۔۱۰ھ میں جب آپؐ حج کے لئے تشریف لے گئے تو آپؐ کے ساتھ کوئی ڈیڑھ لاکھ مسلمان تھے جو ملک کے ہر حصے سے آئے تھے۔آپ نے دنیا میں جو دین پیش فرمایا اس نے اپنے لیے خود بخود جگہ بنالی۔چین میں کبھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی۔مگر چین کے کروڑوں مسلمان اور ہندوستان کے روز افزوں نومسلم اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام کی اندرونی کشش کتنی ہے۔وہ آپؐ ہی تھے جو تعصّبات سے بھری دنیا میں برملا فرما گئے کہ نسل، رنگ یا زبان سے کسی انسان کو دوسرے پر فوقیت نہیں۔حقیقی فضیلت تقویٰ اور نیکی کو حاصل ہے۔

آپ ﷺ نے اسلام کے اصول پر جس سختی سے عمل کرایا اسی کا نتیجہ ہے کہ تمام پست قومیں اسی کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتی رہی ہیں۔اسلام سے زیادہ مساوات کسی اور مذہب میں نظر نہیں آتی۔مثلاً رنگ و زبان کے متعلق نظریات کی تنوع پسندی کو بے اثر بنانے میں اسلام سے زیادہ کسی مذہب و مسلک کو کامیابی نہیں ہوئی۔

پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت بلا اختلاف تاریخ انسانی کا تاریک ترین اور پست ترین دور تھا۔صدیوں سے انسانیت جس پستی و نشیب کی طرف جارہی تھی اس کے آخری نقطہ کی طرف پہنچ گئی تھی۔روئے زمین پر اس وقت ایسی کوئی طاقت نہ تھی جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے اور ہلاکت کے غار میں گرنے سے روک سکے۔انسان اس صدی میں خدا فراموش ہو کر کامل طور پر خود فراموش بن چکا تھا۔وہ اپنے انجام سے بالکل بے فکر اور بے خبر اور برے بھلے کی تمیز سے قطعاً محروم ہو چکا تھا۔پیغمبروں کی دعوت کی آواز عرصہ ہوا دب چکی تھی۔جن چراغوں کو یہ حضرات روشن کر گئے تھے۔وہ ہواؤں کے طوفان میں اس طرح ٹمٹما رہے تھے جن سے صرف چند خدا شناس دل روشن تھے۔دیندار اشخاص دین کی امانت کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہو کر دیر و کلیسا اور صحراؤں کی تنہائیوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔زندگی کے مطالبات اور اس کی خشک و تلخ حقیقتوں سے دامن بچا کر دین و سیاست اور روحانیت و مادیت کے معرکہ میں شکست کھا کر اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گئے تھے۔آپؐ کی بعثت کے وقت دنیا میں دو بڑے مذاہب یہودیت اور عیسائیت موجود تھے۔اسی طرح رومی اور ایرانی اس وقت مغرب و مشرق کی امامت اور دنیا کی قیادت کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے۔وہ دنیا کے لئے کسی اچھا نمونہ ہونے کی بجائے ہر قسم کی خرابی اور فساد کے علمبردار و ذمہ دار تھے۔مختلف اجتماعی اور اخلاقی امراض کا عرصہ سے یہ قومیں آشیانہ بنی ہوئی تھیں ان کے افراد تعیش و تکلفات کی زندگی اور مصنوعی تمدن کے سمندر میں سرتا پا غرق تھے۔زندگی کی ہوس اور لذت کی حرص اتنی بڑھ گئی تھی کہ سیر ہی نہ ہوتے تھے، متوسط طبقہ کے لوگ (ہر زمانہ کے دستور کے مطابق) اس اعلیٰ طبقہ کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتے تھے۔اور تقلید کو باعث فخر سمجھتے تھے۔جب کہ عوام زندگی کے بوجھ اور حکومت کے مطالبات کے بار میں ایسے دبے ہوئے تھے اور غلامی و قانون کی بیڑیوں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ زندگی جانوروں سے بدتر تھی۔

تہذیب و تمدن' خود سری' بے راہ روی اور اخلاقی پستی کی نذر ہو گیا۔دنیا کے مختلف حصوں اور ملکوں میں ایسی دینی غفلت و خود فراموشی، اجتماعی بے نظمی و انتشار اور اخلاقی تنزل و زوال رونما تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ممالک تنزل و انحطاط اور شر و فساد میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں۔اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سا ملک دوسرے سے بڑھا ہوا ہے۔اس دور میں بڑے بڑے مذہب بازیچۂ اطفال اور منافقین کا تختۂ مشق بن گئے تھے۔ان مذاہب کی صورت و حقیقت دونوں اس درجہ مسخ ہو گئیں تھیں کہ اگر یہ ممکن ہوتا کہ کسی طرح

ان مذاہب کے پیشوا دنیا میں آ کر اپنے دین کا حال دیکھ سکیں تو قطعاً وہ اپنے مذاہب نہ پہچان سکتے۔[۱]

آپ ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا میں دو بڑے مذاہب یہودیت اور عیسائیت موجود تھے۔ یورپ، ایشیا، افریقہ میں بسنے والی قوم یہود دنیا کی تمام قوموں میں اس لحاظ سے برتر تھی کہ اس کے پاس دین کا بہت بڑا سرمایہ تھا اور اس میں دینی اصلاحات سمجھنے کی سب سے زیادہ صلاحیت تھی۔ لیکن یہ یہودی مذہب و تمدن یا سیاست میں وہ مقام نہیں رکھتے تھے۔ کہ دوسروں پر اثر ڈال سکیں بلکہ ان کے لئے مقدر ہو چکا تھا کہ دوسرے ان پر حکومت کریں۔ عرصۂ دراز تک غلام رہنے اور انواع واقسام کی سختیاں اور سزائیں برداشت کرنے کے سبب ان کا ایک خاص قسم کا مزاج بن گیا تھا۔ قومی غرور، نسبی تکبر، حرص اور مال و دولت کی حد سے بڑھی ہوئی طمع، مسلسل سودی کاروبار سے ان میں مخصوص قسم کی ذہنیت و سیرت اور قومی حصائل و عادات پیدا ہو گئے تھے۔ جن میں وہ ہمیشہ منفرد رہے۔ یہ قوم کمزور یا مغلوب ہونے کی صورت میں ذلت و خوشامد اور غالب ہونے کی صورت میں انتہائی بے رحم اور بد معاملہ ہوتی تھی۔ دغابازی، نفاق، سنگدلی و خود غرضی مفت خوری و حرام خوری، راہ حق سے لوگوں کو روکنا، ان کا قومی کردار تھا۔ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں وہ اخلاقی انحطاط، انسانی پستی اور اجتماعی فساد میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔

اسی طرح عیسائی مذہب میں اس درجہ تفصیل و وضاحت نہیں ملتی کہ جس کی روشنی میں زندگی کے اہم مسائل سلجھائے جا سکیں۔ یا اس کی بنیاد پر تمدن کی تعمیر ہو سکے۔ یا اس کے زیر ہدایت کوئی سلطنت چل سکے جو کچھ تھا وہ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات کا ہلکا سا خاکہ تھا۔ جس پر توحید کے سادہ عقیدے کا کچھ پرتو تھا۔ عیسائیت کا یہ امتیاز بھی اس وقت تک رہا جب تک کہ یہ مذہب سینٹ پال کی دستبرد سے بچا رہا۔ اس نے آ کر رہی سہی روشنی بھی گل کر دی۔ [۲] کیونکہ جس ماحول میں سینٹ پال کی پرورش ہوئی اس نے مسیحیت میں ان تمام جہالتوں اور لغویات کی آمیزش کر دی۔ جن سے وہ نکل کر آیا تھا۔ غرض چوتھی صدی میں عیسایت یونانی خرافات، رومی بت پرستی، اور مصری افلاطونیت کا شکار ہو گئی۔ آخر کار عیسائیت چند بے جان مراسم اور بے کیف عقائد کا نام رہ گیا تھا۔ جو نہ روح کو سکون دے سکتے تھے نہ عقل کی افزائش کا سبب بن سکتے تھے۔ اس پر تحریف و تاویل کی مصیبت اس سے بڑھ کر تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیت علم وفکر کے در کھولنے کی بجائے خود علم وفکر کے مسلسل انحطاط کے باعث صرف بت پرستی کا مذہب بن کر رہ گئی۔

وہ مغربی قومیں جو شمال و مغرب میں آباد تھیں۔ جہالت و ناخواندگی کا شکار اور خونی جنگوں سے زار و نزار تھیں۔ اور جنگ و جہالت کی پیدا کی ہوئی تاریکی میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ ان ممالک میں اب تک علم و تمدن کی صبح نمودار نہیں ہوئی تھی۔ جیسا کہ مغربی مفکر رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے۔

> ''پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جا رہی تھی۔ اس دور کی وحشت و بربریت زمانہ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی زیادہ بڑھی چڑھی تھی۔ کیونکہ اس کی مثال ایک بڑے تمدن کی لاش کی تھی جو گل سڑ گئی ہو۔ اس تمدن کے نشانات مٹ رہے تھے اور اس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی۔ وہ ممالک جہاں پر تمدن برگ و بار لایا اور گذشتہ زمانہ میں اپنی انتہائی ترقی کو پہنچ گیا تھا۔ جیسے اٹلی، فرانس اب وہاں وطوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا'' [۳]

ایران کے سلاطین جن کا لقب کسریٰ ہوا کرتا تھا اس بات کے مدعی تھے کہ ان کی رگوں میں خدائی خون ہے اہل ایران بھی انہیں اسی

---

[۱] ابوالحسن ندوی: انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ص: ۳۳
[۲] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، ص: ۳۴
[۳] The Making of Humanity, P.164

نظر سے دیکھتے تھے کہ گویا وہ خدا ہیں۔اہل ایران اپنی ایرانی قومیت کو عظمت وتقدیس کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔اور سمجھتے تھے کہ ان کو دنیا کی ہر قوم اور ہر نسل پر فوقیت وفضیلت حاصل ہے ان کو خدا کی طرف سے جو صلاحیتیں اور قابلیتیں ودیعت کی گئی ہیں اس میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔دوسری قوموں کو یہ ذلت وحقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

اہل ایران ایسے مکمل اور جامع دین سے یکسر محروم تھے جوان کے باطن کی اصلاح کرتا، ان کے اخلاق سنوارتا وہ آگ کی پرستش کرتے تھے آگ اپنے پجاریوں کو ہدایت دینے ان کے مسائل حل کرنے یا اپنا کوئی پیغام دینے سے یکسر قاصر ہے۔ایرانیوں کا مذہب چند رسوم ورواج کا حامل تھا۔اس طرح ان میں اور دنیا کے دیگر لا مذہب ولا قانون افراد میں اخلاق واعمال کے لحاظ سے ذرہ بھر فرق نہ تھا۔اسی طرح ہندوستان میں بدھ مت اپنی انفرادیت وسادگی کھو چکا تھا۔اور ہندومت میں گم ہو چکا تھا۔ہندوستان کے مورخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ چھٹی صدی عیسوی سے جو زمانہ شروع ہوتا ہے وہ مذہبی،اجتماعی اور اخلاقی لحاظ سے ملک کی تاریخ کا پست ترین دور تھا۔

ہندوستان کے اردگرد ممالک میں جو اجتماعی واخلاقی انحطاط رونما ہو چکا تھا اس میں یہ بھی کسی سے پیچھے نہ تھا۔بت پرستی عروج پر تھی، وید میں دیوتاؤں کی تعداد تینتیس تھی۔بتوں اور مجسموں، دیوی، دیوتاؤں کا کوئی شمار نہ تھا۔یہاں تک کہ شجر وحجر،معدنیات وجمادات،حیوانات سب ہی اس میں شامل ہیں۔ڈاکٹر گستاؤلی بان تمدن ہند میں لکھتا ہے۔

> ”رگ وید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا مفہوم ان کے یہاں نہیں ہے وہ متعدد دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے ان دیوتاؤں کی تین قسمیں کی جاسکتی ہیں (۱) آکاش کے دیوتا (۲) پرتھوی یعنی زمین کے دیوتا (۳) پانی کے دیوتا۔اور ان میں ہر ایک کے گیارہ گیارہ دیوتا ہیں گویا کل ۳۳ دیوتا ہوئے۔اور بعضوں نے ۳۳ سے تین ہزار تین سو تینتیس تک پہنچا دیئے ہیں۔بعض ان میں سے سودمندی اور فائدے کے خیال سے دیوتا مانے گئے ہیں اور بعض خوف اور ڈر کی وجہ سے مثلاً از روئے رگ وید اگنی (آگ) برق سے آئی اور دولکڑیوں کی رگڑ سے پیدا ہوئی۔لہذا ایسی شے جو آسمان سے زمین پر آئی۔دیوتا ہے۔آندھی،رعد اور برق خوف کی وجہ سے دیوتا ہیں سب سے بڑا دیوتا اندر ہے۔ جو نیلے آسمان کا دیوتا۔بادلوں کو جمع کرنے والا،گرج چمک کرنے والا،تاریکی کا مٹانے والا،روشنی کا لانے والا۔لیکن ان سب کے پیچھے ایک خیال ہے جو حسّیات سے پرے اور جس کا نام مذہب ہے“۔[۱]

اسی طرح کسی قوم میں اتنا بین طبقہ داری امتیاز اور پیشوں اور زندگی کے مشغلوں کی ایسی انمٹ اور اٹل تقسیم کم دیکھنے میں آئی ہے جیسی ہندوستان کے قدیم مذہبی ومعاشرتی قانون میں ہے۔منوشاستر میں چار ذاتیں بیان کی گئی ہیں۔برہمن،یعنی مذہبی پیشوا،کھشتری،(لڑنے والے) ویش،زراعت وتجارت پیشہ اور شودر جن کا کوئی خاص پیشہ نہ تھا۔اور جو دوسری ذاتوں کے صرف خادم تھے منوشاستر میں ہے۔

> ”قادر مطلق نے دنیا کی بہبودی کے لئے اپنے منہ سے اور اپنے بازوؤں سے اور اپنی رانوں سے اور اپنے پیروں سے برہمن،کھشتری،ویش اور شودر کو پیدا کیا“۔[۲]

> ”اس دنیا کی حفاظت کے لیے اس نے ان میں سے ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ فرائض قرار دئے“۔[۳]

---

۱ (مترجم علی بلگرامی) تمدن ہند،ص:۴۴		۲ منوشاستر؛باب اول؛۳۱

۳ منوشاستر؛باب اول؛۸۷

ہندوستانی سماج میں شودر جانوروں سے بھی بدتر درجہ رکھتے ہیں۔منوشاستر میں ہے۔

''برہمن کی خدمت کرنا شودر کیلئے نہایت قابل تعریف بات ہے اور اس کے سوا کسی اور چیز سے اسے اور کوئی اجر نہیں مل سکتا۔'' [۱]

غرض ہندوستان جو فطرت کے خزانوں سے مالا مال تھا سچے آسمانی مذہب کی تعلیمات سے محروم ہونے کے سبب رسوم و روایات کا پرستار بنا ہوا تھا دنیا کی اخلاقی و روحانی رہنمائی کی بجائے خود اندرونی خلفشار و انتشار میں مبتلا تھا۔

خلاصہ یہ کہ ہے اس ساتویں صدی مسیحی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہ آتی جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جا سکے اور نہ ایسی کوئی سوسائٹی تھی جو شرافت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کی حامل ہو۔نہ کوئی حکومت تھی جو عدل وانصاف پر مبنی ہو۔نہ ایسی قیادت تھی حکمت و دانائی کا پیکر ہو نہ کوئی ایسا دین تھا جو انبیاء کرام کی طرف سے نسبت رکھتا ہو۔

اس بارے میں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

ظهر الفساد فی البر و البحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقهم بعض الذی عملوا لعلهم یر جعون [۲]

''خرابی پھیل گئی ہے خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے نتیجہ میں تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھادے اور وہ باز آجائیں۔''

ایسے میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مبعوث فرمایا کہ قعرِ مذلت میں پڑی انسانیت کو روشنی کی طرف لائیں

الرٰ کتب انزلنه الیك لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور باذن ربهم الی صراط العزیز الحمید [۳]

''الرٰ، یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے تم پر اتاری ہے تاکہ تم تمام لوگوں کو ان کے پرودگار کے حکم سے تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاؤ اس خدا کے راستے کی طرف جو غالب اور تعریف والا ہے''

پہلی صدی ہجری میں جزیرۃ العرب میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی تھی۔اسلامی تمدن کا اپنی پوری روح اور مظاہر کے ساتھ قیام' مذاہب اور اخلاق کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز اور سیاست و اجتماع کی دنیا میں ایک بالکل نیا واقعہ تھا۔اس انقلاب سے دنیا کے سفر کی سمت بدل گئی۔اسلام کی یہ عظیم الشان فتح جاہلیت کے لئے ایک آزمائش وخطرہ بن گئی اس انقلاب کا اثر بہت وسیع اور گہرا تھا۔خدا پرستی کی وہ راہ جو جاہلیت کی حکومت و اقتدار میں دشوار و خطرات سے بھری ہوئی تھی۔اب بہت سہل اور محفوظ ہوگئی۔جاہلیت کے حلقہ اور ماحول میں خدا کی اطاعت مشکل تھی۔اب اسلامی ماحول میں خدا کی نافرمانی مشکل ہوگئی۔فسق و فجور، ظلم و بربریت کا برملا اظہار کل تک عام تھا تو اب ایسا کرنا مشکل تھا۔کل تک دعوۃ الی اللہ دینا جرم تھا جس کے لئے بڑی احتیاط اور راز داری کی ضرورت تھی اب وہ ایک کار خیر تھا جس کے لئے کسی راز داری کی ضرورت نہ تھی۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے

واذکروا اذانتم قلیل مستضعفون فی الارض تخافون ان یتخطفکم الناس فاوٰکم وایدکم بنصرہ ورزقکم من الطیبٰت لعلکم تشکرون [۴]

---

۱ منوشاستر؛ باب دھم:۱۲۹　　۲ الروم،۳۰/۴۱

۳ ابراہیم،۱۴/۱　　۴ الانفال،۸/۲۶

''اور وہ وقت یاد کرو جب تمہاری تعداد بہت تھوڑی تھی اور تم ملک میں کمزور سمجھے جاتے تھے تم اس وقت ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تم کو اچک نہ لے جائیں پھر اللہ نے تمہیں ٹھکانہ دیا اپنی مدد سے قوت بخشی اور اچھی چیزیں دے کر رزق کا سامان مہیا کر دیا تا کہ تم شکر گزار رہو''

اللہ کی طرف سے عطا کردہ اقتدار و طاقت کی وجہ سے مسلمانوں کو حکم و ممانعت کی قوت کو حاصل ہوگئی۔ اسلام کے اصول وحقائق لوگوں تک پہچانا اور عمل کروانا آسان ہوگیا۔ لوگوں کی طبیعتیں اور ذہنیتیں اسلام سے متاثر ہونے لگیں بالآخر جزیرۃ العرب میں عہد نبویؐ میں اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔ اسلام کے ساتھ نسبت باعث افتخار بن گئی دنیا اسلام سے قریب ہوتی چلی گئی۔ اسلام کے یہ اثرات نہ صرف علم وفلسفہ، مذہب وتمدن سے ظاہر ہوتے تھے۔ بلکہ لوگوں کے ضمیر اوران کے باطن بھی ان اثرات کی گواہی دیتے تھے۔

اسلام نے توحید کی دعوت پیش کی بت پرستی اور شرک کی ایسی مذمت کی کہ بت پرستی اور شرک ہمیشہ کے لئے بے وقعت اور ذلیل ہوگیا۔

جزیرہ نمائے عرب اسلام سے پہلے کبھی ایک اقتدار کے تحت متحد نہیں ہوسکا تھا۔ اور یہ کتنا انوکھا اور عجیب واقعہ تھا کہ پورے ملک نے آپ ﷺ کو متفقہ طور پر اپنا روحانی وسیاسی قائد تسلیم کرلیا تھا۔ جہاں بدامنی و نا اتفاقی کا دور دورہ تھا دس سال کی کوشش میں وہاں ایک مرکز کے تحت نظام قائم کر دینا آپ کا بے مثال کارنامہ تھا۔ مذہبی جوش اور مذہبی عقیدت، نقطۂ نظر کو تمام دوسرے پہلوؤں سے ہٹا کر ایک ہی پہلو پر مرتکز کر دیتی ہے اور خواہشات اور آرزوؤں کو حق کی جانب موڑ دیتی ہے۔ اس طرح ان میں ایک عمیق بصیرت پیدا ہوجاتی ہے جس کا مقابلہ کرنا کبھی آسان نہیں ہوتا۔ وہ حکومتیں جو دین کی نعمت سے محروم ہوتی ہیں اگرچہ تعداد میں ان سے کہیں زیادہ ہوں۔ ان کی برابری نہیں کرسکتیں۔ صدر اسلام میں مسلمانوں کو جو بے پناہ فتوحات حاصل ہوئیں وہ اسی سبب سے ہوئیں کہ مسلمان دین سے بہرہ مند تھے اور مخالفین میں دینی نقطۂ نظر مفقود تھا۔

عہد خلافت راشدہ میں دنیا کی دو عظیم سلطنتیں قیصر وکسریٰ کو شکست دے کر اسلامی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔ آپؐ کے بعد ایک صدی کے اندر ہی آپ کے پیرو ایک ایسی وسیع وعریض سلطنت کے مالک بن گئے تھے جو رومیوں کو ان کے انتہائی عروج کے وقت بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس سلطنت کے دامن میں اگر وہ ایک طرف خلیج بسکے (Biscay) سے دریائے سندھ اور چین کی سرحدوں تک پھیل گئے تھے تو دوسری طرف بحیرہ خوارزم اور دریائے نیل کے شمالی آبشاروں کو انہوں نے اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔ ریگ زارِ عرب کے فرزند رسولؐ کا نام خدائے بزرگ وبرتر کے نام کے ساتھ دن میں پانچ دفعہ ان سینکڑوں ہزاروں مسجدوں کے بلند میناروں سے پکارا جاتا تھا جو جنوبی یورپ اور شمالی افریقہ سے لے کر مغربی اور وسطی ایشیا تک پھیلی ہوئی تھیں۔

اپنی اس بے نظیر وسعت پذیری کے دور میں مسلمانون نے اپنے دینی عقائد، طرز کلام، حتی کہ اپنے جسمانی خدوخال کے اعتبار سے غیر قوموں کے افراد کی جتنی بڑی تعداد کو اپنے اندر جذب کیا اتنی بڑی تعداد میں دنیا میں کوئی قوم آج تک جذب نہ کرسکی۔ نہ یونانی، اشوری، کلدانی، آرامی اور فینقی جیسی قوموں کے آباؤ اجداد جزیرہ نمائے عرب ہی میں پیدا ہوئے لیکن سینکڑوں برس ہوئے زمانہ نے صفحۂ ہستی سے ان کا نام ونشان تک مٹا دیا لیکن مسلمان آج بھی زندگی کے وسعت پذیر میدان میں زندہ قوموں کے ساتھ رواں دواں ہیں۔ انسانیت کی بہتری و بھلائی کے لیے جو خدمات عربوں نے قرون وسطیٰ کی ابتدا میں انجام دی ہیں ویسی خدمت کسی قوم نے انجام نہیں دی۔

فلپ۔ کے۔ ہتی لکھتے ہیں۔

> ''مسلم اسپین کے ایک کالج کے بیرونی دروازہ پر جو کتبہ نصب ہے اس میں یہ مقبول مقولہ درج ہے۔ ''دنیا کا مدار چار چیزوں پر ہے۔ عالموں کا علم، اکابر کا عدل، عابدوں کا تقویٰ، اور

جوانمردوں کی شجاعت'' ؎۱

یہ بات بڑی حیران کن ہے کہ اس یورپی تحریر میں جو اسلامی تصورات پیش کئے گئے ہیں ان میں علم و دانش ہی کو پہلا مقام دیا گیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مسلمان حکمرانوں نے مغربی دنیا پر اپنی مردانگی، شجاعت، علمی قابلیت کا نہایت گہرا نقش بٹھایا تھا۔

قرونِ وسطیٰ کے یورپ کے ذہنی ارتقاء کی تاریخ میں مسلم سپین نے ایک نہایت ہی درخشاں باب کا اضافہ کیا۔ جبکہ اسلام سے قبل اس سوسائٹی کی حالت خاصی ناگفتہ بہ تھی امراء عیش پسند تھے اور راہب خواہشاتِ نفسانی کے غلام، دنیا کے نگہبان بادشاہ ہوتے ہیں اور دین کے رہنما علماء۔ لیکن ہر دو پر موت طاری تھی۔ آبادی کا ایک حصہ زندگی کی بنیادی ضروریات سے محروم تھا۔ امراء تو عیش کے دلدادہ تھے پادری بھی داد عیش دے رہے تھے۔ ان کے دل میں انجیل مقدس کا احترام تھا نہ غضب الٰہی کا ڈر۔ وہ صرف نفس کے بندے تھے۔ مذہب صرف ایک گورکھ دھندہ بن کر عبادت گاہوں کے افسروں پجاریوں کی اجارہ داری بن گیا۔ پیغمبر اسلام کی تعلیمات تھیں'' **الدین یسر**'' (دین آسانی کا نام ہے) وہ ہر ایک فرد انسانی کا معاملہ ہے۔

لا یکلف اللہ نفساً الا وسعھا ؎۲

''ہر شخص پر اس کی استطاعت کے مطابق ہی ذمہ داری ہے''

جبکہ یہودیوں کو اپنے ہم عصروں میں واحد قوم ہونے کی بنا پر ناز تھا۔ اگرچہ باقی دنیا میں وہ ملعون تھے لیکن اسلام نے برملا اعتراف کیا۔

فضّلکم علی العالمین ؎۳

''خدا نے تم کو سارے جہانوں پر فضیلت دی''

عیسائیوں کو اپنے بانی مذہب کی بعض خصوصیتوں پر ناز تھا جس سے باقی ساری دنیا کو انکار تھا۔ لیکن قرآن نے اس کو بھی قبول کیا کہ

عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ القاھا الی مریم و روح منہ ؎۴

''وہ اللہ کے رسول کلمۃ اللہ اور روح اللہ تھے''

لیکن ان دونوں قوموں کو بتا دیا کہ صرف مان لینا کافی نہیں عمل ضروری ہے۔ خدا کا حساب کتاب فرداً فرداً ہر انسان سے ہوگا۔ آپؐ نے بنی اسرائیل کے انبیاء ان سے قبل اور ان کے بعد کے انبیاء کے بارے میں قرآن کی رو سے فرمایا:

وان من اُمّۃٍ الا خلافیھا نذیر ؎۵

''اور بے شک ہر امت میں ایک ڈرانے والا تھا''

یہ فرما کر آپؐ نے دنیا کی ہر قوم کا دل جیت لیا۔ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک آنے والے رسولوں میں سے کچھ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ورسلاً قد قصصنا ھم علیك من قبل ورسلاً لم نقصصھم علیك ؎۶

''اور کچھ رسول ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا اس سے پہلے اور کچھ کا ہم نے آپؐ سے ذکر نہیں کیا''

اس طرح کسی کے لئے رنجش کی وجہ نہ رہی اور آپؐ رحمت اللعالمین ثابت ہوئے آپؐ نے فرمایا:

؎۱ تاریخ عرب، ص: ۱۶۷　؎۲ البقرہ، ۲/۲۸۶　؎۳ الاعراف، ۷/۱۴۰

؎۴ النساء، ۴/۱۷۱　؎۵ فاطر، ۳۵/۲۴　؎۶ النساء، ۴/۱۶۴

ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة و فی الاٰخرة حسنة[۱]

کہہ کر دین و دنیا دونوں کو باہم ملا دیا۔ ان میں فطری مساوات اور اختیاری فضیلت (اعمال صالح کی بنا پر) قائم کی اور جملہ سابقہ مذاہب کا احترام و اعتراف کرتے ہوئے ان کے مقابل اسلامی حیثیت یہ بیان کی کہ یہ آیت تجدید صداقت اور بنیادی مذہب ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں دین و دنیا دونوں کی اچھائی پوشیدہ ہے۔

دنیا میں ایک حیثیت کے قائدین کی کمی نہیں۔ سکندر اعظم اور نپولین وہٹلر کی زندگی صرف ایک سپہ سالار اور فاتح کے لئے مفید مواد و مطالعہ پیش کر سکتی ہے۔ گوتم بدھ کی زندگی ریاضت و عبادت میں خصوصی دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ہی سبق آموز ہو سکتی ہے۔ ہومر (Homer) صرف ایک شاعر تھا۔ افلاطون وارسطو صرف حکیم و فلسفی تھے۔ زندگی کے دوسرے شعبوں میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے برخلاف رسول اکرم کی حیات مبارکہ ہمہ جہتی حیثیت رکھتی ہے۔ اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر آپؐ نے قلیل عرصے میں عرب جیسے خانہ بدوش قبائل جہاں خانہ جنگیاں ہی رہا کرتی تھیں۔ ایک مستحکم و بڑی مملکت قائم کر دی۔ عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایسی حکومت قائم ہوئی جو پورے جزیرہ نما کو حلقہ بگوش اسلام بنا سکی اور یہ آپؐ کی قائدانہ خصوصیات و تعلیمات کی بدولت تھا کہ عرب جیسی گمنام اور جاہل قوم نے بین الممالک تعلقات میں پہلا قدم رکھا۔ اور فتوحات کی وسعت اور گہرائی کا جو ریکارڈ ان مسلمان قائدین نے قائم کیا وہ اب تک کسی قوم سے توڑا نہ جا سکا۔ ابتدائی چند سالوں میں عراق، ایران، فلسطین، شام، مصر، طرابلس، تونس، ترکستان، آرمینیا اور مغربی سندھ اور ہندوستان کو زیر کر لیا یہ سب علاقے آج بھی ٹھوس اسلامی علاقے ہیں ان میں سے اکثر کی زبان تک عربی ہو گئی ہے۔ کیونکہ "**الناس دین ملوکهم**" رعایا اپنے حاکموں کے دین پر ہی ہوتی ہے

ان قائدین میں وہ تمام صفات تھیں جو قوموں کی رہنمائی کے منصب جلیل کا اہل ثابت کرتی ہیں۔ ان کی نگرانی و قیادت ہی میں قوموں کی فلاح و سعادت کی ضمانت ہوتی ہے۔ مسلمانوں کے پاس آسمانی کتاب اور الٰہی شریعت موجود تھی۔ اس لئے ان کو اپنی طرف سے قانون سازی کی ضرورت نہ تھی۔

کنفیوشس کا قول ہے:

> "انسان گھاس کی طرح ہوتے ہیں اور حاکم ہوا کی مانند جس طرف ہوا چلتی ہے۔ گھاس ادھر ہی مڑتی چلی جاتی ہے"۔

یورپ کی مذہبی تاریخ اور مسیحی کلیسا کی سرگزشت کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اسلام کے دینی اثرات کے اور بہت سے نمونے اور نظیریں ملیں گی۔ خود لوتھر کی مشہور اصلاحی تحریک اپنے نقائص کے باوجود اسلام سے متاثر تھی۔ اور مؤرخین کو اس کا اعتراف ہے کہ اس کے بانی پر اسلامی تعلیمات کے اثرات پڑے تھے۔ اور صرف مذہب ہی نہیں بلکہ یورپ کی پوری زندگی اور اس کا تمدن اسلام سے متاثر ہوا ہے۔

رابرٹ بریفالٹ اپنی کتاب میں لکھتا ہے

> "یورپ کی ترقی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں اسلامی تمدن کا دخل نہ ہو۔ اور اس کی ایسی نمایاں یادگاریں نہ ہوں۔ جنہوں نے زندگی پر بڑا اثر ڈالا ہو" [۲]

ایک اور جگہ لکھتا ہے:

---

۱ البقرہ ۲، ۲۰۱　　　۲ The Making of Humanity, P. 190

''صرف طبعی علوم ہی یورپ میں زندگی پیدا کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ بلکہ اسلامی تمدن نے یورپ کی زندگی پر بہت عظیم الشان اور مختلف النوع اثرات ڈالے ہیں۔ اس کی ابتدا اسی وقت سے ہو جاتی ہے۔ جب اسلامی تہذیب و تمدن کی پہلی کرنیں یورپ پر پڑنا شروع ہوئیں'' ۱؎

اسی طرح ہندوستان کی قوموں کے اختلاف و معاشرت اور قانون سازی میں اسلامی ذہنیت اور اسلامی شریعت کے اثرات نظر آئیں گے۔ عورت کا احترام اور اس کے حقوق کا اعتراف مختلف اسلامی فتوحات کے اور مسلمانوں کے اختلاط کے بعد سے روز بروز زیادہ تسلیم کیا جانے لگا۔

البتہ گستاؤلی بان کے بقول:

''ہندوستان میں مسلمانوں نے ویسا گہرا اثر نہیں ڈالا جیسا کہ مصر میں، یہاں مفتوحین کا اثر فاتحین پر زیادہ پڑا جس کی مثال اسلامی دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ اس جدید تمدن نے جس کو افغان اور ترک و مغل ہندوستان میں لائے تھے۔ پہلے تو بہت کچھ انقلاب پیدا کیا۔ لیکن آخر میں پھر مفتوح قوم کے تمدن سے مغلوب ہو گیا'' ۲؎

متمدن دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن بعثت محمدیؐ اور ظہور اسلام کے بعد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اسلام یا مسلمانوں سے قطعاً متاثر نہیں ہوا۔ مسلمانوں نے تقریباً چھ سو سال تک دنیا کے وسیع علاقے پر حکومت کی۔ سیاسی غلبہ کے ساتھ اسلام صدیوں تک دنیا کی غالب تہذیب اور عالمی تہذیب بنا رہا۔ اسلام کی یہ تیز رفتار ترقی، اشاعت اور وسیع سلطنت، یہودیت اور عیسائیت کے لیے باعث حسد اور بغض و عناد بنی رہی۔

جس طرح موسم بہار میں نباتات اور انسانوں کے مزاج موسم سے متاثر ہوتے ہیں اسی طرح غیر محسوس و محسوس طریقہ پر اسلامی اقتدار کے زمانہ میں لوگوں کی طبیعتیں اور ذہنیتیں متغیر اور اسلام سے متاثر ہونے لگیں۔ دلوں میں گداز و نرمی پیدا ہوئی۔ اسلام کے اصول و حقائق دل و دماغ میں پیوست ہونے لگے۔ اسلام کے شعائر و خصوصیات کو اختیار کرنا ایک فخر اور تعریف کی چیز بن گئی۔ ان اثرات سے نہ علم و فلسفہ خالی تھا نہ مذاہب و تمدن، لوگوں کے ضمیر اور ان کے باطن، ان اثرات کی شہادت دیتے تھے اور ان کے اصلاحی میلانات اس کی غمازی کرتے تھے۔ مسلمانوں کے تنزل کے بعد بھی جو اصلاحی تحریکات ان قوموں میں پیدا ہوئیں وہ اسلام کے مذہبی اثرات اور خیالات کا نتیجہ ہیں۔

۱؎ The Making of Humanity, P.202

۲؎ تمدن ہند، ص: ۳۵۴

فصل سوم

سیاسی اثرات

اسلام کی ایک مختصر اور جامع تعریف یہ کی جاسکتی ہے کہ وہ بندے اور خدا تعالیٰ کے درمیان تعلق نیز بندوں کے ایک دوسرے کے ساتھ صحیح تعلقات کی تشریح کا نام ہے۔ان ہی دوگونہ تعلقات کی حیثیت سے وہ زندگی کے ہر شعبہ میں انسان کی رہنمائی اور ہدایت کرتا ہے۔

سیاست انسانی زندگی کا ایک بہت اہم شعبہ ہے اجتماعی زندگی میں نظم مملکت کا معاملہ ایک اہم معاملہ ہے۔اور کوئی بھی متمدن شخص اس سے کسی طرح گریز نہیں کرسکتا۔اسلام کا سیاسی نظام واضح کرتا ہے کہ صرف یہی نظام رضائے الٰہی کے مطابق ہے۔اس پر عمل پیرا ہونا تعلق مع اللہ کو قوی کرتا ہے اس کی وجہ سے بندوں کے باہمی تعلقات مرضی حق کے مطابق ہوجاتے ہیں۔اسلامی سیاست خالص دینی عمارت ہے جس کی بنیاد عقیدہ توحید، اور معبود حقیقی کے اعلیٰ و بے نظیر اسلامی تصور پر ہے۔اس اعتبار سے اسلام کا نظام سیاسی دنیا کے ہر سیاسی نظام سے کلیۃً ممتاز ہے۔اس میں اقتدار اعلیٰ اس ہستی کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے جو حقیقی مالک کائنات ہے۔

اسلام سے پہلے اس دنیا کا کیا حال تھا۔مشرق و مغرب شمال و جنوب کا کیا نقشہ تھا۔چین و عرب اور ہند سے لے کر روم و فارس تک معاصر دنیا کا عقلی و فکری مزاج کیا تھا۔آپ کی بعثت سے پہلے انسانیت ہلاکت کے غار میں گرنے کو تھی۔نشیب کی طرف جاتے ہوئے روز بروز اس کی رفتار میں تیزی پیدا ہورہی تھی۔انسان اس صدی میں خدا کا بھول چکا تھا۔انجام سے بے خبر برے بھلے کی تمیز کھو چکا تھا۔

رومی اور ایرانی اس وقت مغرب و مشرق کی امامت اور دنیا کی قیادت کے اجارہ دار بنے ہوئے تھے۔وہ دنیا کے لئے کوئی اچھا نمونہ ہونے کی بجائے ہر قسم کی خرابی اور فساد کے علمبردار و ذمہ دار تھے۔مختلف اجتماعی اور اخلاقی امراض کا عرصہ سے یہ قومیں نشانہ بنی ہوئی تھیں۔بادشاہ اور حکام خواب غفلت میں مدہوش اور نشۂ سلطنت میں سرشار تھے۔دنیا کے مختلف حصوں اور ملکوں میں ایسی دینی غفلت و خود فراموشی، اجتماعی بے نظمی و انتشار اور اخلاقی تنزل و زوال رونما تھا۔جیسے کہ یہ ممالک تنزل و انحطاط اور شر و فساد میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں۔نظام حکومت میں حد درجہ ابتری تھی۔حکام کی سخت گیری اور عوام کی اخلاقی گراوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قومیں اپنے اندرونی مسائل ہی میں الجھ کر رہ گئی تھیں۔ان کے پاس نہ دینی ہدایات تھیں اور نہ نظام حکومت کے لئے مستحکم و مقبول اصول۔اس طرح روم کی مشرقی ریاست میں اجتماعی بدنظمی انتہا کو پہنچ گئی تھی۔عام رعایا بے شمار مصائب کا شکار تھی۔ٹیکس اور محصول دوگنے چوگنے بڑھ گئے تھے۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے باشندے حکومت سے نالاں تھے اپنے ملکی حکمرانوں پر غیر ملکی حکمرانوں کو ترجیح دیتے تھے۔

یورپ کی وہ قومیں جو شمال و مغرب میں آبادی تھیں۔جہالت و ناخواندگی کا شکار تھیں۔ان ممالک میں اب تک علم تمدن کی صبح نمودار نہیں ہوئی تھی۔مشرق و مغرب کے ممالک میں جو انقلاب انگیز واقعات و تغیرات پیش آرہے تھے۔ان سے ان قوموں کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔اس زمانہ میں مغربی یورپ کے اندر یک جہتی اور نظام کے کوئی آثار نہیں تھے۔

مغربی مفکر رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے

''پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جارہی تھی۔اس دور کی وحشت و بربریت زمانہ قدیم کی وحشت و بربریت سے کئی درجہ زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔اس تمدن کے نشانات مٹ رہے تھے۔اس پر زوال کی مہر لگ چکی تھی وہ ممالک جہاں یہ تمدن رنگ لایا اور گزشتہ زمانہ میں اپنی انتہائی ترقی کو پہنچ گیا تھا۔جیسے اٹلی،

فرانس، وہاں تباہی، طوائف الملو کی اور ویرانی کا دور دورہ تھا'' [1]

یورپ' ایشیاء اور افریقہ میں رہنے والے یہودی اگرچہ دیگر اقوام میں ممتاز تھے کہ ان کے پاس دین کا سرمایہ تھا لیکن یہ یہودی، مذہب وتمدن یا سیاست میں وہ لگاؤ نہیں رکھتے تھے کہ دوسروں پر اثر ڈال سکیں۔ چھٹی صدی کے آخر میں یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی رقابت و منافرت اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ ایک دوسرے کو ذلیل کرنے، نیچا دکھانے، اپنی قوم کا انتقام لینے اور مفتوح کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ان دونوں مکاتب فکر سے کیا توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ انسانیت کے پاسبان ثابت ہوں گے۔ اہل ایران اپنی ایرانی قومیت کو عظمت وتقدس کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اپنے تئیں یہ سمجھ بیٹھے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر نسل پر اس قومیت ونسل کو فضیلت وبرتری حاصل ہے۔

مشرق اور وسط ایشیا کی دوسری قومیں بگڑے ہوئے بدھ مت اور وحشیانہ بت پرستی کے درمیان تھیں۔ نہ کوئی علمی دولت ان کے پاس تھی اور نہ سیاست کا کوئی ترقی یافتہ نظام ان کے پاس تھا۔

خالص آمرانہ حکومت کا دور دورہ تھا۔ اس زمانہ کی سیاست مطلق العنان بادشاہت تھی۔ یہ بادشاہت اکثر مخصوص خاندانوں کی عظمت پر قائم ہوئی تھی۔ جیسا کہ ایران میں تھا۔ کبھی یہ بادشاہت محض سلاطین کی عظمت پر قائم ہوتی تھی۔ جیسے اہل چین اپنے بادشاہ کو شہنشاہ فرزند آسمان کہتے تھے۔

کبھی بادشاہت کسی خاص گروہ یا کسی مخصوص وطن کا حق سمجھی جاتی تھی۔ جیسا کہ مملکت روما میں اعتقاد تھا۔ وہاں رومی وطن اور رومی قومیت کی عظمت بنیادی قانون تھا۔ دوسری قومیں اور دوسرے ملک اس قومیت کے غلام تھے۔

رابرٹ بریفالٹ Robert Brieffault رومی سلطنت کے بارے میں لکھتا ہے

> ''رومی سلطنت کی تباہی کا سبب وہاں کی بڑھی ہوئی خرابیاں نہ تھیں۔ بلکہ اصلی برائی اور بنیادی خرابی فساد وشر اور حقائق سے گریز کی عادت تھی۔ جو اس سلطنت کے قیام اور نشو ونما میں پہلے ہی دن سے موجود تھی۔ یہ خرابی سلطنت کے اندر جڑ پکڑ چکی تھی۔ جب کسی انسانی جماعت کی تعمیر اس طرح کمزور اور کج بنیاد پر کی جائے گی تو اس کے مرنے سے صرف ذہانتیں اور عملی سرگرمیاں نہیں بچا سکتیں۔ چونکہ خرابیوں پر ہی اس سلطنت کی بنیاد تھی۔ اس لئے اس کا خاتمہ اور زوال بھی ضروری تھا''۔ [2]

روم اور ایران دونوں جگہ عام طور سے لوگوں پر عیش پرستی کا بھوت سوار تھا۔ مصنوعی تہذیب اور پرفریب زندگی کا ایک سیلاب تھا جس میں سرتاپا غرق تھے۔ گویا ساتویں صدی عیسوی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہ آتی تھی جو شرافت اور اعلیٰ اقدار کی حامل کہلا سکے۔ نہ ایسی قیادت تھی جو علم وحکمت اپنے ساتھ رکھتی ہو۔ آپ ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا کی کیفیت ایک ایسے مکان کی تھی جس کی بنیادیں زلزلے نے ہلا دی ہوں۔

اگر آپ سیاسی رہنما ہوتے تو آپ ﷺ عرب کو ایک وطن قرار دے کر عربی قبائل کا ایک اتحاد قائم کرتے اور عرب کی مضبوط طاقتوں سے ایک مضبوط بلاک بنا لیتے۔

---

۱ The Making of Humanity, P. 164

۲ Ibid, P. 159

اور ایک عربی ریاست یا جمہوریہ کی بنیاد رکھتے اور بآسانی صدر ہو جاتے اور آپ کو عرب کے سرداران کا اشتراک بھی حاصل ہو جاتا اور وہ آپؐ کو عرب کی قیادت سونپ دیتے۔ لیکن آپ ﷺ اس لئے مبعوث نہیں ہوئے تھے کہ ایک بگاڑ کو تبدیل کر کے دوسرا بگاڑ اس کی جگہ پر لائیں اور ایک ناانصافی کو مٹا کر دوسری ناانصافی پیدا کریں۔

آپ ﷺ کا مقصدِ بعثت دنیا کو جنت کی بشارت اور عذابِ آخرت کی وعید پہنچانا تھا۔ آپ ﷺ کی بعثت کا مقصد انسانوں کی بندگی سے نکال کر صرف خدا کی بندگی کی طرف لانا تھا۔ نیکی کی ترغیب دینا اور بدی سے روکنا تھا۔ حلال و حرام کی تمیز سکھانا اور ان بیڑیوں کو کاٹنا تھا جو انسانوں نے اپنی نادانی سے یا مذاہب و حکومتوں نے زبردستی لوگوں کے پاؤں میں ڈال رکھیں تھیں۔ آپ ﷺ کے مخاطب صرف ایک قوم یا ایک ملک کے باشندے نہ تھے۔ آپ کا خطاب تمام انسانوں اور پورے انسانی ضمیر سے تھا۔

نبی کریم ﷺ نے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اپنی تعلیم و تبلیغ سے اس قوم کے مختلف عناصر کو اس طرح جوڑ دیا کہ یہ پوری قوم ایک بنیان مرصوص بن گئی یہ صرف متحد اور منظم ہی نہیں ہوگئی بلکہ اس کے اندر سے صدیوں کے پرورش پائے ہوئے اسباب نزع و اختلاف بھی ایک ایک کر کے دور ہو گئے اپنے ظاہر ہی میں متحد و مربوط نہیں ہوئی بلکہ اپنے باطنی عقائد و نظریات میں بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہوگئی۔ نہ صرف خود منظم ہوئی بلکہ اس نے پوری انسانیت کو بھی اتحاد و تنظیم کا پیغام دیا۔ یہ ایک بالکل اصولی اور انسانی تنظیم تھی۔ اس کے پیدا کرنے میں حضورؐ نے نہ تو نسلی، لسانی اور جغرافیائی تعصّبات سے کوئی فائدہ اٹھایا نہ قومی حوصلوں کی انگیخت سے کوئی کام لیا، نہ دنیوی مفادات کا کوئی لالچ دلایا، نہ کسی دشمن کے ہوّے سے لوگوں کو ڈرایا۔ دنیا میں جتنے بھی چھوٹے بڑے مدبر اور سیاست دان گزرے ہیں انہوں نے ہمیشہ اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل میں انہیں محرکات سے کام لیا تھا۔ اگر حضورؐ بھی ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتے تو یہ بات آپؐ کی قوم کے مزاج کے بالکل مطابق ہوتی۔ لیکن آپؐ نے نہ صرف یہ کہ ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ان میں سے ہر چیز کو ایک فتنہ قرار دیا۔ اور ہر فتنہ کی خود اپنے ہاتھوں سے بیخ کنی فرمائی آپؐ نے اپنی قوم کو صرف خدا کی بندگی اور اطاعت، عالمگیر انسانی اخوت، ہمہ گیر عدل و انصاف، اعلائے کلمۃ اللہ اور خوفِ آخرت کے محرکات سے جگایا۔ یہ سارے محرکات نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ تھے اس وجہ سے آپؐ کی مساعی سے دنیا کی قوموں میں صرف ایک قوم کا اضافہ نہیں ہوا بلکہ ایک بہترین امت ظہور میں آئی جس کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے۔

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر[1]

''تم دنیا کی بہترین امت ہو جو لوگوں کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لئے اٹھائے گئے ہو''

حضورؐ کی سیاست اور حضورؐ کے تدبر کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آپؐ جن اصولوں کے داعی بن کر اٹھے وہ فرد، معاشرہ اور قوم کی ساری زندگی پر حاوی تھے، انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ ان کے احاطہ میں آتا تھا۔ لیکن آپؐ نے اپنے کسی اصول کے معاملہ میں کبھی کوئی لچک قبول نہیں فرمائی۔ نہ دشمن کے مقابل میں نہ دوست کے مقابل میں۔

آپؐ کی پوری زندگی گواہ ہے کہ آپؐ نے کسی سختی سے دب کر کسی اصول کے معاملہ میں کوئی سمجھوتہ گوارا نہیں فرمایا۔ اسی طرح آپؐ جب دنیا سے تشریف لے گئے تو اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپؐ کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات اپنی جگہ پر پتھر کی لکیر کی طرح ثابت و قائم تھی۔ دنیا کے مدبروں اور سیاست دانوں میں سے کسی ایسے مدبر اور سیاستدان کا نشان آپ نہیں دے سکتے جو اپنے دو چار اصولوں کو بھی دنیا میں برپا کرنے میں اتنا مضبوط ثابت ہو سکا۔

---

[1] ال عمران، ۳/۱۱۰

حضور صلعم کی سیاست اس اعتبار سے بھی دنیا کے لئے ایک نمونہ اور مثال ہے کہ آپ ؐ نے سیاست کو عبادت کی طرح ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک رکھا۔ آپ جانتے ہیں کہ سیاست میں وہ بہت سی چیزیں مباح بلکہ بعض صورتوں میں مستحسن سمجھی جاتی ہیں جو شخصی زندگی کے کردار میں مکروہ اور حرام قرار دی جاتی ہیں۔

حضور صلعم کی سیاست اور حضور ؐ کے تدبر کا یہ بھی اعجاز ہے کہ آپ ؐ نے عرب جیسے ملک کے ایک ایک گوشہ میں امن وعدل کی حکومت قائم کر دی کفار ومشرکین کا زور آپ ؐ نے اس طرح توڑ دیا کہ فتح مکہ کے موقع پر فی الواقع انہوں نے گھٹنے ٹیک دیئے۔ یہود کی سیاسی سازشوں کا بھی آپ ؐ نے خاتمہ کر دیا۔ رومیوں کی سرکوبی کے لئے بھی آپ ؐ نے انتظامات فرمائے۔ یہ سارے کام آپ نے کر ڈالے لیکن اس سارے جہاد کے اندر انسانی خون بہت کم بہا۔ نبی کریم ؐ سے پہلے کی تاریخ بھی شہادت دیتی ہے اور آج کے واقعات بھی شہادت دے رہے ہیں کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں جانیں ختم ہو جاتی ہیں اور مال واسباب کی بربادی کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن نبی کریم ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے جو انقلاب برپا ہوا اس کی عظمت اور وسعت کے باوجود شاید ان نفوس کی تعداد سو سے زیادہ نہیں ہوگی۔ جو اس ساری جدوجہد کے دوران حضور ؐ کے ساتھیوں میں سے شہید ہوئے یا مخالف گروہ کے آدمیوں میں سے قتل ہوئے۔

نبی کریم ﷺ کی سیاست اور آپ ؐ کے تدبر کا ایک اور پہلو بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ آپ ؐ نے اپنی حیات مبارکہ میں ہی ایسے لوگوں کی ایک بڑی جماعت بھی تربیت کر کے تیار کر دی جو آپ ؐ کے پیدا کردہ انقلاب کو اس کے اصلی مزاج کے مطابق آگے بڑھانے اس کو مستحکم کرنے اور اجتماعی وسیاسی زندگی میں اس کے تمام مقتضیات کو بروئے کار لانے کے لئے پوری طرح اہل تھے۔ چنانچہ اس تاریخی حقیقت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ حضور ؐ کی وفات کے بعد اس انقلاب نے عرب سے نکل کر آس پاس کے دوسرے ممالک میں قدم رکھ دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کرۂ ارض کے تین براعظموں میں اس نے اپنی جڑیں جمالیں۔ اور اس کی اس وسعت کے باوجود اس کی قیادت کے لئے موزوں اشخاص ورجال کی کمی محسوس نہیں ہوئی یہاں جن تین براعظموں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان کے متعلق یہ حقیقت بھی ہر شخص جانتا ہے کہ ان کے اندر وحشی قبائل آباد نہیں تھے بلکہ وقت کی نہایت ترقی یافتہ جبار وقہار شاہنشاہتیں تھیں لیکن اسلامی انقلاب کی موجوں نے جزیرہ عرب سے اٹھ کر ان کو ان کی جڑوں سے اس طرح اکھاڑ پھینکا گویا زمین میں ان کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔ اور ان کے ظلم وجور کی جگہ ہر گوشے میں اسلامی تہذیب وتمدن کی برکتیں پھیلا دیں جن سے دنیا صدیوں تک متمتع ہوتی رہی۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ارباب سیاست اس صورت حال پر شرمندگی اور ندامت کا اظہار کرنے کی بجائے اس کو ہر انقلاب کا ایک ناگزیر نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن حضرت محمد ﷺ کی قیادت میں دنیا میں جو انقلاب رونما ہوا اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کوئی ایک واقعہ بھی ہم کو ایسا نہیں ملتا کہ کسی کے ناموس پر دست درازی ہوئی ہو۔ جو لوگ عوام کو ایک نظام میں پرونے اور ایک نظم قاہر کے تحت منظم کرنے کے لئے اٹھتے ہیں وہ بہت سی باتیں اپنوں اور بیگانوں پر اپنی سطوت جمانے اور اپنی ہیبت قائم کرنے کے لئے اختیار کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ساری باتیں ان کی سیاسی زندگی کے لازمی تقاضوں میں سے ہیں اگر وہ یہ باتیں نہ اختیار کریں گے تو سیاست کے جو تقاضے ہیں وہ ان کے پورے کرنے سے قاصر رہ جائیں گے۔

لیکن ہمارے نبی کریم ﷺ اس اعتبار سے بھی دنیا کے تمام اہل سیاست سے الگ رہے جب آپ ؐ اپنے صحابہ میں چلتے تو کوشش فرماتے کہ سب کے پیچھے چلیں مجلس میں تشریف رکھتے تو اس طرح گھل مل کر بیٹھتے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہوتا کہ حضرت محمد ﷺ کون ہیں کھانا کھانے کے لئے بیٹھتے تو دوزانوں ہو کر بیٹھتے اور فرماتے کہ میں اپنے رب کا غلام ہوں اور جس طرح ایک غلام کھانا کھاتا ہے اسی طرح میں بھی کھانا کھاتا ہوں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس زمانہ کی بدویانہ زندگی میں سیاست اس طمطراق اور اس ٹھاٹ باٹ سے آشنا نہیں ہوئی تھی جس کی وہ اب عادی ہوگئی ہے یہ خیال بالکل غلط ہے۔ سیاست اور اہل سیاست کا طریقہ ہمیشہ سے یہی رہا ہے۔ فرق اگر ہوا ہے تو محض بعض ظاہری باتوں میں ہوا ہے البتہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے ایک نئے طرز کی سیاسی زندگی کا نمونہ دنیا کے سامنے رکھا جس میں دنیوی کروفر کے بجائے خلافت الٰہی کا جلال اور ظاہری ٹھاٹ باٹ کی جگہ خدمت اور محبت کا جمال تھا لیکن اس سادگی اور فقر و درویشی کے باوجود اس کے دبدبے اور اس کے شکوہ کا یہ عالم تھا کہ روم وشام کے بادشاہوں پر اس کے تصور سے لرزہ طاری ہوتا تھا۔

آپ ﷺ کے بعد خلافت راشدہ کا دور آیا۔ اسلامی معاشرہ یا ہئیت اجتماعی میں خلیفہ، آنحضرت ﷺ کا جانشین خیال کیا جاتا ہے اسے مطلق سیاسی اور مذہبی اختیارات حاصل تھے۔ خلیفہ کا فرض تھا کہ وہ اسلامی قوانین کا تحفظ اور ان کا نفاذ کرے۔ عام فلاح و بہبود کی ذمہ داریاں اٹھانا بھی اس کا فرضِ منصبی تھا وہ مسلمانوں کا مذہبی اور سیاسی مرکز تھا۔ اس لحاظ سے اس کی حیثیت، قرون وسطیٰ کے پاپائے روم سے مختلف تھی سر تھامس آرنلڈ نے قرون وسطیٰ میں مشرق کے خلافت کے نظام حکومت میں اور مغرب کے کلیسائی نظام حکومت پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔

> ''یہ دونوں نظام مذہبی اثر اور قوت کی بنیاد پر قائم تھے اسلام اور عیسائیت دونوں عالمگیر مذہب تھے اور اپنا اپنا دائرہ عمل وسیع کرنے کی فکر میں ہمیشہ رہتے تھے اور ان دونوں میں فرق یہ تھا کہ مقدس رومی سلطنت، پچھلی بت پرست سلطنت ہی کی بگڑی ہوئی شکل تھی۔ اس کی بڑی دلیل یہ ہے کہ شہنشاہ شارلیمان ۷۶۸ء ۸۱۴ء کے انقلاب بت پرستانہ عقائد کے آئینہ دار تھے دوسرے یورپ میں دو فرمانروا تھے ایک سیاسی جسے شہنشاہ کہتے تھے۔ دوسرا مذہبی یا روحانی جسے پاپا (پوپ) سے خطاب کیا جاتا ہے لیکن خلافت کی بنیاد کسی پچھلے سیاسی نظام پر قائم نہیں تھی بلکہ وہ ایک جدید نظام تھا جس کی تعمیر اور تکوین زمانہ کی احتیاجات اور اس سیاسی ماحول کی بنیاد پہ ہوئی تھی کہ جو ظہور اسلام کے بعد عربوں کے بلاد فارس اور مشرقی سلطنت روما کے ایک بڑے حصے پر تسلط قائم کر لینے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ خلیفہ کے سیاسی فرمانروا ہونے کا مفہوم یہ تھا کہ وہ مذہبی اور سیاسی دونوں قسم کے اختیارات کا حامل ہے۔ مذہبی حیثیت سے اس کی حکومت کا حقیقی مقصد صرف دین کا تحفظ تھا۔ دین کے حامی کی حیثیت سے وہ جنگ کرتا تھا مذہب کو صدمہ پہنچانے والے افراد کو سزائیں دیتا تھا۔ نماز میں امامت اور جمعہ میں خطبہ دینا بھی اس کے فرائض میں شامل تھا لیکن پوپ صرف ایک راہب اعظم کی حیثیت رکھتا تھا جو صرف گنہگاروں کے قصور معاف کر سکتا تھا اور مذہبی معاملات میں اسے آخری فیصلہ کرنے کا حق حاصل تھا۔[1]

خلافت راشدہ کی قیادت کا دور تاریخ اسلام میں نہیں بلکہ تاریخ عالم کا درخشندہ دور ہے عدل وانصاف مواخات و مساوات اور انسانی حریت و آزادی، اسلام کی معاشرتی و تہذیبی ترقی وارتقاء اور انسانی فلاح و بہبود کا وہ زمانہ ہے جس میں ریاست وسیاست قانون و آئین، عدل اجتماعی اور مصالح انسانیت کے اصولوں پر عمل کر کے نوع انسانی کی آئندہ نسلوں کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ قائم کیا گیا۔

---

1. The Caliphate, P. 18

فلپ۔کے۔ ہِتی لکھتے ہیں

''ساتویں صدی عیسوی کے ابتدائی تیس پینتیس سالوں میں یہ پیش گوئی کرنے کی کوئی جرأت کرتا کہ دس بیس سال کے اندر باہر ایک نامعلوم طاقت عرب جیسی غیر متمدن سرزمین سے اٹھے گی اور اپنے زمانے کی دو نہایت بڑی سلطنتوں پر دھاوا بولے گی ایک پر قابض ہو جائے گی اور ایک کا بہترین علاقہ چھین لے گی تو اسے پاگل سمجھا جاتا۔لیکن بالکل ایسا ہی ہوا۔رسول ؐ کی وفات کے بعد عرب کی بانجھ زمین کو جیسے کسی نے جادو کے زور سے مردم خیز خطہ بنا دیا۔اس کی خاک سے ایسے ایسے عالی ہمت اور بلند حوصلہ لوگ اٹھے کہ شمار اور صفات کے اعتبار سے اور کہیں ان کی نظیر نہیں ملتی''۔[1]

مسلمانوں کی معجزہ نما فتوحات میں اس فوجی تکنیک کا بھی کچھ کم حصہ نہیں ہے جو انہوں نے مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے لق و دق صحراؤں کی مہمات جنگ میں استعمال کی تھیں۔اس سے مراد گھوڑ سوار اور شتر سوار فوجی دستوں کا استعمال ہے جس میں رومیوں کو کبھی مہارت نصیب نہیں ہوئی تھی۔بعض عرب قبیلوں کو بلاد شام ٗ عراق اور خاص کر ساحل عرب میں سیاسی حقوق پہلے ہی سے حاصل ہو چکے تھے ادھر نصرانی کلیسا میں عقائد کے اختلاف رونما ہو چکے تھے۔یونانی کلیسا کے مظالم انتہا کو پہنچ چکے تھے ان تمام عوامل نے مل کر عرب فوجوں کے لئے حالات سازگار کیے۔شام اور فلسطین کے سامی اور مصر کے حامی باشندوں نے ان اجنبی عربوں کو اپنے نفرت انگیز اور ظالم حکمرانوں کے مقابلہ میں بہتر جانا۔حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تحریک ہی کے زیر اثر مشرق جاگا اور اس نے مغرب کی ہزار سالہ غلامی کے طوق کو گلے سے اتار پھینکا۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ نئے فاتحین نے جو خراج عائد کیا وہ سابقہ حاکموں کے عائد کئے ہوئے محصولوں کے مقابلے میں کم تھا۔اب مفتوح زیادہ آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی فرائض ادا کر سکتے تھے۔

جزیرہ نمائے عرب کے باہر اور خاص کر یہودیوں اور نصرانیوں میں یہی چیز کام کر رہی تھی اور یہ فاتحین کے نقطۂ نظر سے تلوار کے بدل سے بھی زیادہ پسندیدہ بدل تھا اور مسلمان خدا کے اس کے حکم کے پابند تھے۔

قاتلو االذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الأخرِ ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتو االکتٰب حتیٰ یعطوا الجزیۃ عن یدٍو ھم صاغرون[2]

''اہل کتاب جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا اور اس کے رسول نے حرام بتایا ہے اور نہ سچے دین کو قبول کرتے ہیں ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر اور رعیت بن کر جزیہ دینا قبول کرلیں''

ممالک شرقیہ پر بہت سی اقوام نے تسلط حاصل کیا۔ایرانیوں ، یونانیوں اور رومیوں وغیرہ نے وقتاً فوقتاً حکومت کی اگرچہ ان اقوام کا ملکی تسلط ہمیشہ پر زور رہا مگر ان کا تمدنی اثر بہت کمزور تھا ان شہروں میں جہاں ان کا تسلط تھا۔نہ اپنا مذہب جاری کر سکے نہ اپنی زبان نہ علوم وفنون

مصر کا ملک خاندان بطلیموس اور رومیوں دونوں کے وقت اپنی اس قدیم حالت میں رہا اور یہاں خود فاتحین نے اپنی مفتوحہ قوم کی زبان مذہب اور طرز تعمیر اختیار کی۔جس نتیجہ کو نہ یونانی ٗ نہ ایرانی ٗ نہ رومی مشرق میں حاصل کر سکے تھے عربوں نے نہایت سرعت کے ساتھ

---

[1] تاریخ عرب (مترجم سید مبارز الدین)،ص:۵۶		[2] التوبہ،۹/۲۹

بلا جبر و اکراہ حاصل کر لیا۔ مسلمانوں کی مصر کی فتح کے بعد مصر اپنے گزشتہ سات ہزار برس کے تمدن کو بھول گیا۔ ایک صدی کے اندر ہی اس نے نیا مذہب اور ایک نئی زبان اور ایک نئی صنعت اس استحکام کے ساتھ اختیار کر لی کہ یہ چیزیں ان کے بعد بھی جنہوں نے ان کو جاری کیا قائم اور سلامت رہیں۔

عربوں سے پہلے مصریوں نے ایک ہی مرتبہ اپنے مذہب کو بدلا تھا اور وہ اس وقت جب قسطنطنیہ کے شہنشاہوں نے ملک میں غارت گری برپا کی تھی۔ اور تمام پرانی یادگاروں کو برباد اور منہدم کر دیا تھا۔ اور پرانے مصری معبودوں کی پرستش کو ایسا جرم ٹھہرایا تھا کہ جس کی سزا موت تھی مصریوں نے اس مذہب کو بالجبر قبول کیا تھا۔ اور جس سرعت کے ساتھ انہوں نے عیسائی مذہب چھوڑ کر کہ اسلام قبول کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس جابرانہ مذہب کا تسلط ان کے قلوب پر کس قدر کمزور تھا۔ جو اثر عربوں نے مصر پر ڈالا وہی انہوں نے افریقہ، شام، ایران و دیگر مفتوحہ ممالک میں بھی پھیلایا۔ ان کا یہ تسلط اور اس کے اثرات ہندوستان تک پہنچے بلکہ چین تک بھی پھیل گئے جہاں وہ صرف تجارت کی غرض سے گئے مگر اپنی اسلامی اقدار ساتھ لے کر گئے تھے۔ تاریخ عالم میں کسی قوم کے تسلط کی اس سے زیادہ صاف اور صریح مثال موجود نہیں ہے جن اقوام سے بھی مسلمانوں کا تعلق ہوا، چاہے چند روز کے لئے ہی کیوں نہ ہو، ان کے تمدن کو قبول کر لیا گیا۔ اسلام کے نام لیوا دیگر فاتحین ترک و مغل وغیرہ نے نہ صرف ان کے تمدن کو اختیار کر لیا بلکہ دنیا میں اس کی اشاعت کے حامی و سرپرست بن گئے۔

ول ڈیورانٹ (Will Durant) اپنی کتاب (Story of Civilization) میں لکھتا ہے۔

> ''اگر ہم تاریخ پر اثرات کے حوالے سے تجزیہ کریں تو آپؐ کا کوئی ثانی نہیں۔ آپؐ نے جاہلیت کی دلدل میں دھنسے ہوئے لوگوں کو روحانی اور اخلاقی رفعت سے ہمکنار کیا اور کسی بھی دوسرے مصلح یا پیغمبر کی نسبت کہیں زیادہ کامیاب رہے۔ تاریخ انسانی کا شاید ہی کوئی اور آدمی کبھی اپنے خوابوں کو اس قدر بھرپور انداز میں تعبیر دے سکا۔ آپؐ نے عربوں کو تہذیب کے ساتھ ساتھ ایک مذہب بھی دیا، کیونکہ مذہب کے علاوہ کوئی اور طریقہ دستیاب ہی نہ تھا۔ آپؐ کی بعثت کے وقت عرب ایک صحرا تھا۔ جہاں بہت سے بت پرست قبائل آباد تھے۔ آپؐ کے وصال کے وقت تک عرب ایک متحد قوم بن چکے تھے'' [1]

---

[1] مترجم یاسر جواد، اسلامی تہذیب کی داستان، ص: ۳۷

ساتواں باب

اسلامی قیادت کے مفقود ہو جانے
کے اسباب واثرات

فصل اول

الف) اسباب

زندہ قوموں کی بعض خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ کامیابی اور ترقی سے ہمکنار ہونے کے لیے دوسروں پر تنقید کرنے کی بجائے خود اپنا محاسبہ کرتی رہی ہیں۔ تنقید کا شوق ہر انسان کو ہوتا ہے اور ایک فرد دوسرے پر تنقید کر کے خوش بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک قوم دوسری قوم پر تنقید کر کے خوش ہوتی ہے۔ لیکن بہترین اور مفید تنقید وہ ہوتی ہے جو اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے کے لئے کی جائے۔ کسی قوم کے ذہنی طور پر ''بالغ'' ہونے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو ماضی اور حال کے آئینے میں تنقید کا موضوع بنائے اور اگر خامی نظر آئے تو اس کی ذمہ داری دوسرے افراد یا اقوام پر ڈالنے کی بجائے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ اس ناکامی و شکست میں خود اس قوم کا کیا حصہ ہے۔ اس قسم کی تنقید محض ایک ذہنی ورزش نہیں ہوتی۔ زندہ قومیں اس قسم کے تجزیے اور تنقید سے اہم نتائج اخذ کرتی ہیں۔ اور ماضی و حال کی خامیوں اور غلطیوں کو سمجھ کر مستقبل کے لئے صحیح راستے تلاش کرتی ہیں۔

مغربی ممالک اور خصوصاً یورپ کے مفکرین نے ان تین چار صدیوں میں اسی قسم کی تنقیدیں کی ہیں اور ان کی روشنی میں اپنی قوم کی کمزوریوں کے اسباب کی نشاندہی کر کے اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی تلافی کی ہے۔ چنانچہ آج مغرب کا بیشتر حصہ ترقی یافتہ ہو چکا ہے۔ اس فکری عمل کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دیگر علوم وفنون کی طرح خود تنقیدی کے فن کی راہ بھی ایک مسلمان مفکر ابن خلدون نے دکھائی تھی۔

ابن خلدون نے قوموں کے عروج، سالمیت اور فلاح کی بنیاد ''عصبیت'' پر رکھی ہے۔ عصبیت سے ابن خلدون کی مراد وہ قوت ہے جو کسی گروہ یا قوم میں محبت، یگانگت اور یک جہتی کے شدید احساسات پیدا کر کے اسے منظم رکھتی ہے اور اس قوت میں کمی کی وجہ سے قوم میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔ جو اس کے زوال کا باعث ہوتا ہے۔ اس عصبیت کو قائم رکھنے میں مذہب اور دیگر فکری و تہذیبی عناصر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ابن خلدون کہتا ہے۔

> ''جب کسی قوم کا برسر اقتدار گروہ ملک کے بیشتر وسائل پر قبضہ کر لیتا ہے تو دیگر طبقات میں بے چینی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حاکم گروہ کے ساتھ متصادم ہو جاتے ہیں تو محنت کش طبقے کی عصبیت حاکم گروہ کی عصبیت سے ٹکرا جاتی ہے اور دونوں کے درمیان عدم تعاون شروع ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ قوم کی شکست وزوال کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے''۔[1]

ابن خلدون کے بعض بنیادی نظریات ایک حد تک وہی ہیں جو پانچ سو سال بعد کارل مارکس نے پیش کئے حالانکہ ابن خلدون کے زمانے میں ذرائع پیداوار کے مسائل اس قدر پیچیدہ نہیں تھے جتنا مارکس کے زمانے میں۔

ابن خلدون کے نزدیک جس طرح انسان بچپن، جوانی اور ضعیفی کے مدارج سے گزرتا ہے، اسی طرح قومیں بھی ان مراحل سے گزرتی ہیں اور یہ مدارج تقریباً تین نسلوں میں طے ہو جاتے ہیں۔

اسلام ایک مکمل دین ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں زندگی کے ہر ہر شعبے سے متعلق ہدایات ہیں، یہ منشا ہرگز نہیں ہوتا کہ جس وقت ''**اکملت لکم دینکم**''[2] والی آیت حضورؐ پر نازل ہوئی تو بس وقت کی رفتار وہیں رک گئی اور انسانی معاشرہ جیسا کہ اس وقت تھا جامد ہو کر رہ گیا۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون، ص: ۱۹۵   [2] المائدہ، ۳/۵

ایسا سوچنا قرآنی تعلیم کے منافی ہوگا۔اس لئے مکمل دین کہنے سے مراد صرف یہ ہے کہ تغیر وتبدل کی جوصورت بھی ہواور جس زمانے میں بھی ہو، اسلام ان سب حالات میں صحیح صحیح رہنمائی کرتا ہے اور ہمیں وہیں سے فیضان حاصل کرنا چاہیے۔اسلام زمانے کی رفتار کونہیں روکتا اور چاہتا ہے کہ معاشرہ میں ضروری اصلاح وتجدید سے کام لے کر زندگی کو مفید اور با مقصد بنایا جائے۔اس کا دعویٰ تو یہ ہے کہ فکر وعمل کی ہر تبدیلی کے باوجود معاشرہ میں توازن، سلامتی اور داخلی وخارجی امن وطمانیت کی فضا اسی کے پیغام پر عمل پیرا ہوکر پیدا کی جاسکتی ہے۔

اسلام ایسا دین ہے جو کسی ایک زمانے تک محدود نہیں، جو تغیر کو آیت الٰہی کہتا ہے اور جو قرآن کی اس آیت ''**الذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا**''[۱] ''جنہوں نے محنت کی ہمارے واسطے، ہم سمجھادیں گے اپنی راہیں'' کے ذریعے ہر لمحہ اور ہر آن اس امر کی ترغیب دیتا ہے کہ لوگ مشیت الٰہی کے مضمرات جو لامتناہی ہیں اور جن کا تعلق انسانی زندگی سے بھی ہے، سمجھنے کی کوشش کرتے رہیں تاکہ کتاب و سنت سے زندہ اور کارآمد اصول دریافت کرنے کا سلسلہ جاری رہے۔قرآن وسنت اور قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ پر غور کرنے سے یہ بات بالکل آشکار ہوجاتی ہے کہ کسی قوم یا کسی ملت کو دنیوی سربلندی محض اس بناء پر نصیب نہیں ہوا کرتی کہ وہ آسمان سے عروج واقبال کا پیدائشی حق دنیا میں لے کر آئی ہے۔عادتِ اللہ شروع سے کچھ اس طرح جاری ہے کہ اس جہد وعمل کی دنیا میں ہر ایک کو اس کی کوشش کے مطابق حصہ دیا جاتا ہے۔مسلمان بھی قدرت کے اس اٹل قانون سے مستثنیٰ نہیں ہیں، بلاشبہ ان کو ''خیر الامم'' کا قابل فخر خطاب عطا کیا گیا ہے۔اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مسلمان قوم اللہ کی محبوب ترین قوم ہے یہ بات بھی اپنی جگہ تسلیم ہے کہ روئے زمین پر کوئی دین مسلمانوں کے دین کا ہم عصر نہیں ہے۔۔۔لیکن ان تمام باتوں سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالا جاسکتا کہ کوئی قوم صرف زبان سے اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ کرکے ہاتھ پیر ہلائے بغیر اوج ثریا کو چھوسکتی ہے اور اگر وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے تب بھی ترقیاں اور کامیابیاں خود آکر اس کے پاؤں چومیں۔

قرآن کریم اور تاریخ اسلام کا ایک سرسری مطالعہ بھی یہ بات ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ مسلمانوں کو سربلند کرنے کے لیے تمام وعدے دو شرطوں پر موقوف رکھے گئے ہیں۔

۱۔ صحیح معنوں میں مسلمان بن کر اپنی زندگی کو ہر شعبے میں اسلام کے تابع بنالینا۔

۲۔ ترقی کے ظاہری اسباب ووسائل جمع کرنے کی کوشش کرنا۔

یہ دو چیزیں وہ ہیں جن میں ترقی اور کامیابی کا راز مضمر ہے اور جن کو قرآن کریم نے نہایت صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ایک طرف ارشاد ہے:

وانتم الأعلون ان كنتم مؤمنين[۲]

''اور تم سربلند ہو، اگر تم مومن ہو''

دوسری طرف فرمایا جاتا ہے

واعدوالهم مااستطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم[۳]

''اور ان (دشمنوں) کے لیے ہر وہ قوت اور گھوڑوں کی چھاؤنیاں تیار کرو جن کی تم میں استطاعت ہے اور جن کے ذریعہ تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو ڈراؤ گے۔''

تاریخ اسلام کے جس انقلاب پر آپ نظر ڈالیں گے، قرآن کریم کے ان ارشادات کی صداقت واضح ہوتی چلی جائے گی۔جہاں

---

۱ العنکبوت، ۲۹/۶۹　　۲ آل عمران، ۳/۱۳۹　　۳ الانفال، ۸/۶۰

مسلمانوں نے سچا مسلمان بن کر ظاہری وسائل و اسباب جمع کرنے کی امکانی کوشش کی ہے، تو خواہ وہ اس کوشش کے باوجود دشمن کے مقابلہ میں کتنے ہی کم حیثیت کیوں نہ رہے ہوں، ہمیشہ فتح کا سہرا ان ہی کے سر بندھا ہے۔ شکست کی ذلت مسلمان کو صرف اس وقت اٹھانی پڑتی ہے جب وہ ان دونوں احکام میں کسی سے منہ موڑ بیٹھا ہو۔

کسی قوم کی قیادت کے زوال یا مفقود ہو جانے کے اسباب زیادہ تر داخلی و ذہنی ہوتے ہیں یا خارجی و عملی، خارجی و عملی ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

معاشرہ کی صحت یا مرض کا انحصار فکر کی صحت یا مرض پر ہے۔ درج ذیل اللہ کے فرامین سے اسی اصول کی وضاحت ہوتی ہے۔

ان الله لا يغير ما بقومٍ حتىٰ يغيروا ما بانفسهم[1]

''اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدلتی''

اور ایک دوسرا قول ہے

ذلك بان الله لم يك مغيراً نعمةً انعمها على قوم حتىٰ يغيروا ما بانفسهم[2]

''یہ اس لئے ہوا کہ اللہ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل لیتی''

ہر معاشرہ تین عناصر سے عبارت ہے۔ یعنی، افکار، اشخاص اور اشیاء، معاشرہ کا عروج اس وقت ممکن ہے جب اشخاص اور اشیاء صحیح افکار کے گرد گھومنے لگیں جب افکار و اشیاء کا محور اشخاص ہوں تو معاشرہ کمزور ہو جاتا ہے اور جب افکار و اشخاص، اشیاء کے گرد چکر لگانے لگیں تو معاشرہ تباہی کے کنارے پہنچ جاتا ہے۔

تو گویا معاشرہ کے یہ تین عناصر (افکار، اشخاص، اشیاء) ایک خاص تعلق کے مطابق ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ اور یہ تعلق زمان و مکاں کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اس تعلق کی نوعیت کے مطابق ہی فرد اور جماعت کے مابین تعلقات کا تانا بانا تشکیل پاتا ہے۔ اور معاشرہ میں بالا دستی کا محور متعین ہوتا ہے۔

معاشرہ کی صحت اس وقت اعلیٰ درجہ کی ہوتی ہے جب افکار کو بالا دستی حاصل ہو، افکار کو اشخاص کے طرزِ عمل اور معاشرہ کی سیاست کا مرکز بنایا جائے اور اشخاص و اشیاء اس محور کے گرد گھومیں۔ یہی وہ حالت ہے جس میں قیادت ان ذہین افراد کے ہاتھ میں آجاتی ہے جو چیلنجوں کا ادراک اور قوت فیصلہ رکھتے ہیں۔ فہم و فکر میں پختگی آجاتی ہے۔ جماعت و حاکم کی تمام تر توجہ عوام کے مسائل اور داخلی و خارجی چیلنجوں پر مرکوز رہتی ہے اور یہ مسائل جس قسم کی قربانی، تنظیم اور تیاری کا تقاضا کرتے ہیں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جب بالا دستی اشخاص کے حصے میں آئے تو افکار و اشیاء ان کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ اشخاص جاہ طلبی، ذاتی اثر و رسوخ اور قوت کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ خاندان، گروہ، علاقہ کی تعریف ہی سوچ کا موضوع بن جاتی ہے جو انتہائی سطحی ہے تمام تر توجہ ایسے فیصلوں پر مرکوز رہتی ہے جو مذہبی، خاندانی اور ملکی تعصّبات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ یہ امور سوچ پر اس طرح اثر انداز ہوتے ہیں کہ وسیع تر قومی مفاد میں فیصلوں کی گنجائش ہی نہیں رہتی داخلی اور خارجی خطرات کا احساس مٹنے لگتا ہے۔ اور جب اشیاء کو بالا دستی حاصل ہو جاتی ہے تو افکار و اشخاص اس کے گرد گھومتے ہیں اور سرمایہ دار اور تاجر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ تعیش اور فضول خرچی معاشرتی ثقافت کو سیاہ کرتی ہے۔ اجتماعی تعلقات کا تانا بانا ٹوٹنے لگتا ہے افکار و اقدار تجارتی مال اور اشیائے صرف بن جاتی ہیں۔ لوگ یومیہ ضروریات میں لگ جاتے ہیں۔ پستی اور ذلت قوم کا مقدر بن جاتی ہے۔

---

[1] الرعد ۱۳/۱۱ [2] الانفال ۸/۵۳

اسلامی تاریخ اس مسلمہ حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ اسلامی سیادت و قیادت نظریاتی ہے دورِ نبوت میں یہی دینی افکار و نظریات سیاست کو مضبوط کرتے تھے۔ اور انہیں عوام وخواص کے تعلقات کا محور بناتے تھے۔ اس دور کے ''اشخاص'' نظریہ اسلامی پر یقین رکھتے تھے اور ان کی ''اشیاء'' اس نظریہ کے گرد گھومتی تھیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم [۱]

''اللہ تعالیٰ نے مومنین سے ان کی جانیں اور مال خرید لئے ہیں''

آپ ؐ نے فرمایا:

''واللہ میں تمہاری تنگ دستی سے نہیں ڈرتا بلکہ تمہاری فراخ دستی سے ڈرتا ہوں جیسا کہ تم سے پہلے
لوگوں کو فراخی ملی اور ان میں حسد ورقابت پیدا ہوئی۔ کہیں
تمہیں بھی یہ ہلاک نہ کردے جیسے اس نے ان لوگوں کو ہلاک کیا'' [۲]

خلفائے راشدین کا زمانہ خالصتاً اسلامی نظریاتی زمانہ تھا خلفائے راشدین کے بعد قوت وعصبیت کے علمبردار افراد کا دور آیا اور اشخاص کی بالادستی کی راہ ہموار ہوئی۔

اس دور کے بعد ''اشیاء'' کی بالادستی کا دور آیا اور اسلامی معاشرہ اسی راہ پر چل پڑا لوگ دولت جمع کرنے اور جائیدادیں بنانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں ہو گئے۔ لوگوں کے مرتبے اور تعلقات اشیاء کی مناسبت سے متعین ہونے لگے۔ ان تین ادوار کے نتائج یہ تھے۔

نظریہ کی بالادستی کے دور میں اشخاص کی آراء متفق رہیں۔ ان کی وحدت مضبوط ہوئی اور معاملات ترقی پذیر رہے۔ اشخاص کی بالادستی کے دور میں خاندانی تنازعات نے خلافت کی جگہ لے لی۔ بے شمار فرقے وجود میں آئے۔ شخصی یا خاندانی تسلط توجہ کا مرکز بنا اور مذہبی تعصب انتہا کو پہنچ گیا۔ اشیاء کی بالادستی نے اسلامی معاشرہ کو مزید بیمار و کمزور کر دیا۔ نظریاتی شعار وعلامات تجارتی مال اور حرص وہوا کے ذرائع بن گئے اور اسلامی معاشرہ موت کے قریب ہو گیا۔

وہ کیا اسباب ہیں کہ عالم اسلام ایک سرے سے دوسرے سرے تک داخلی وخارجی طور پر شکست سے دوچار ہے اس تنزل کے خوفناک نتائج سے آنکھیں چرانا مزید المیہ ہوگا۔ اس کے اسباب کی صحیح نشاندہی لازم ہے۔

---

۱ التوبہ ۹/۱۱۱

۲ صحیح مسلم، کتاب الزھد، (شرح نووی) ۱۸/۹۵

داخلی اسباب

حضرت محمد ﷺ کی رہنمائی میں جو مسلم معاشرہ وجود میں آیا اور پھر ہجرت کے بعد سیاسی طاقت حاصل کر کے جس ریاست کی شکل اختیار کی اس کی بنا آپؐ نے الہامی تعلیمات پر رکھی تھی۔ اس ریاست کا اولین نظریہ یہ تھا کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اہل ایمان کی حکومت دراصل نیابت الٰہی ہے جسے مطلق العنانی کے ساتھ کام کرنے کا حق نہیں ہے۔ بلکہ اس کو لازماً اس قانون خداوندی کے تحت رہ کر ہی کام کرنا چاہیے جس کا ماخذ خدا کی کتاب ہے۔ اور اس کے رسولؐ کی سنت۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا:

ترکت فیکم امرین لن یضلوا ما تمسکتم بھا کتاب اللہ و سنته رسوله۱

''میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں جنہیں اگر تم تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت''

دوسری بات عدل و مساوات تھی تمام مسلمانوں کے حقوق بلحاظ رنگ و نسل و زبان و وطن برابر قرار دیئے۔ ان کے درمیان اخوت کا رشتہ استوار کیا۔

انما المومنون اخوة ۲ مومن تو ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔

آپؐ نے مزید صراحت فرمائی۔

''مسلمان بھائی بھائی ہیں کسی کو کسی پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بناپر''

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یا ایھاالناس انا خلقنکم من ذکر و انثیٰ و جعلنکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ۳

''لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خوب کھول کر یہ حقیقت بیان فرمادی ہے کہ اس دنیا میں انسانوں کے درمیان رنگ و نسل اور زبان و وطن کی جو تفریق کی گئی ہے اس کا مقصد اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کہ اس کے ذریعہ لوگ ایک دوسرے کی شناخت کر سکیں۔ جہاں تک عزت کا تعلق ہے وہ انسان کے ذاتی اعمال ہیں نہ کہ کوئی اور وجہ۔

اسلام کے ابتدائی دور میں اسلامی معاشرہ تمام تر قبائلی، نسلی اور وطنی عصبیتوں سے بالاتر تھا۔ لیکن آپؐ کی وفات کے بعد عرب کی قبائلی عصبیتیں طوفان کی طرح اٹھ کھڑی ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ مدعیان نبوت کے ظہور اور ارتداد کی تحریک میں یہی محرک موثر تھا۔ مسلیمہ کے ایک پیروکار کا قول ہے۔

''میں جانتا ہوں مسلیمہ جھوٹا ہے مگر ربیعہ کا جھوٹا مضر کے سچے سے اچھا ہے'' ۴

اسی طرح دوسرے مدعی نبوت طلیحہ کی حمایت میں بنی غطفان کے ایک سردار نے کہا تھا

''خدا کی قسم اپنے حلیف قبیلوں کے ایک نبی کی پیروی کرنا قریش کے نبی کی پیروی سے مجھ کو زیادہ محبوب ہے'' ۵

مدینہ میں جب حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی تو حضرت سعد بن عبادہؓ نے قبائلی عصبیت ہی کی بنا پر ان کی خلافت تسلیم کرنے سے اجتناب کیا تھا۔ ۶

۱　مسلم، الجامع، باب حجۃ النبیؐ، ۱/ ۳۹۷　　۲　الحجرات، ۴۹/ ۱۰　　۳　الحجرات، ۴۹/ ۱۳

۴　ابن جریر، الطبری، ۲/ ۵۰۸　　۵　ابن جریر، الطبری، ۲/ ۴۸۷　　۶　ابن جریر، الطبری، ۲/ ۴۴۹

ایسے ماحول میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے بے لاگ اور غیر متعصّبانہ طریقے سے نہ صرف تمام عرب قبائل، بلکہ غیر عرب نو مسلموں کے ساتھ بھی منصفانہ برتاؤ کیا اپنے قبیلے کے ساتھ انہوں نے امتیازی سلوک نہیں کیا جس سے وقتی طور پر یہ عصبیتیں دب گئیں۔البتہ حضرت عمرؓ کو اپنے آخر زمانے میں اس بات کا خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں ان کے بعد عرب قبائلی عصبیتیں (جو اسلامی تحریک کے زبردست انقلابی اثر کے باوجود ابھی بالکل ختم نہیں ہوئی تھیں) پھر نہ جاگ اٹھیں اور ان کے نتیجے میں اسلام کے اندر فتنے برپا ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اپنے امکانی جانشینوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حضرت عثمانؓ کے متعلق کہا: ''اگر میں ان کو اپنا جانشین تجویز کروں تو وہ ابی معیط (بنی امیہ) کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دیں گے اور وہ لوگوں میں اللہ کی نافرمانیاں کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں نے ایسا کیا تو عثمانؓ یہی کریں گے۔ اور اگر عثمانؓ نے یہ کیا تو وہ لوگ ضرور معصیتوں کا ارتکاب کریں گے اور عوام شورش برپا کر کے عثمانؓ کو قتل کر دیں گے۔ اسی چیز کا خیال ان کو اپنی وفات کے وقت بھی تھا۔ چنانچہ آخری وقت میں انہوں نے حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو بلا کر ہر ایک سے کہا'' اگر میرے بعد تم خلیفہ ہو تو اپنے قبیلے کے لوگوں کو عوام کی گردنوں پر سوار نہ کر دینا۔ مزید برآں چھ آدمیوں کی انتخابی شوریٰ کے لئے انہوں نے جو ہدایات چھوڑیں ان میں دوسری باتوں کے ساتھ ایک بات یہ بھی شامل تھی کہ منتخب خلیفہ اس امر کا پابند رہے کہ وہ اپنے قبیلے کے ساتھ کوئی امتیازی برتاؤ نہ کرے گا۔ مگر بدقسمتی سے خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ اس معاملے میں معیار مطلوب کو قائم نہ رکھ سکے۔ انکے عہد میں بنی امیہ کو کثرت سے بڑے بڑے عہدے اور بیت المال سے عطیے دئے گئے اور دوسرے قبیلے اسے تلخی کے ساتھ محسوس کرنے لگے۔ حضرت عثمانؓ کے نزدیک یہ صلہ رحمی کا تقاضا تھا چنانچہ وہ کہتے تھے کہ ''عمرؓ خدا کی خاطر اپنے اقرباء کو محروم کرتے تھے اور میں خدا کی خاطر اپنے اقرباء کو دیتا ہوں''۔ ایک موقع پر انہوں نے فرمایا: ''ابوبکرؓ وعمرؓ بیت المال کے معاملہ میں اس بات کو پسند کرتے تھے کہ خود بھی خستہ حال رہیں اور اپنے اقرباء کو بھی اسی حالت میں رکھیں۔ مگر میں اس میں صلۂ رحمی کرنا پسند کرتا ہوں۔ اس کا نتیجہ آخر کار وہی ہوا جس کا حضرت عمرؓ کو اندیشہ تھا۔ ان کے خلاف شورش برپا ہوئی اور صرف یہ نہیں کہ وہ خود شہید ہوئے، بلکہ قبائلی عصبیت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر سے سلگ اٹھیں [1] اور پھر مزید فرقوں میں بٹ گئے کچھ معتدل اور کچھ غالی ہو گئے۔ شیعوں میں اثناعشریہ کا فرقہ زیادہ پھیلا۔ یہ حضرت علیؓ سے لے کر ان کی بارہ پشت تک کی اولاد کو اپنا امام مانتے ہیں۔ اور ان کو ہی کتاب وسنت کا شارع سمجھتے ہیں ان ہی میں سے فرقہ اسماعیلیہ نکلا۔

اسماعیلیوں ہی سے ایک فرقہ باطنیہ ہوا جس کا عقیدہ یہ ہے کہ شریعت کے باطن کا علم صرف اس کے امام کو ہوتا ہے۔ قرامطہ، بوہرے، خوجے اور نزاری بھی اسماعیلیوں ہی میں سے ہیں۔ شیعوں ہی میں سے ایک فرقہ حاکمیہ ہوا جو خلیفہ حاکم بامر اللہ کا پیروکار تھا۔[2] باطنیوں میں سے بابی اور بہائی فرقے نکلے۔ شیعوں کے ساتھ خوارج کا فرقہ بھی پیدا ہوا۔ یہ ایک سیاسی فرقہ تھا جو شیخین کے علاوہ دوسرے دونوں حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو نعوذ باللہ گمراہ تصور کرتے تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کا حکم قابل قبول نہ سمجھتے تھے۔ وہ اس کے بھی قائل تھے کہ کوئی بھی مسلمان انتخاب کے ذریعہ خلیفہ ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے اس خیال کو دینی رنگ دے دیا۔ اور عبداللہ بن وہب الراسبی کو اپنا امیر المومنین بنایا پھر ان کے بھی کئی فرقے ہو گئے۔ اپنے اپنے عقائد میں انتہا پسند تھے۔ ایک فرقہ عبدالکریم عجرد کے ماننے والے عجاردہ کہلائے یہ اس کے قائل تھے کہ بچے جب تک جوان ہو کر باضابطہ ایمان نہ لائیں۔ خارج از اسلام ہیں ان کی بھی کئی شاخیں تھیں۔ میمونیہ، حلفیہ، حمزیہ، شعوبیہ اور خازمیہ وغیرہ۔

اہل سنت والجماعت میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل جیسے فقہاء ہوئے جن کے مقلدین حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی کہلائے۔ ان سے الگ اہل حدیث ہیں۔ جو کسی امام کے مقلد نہیں۔ مگر سنی ہی سمجھے جاتے ہیں

---

[1] ابن جریر، الطبری، ج ۳، ص: ۲۹۱　[2] سید صباح الدین، مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب، ص: ۲۴

اس طرح اسلام میں بے شمار فرقے پیدا ہو گئے جس ملک میں بھی مسلمان گئے اور پھیلے وہاں کوئی نہ کوئی مذہبی فرقہ ضرور پیدا ہوتا رہا۔ مثلاً ہندوستان میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں اباحتیوں کا ایک فرقہ ایسا بھی تھا جو گناہ کو گناہ نہیں سمجھتا تھا۔ اکبر بادشاہ نے خود دین الٰہی کا اجراء کیا۔ فرخ سیر کے زمانے میں میر محمد حسین رضوی مشہدی نے بھی اپنے نبی ہونے کا اعلان کیا۔ اس کے معتقدین فربودی کہلائے۔ انگریزوں کے زمانہ میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے کو نہ صرف مہدی ظاہر کیا بلکہ یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ حضرت عیسیٰؑ کی قوت اس میں لوٹ آئی ہے۔ یہاں پر یہ بتا دینا بھی مقصود ہے کہ شارع جب عصبیت سے روکتے ہیں تو اس سے ان کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ عصبیت کے غلط استعمال کو روکا جائے۔ اور محض حق کی نصرت و تائید کے لئے اس کا استعمال ہو۔

آپؐ نے فرمایا:

''جس نے قبائلی عصبیت کی طرف دعوت دی۔ وہ ہم میں سے نہیں جو قبائلی عصبیت کے لئے لڑا وہ ہم میں سے نہیں جو قبائلی عصبیت پر مرا وہ بھی ہم میں سے نہیں''[1] جب ایک صحابی نے اس کی وضاحت چاہی تو آپ نے فرمایا: ''اس سے مراد یہ ہے کہ تو کسی غیر منصفانہ مقصد کی خاطر اپنے قبیلے کی مدد کرے''

خلفائے راشدین کا زمانہ مجسم اسلامی نظریہ تھا یہ خلفاء کامل اشخاص کو دعوت اسلامی کی نشر و اشاعت کے لئے باہر بھیجتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں نظم و نسق اور حکومت کے بہت سے قاعدے ایرانیوں سے اخذ کئے حضرت عمرؓ کی سیاست کا ایک بڑا اصول یہ تھا کہ وہ قدیم سلطنتوں اور حکمرانوں کے قواعد اور انتظامات سے واقفیت پیدا کرتے تھے اور ان میں سے جو چیزیں پسند کے قابل ہوتی تھیں ان کو اختیار کرتے تھے، خراج، عشور، دفتر، رسید کاغذاتِ حساب ان تمام انتظامات میں انہوں نے ایران اور شام کے قدیم قواعد پر عمل کیا البتہ جہاں کوئی نقص پایا اس کی اصلاح کر دی۔[2]

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ ''عموماً مورخوں نے لکھا ہے کہ جب فارس کا رئیس ہرمزان اسلام لایا تو حضرت عمرؓ نے اس کو اپنے پاس خاص درباریوں میں داخل کیا۔ اور انتظامات ملکی کے متعلق اس سے اکثر مشورے لیتے تھے''[3]

جزیہ حالانکہ بظاہر مذہبی لگاؤ رکھتا تھا۔ تاہم اس کی تشخیص میں وہی اصول ملحوظ رکھے جو نوشیروان نے اپنی حکومت میں قائم کئے تھے۔ علامہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری نے جہاں نوشرواں کے انتظامات اور جزیہ کا ذکر کیا ہے وہاں لکھا ہے۔

وھی الوضائع التی اقتدیٰ بھا عمر بن الخطاب حین افتتح بلاد الفرس[4]

''اور یہ وہی قاعدے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے جب فارس کا ملک فتح کیا تو ان کی اقتداء کی''

خلفائے راشدین کے بعد جب خلافت عصبیت کا شکار ہو کر ملوکیت میں داخل ہو گئی اور اسلامی قیادت کا زوال شروع ہو گیا تو اس تغیر کا آغاز اسی طرح ہوا جیسے حضرت عمرؓ کو خدشہ تھا کہ کہیں انکے جانشین اپنے قبیلے اور اپنے اقرباء کے معاملے میں ان اقدار کو تبدیل نہ کر دیں جو آپؐ کے زمانے سے ان کے زمانے تک چلی آ رہی تھیں۔

مسلمان نہ صرف عصبیت کا شکار ہوئے۔ بلکہ وہ متعدد فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ سب سے پہلے شیعانِ علیؓ کا فرقہ وجود میں آیا۔ وہ حضرت علیؓ کے وصی ہونے پر کامل یقین رکھتے تھے۔ اس لئے اسلام کے پہلے تین خلفاء کے منکر ہو گئے۔ حضرت فاطمہؓ کی اولاد اوصیا سمجھ کر اپنا امام تسلیم کرتے رہے۔ اسی طرح علمائے ظاہر اور صوفیائے کرام کے اختلاف کی المناک داستان الگ ہے۔

---

1. ابوداؤد: بروایت جبیر بن مطعم، ابن الہیثمی، مجمع الزوائد، ۵/۲۲۲
2. شبلی نعمانی، الفاروق، ص:۳۰۹
3. الفاروق، ص:۳۱۰
4. تاریخ طبری، ص:۱۲۲

ان فرقہ بندیوں سے مسلمانوں میں جو انتشار پھیلا وہ ان کے سیاسی وخارجی انتشار سے کم مہلک ثابت نہیں ہوا۔شیعوں اور سنیوں کے تصادم سے ملی اور ملکی نقصانات ہوتے رہے۔

معاصر وحکمران اپنے سیاسی مصالح اور ذاتی مفاد و دینی رجحانات کی وجہ سے بعض مذہبی فرقوں کے حریف اور فریق بن جاتے۔ عبدالمالک بن مروان خارجیوں کا سخت مخالف رہا۔ ہشام بن عبدالمالک اموی نے امام زید بن علی بن حسین کو قتل کرادیا۔امام ابوحنیفہ عباسیوں کے بجائے سادات کی خلافت کے حق میں تھے۔منصور نے عہدہ قضاء نہ قبول کرنے کے بہانے سے ان کو قید خانہ میں بھجوا کر وہاں زہر دلوادیا۔ خلقِ قرآن کے مسئلہ پر معتصم باللہ بن ہارون نے احمد بن حنبل کو اٹھائیس مہینے تک جیل خانے میں رکھا۔اور برابر کوڑے لگواتا رہا۔

یہ درد بھری روئداد اس ملت کی ہے جو خیر الامت کہلائی۔جس کو اللہ نے یہ حکم دیا تھا کہ تم سب مل کر مضبوطی سے اللہ کے دین کی رسی کو پکڑے رکھو[۱] پھر یہ بھی حکم دیا کہ

''وہ آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کریں، ورنہ وہ بزدل ہو جائیں گے'' [۲]

حضرت معاویہؓ کے ہاتھ میں اختیارات کا آنا خلافت سے ملوکیت کی طرف اسلامی قیادت کے انتقال کا عبوری مرحلہ تھا حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جب حضرت معاویہؓ کی بیعت ہو جانے کے بعد ان سے ملے تو **السلام علیك ایها الملك** کہہ کر خطاب کیا،حضرت معاویہؓ نے کہا اگر آپ امیر المومنین کہتے تو کیا حرج تھا۔تو انہوں نے جواب دیا خدا کی قسم جس طرح آپ کو یہ حکومت ملی ہے اس طریقہ سے مجھے مل رہی ہوتی تو میں اس کا لینا ہرگز پسند نہ کرتا۔ [۳] حضرت معاویہؓ خود بھی یہ بات سمجھتے تھے۔ایک بار انہوں نے خود کہا تھا ''انا اول الملوک'' میں مسلمانوں میں پہلا بادشاہ ہوں۔ [۴] اسی طرح کے خیالات کا اظہار اپنے زمانہ خلافت کے آغاز میں مدینہ طیبہ میں تقریر کرتے ہوئے ان الفاظ میں کیا:

اما بعد، فانی والله ما ولیت امرکم حین ولیته وانا اعلم انکم لا تسرُّون بولایتی ولا تحبو نها وانی لعالم بما فی نفوسکم من ذالك ولکنی خالستکم بسیفی هذا مخالسة.......... وان لم تجدونی اقوم بحقکم کله فارضوا منی ببعضه [۵]

''بخدا میں تمہاری حکومت کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ تم میرے برسر اقتدار آنے سے خوش نہیں ہو اور اسے پسند نہیں کرتے اس معاملہ میں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے میں خوب جانتا ہوں،مگر میں نے اپنی اس تلوار کے زور سے تم کو مغلوب کر کے اسے لیا ہے..........اب اگر تم یہ دیکھو کہ میں تمہارا حق پورا پورا ادا نہیں کر رہا ہوں تو تھوڑے پر مجھ سے راضی رہو''

اس طرح جس تغیر کی ابتدا ہوئی تھی، یزید کی ولی عہدی کے بعد سے وہ ایسا مستحکم ہوا کہ۔اس کے بعد سے آج تک مسلمانوں کو انتخابی خلافت کی طرف پلٹنے کا کوئی موقع نصیب نہیں ہو سکا۔لوگ مسلمانوں کے آزادانہ اور کھلے مشورے سے نہیں بلکہ طاقت سے برسر اقتدار آتے رہے۔بیعت سے اقتدار حاصل ہونے کے بجائے اقتدار سے بیعت حاصل ہونے لگی۔بیعت کرنے یا نہ کرنے میں مسلمان آزاد نہ رہے۔بیعت کا حاصل ہونا اقتدار پر قابض ہونے اور قابض رہنے کے لئے شرط نہ رہا۔لوگوں کی اول تو یہ مجال نہ تھی کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آیا ہوا تھا اس کے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے لیکن اگر وہ بیعت نہ بھی کرتے تو اس کا نتیجہ ہرگز یہ نہ ہوتا تھا کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا ہو وہ ان کے بیعت نہ کرنے کی وجہ سے ہٹ جائے۔

۱　ال عمران،۳/۱۱　　۲　انفال،۸/۴۶　　۳　ابن الاثیر،البدایہ والنہایہ،۸/۴۲

۴　ابن عبدالبر،الاستیعاب،۱/۲۵۴　　۵　ابن کثیر،البدایہ والنہایہ،۸/۱۳۲

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی آہنی دیوار میں کئی رخنے پیدا ہو گئے۔ جن سے مسلسل فتنے اور مصائب نفوذ کرتے رہے۔ اب مسلمان قیادت خلافت کی بجائے شخصی حکومت اور موروثی بادشاہت تھی۔ مسلمان جو خلافت راشدہ کے نظام کو قابلِ تقلید اور نمونہ عمل سمجھتے تھے وہ خلافت کی جگہ ملوکیت سے ناخوش تھے۔ اس طرزِ عمل کو انہوں نے کبھی استحسان کی نظر سے نہیں دیکھا۔ علاوہ ازیں اس طرزِ حکومت میں قیصر وکسریٰ کی مستبدانہ خرابیاں پیدا ہو گئیں عام مسلمانوں کے دلوں میں زبردست ردّعمل پیدا ہوا۔ خفیہ واعلانیہ بغاوتیں ہوئی۔ حکومت کے اس نظم ونسق اور انصرام میں لامحالہ کمزوری اور ابتری پیدا ہونا تھی جو ہوئی۔

ولی عہدی کا نظام جو حضرت معاویہؓ نے یزید کو جانشین مقرر کر کے شروع کیا وہ ایک بڑی خرابی کا باعث بنا۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں ''حضرت معاویہؓ کے چار افعال ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا بھی ارتکاب کرے تو اس کے حق میں مہلک ہو۔ ایک ان کا اس امت پر تلوار سونت لینا اور مشورہ کے بغیر حکومت پر قبضہ کر لینا درآنحالیکہ امت میں بقایائے صحابہ موجود تھے دوسرے ان کا اپنے بیٹے کو جانشین بنانا حالانکہ وہ شرابی اور نشہ باز تھا، ریشم پہنتا اور طنبورے بجاتا تھا۔ تیسرے ان کا زیاد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا۔ چوتھے ان کا حُجر اور انکے ساتھیوں کو قتل کر دینا''۔[1]

اسکے بعد لوگوں کی آواز کو جبر وظلم کے دبانے کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا۔ اور اکثر اوقات ایسے واقعات بھی واقعہ پذیر ہوئے جو ظلم وجبر کی علامتیں بن گئے۔

حضرت معاویہؓ کے عہد میں سیاست کو دین پر بالا رکھنے کی اور سیاسی اغراض کے لئے شریعت کی حدیں توڑ ڈالنے کی جو ابتداء ہوئی تھی۔ ان کے اپنے نامزد کردہ جانشین یزید کے عہد میں وہ بدترین نتائج تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے زمانے میں تین ایسے اہم واقعات ہوئے جس نے پوری دنیائے اسلام کو لرزہ براندام کر دیا۔

یزید کی موت کے بعد مروان نے دو دو ولی عہد بنانے کی رسم ڈالی۔ یہ طریقہ نامزدگی بھی حد درجہ خرابی کا باعث بنا۔ ایک ولی عہد دوسرے کو راستے سے ہٹانے کے لئے ہر دم کوشاں رہتا۔ اس کشمکش اور رسہ کشی کی بدولت امورِ حکومت ادھورے رہتے۔ بنو امیہ کی حکومت شخصی اور مطلق العنان تھی۔ ایسی حکومتوں کا استحکام اور قیام حکمرانوں کی اہلیت اور شخصی قابلیت کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے ان حکمرانوں نے خلافتِ راشدہ کو ملوکیت میں تبدیل کرنے کے بعد نظامِ حکومت میں خلافِ شرع تبدیلیاں کیں۔ بیت المال کو شاہی خزانے میں تبدیل کر دیا۔

خلفائے راشدین بیت المال کو خدا اور خلق کی امانت سمجھتے تھے۔ اس میں قانون کے خلاف کچھ آنے اور اس میں سے قانون کے خلاف کچھ خرچ ہونے کو وہ جائز نہ رکھتے تھے فرمانرواؤں کی ذاتی اغراض کے لئے اس کا استعمال ان کے نزدیک حرام تھا۔ بادشاہی اور خلافت کے درمیان بنیادی فرق ہی ان کے نزدیک یہ تھا کہ بادشاہ قومی خزانے کو اپنی ذاتی ملک بنا کر اس میں اپنی خواہشات کے مطابق آزادانہ تصرف کرتا ہے اور خلیفہ اسے خدا اور خلق کی امانت سمجھ کر ایک ایک پائی حق کے مطابق وصول اور حق ہی کے مطابق خرچ کرتا ہے۔

بیت المال کے استعمال کے موقع پر حضرت عمرؓ نے اپنی مجلس میں کہا کہ ''خدا کی قسم میں ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ اگر میں بادشاہ ہو گیا ہوں تو یہ بڑی سخت بات ہے'' اس پر ایک صاحب نے کہا ''اے امیر المومنین، ان دونوں میں بڑا فرق ہے'' حضرت عمرؓ نے پوچھا وہ کیا۔ انہوں نے کہا'' خلیفہ کچھ نہیں لیتا مگر حق کے مطابق اور کچھ خرچ نہیں کرتا مگر حق کے مطابق۔ آپ خدا کے فضل سے ایسے ہی ہیں۔ رہا بادشاہ، تو وہ لوگوں پر ظلم کرتا ہے ایک سے بے جا وصول کرتا ہے اور دوسرے کو بے جا عطا کر دیتا ہے''۔[2]

---

[1] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۸/۱۳۰　　[2] طبقات ابن سعد، ۳/۳۰۶۔۳۰۷

اسی طرح ایک اور موقع پر حضرت عمرؓ اپنی ایک تقریر میں بیان کرتے ہیں کہ بیت المال میں خلیفہ کا کیا حق ہے

''میرے لئے اللہ کے مال میں سے اس کے سوا کچھ حلال نہیں ہے کہ ایک جوڑا کپڑا گرمی کے لئے اور ایک جاڑے کے لئے اور قریش کے ایک اوسط آدمی کے برابر معاش اپنے گھر والوں کے لئے لے لوں۔ پھر میں بس ایک آدمی ہوں مسلمانوں میں سے'' ۱؎

بیت المال کا اسلامی تصور یہ تھا کہ وہ خلیفہ اور اس کی حکومت کے پاس خدا کی امانت ہے۔ جس میں کسی کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں۔ دور ملوکیت میں بیت المال کا یہ تصور، اس تصور سے بدل گیا کہ خزانہ بادشاہ اور شاہی خاندان کی ملک ہے، رعیت بادشاہ کی محض باجگزار ہے اور کسی کو حکومت سے حساب پوچھنے کا حق نہیں ہے اس دور میں بادشاہوں اور شاہزادوں کی، بلکہ ان کے گورنروں اور سپہ سالاروں تک کی زندگی جس شان سے بسر ہوتی تھی وہ بیت المال میں بے جا تصرف کے بغیر کسی طرح ممکن نہ تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ میں جب شاہزادوں اور امراء کی ناجائز املاک کا محاسبہ کیا، اس وقت انہوں نے خود اپنی ۴۰ ہزار دینار سالانہ کی جائداد، جو انہیں اپنے والد عبدالعزیز بن مروان سے میراث میں ملی تھی بیت المال کو واپس کی۔ اس جائداد میں فدک بھی شامل تھا جو نبی کریم ﷺ کے بعد تمام خلفاء کے زمانہ میں بیت المال کی ملک رہا تھا۔ اور حضرت ابوبکرؓ نے اسے حضورؐ کی میراث میں آپ کی صاحبزادی تک کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مگر مروان بن الحکم نے اپنے زمانہ خلافت میں اسے اپنی ملک اور اپنی اولاد کی میراث بنا لیا ۲؎

بیت المال کی آمدنی کو دیکھئے تو نظر آتا ہے کہ اس کے بارے میں بھی حلال وحرام کی تمیز ان کے ہاں اٹھتی چلی گئی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے ایک فرمان میں ان ناجائز ٹیکسوں کی ایک فہرست دی ہے جو ان کے پیش رو شاہان بنی امیہ کے زمانے میں رعایا سے وصول کئے جاتے تھے۔ ۳؎ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے بیت المال کی آمدنی کے بارے میں شریعت کے قواعد کو کس بری طرح توڑنا شروع کر دیا تھا۔

اس سلسلے میں سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ جو غیر مسلم اسلام قبول کر لیتے تھے ان پر بھی اس بہانے سے جزیہ لگایا جاتا تھا کہ یہ محض جزیے سے بچنے کے لیے ایمان لا رہے ہیں حالانکہ اصل وجہ اس فعل کی یہ تھی کہ اشاعت اسلام سے ان کو بیت المال کی آمدنی کم ہو جانے کا خطرہ تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ نامزد ہوئے تو خراسان سے ایک وفد نے آ کر ان سے شکایت کی کہ ہزارہا آدمی جو مسلمان ہوئے تھے سب پر جزیہ لگا دیا گیا ہے اور گورنر کے تعصب کا یہ حال ہے کہ وہ اعلانیہ کہتا ہے کہ ''اپنی قوم کا ایک آدمی مجھے دوسرے سو آدمیوں سے زیادہ عزیز ہے''۔ اسی بنا پر حضرت موصوف نے الجراح بن عبداللہ الحکمی کو خراسان کی گورنری سے معزول کیا اور اپنے فرمان میں لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو داعی بنا کر بھیجا تھا نہ کہ تحصیلدار ۴؎

ایک اور اہم تغیر یہ تھا کہ مسلمانوں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آزادی سلب کر لی گئی۔ حالانکہ اسلام میں مسلمانوں کا یہ صرف حق ہی نہیں بلکہ فرض قرار دیا گیا ہے اور اسلامی معاشرہ وریاست کا صحیح راستے پر چلنا اس پر منحصر ہے کہ قوم کا ضمیر زندہ اور اس کے افراد کی زبانیں آزاد ہوں، ہر غلط کام پر وہ بڑے سے بڑے آدمی کو ٹوک سکیں اور حق بات برملا کہہ سکیں، خلافت راشدہ میں لوگوں کی یہ آزادی پوری

۱؎ ابن کثیر، البدایہ والنھایہ، ۷/۱۳۴　　۲؎ ابن کثیر، البدایہ والنھایہ، ۴/۱۶۴

۳؎ ابن جریر، الطبری، ۵/۳۲۱　　۴؎ ابن جریر: الطبری، ۴/۳۱۴

طرح محفوظ تھی۔ خلفائے راشدین اس کی نہ صرف اجازت دیتے تھے بلکہ اس پر لوگوں کی ہمت افزائی کرتے تھے ان کے زمانہ میں حق بات کہنے والے ڈانٹ اور دھمکی سے نہیں تعریف و تحسین سے نوازے جاتے تھے اور تنقید کرنے والوں کو دبایا نہیں جاتا تھا، بلکہ ان کو معقول جواب دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ لیکن دورِ ملوکیت میں ضمیروں پر قفل چڑھا دئے گئے اور زبانیں بند کر دی گئیں۔

ایک نمایاں تبدیلی یہ تھی کہ دورِ ملوکیت کے آغاز ہی سے بادشاہ قسم کے خلفاء نے قیصر و کسریٰ کا سا طرزِ زندگی اختیار کر لیا اور اس طریقے کو چھوڑ دیا جس پر نبی ﷺ اور چاروں خلفائے راشدین زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے شاہی محلات میں رہنا شروع کر دیا۔ شاہی حرس (Bodyguard) ان کے محلوں کی حفاظت کرنے اور ان کے جلو میں چلنے لگے۔ حاجب و دربان ان کے اور عوام کے درمیان حائل ہو گئے۔ رعیت کا براہِ راست ان تک پہنچنا اور ان کا خود رعیت کے درمیان رہنا' سہنا اور چلنا پھرنا بند ہو گیا۔ اپنی رعیت کے حالات معلوم کرنے کے لئے وہ اپنے ماتحت کارپردازوں کے محتاج ہو گئے جن کے ذریعہ سے کبھی کسی حکومت کو بھی صحیح صورتِ احوال کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ اور رعیت کے لئے بھی ممکن نہ رہا کہ بلاتوسط ان تک اپنی حاجات اور شکایات لے کر جا سکیں۔ یہ طرزِ حکومت اس طرز کے بالکل برعکس تھا جس پر خلفائے راشدین حکومت کرتے تھے وہ ہمیشہ عوام کے درمیان رہے جہاں ہر شخص ان سے آزادی کے ساتھ مل سکتا تھا۔ وہ بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور ہر شخص ان کا دامن پکڑ سکتا تھا وہ پانچوں وقت عوام کے ساتھ انہیں کی صفوں میں نمازیں پڑھتے تھے اور جمعہ کے خطبوں میں ذکر اللہ اور تعلیم دین کے ساتھ ساتھ اپنی حکومت کی پالیسی سے بھی عوام کو آگاہ کرتے تھے۔ اور اپنی ذات اور اپنی حکومت کے خلاف عوام کے ہر اعتراض کی جواب دہی بھی کرتے تھے۔ اس طریقے کو حضرت علیؓ نے کوفے میں اپنی جان کا خطرہ مول لے کر بھی آخری وقت تک نبھایا۔ لیکن ملوکیت کا دور شروع ہوتے ہی اس نمونے کو چھوڑ کر روم و ایران کے بادشاہوں کا نمونہ اختیار کر لیا گیا۔ اس تبدیلی کی ابتدا حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ بعد میں یہ برابر بڑھتی ہی چلی گئی۔[1]

اسلامی ریاست کے بنیادی قواعد میں سے ایک اہم قاعدہ یہ تھا کہ حکومت مشورے سے کی جائے اور مشورہ ان لوگوں سے لیا جائے جن کے علم، تقویٰ، دیانت، اور اصابتِ رائے پر امت کو اعتماد ہو۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں قوم کے بہترین لوگ ان کے مشیر تھے جو دین کا علم رکھنے والے اور اپنے علم و ضمیر کے مطابق پوری آزادی کے ساتھ بے لاگ رائے دینے والے ہوتے تھے۔ پوری قوم کو ان پر یہ اعتماد تھا کہ وہ حکومت کو کبھی غلط راستے پر نہ جانے دینگے۔ یہی لوگ امت کے اہل الحل والعقد تسلیم کئے جاتے تھے۔ مگر جب ملوکیت کا دور آیا تو یہ قاعدہ بھی بدل گیا۔ شوریٰ کی جگہ شخصی استبداد نے لے لی۔ حق شناس اور حق گو اہلِ علم سے بادشاہ اور بادشاہوں سے یہ لوگ دور بھاگنے لگے اب بادشاہوں کے مشیر اگر تھے تو ان کے گورنر، قائدین، شاہی خاندان کے امراء، اور درباری لوگ تھے نہ کہ وہ اہل الرائے اصحاب جن کی قابلیت اور دیانت و امانت پر امت کو اعتماد تھا۔

اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ایک بڑھتے ہوئے تمدن میں پیش آنے والے قانونی مسائل میں فیصلہ دینے والا کوئی ایسا با اختیار ادارہ باقی نہ رہا جس کی طرف معاملات میں بروقت رجوع کیا جا سکتا ہو، جس کے اجماعی یا جمہوری فیصلے قانونِ اسلامی کے جز بن جائیں۔ اور پھر ملک کی تمام عدالتیں انہی کے مطابق معاملات کے تصفیے کرنے لگیں۔ جہاں تک حکومت کے نظم و نسق، اہم داخلی و خارجی مسائل، اور عام پالیسی کے معاملات کا تعلق تھا، یہ شاہی کونسل ان کے فیصلے تو برے بھلے کر سکتی تھی۔ لیکن قانونی مسائل کے فیصلے کرنا اس کے بس کا کام نہ تھا۔

---

[1] البدایہ والنہایہ، ۴/۲۰۳

ایک اور عظیم تغیر جو اس دور ملوکیت میں رونما ہوا وہ یہ تھا کہ اس میں قوم،نسل،وطن اور قبیلہ کی وہ تمام جاہلی عصبیتیں پھر سے ابھر آئیں جنہیں اسلام نے ختم کر کے خدا کا دین قبول کرنے والے تمام انسانوں کو یکساں حقوق کے ساتھ ایک امت بنایا تھا۔بنی امیہ کی حکومت ابتدا ہی سے ایک عرب حکومت کا رنگ لیے ہوئے تھی جس میں عرب مسلمانوں کے ساتھ غیر عرب نومسلموں کے مساوی حقوق کا تصور قریب قریب مفقود تھا۔اس میں اسلامی احکام کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے نومسلموں پر جزیہ لگایا گیا۔جیسا کہ اس سے پہلے بیان ہوا کہ اس سے اشاعتِ اسلام میں شدید رکاوٹ پیدا ہوئی بلکہ عجمیوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اسلامی فتوحات نے دراصل ان کو عربوں کا غلام بنا دیا ہے اور اب وہ اسلام قبول کر کے بھی ان کے برابر نہیں ہو سکتے۔یہ خرابی اور آگے بڑھی۔والی،قاضی حتیٰ کہ امام نماز مقرر کرتے ہوئے بھی یہ دیکھا جانے لگا کہ آدمی عرب ہے یا غیر عرب۔کوفے میں حجاج بن یوسف نے حکم دے رکھا تھا کہ عرب کے سوا کوئی شخص نماز میں امام نہ بنایا جائے۔[۱] عراق میں نبطیوں کے ہاتھوں پر مہریں لگائی گئیں۔بصرے سے نومسلم عجمیوں کا وسیع پیمانے پر اخراج کیا گیا۔[۲]

یہی وہ طرزِ عمل تھا جس نے عجم میں شعوبیت (عجمی قوم پرستی) کو جنم دیا۔اور اسی کی بدولت خراسان میں بنی امیہ کے خلاف عباسیوں کی دعوت کو فروغ نصیب ہوا عجمیوں میں عربوں کے خلاف جو نفرت پیدا ہو چکی تھی،عباسی داعیوں نے اسے بنی امیہ کے خلاف استعمال کیا،اور انہوں نے اس امید پر عباسیوں کا ساتھ دیا کہ ہمارے ذریعہ سے انقلاب ہوگا تو ہم عربوں کا زور توڑ سکیں گے۔

یہ پالیسی صرف عرب وعجم کے معاملے ہی تک محدود نہ تھی بلکہ خود عربوں میں بھی اس نے سخت قبائلی تفریق برپا کر دی۔عدنانی اور قحطانی،یمانی اور مضری،ازد اور تمیم،کلب اور قیس کے تمام پرانے جھگڑے اس دور میں پھر سے تازہ ہو گئے۔حکومت خود قبیلوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتی تھی اور اس کے عرب گورنر اپنی اپنی ولایتوں میں پورے تعصب کے ساتھ اپنے قبیلے کو نوازتے اور دوسرے قبیلوں کے ساتھ بے انصافیاں کرتے تھے۔

حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں ابن عساکر کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں عباسی فوجیں دمشق پر چڑھی چلی آ رہی تھیں اس وقت بنی امیہ کے دارالسلطنت میں یمانی اور مضری کی عصبیت پوری شدت کے ساتھ بھڑکی ہوئی تھی حتیٰ کہ ہر مسجد میں دو محرابیں الگ الگ تھیں اور جامع مسجد میں دو منبروں پر دو امام خطبے دیتے اور جماعتوں کی الگ الگ امامت کراتے تھے۔ان دونوں گروہوں میں سے کوئی کسی کے ساتھ نماز تک پڑھنے کے لئے تیار نہ تھا۔[۳]

اسلام جس بنیاد پر دنیا میں اپنی ریاست قائم کرتا ہے وہ یہ ہے کہ شریعت سب سے بالا ہے۔حکومت اور حکمران،راعی اور رعیت،بڑے اور چھوٹے،عوام اور خواص سب اس کے تابع ہیں،کوئی اس سے آزاد یا مستثنیٰ نہیں اور کسی کو اس سے ہٹ کر کام کرنے کا حق نہیں۔دوست ہو یا دشمن،حربی کافر ہو یا معاہد،مسلم رعیت ہو یا ذمی،مسلمان وفادار ہو یا باغی،غرض جو بھی ہو شریعت میں اس سے برتاؤ کرنے کا ایک طریقہ مقرر ہے جس سے کسی حال میں تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔

خلافت راشدہ اپنے پورے دور میں اس قاعدے کی سختی کے ساتھ پابند رہی ہے حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے انتہائی نازک اور سخت اشتعال انگیز حالات میں بھی حدود شرع سے قدم باہر نہ رکھا ان راست رو خلفاء کی حکومت کا امتیازی وصف یہ تھا کہ وہ ایک حدود آشنا حکومت تھی نہ کہ مطلق العنان حکومت۔

---

۱ ابن عبد ربہ،العقد الفرید،۲/۲۳۳　۲ ابن عبد ربہ،العقد الفرید،۳/۴۱۶　۳ البدایہ والنھایہ،۱۰/۴۵

ملوکیت کے دور میں بادشاہوں نے اپنے مفاد، اپنی سیاسی اغراض اور خصوصاً اپنی حکومت کے قیام و بقاء کے معاملہ میں شریعت کی عائد کی ہوئی کسی پابندی کو توڑ ڈالنے اور اس کی باندھی ہوئی کسی حد کو پھلانگ جانے میں تامل نہ کیا۔ اگر چہ ان کے عہد میں مملکت کا قانون اسلامی قانون ہی رہا۔ کتاب اللہ وسنت رسول اللہ ؐ کی آئینی حیثیت کا ان میں سے کسی نے کبھی انکار نہیں کیا۔ عدالتیں اسی قانون پر فیصلے کرتی تھیں اور عام حالات میں سارے معاملات شرعی احکام ہی کے مطابق انجام دیئے جاتے تھے۔ لیکن ان بادشاہوں کی سیاست دین کی تابع نہ تھی۔ اس کے تقاضے وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورے کرتے تھے اور اس معاملہ میں حلال و حرام کی تمیز روا نہ رکھتے تھے۔ یہ پالیساں حضرت امیر معاویہؓ کے عہد سے ہی شروع ہوگئی تھیں۔

امام زہری کی روایت ہے کہ رسول اکرمؐ اور چاروں خلفائے راشدین کے عہد میں یہ سنت تھی کہ نہ کافر مسلمان کا وارث ہوسکتا ہے اور نہ مسلمان کافر کا۔ حضرت معاویہؓ نے اپنے زمانۂ حکومت میں مسلمانوں کو کافر کا وارث قرار دیا اور کافر کو مسلمان کا وارث قرار نہ دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے آکر اس بدعت کو موقوف کیا مگر ہشام بن عبدالملک نے اپنے خاندان کی روایت کو پھر جاری کر دیا۔[۱]

اس کے علاوہ مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کے احکام کی صریح خلاف ورزی کی۔ کتاب وسنت کی رو سے پورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہیے اور باقی چار حصے اس فوج میں تقسیم کئے جائیں جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت سے سونا اور چاندی ان کے لئے الگ نکال لیا جائے پھر باقی مال شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔[۲] حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کاروائی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔[۳] اسی طرح کے بہت سے غیر شرعی احکام امیر معاویہؓ کے دور حکومت میں روا رکھے گئے اور بعد ازاں اموی خلفاء نے اسی نہج کو اپنایا۔

بنی امیہ کی حکومت سندھ سے لے کر سپین تک دنیا کے ایک بہت بڑے حصے میں کمال درجہ دبدبے کی حکومت تھی اور بظاہر اس کی طاقت کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ یہ ہلائے نہ ہل سکے گی۔ لیکن ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ عباسیوں نے بآسانی ان کا تختہ الٹ دیا اور جب وہ گرے تو کوئی آنکھ ان پر رونے والی نہ تھی۔ نئے مدعیانِ خلافت جس وجہ سے کامیاب ہوئے تھے وہ یہ تھی کہ انہوں نے عام مسلمانوں کو یہ اطمینان دلایا تھا کہ ہم خاندانِ رسالت کے لوگ ہیں، ہم کتاب وسنت کے مطابق کام کریں گے۔ لیکن حکومت حاصل ہونے کے بعد کچھ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ انہوں نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ یہ سب فریب تھا۔ بادشاہی کا طرز وہی رہا جو بنی امیہ نے اختیار کیا تھا۔ فرق صرف یہ ہوا کہ بنی امیہ کے لئے قسطنطنیہ کے قیصر نمونہ تھے اور عباسی خلفاء کے لئے ایران کے کسریٰ۔ شوریٰ، بیت المال، عدلیہ غرض سب نظام وہی رہے اور عباسیوں نے عجمیوں کو زیادہ نوازا۔ یہ واقعات وتغیرات جو خلافتِ راشدہ کے ملوکیت میں آجانے سے رونما ہوئے ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ امت اور شریعت کو نظر انداز کر کے کسی شخص، خاندان یا گروہ کے اقتدار کے لئے کوشاں ہونا کتنے بدترین نتائج پیدا کرتا ہے۔ ان سیاسی تغیرات نے سرے سے اسلامی نظامِ زندگی ہی کا خاتمہ کر دیا۔[۴]

۱　البدایہ والنہایہ، ۱۳۹/۸　　۲　ابن سعد، طبقات، ۷/ ۲۸، الطبری ۴/ ۱۸۷، ابن الاثیر ۳/ ۲۳۳، الاستیعاب، ۱/ ۱۱۸

۳　ابن الاثیر ۳/ ۲۴۸　　۴　مودودی ابوالاعلیٰ، خلافت وملوکیت، ص: ۲۰۱

خارجی اسباب

جب کوئی قوم داخلی طور پر انتشار کا شکار ہو جائے اور حکام تعیش پسندی اور جاہ پسندی کی راہ پر چل پڑیں تو بیرونی عوامل اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔اس قوم میں شکست وریخت کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔

خلافت کے متعلق خلفائے راشدین اور اصحاب رسول ﷺ کا متفق علیہ تصور یہ تھا کہ ایک انتخابی منصب ہے جسے مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آزادانہ رضامندی سے قائم ہونا چاہیے موروثی یا طاقت سے برسر اقتدار آنے والی امارت ان کی رائے میں خلافت نہیں بادشاہت ہے۔حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اس کی تشریح ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

ان الامرة ما اؤ تمر فيها و ان الملك ما غلب عليه بالسيف[۱]

''خلافت وہ ہے جسے قائم کرنے میں مشورہ کیا گیا ہو اور بادشاہی وہ ہے جس پر تلوار کے زور سے غلبہ حاصل کیا گیا ہو''

تلوار کے زور پر حاصل ہونے والی حکومت یا امارت ریاست ورعایا کو مستحکم کرنے میں ناکام رہتی ہے۔وہ خلوص اور محنت ومشقت جو کسی نظریہ یا فکر کی بنا پر رعایا کے لئے پیدا ہوتا ہے وہ ناپید ہو جاتا ہے۔جس کا نتیجہ رعایا کی طرف سے عدم تعاون کی صورت میں نکلتا ہے۔

عربوں کے غلبہ واستیلاء کے بعد ایرانیوں نے اگرچہ اسلام قبول کر لیا تھا۔لیکن ایران کی عظمت پارینہ کے نقوش ابھی تک ان کے ذہنوں میں تازہ تھے۔اسلام سے قبل ایران اپنی تہذیب اور دنیاوی سطوت وصولت اور شاہانہ تزک واحتشام کی بناء پر دنیا کے عظیم ترین ملکوں میں شمار ہوتا تھا۔ایرانی اپنے شاندار اور تابناک ماضی کی وجہ سے عربوں کے مقابلے میں احساس برتری میں مبتلا تھے اور وہ ہر اس تحریک کی پشت پناہی اور مدد کے لئے تیار رہتے جس سے عربوں پر ان کی فوقیت مسلم ہو۔تحریک عباسیہ کی بے نظیر مقبولیت اور ابومسلم خراسانی کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ ایرانیوں کی عرب دشمنی بھی تھی۔دوسری وجہ عجمی مسلمانوں کے عرب تمدن پر اثرات تھے۔اسلامی فتوحات کے باعث عجمی قوتوں کے جو لوگ مسلمان ہو کر عرب مسلمانوں کے ساتھ گھل مل کر رہنے لگے،وہ چونکہ نئے مسلمان تھے مسلمانوں کی اندرونی کشمکش کی بنا پر ان کو صحیح اسلامی تربیت کا موقع نہیں ملا تھا۔اس بنا پر اسلام کی حقیقی روح ان کے دل ودماغ میں سرایت نہیں ہو سکی تھی۔عہد جاہلیت کے اطوار کا کچھ کچھ اثر اب بھی ان کے اذہان اور زندگیوں میں محسوس ہوتا تھا۔دوسری طرف سبائیوں کا گروہ دیندار مسلمانوں کے بھیس میں برابر اپنی ناپاک تگ ودو میں مصروف تھا اور مسلمانوں کی اجتماعی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا ان دونوں طبقوں کے میل جول کا یہ اثر ہوا کہ بڑے بڑے راسخ العقیدہ مسلمانوں سے بھی لغزشیں ہوئیں۔اور وہ ان خطرات کا احساس نہ کر سکے جو ان کے طرز عمل سے پیدا ہو سکتے تھے۔

وہ غیر عرب جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔موالی کہلاتے تھے اسلامی معاشرے میں اگرچہ عرب وغیر عرب کی کوئی تخصیص جائز نہ تھی۔لیکن خلافت راشدہ کے بعد کے حکمرانوں نے عرب اور غیر عرب میں امتیاز کر کے نومسلموں کو عربوں کے مساوی حقوق نہ دیئے۔ان لوگوں سے جزیہ بھی وصول کیا جاتا جو شرعی نقطۂ نظر سے ناجائز ہے اس سلوک کی بنا پر عجمیوں کے دلوں میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ عربوں نے ہمارے علاقے فتح کر کے ہمیں غلام بنا لیا ہے۔اقتصادی ومعاشرتی لحاظ سے بھی عربوں نے انہیں مساوی درجہ نہ دیا۔ان پر مختلف قسم کے ناجائز ٹیکس لگائے گئے۔اس طرح یہ لوگ اقتصادی بدحالی کا شکار ہوئے ان عوامل نے انہیں شورشوں اور بغاوتوں پر اکسایا ان میں عام بے چینی اور عدم اطمینان پیدا ہوا۔حجاج بن یوسف نے ان پر بے پناہ مظالم ڈھائے۔بالآخر اسی طرز عمل نے عجم میں شعوبی (عجمی قوم پرستی) تحریک کو جنم دیا جو مسلمانوں کے لئے وجۂ مخاصمت بنی رہی۔

۱　ابن سعد،طبقات،۱۱۳/۴

پانچویں صدی کے آخر میں خلافت عباسیہ کی حد درجہ کمزوری اور انحطاط اور پھر مختلف حکومتوں اور سلطنتوں میں عالم اسلام کے تقسیم ہو جانے سے یورپ کو حوصلہ ہوا۔ اسلام کا عروج جو یورپ کی نظروں میں ہمیشہ کھٹکتا رہا تھا اسے جب کبھی موقع ملا اس نے مسلمانوں کی سیاسی قوت وطاقت کا شیرازہ پراگندہ کر دینے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ خلافت بنی عباس کے دور اول میں رومیوں نے بار ہا حملے کئے مگر ہر دفعہ انہیں منہ کی کھانی پڑی عالم اسلام کے مختلف حکومتوں میں تقسیم ہونے کے سبب یورپ کا حوصلہ بڑھا اور نئے سرے سے مسلمانوں کے مقبوضہ علاقوں پر اپنا تسلط قائم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ چنانچہ ۴۷۸ھ میں اندلس کے علاقوں میں سے طلیطلہ اور دوسرے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ پھر جزیرہ صقلیہ سے بھی مسلمانوں کو بے دخل کر دیا۔ مسیحی یورپ جو صدیوں سے اسلام سے خار کھائے بیٹھا تھا کہ مسلمان اس کی پوری مشرقی سلطنت پر قابض تھے اور اس کے تمام مقدس مقامات ان کے قبضہ اور تولیت میں تھے لیکن طاقتور اسلامی سلطنتوں کی موجودگی اور ہمسایہ مسیحی سلطنت پر ان کی مسلسل پیش قدمیوں کی بنا پر اس کو حملہ کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ لیکن پانچویں صدی ہجری اور گیارہویں صدی عیسوی کے آخر میں ایسے حالات واسباب پیش آئے کہ یورپ کے صلیبی سپاہیوں'' نے شام وفلسطین کا رخ کیا ان کی فوجیں سیلاب اور طوفان کی طرح پھیل گئیں۔ ۴۹۲ھ میں صلیبیوں نے یروشلم کو فتح کر لیا۔ چند سال کے اندر فلسطین کا بڑا حصہ ان کے تصرف میں آ گیا۔ صلیبیوں نے بیت المقدس کی فتح کے نشہ میں سرشار ہو کر مجبور مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا ان کا ذکر ایک ذمہ دار مسیحی مؤرخ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> ''بیت المقدس میں فاتحانہ داخلہ پر صلیبی سپاہیوں نے ایسا قتل عام مچایا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ ان صلیبیوں کے گھوڑے جو مسجد عمر سوار ہو کر گئے گھٹنوں تک خون کے چشمے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر ان کو دیوار سے دے مارا گیا ان کو چکر دے کر فصیل سے پھینک دیا گیا'' ۱؎

بیت المقدس کی فتح اسلامی سلطنت کے ضعف اور زوال اور مسیحی دنیا کی بیداری اور طاقت کی خبر دیتی تھی مسلمانوں کے اس انحطاط کے دور میں عالم اسلام پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا۔ یہ موصل کا زنگی خاندان تھا۔ جس کے دو افراد عماد الدین زنگی اور اس کا فرزند نور الدین زنگی تھا جس نے صلیبیوں کو پے در پے شکستیں دیں اور بیت المقدس کے علاوہ تقریباً پورے فلسطین کا علاقہ چھڑا لیا۔ مشہور مؤرخ ابن الاثیر الجزری جو ان کے خورد سال معاصر ہیں لکھتے ہیں۔

> ''میں نے گزشتہ سلاطین کی زندگی اور حالات کا مطالعہ کیا ہے خلفائے راشدین اور عمر بن عبدالعزیز کے بعد نور الدین سے بہتر اور ان سے زیادہ عادل سلطان میری نظر سے نہیں گزرا'' ۲؎

نور الدین کے بعد ان کے تربیت یافتہ سلطان صلاح الدین نے صلیبی دنیا کے مقابلہ میں عالم اسلام کی قیادت سنبھالی اور ان کو ایسی شکست دی جس سے ان کی کمر ٹوٹ گئی ان کی قسمت پر مہر لگ گئی۔ حطین کی فتح کے بعد سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس دوبارہ حاصل کیا اور نوے برس سے جو آرزو مسلمانوں کے دلوں کو بے چین کئے ہوئے تھی پوری کی یعنی نوے سال کے بعد بیت المقدس میں نماز جمعہ ادا کی گئی۔ بیت المقدس کی فتح اور حطین کی ذلت آمیز شکست سے یورپ میں غیظ وغضب کی آگ پھر بھڑک اٹھی اور سارا یورپ شام کے چھوٹے سے ملک پر اُمڈ پڑا۔ ان سب کے مقابلہ میں تنہا سلطان صلاح الدین تھا۔ اس کے چند عزیز اور حلیف پورے عالم اسلام کی مدافعت کر رہے تھے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے جو کام اس کے سپرد کیا تھا اس کے ہاتھوں مکمل ہوا۔

۱؎ Encyclopaedia Britanica Vol,vii,P. 62　　۲؎ تاریخ الکامل، ۱۱/۱۶۴

لین پول لکھتا ہے۔

”تیسری صلیبی جنگ میں تمام مسیحی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کرنے آئی مگر صلاح الدین کی قوت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ صلاح الدین کی سپاہ مہینوں کی سخت محنت وجانفشانی اور برسوں کی مخدوش اور خطرناک خدمت کے بعد تھک کر چور چور ہو چکی تھی مگر کسی کی زبان پر حرفِ شکایت نہ تھا“۔[1]

صلاح الدین کی مجاہدانہ کوششوں اور بہترین قیادت نے عالم اسلام کو صلیبیوں کی غلامی سے عرصہ تک محفوظ کر دیا۔ مگر عیسائیوں نے ان جنگوں سے بھر پور فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے اپنی اور عالم اسلام کی کمزوری کا مطالعہ اور تجزیہ کیا نئے صلیبی حملہ کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ جب کہ عالم اسلام پر غفلت طاری ہوگئی۔ خانہ جنگیوں اور باہمی اختلافات نے پھر سر اٹھایا اور عالم اسلام خود غرضیوں، خانہ جنگیوں اور سازش کا شکار ہو گیا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک انحطاط اور تنزل چھا گیا۔ ساتویں صدی ہجری کے وسط میں ان کا سیاسی انتشار، اخلاقی کمزوری اور ضعف پورے طور پر نمایاں ہو گیا۔ اسلامی طاقت کا وہ مہیب سایہ جو دور سے نظر آتا تھا او جھل ہو گیا اور اس کے ہٹتے ہی مسلمانوں پر وحشی لوگوں اور حریف طاقتوں کا نرغہ ہوا اور اسلامی ممالک ایک لاوارث مال کی طرح فاتحین میں تقسیم ہونے لگے۔

ان وحشیانہ حملوں میں سب سے بڑا حملہ تاتاریوں کا حملہ تھا جو سارے عالم اسلام پر چھا گئے۔ مسلمان مبہوت وششدر رہ گئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک حراس اور یاس کا عالم طاری ہو گیا۔ مؤرخ ابن اثیر لکھتے ہیں۔

”یہ حادثہ اتنا ہولناک اور ناگوار ہے کہ میں کئی برس تک اس پس وپیش میں رہا کہ اس کا ذکر کروں یا نہ کروں اب بھی بڑے تردد اور تکلیف کے ساتھ اس کا ذکر رہا ہوں اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی موت کی خبر سنانا کہاں آسان ہے اور کس کا جگر ہے کہ ان کی ذلت ورسوائی کی داستان سنائے۔ کاش میں نہ پیدا ہوتا، یا اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا اور بھولا بسرا ہو جاتا“۔

یہ وہ حادثہ عظمٰی اور مصیبت کبریٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی اس واقعہ کا تعلق تمام انسانوں سے بالعموم اور مسلمانوں سے بالخصوص ہے۔ اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا این دم ایسا واقعہ دنیا میں پیش نہیں آیا تو وہ کچھ غلط دعویٰ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ تاریخ میں اس کے پاسنگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا۔ اور شاید دنیا قیامت تک (یاجوج و ماجوج کے سوا) کبھی ایسا واقعہ نہ دیکھے ان وحشیوں نے کسی پر رحم نہیں کیا۔ انہوں نے عورتوں، مردوں اور بچوں کو قتل کیا۔ عورتوں کے پیٹ چاک کئے اور پیٹ کے بچوں کو مار ڈالا۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم** یہ حادثہ عالمگیر و عالم آشوب تھا ایک طوفان کی طرح اٹھا اور دیکھتے دیکھتے سارے عالم پر پھیل گیا۔[2]

۶۵۶ ھ میں یہ تاتاری دار الخلافہ بغداد میں فاتحانہ داخل ہوئے اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ مورخ ابن کثیر بغداد کی تباہی اور تاتاریوں کی غارت گری کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

”بغداد میں چالیس دن تک قتل وغارت کا بازار گرم رہا چالیس دن کے بعد یہ گلزار شہر جو دنیا کا پر رونق ترین شہر تھا۔ ایسا ویران وتاراج ہو گیا کہ تھوڑے سے آدمی دکھائی دیتے تھے۔ بازاروں اور راستوں پر لاشوں کے ڈھیر اس طرح نظر آتے تھے کہ ٹیلے لگتے تھے ان لاشوں پر بارش ہوئی تو صورتیں بگڑ گئیں اور سارے شہر میں تعفن پھیلا جس سے شہر کی ہوا خراب ہوئی اور سخت وبا پھیلی جس کا اثر ملک شام تک پھیلا بکثرت مخلوق مری“۔[3]

۱　سلطان صلاح الدین، (از سٹینلے لین پول مترجم مولوی عنائت اللہ) ص: ۳۱۰　　۲　ابن الاثیر، تاریخ الکامل، ۱۳/۲۰۲۔۲۰۳

۳　البدایہ والنہایہ، ص: ۳۳۸

عراق وشام کے بعد تاتاریوں کا رخ مصر کی طرف تھا اور وہی تنہا اسلامی ملک تھا جو ان کی غارت گری سے بچا ہوا تھا۔ سلطان مصر نے تاتاریوں کی چڑھائی سے پہلے مدافعانہ جنگ کی بجائے شام میں تاتاریوں پر خود حملہ کر دیا۔ تاتاریوں کو شکستِ فاش ہوئی مصریوں نے ان کو کثرت سے قتل کیا اور بہت سے گرفتار کئے۔

بایں ہمہ تاتاری عراق سے لے کر ایران وترکستان تک قابض تھے دارالسلام بغداد ان کے قبضے میں تھا۔ اسلام کے علمی وتہذیبی مرکز پر نیم وحشی بت پرست قوم کا قابض رہنا انتہائی افسوس ناک تھا۔

تاتاری حملہ سے مسلمانوں کو ایسا دھچکا لگا کہ سنبھلنے کے لئے مدت درکار تھی۔ اس حملہ سے مسلمانوں کے قوائے فکریہ مضمحل اور پژمردہ ہو گئے اس وقت ایک ایسی تازہ دم عالی حوصلہ مجاہد سیرت قائد کی ضرورت تھی جو گرتے ہوئے عالم اسلام کو سنبھال سکے۔ اور عالم اسلام کی قیادت کا فرض انجام دے سکے۔ آٹھویں صدی ھجری میں عثمانی ترک تاریخ کے منظر عام پر آئے۔ انہوں نے دنیا کو عام طور پر اور مسلمانوں کی نگاہوں کو خصوصیت کے ساتھ اپنی طرف متوجہ کیا جب سلطان محمد فاتح نے ۸۵۳ھ میں اپنی چوبیس برس کی عمر میں بازنطینی سلطنت کے ناقابل تسخیر دارالسلطنت قسطنطنیہ کو فتح کر لیا۔ اس واقعے سے مسلمانوں میں ایک نئی امنگ اور نیا جوش پیدا ہوا۔ ترک اس کے اہل تھے کہ ان پر اسلامی طاقت کو از سر نو واپس لانے اور دنیا میں کھوئے مقام ومرتبہ کو حاصل کرنے میں اعتماد کیا جائے۔ وہ ایک بلند حوصلہ پر جوش اور زندہ قوم تھی۔ جس میں جہاد کی روح تھی جنگی قوت بھی حاصل تھی۔ بین الاقوامی قیادت کے لئے ان کو بہترین جغرافیائی مرکز حاصل تھا۔ وہ جزیرہ نمائے بلقان سے بیک وقت ایشیا اور یورپ کی نگرانی کر سکتے تھے۔ انکا دارالسلطنت بحر اسود اور بحر ابیض کے درمیان واقع تھا۔ ایک ایسی حکومت جس کو تین براعظموں (یورپ، ایشیاء، افریقہ) کی بیک وقت نگرانی کرنی تھی بہترین پایۂ تخت تھا ترکی چونکہ یورپ میں ہے، یورپ کی ترقی کے ہمقدم رہ کر ترکوں کیلئے یہ ممکن تھا کہ علم وعقل کے میدان میں ترقی کریں اور یورپ کی عیسائی قوموں سے بازی لے جائیں۔ لیکن ترکوں کی بدقسمتی سے زیادہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ عین ترقی وعروج کے زمانہ میں ترکوں میں تنزل وانحطاط شروع ہو گیا۔ اور قوموں کے پرانے مرض عود کر آئے حسد وبغض کا نشو ونما ہوا۔ بادشاہ ظالم وجابر ہونے لگے حکمرانوں کی تربیت کا نظام بگڑ گیا۔ اخلاق پست ہو گئے۔ حکام وسپہ سالار قوم وسلطنت سے خیانت وغداری کرنے لگے۔ راحت طلبی اور عیش پرستی بڑھ گئی ان میں زوال پذیر قوموں کی تمام خصوصیات پیدا ہو گئیں۔ ترک مطمئن ہو کر بیٹھ گئے وہ اپنی جگہ پر ہی رہے اور یورپین قومیں کہاں سے کہاں پہنچ گئیں۔ مسلمانوں میں یورپ کا دیا ہوا تصورِ قومیت سرائیت کر گیا۔ مصر کے لوگ مصری، عرب عربی، افغان افغانی، ترک ترکی، غرض علاقے کی بنیاد پر نسبت دی جانے لگی۔

اسی طرح مشرق میں جب مغربی اقوام، تاجر اور پھر فاتح آئے تو یہاں عرصہ سے اخلاقی انحطاط شروع ہو چکا تھا۔ اسلامی اور مشرقی تہذیب روبہ تنزل تھی سارا عالم اسلام مشرق سے مغرب تک اس کی لپیٹ میں تھا۔ اس کی وجہ یقیناً وہ مسلسل صلیبی جنگیں اور تاتاریوں کے حملے بھی ہو سکتے ہیں کہ چنگیز خان تاتاری کے حملے میں جتنا انسانی خون بہا اور تہذیب وتمدن اور علم وحکمت کی جس قدر بربادی ہوئی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

مسلمانوں کو اپنے ماضی کے تمام تہذیبی اور علمی سرمائے سے محروم کر دیا گیا۔ دوسری طرف ان ملکوں میں ایسے معاشی واجتماعی حالات پیدا ہو گئے کہ ان کی موجودگی میں قوم کی فکری توانائیاں شل ہو کر رہ گئیں۔ بعینہ یہی کچھ وسطِ ایشیا، ایران، عراق، افغانستان اور ہندوستان میں ہوا۔ ہندوستان چنگیز خان اور ہلاکو خان کے عذاب سے تو بچ گیا مگر تیمور کے ہاتھوں اس پر کافی تباہی آئی۔ تہذیب کی وہ شمع جو بغداد میں روشن

ہوئی تھی جسے بخارا، ہرات اور سمرقند میں ایک نئی زندگی ملی تھی ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔ وہ کتب خانے نہ رہے جن سے کسب علم ہوتا اور وہ لوگ نہ رہے جو کسب علم کرتے۔ اور وہ علمی و جماعتی ادارے مفقود ہو گئے جن سے افراد تربیت پاتے تھے۔

سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں بہت بڑا علاقہ تھا جس کی وجہ سے عثمانی رعایا میں مختلف اقوام ہو گئی تھیں۔ ان میں زیادہ تر عیسائی تھے۔ سلطنت عثمانیہ کے زوال پذیر ہونے اور مشرقی و مغربی عیسائیوں کے گٹھ جوڑ کے ساتھ ساتھ یہ عیسائی رعایا سلطنت عثمانیہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کرنے لگی اور یورپین طاقتوں سے سازباز کر کے عیسائی رعایا نے سلطنتِ عثمانیہ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

ترکوں نے عربوں سے زیادہ حکومت کی لیکن وہ عربوں کی طرح کوئی خاص معاشرت پیدا نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ترکی میں کئی قومیں آباد تھیں یہ ایران، عراق، شام اور ایشیائے کوچک کے علاقوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ چنانچہ ان پر ایشیائے کوچک کے ایرانی سلجوقیوں کا اثر ہو گیا تھا اسی لئے ان کے خیالات ایرانی خیالات سے ہم آہنگ ہو گئے۔ مثلاً عثمانیوں کے ابتدائی ادبی رجحانات بالکل ایرانی تھے اسی طرح یہ تصور کہ سربراہ مملکت سے کسی قسم کی باز پرس نہیں کی جا سکتی ایرانی ہی تھا۔

ترکوں کی دولتِ عثمانیہ کے ہم عصر دو طاقتور مشرقی حکومتیں تھیں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت جس کی بنیاد بابر کے مضبوط ہاتھوں سے پڑی تھی ترکی کے بعد مشرق کی سب سے بڑی باعظمت اور پُرشکوہ سلطنت تھی۔ اسی خاندان کا آخری طاقتور بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر تھا جو سلطنت کی وسعت، فتوحات کی کثرت شرع اور دینداری اور دینی علم میں ہندوستان کی پوری اسلامی تاریخ میں خاص اختیار رکھتا تھا۔ یہ زمانہ یورپ کی بیداری اور ترقی کا زمانہ تھا بدقسمتی سے اورنگ زیب کے سب جانشین نااہل، پست ہمت نکلے وہ یورپ کے خطرات کا مقابلہ اور امت مسلمہ کی حفاظت کرنے کے کیا اہل ہوتے اپنے ملک وسلطنت کی حفاظت بھی نہ کر سکے۔ اور بالآخر اپنی نااہلی، کمزوری اور نااتفاقی سے انگریزی حکومت کے قیام واستحکام، انگلستان کی ترقی وتمول اور صنعتی انقلاب کا باعث ہوئے اور بالواسطہ اکثر ممالک کی غلامی کا سبب بنے۔

دوسری بڑی سلطنت ایران کی صفوی سلطنت ہے جو ایک بڑی متمدن اور ترقی یافتہ سلطنت تھی لیکن شیعیت کے غلو وتعصب اور ترکی حکومت سے نبرد آزمائی نے اس کو کسی اور کام کی فرصت نہ دی۔ اور وہ بہترین زمانہ جو یورپ کی تعمیر وتنظیم کا تھا یہ دونوں سلطنتیں ایک دوسرے پر حملہ کرنے یا اپنی حفاظت ومدافعت میں مصروف رہیں۔ دونوں سلطنتیں اپنے مسائل میں ایسی الجھیں کہ یورپ کے دور دراز ممالک تو ایک طرف رہے، اپنے اسلامی ممالک کی بھی کوئی خبر نہ تھی۔

سولہویں، سترھویں صدی عیسوی میں جہاں یورپ اپنی لمبی نیند سے بیدار ہوا تھا ترک تنزل وانحطاط علمی پسماندگی اور جمود کا شکار ہو چکے تھے۔ علم وصنعت کے میدان میں ترکوں کی پسماندگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سولہویں صدی سے پہلے ترکی میں جہاز سازی کی صنعت شروع نہیں ہوئی تھی اٹھارویں صدی کے آخر تک ترکی نئی ایجادات اور ترقیوں سے اس قدر بیگانہ تھا کہ جب قسطنطنیہ کے باشندوں نے دارالسلطنت پر ایک غبارہ Baloon کو پرواز کرتے دیکھا تو اس کو سحر یا کیمیا کی کرشمہ سازی سمجھے۔ جب ترکی کا یہ حال تھا جو عالم اسلام کا قائد تھا تو دوسرے عرب اور اسلامی ممالک کا جو ترکی کے زیر اثر یا دست نگر تھے جو کچھ حال ہوگا اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ایک فرانسیسی سیاح موسیو والنی Volney نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے۔

''یہ ملک صنعت میں اس قدر پیچھے ہیں کہ اگر تمہاری گھڑی خراب ہو جائے تو غیر ملکی کے علاوہ کوئی درست کرنے والا نہیں ملے گا''۔[1]

---

[1] بحوالہ (ڈاکٹر احمد امین، زعماء الاصلاح فی العصر الحدیث) ص: ٦

مادی اسباب

اسلامی فلسفہ کے مطابق مذہب اسلام حالات کی پیداوار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے حالات کو ایک خاص طرز وطریق پر ڈالنے کے لئے دنیا میں نازل کیا ہے تاکہ انسان ہر طرح کے رنج اور خوف سے نجات حاصل کر سکے۔ مادی لحاظ سے انسان کے رنج اور خوف کے بنیادی اسباب اس کی مادی ضروریات کی عدم فراہمی ہے۔

فاما یاتینکم منی ھدیً فمن تبع ھدی فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون.١

''پھر اگر تمہیں میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لئے کسی رنج وخوف کا موقع نہ ہوگا''

یہاں ہدایت کے متعلق دونوں امور یعنی ہدایت پہنچانے اور ہدایت کی پیروی کرنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہدایت جو انسان کو دنیوی اور اخروی خوف سے نجات دلا سکتی ہے صرف وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کی رہنمائی کے لئے دی گئی ہے۔ چنانچہ یہ ہدایت کسی عصری تقاضے یا کسی ماحول کی پیداوار نہیں نہ کسی زمان ومکان کی قید میں ہے۔ بلکہ جس قادر مطلق ہستی نے انسان کو پیدا کیا اس کرہ ارضی پر اتارتے ہی اس کی رشد وہدایت کا انتظام بھی فرمایا۔

اسلام کے سطح بین ناقدین اس کے اس تصور کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور باطل فلسفے کی رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذہب کو انسان کی مادی ضروریات نے جنم دیا ہے اور ان احتیاجات کو تبدیل ہونے کے ساتھ مذہب بھی بدلتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کے برعکس اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ ہدایت کا سرچشمہ باری تعالیٰ ہے اور انسان کی فلاح و بہبود کا راز صرف اس چیز میں مضمر ہے کہ وہ اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کو ہدایت کے مطابق ڈھالے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

قل ان ھدی اللہ ھوالھدیٰ وامرنا لنسلم لرب العٰلمین .٢

''آپ کہہ دیجئے کہ صحیح راہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے اور اس کی طرف سے ہمیں یہ حکم ملا ہے کہ مالک کائنات کے آگے سرتسلیم خم کریں''

ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلامی عقائد کی اساس وبنیاد اس عقیدہ توحید پر ہے کہ انسان ذات وصفات میں کسی کو خدا کا شریک نہ بنائے اور دل سے اس بات کا یقین رکھے کہ دنیا کے تمام نفع وضرر کا مالک صرف خدا ہے۔ وہ ہمارا خالق ہے اور ہم اس کی مخلوق سب اسی کی اطاعت و بندگی کریں گے اور کسی کے سامنے پیشانی نہ جھکائیں گے۔ ہمارا رزق، موت، زندگی، عزت وذلت، کامرانی وناکامی، دولت وغربت ان سب کا ملنا محض خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس عقیدہ توحید پر راسخ علم نے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو اتنا بلند حوصلہ اور عالی ہمت بنا دیا کہ وہ دنیاوی خواہشات وتعیّشات سے بے نیاز ہو گئے ان کا مرنا جینا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سب خدا کے لئے ہو گیا۔

ان کا مقصد زندگی خدا کے احکام کی بجا آوری اور اس کے اوامر ونواہی کی دنیا میں تبلیغ واشاعت رہا ملک گیری یا ملوکیت پرستی کا اس جماعت کے وہم وگمان میں گزر بھی نہ تھا۔ صرف بندگان خدا کی فلاح ورفاہ اور ان میں محبت وانسانیت کی فضا قائم کرنا ان کا اولین مطمع نظر تھا۔ ان چہروں پہ استغنا کا نور چمکتا تھا۔ پیشانی سے قناعت وصبر کا اطمینان برستا نظر آتا تھا۔ قلتِ مال بلکہ فقدانِ مال کے باوجود دبدبۂ سکندری ان کے چہروں سے عیاں تھا۔ یہ جماعت آپ ﷺ کے صحابہ کرام کی تھی جو نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے ظاہری نمود وشان کا احساس تک نہ تھا۔ یہ خلفاء راشدین جس سادگی سے رہتے تھے۔ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ دنیا سے بڑے بڑے عادل، انصاف پسند، اور رحم دل بادشاہ گزرے ہیں مگر کوئی قوم حضرت عمرؓ جیسا ایک بھی حکمران پیش نہ کر سکی۔ پیوند لگے کپڑے پہن کر اور خاک کی فرش پر بیٹھ کر عرب وایران کی

١　البقرہ،٢/ ٣٨　　　٢　الانعام،٦/ ٧١

قسمتوں کے فیصلے کرتے تھے دوسری طرف جسے بیوہ وغریب عورتوں کے چولہوں میں آگ جلانے اور کھانا پکانے میں بھی دریغ نہ ہوتا تھا۔ اس بے غرضی، بے نفسی اور خلوص وخشیت الٰہی کے باعث خلفاء راشدین بیت المال کے ایک ایک پیسہ کی حفاظت کرتے اور اس کو حقیقتاً قوم کی امانت سمجھتے تھے اس بناء پر اس کا ایک پیسہ بھی اپنی ذات یا اپنے خاندان کے کسی فرد کے آرام وآسائش پر خرچ کرنا حرام جانتے تھے۔ اسلام ایک فطری اور سادہ مذہب اور اس کا رکن بے جا تمدنی تکلیف سے پاک ہے گو جائز حدود کے اندر شریعت نے عیش وتنعم کی اجازت دی ہے لیکن ہر وہ شے جو سادگی اور جہد وعمل کے خلاف ہو، وہ اسلامی روح کے منافی ہے۔

اسلام کی یہ سادگی خلافت راشدہ کے دور تک قائم رہی گو اس زمانہ میں فتوحات کی کثرت اور مال غنیمت کی فروانی سے صحرائے عرب میں سونے چاندی کے دریا بہنے لگے تھے۔ ایران وروم کے خزانے کھنچ کھنچ کر مدینہ کی گلیوں میں آگئے تھے لیکن اس سے مسلمانوں کی سادگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

دولت کی فراوانی اور مختلف تمدنوں اور قوموں کے اختلاط کے اثرات طبعی ہیں جس سے کوئی قوم بچ نہیں سکتی۔ اور یہ اختلاط حضرت عمرؓ ہی کے زمانے سے جب اسلام نے جزیرۃ العرب سے نکل کر ایران وروم کی سرزمین میں قدم رکھا، شروع ہو گیا تھا مگر اس وقت تک مسلمانوں میں اسلامی روح پوری طرح موجود تھی۔ خود حضرت عمرؓ کو اسلامی سادگی کے تحفظ میں بڑا اہتمام تھا اسلام کے محافظ ونگہبان صحابہ کرام موجود تھے۔ جو کسی بیرونی اثر کو گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے اس دور میں دوسری قوموں کے اختلاط کے اثر ظاہر نہیں ہونے پائے لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اتنے ہی دوسری قوموں کے اثرات پھیلتے گئے۔ اور جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوئی تو شاہانہ اطوار وانداز نے بیت المال کو قومی امانت کی بجائے حکمرانوں کی ذاتی ملکیت بنا دیا۔ اموی خلفاء کی زندگیاں قیصر وکسریٰ کے نمونہ پر تھیں۔ بیت المال کی آمدنی کا کثیر حصہ خلفاء کے قرابت داروں پر وظائف وانعام واکرام داد ودہش اور جاگیروں اور املاک کی صورت میں صرف ہو جاتا۔

شاعروں، گویوں اور مسخروں کی سرپرستی ہونے لگی حاجت مندوں اور مفلس ونادار لوگوں کے وظائف کی تعداد میں کمی کر دی گئی اخراجات کے علاوہ بیت المال کی آمدنی کے باب میں حلال وحرام کی تمیز ختم کر دی گئی طرح طرح کے ناجائز ٹیکس نافذ کئے گئے۔ جن کی شرعی حیثیت اور عوامی فلاح وبہبود کے نقطۂ نظر سے نہ ہونے کے برابر تھی۔ ان خلفاء نے دنیا دار بادشاہوں کی وضع قطع واطوار اپنائے حضرت امیر معاویہ نے نشست کے لئے تخت سے مشابہ ایک مسند بنوائی۔ ان کے بعد اکثر خلفاء نے شاہان روم وفارس کا طرز زندگی اختیار کیا۔ انہوں نے اسوۂ رسول ﷺ اور خلفائے راشدین کے نمونہ کو ترک کر دیا۔

جاہ وجلال، قدم وحشم اور قیصرانہ دبدبہ وصولت خلافت اموی کا طرۂ امتیاز تھا۔ عوام اور خلفاء کے درمیان رابطہ ختم ہو کر رہ گیا تھا مادہ پرستی بڑھ گئی۔ اخلاقی اقدار کی بجائے خلفاء اشیاء وزر کے گرد گھومنے لگے۔ ذاتی جاگیریں اور مال ودولت کی کثرت ہوگئی ذرائع آمدن بڑھانے کے لئے ٹیکسوں میں اضافہ کیا گیا۔

مسلمان حکمران شادی بیاہ کی رسموں پر بے دریغ خرچ کرتے یہ بے جا اسراف مسلمان فرمارواؤں کے خورد ونوش میں بھی ہوتا۔ ہارون الرشید کے دستر خوان پر تیس تیس قسموں کے کھانے ہوتے تھے۔ محلات کی تعمیر میں بھی اسراف کا مظاہرہ ہوتا ان کی ان شاہ خرچیوں کی وجہ سے مسلمان اقتصادی طور پر کمزور ہو گئے۔ جو پیسہ ملک کی تعمیر وترقی پر خرچ ہونا تھا وہ ذاتی آسائشوں اور تعشیات پر صرف ہونے لگا جس کا نتیجہ آپس میں افتراق اور خانہ جنگی کی صوت میں رونما ہوا۔

فلپ۔کے۔حتی لکھتے ہیں۔

''اس زوال وانحطاط میں بہت سی سماجی اور اخلاقی قوتوں کا ہاتھ بھی شامل تھا۔سینکڑوں سال کے دوران فاتحوں کا خون مفتوح کے خون سے مل کر اپنا خالص رنگ کھو بیٹھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فاتحوں کا اعلیٰ مرتبہ اور ان کی بہتر صفات سب ناپید ہوگئیں فاتحین کی مملکت آہستہ آہستہ مفتوحین کی مملکت بن گئی۔حرم اور حرم کے بے شمار خواجہ سرا،کنیزیں غلمان قصر شاہی کی بے گنت خواصیں ان گنت سوتیلے بہن بھائی ان کی ناگزیر رقابتیں اور سازشیں نغمہ وشراب میں ڈوبی ہوئی عیش پرست زندگی غرض یہ اور اسی طرح کے دوسرے عوامل نے مل کر منزلی زندگی کا رس چوس لیا۔تخت وتاج کے پہلے ہی سے کمزور وارثوں کا موقف جانشینی کے حق کے بارے میں ان کے ان گنت جھگڑوں اور منافقتوں کی وجہ سے اور بھی غیر یقینی ہو کر رہ گیا تھا'' [1]

اس کے علاوہ معاشی عوامل بھی اہم تھے۔محاصل کی کثرت اور حکمران طبقہ کے فائدے کی صوبیداری حکومت دونوں نے زراعت اور صنعت وحرفت کی کمر توڑ دی۔حکمران طبقہ جتنا دولتمند ہوتا جاتا اسی نسبت سے عوام کی غربت بڑھتی جاتی تھی۔ بڑی ریاستوں کے اندر چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنتی جارہی تھیں۔اور ان کے مالک مستقل طور پر اپنے زرعی غلاموں کو لوٹ رہے تھے پے در پے خون آشام لڑائیوں نے فوجی بھرتی میں انسانوں کو کھینچا تو بہت سی زمینیں تباہ ہو کر رہ گئیں۔

سپین اور یورپ کے دوسرے حصوں میں اسلامی اقتدار کے زوال کے اسباب مجموعی حیثیت سے اس قسم کے ہیں جن کے ہاتھوں مملکت کے مشرقی اور وسطی علاقوں میں خلافت کا خاتمہ ہوا تھا۔فرق صرف اتنا ہے کہ ایک ضرب نصرانیوں نے لگائی اور دوسری مغلوں نے جس وقت مسلمان حکمران پستی کی طرف جارہے تھے اور یورپ ترقی کی راہ پر گامزن تھا مسلمانوں میں قومی ،لسانی ،گروہی اور مذہبی عصبیت بہت بڑھ گئی تھی۔انقلاب فرانس کے بعد مسلمان ممالک بھی قومیت کا شکار ہو گئے۔

یورپ جس کا رخ مکمل مادیت کی طرف تھا اس کے خیالات ،نقطۂ نظر ،نفسیات وذہنیت اخلاق واجتماع ،علم وادب ،حکومت وسیاست ،غرض زندگی کے تمام شعبوں میں مادیت غالب آگئی اگرچہ شروع میں اس کی رفتار سست رہی لیکن قوت اور عزم کے ساتھ یورپ نے مادیت کی طرف حرکت جاری رکھی۔بالآخر انہوں نے حرکت ومادہ کے علاوہ ہر چیز کا انکار کر دیا جو حواس اور تجربہ کے اندر نہ آسکے جس کا شمار و پیائش یا وزن نہ ہو سکے۔اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کا وجود اور تمام مابعد الطبیعات ایسے مفروضات بن گئے جن کی گویا عقل وعلم سے کوئی تائید نہیں ہوئی۔ انہوں نے بتدریج معصیت کو خوش نما اور دلفریب بنا کر پیش کیا۔طبیعتوں کو ہر قید وبند اور فرد کو ہر ذمہ داری سے آزاد کیا۔اخلاقی حدود وقیود سے بے نیاز کیا۔حقیقت یہ ہے کہ یورپ کا موجودہ مذہب جس کی دلوں پر حکمرانی ہے دراصل مذہب نہیں مادیت پرستی ہے۔

یورپ کے تمام سیاسی ،اجتماعی اور یہ مادہ پرستانہ روح اور اخلاقی قدیم وجدید نظریات میں جاری وساری نظر آئے گی۔حتیٰ کہ اس روحانی تحریک کی جس سے یورپ کو بڑی دلچسپی ہوگئی ہے روح بھی مادیت ہے۔ان تمام باتوں کے پہلو بہ پہلو یہ ایک حقیقت ہے کہ یورپ کی یہ تمام مادی ترقی جو مسلمانوں ہی کی مرہون منت ہے کیونکہ اس نے اس سلسلہ میں اسلامی خصوصاً عربی ماخذ سے بہت استفادہ کیا ہے۔ عالم اسلامی سے اس نے کہیں زیادہ فائدہ اٹھایا ہے لیکن یورپ نے اس احسان کا اعتراف نہیں کیا۔اگرچہ نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ اسلام دشمنی کم

---

[1] تاریخ عرب ،ص:۱۸۸

ہوتی مگر یہ دشمنی بڑھتی ہی گئی۔اور بالآخر ایک عادت بن گئی۔حلم کے ہر ذکر سے یورپ کا قومی شعور تمتما اٹھتا ہے۔تمام تہذیبی قومی تہذیبوں کے باوجود یورپ کی اسلام دشمنی کی خصلت باقی رہی۔یورپ اور امریکہ کی صلیبی سامراجیت کے لئے اس بات کو نظر انداز کر دینا ناممکن ہے کہ اسلامی روح سامراجیت کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ یورپ دین و مذہب کو کوئی اہمیت نہیں دیتا لیکن وہ عالم اسلامی سے کچھ خطرہ محسوس کرتا ہے۔تو اس کی اسی مادی طاقت کے سبب دین دراصل ایک روحانی قوت ہے جس میں مادی قوتوں کو اکسانے اور ابھارنے کی بے پناہ تاثیر پنہاں ہے۔یہ اسلام اور مسیحیت میں بنیادی فرق ہے۔اسلام ہر طرح کی مادی تیاری کرنے، جم کر مقابلہ کرنے اور ہر طرح کی قربانیاں دینے پر ابھارتا ہے۔اور کمزوری کا شکار ہو کر ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دینے والوں کو دنیا و آخرت دونوں میں برے انجام کی دھمکی دیتا ہے۔

واعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل ترهبون به عد و الله و عدوكم[1]

''اور تم لوگ جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لئے تیار رکھو اس کے ذریعہ سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوفزدہ کر سکو''

پھر فرمایا:

يا يهاالذين اٰمنو ا لا تتخذو االكٰفرين اولياء من دون المؤمنين [2]

''اے ایمان والو مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ''

گویا دین ایک روحانی قوت ہے اور مادی طاقت بہم پہنچانے کے لئے ایک للکار بھی ہے۔دین پر حملہ کے مقابلہ کے لیے خود ایک چٹان ہے اور جم کر مقابلہ کرنے کی تلقین بھی ہے۔اسلام دشمنی کے مظاہر مختلف قوتوں کے طرزِ استعمار کے ساتھ مختلف ہوتے رہتے ہیں فرانس نے مغرب کے سارے عرب ممالک میں اسی دشمنی کے تحت ہر ہر قوم کی مخالفت کے بہانے سے اسلام کے خلاف کھلم کھلا جنگ کا اعلان کر رکھا ہے۔دمشق میں اس کے نمائندے دن دہاڑے یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ صلیبی مجاہدین کی نسل سے ہیں[3] انگلستان مکر وفریب کی راہ اختیار کرتا ہے اور خاموشی و اخفاء کے ساتھ مسلمان ممالک کے تعلیمی اداروں میں اپنے نفوذ کی راہیں نکالتا ہے تاکہ قائد کی ایسی ذہنیت پروان چڑھائے جو اسلامی زندگی بلکہ مشرقی زندگی کی ساری قدروں کو حقارت کی نظر سے دیکھے۔اور ایسا ہی ہو رہا ہے۔

مسلمان بحیثیت مجموعی ابھی تک زوال کے نرغے میں پھنسے ہوئے ہیں۔اور یہ زوال مادی بھی ہے اور معنوی اور روحانی بھی، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ مادی سے کہیں زیادہ معنوی اور روحانی ہے تو اس میں چنداں مبالغہ نہیں ہوگا۔اس کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ مسلمان قوم اپنے خیال کے مطابق جہاں تک کہ اس سے بن پڑتا ہے۔اس زوال پر قابو پانے میں کوشاں ہے اور اپنے حالات کے مطابق اصلاحِ احوال میں لگی ہوئی ہے۔

بے شک وہ مادی اسباب جو مشرق اور مغرب کی علیحدگی کا باعث بنے مثلاً امریکہ کا انکشاف، بین الاقوامی تجارتی راستوں کی تبدیلی، اور زرعی اجناس کی قیمتوں کے مقابلے میں مشین کی بنی ہوئی اشیاء کا بہت زیادہ نفع بخش ہونا، فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشرقی اقوام کی فرسودہ ذہنیت بھی ان کے جمود اور معاشی افلاس کا بہت حد تک سبب ہے۔

---

[1] الانفال،۸/۶۰　　[2] النساء،۴/۱۴۴

[3] سید قطب شہید، اسلام میں عدل اجتماعی (مترجم ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی) ص:۵۱۹

بعض مسلمان علماء نے مسلمان قوم کی پس ماندگی کے وجوہ کو اچھی طرح سمجھا۔ اور انہوں نے تعلیم کے ذریعہ ان کو دور کرنے کی پوری کوشش کی۔ یہ دراصل ابن رشد اور ابن ماجہ جیسے بڑے فلسفیوں اور اجتماعی نفسیات کے ماہروں (اس زمانے کے مسیحی یورپ میں اس قسم کا نظم فکر مفقود تھا) کے صحیح روحانی جانشین سمجھے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے سائنٹفک عقائد ایسی زبان اور ایسے انداز میں پیش کئے جو عام لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے لئے قابل فہم تھے۔

اس ضمن میں انیسویں صدی کے مسلمان مصلح جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہٗ اور ان کے کثیر التعداد شاگرد جو مصر کے ماہوار مجلّہ ''المنار'' کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے، نیز توفیق صدقی اور فرید وجدی وغیرہ آتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ جدید نیچرل سائنس اور علم اجتماعیات کا رشتہ قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت سے ڈھونڈیں۔ اس طریق سے وہ مسلمانوں کی نظروں میں نئی تحقیقات کو حق بجانب بھی ثابت کر سکتے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اس طرح ان کے مذہبی عقائد کو بھی تقویت دینا چاہتے تھے۔ یہ طریق کار اپنے اجتماعی مقصد کے اعتبار سے حق بجانب تھا قدامت زدہ مسلمانوں کی ذہنیت نے انہیں قرون وسطی کے افکار کی تقدیر پرستی اور غلامی میں جکڑا ہوا تھا۔ اس ذہنیت کا مسیحی دنیا پر بھی ایک زمانے میں تسلط رہ چکا ہے۔ لیکن جدید یورپ میں یہ ذہنیت بڑی سرعت سے اپنی موت آپ مر گئی۔

ایک دوسری حیثیت سے غور فرمایئے تو موجودہ دور کی یہ سب سے بڑی نفسیاتی حقیقت بخوبی ظاہر ہو جائے گی۔ کہ دنیا کی قومیں مادی علوم میں جس کو اپنا امام تسلیم کر لیتی ہیں۔ وہ ذہنی ونفسیاتی اعتبار سے اپنے دیگر تمام تہذیبی وتمدنی معاملات میں بھی اسی کو ''امامت'' کے منصب پر فائز سمجھنے لگ جاتی ہیں۔ جیسا کہ آج علمائے اسلام کے مقابلے میں علمی دنیا پر مستشرقین کی دھاک بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اور ان ''اولوالالباب'' کے اقوال کے مقابلے میں علمائے اسلام کی ''باتوں'' کو کوئی نہیں سنتا اور ان پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ یا زیادہ واضح الفاظ میں انکی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ گویا کہ وہ بالکل بے وقعت اور بے وقار ہو گئے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کے نزدیک اصل معیار مادی شان وشوکت کا ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے کسی چیز کے ظاہری پہلو کو دیکھتے ہیں اور اگر ظاہر خراب ہے تو سمجھتے ہیں کہ اس کا باطن بھی خراب ہوگا۔

جو حال موجودہ ترقی یافتہ قوموں کا آج ہے وہی حال قرون وسطیٰ میں مسلمانوں کا بھی رہ چکا ہے۔ جب کہ اہل اسلام اپنے باطن کے ساتھ ساتھ ظاہری حیثیت سے بھی ممتاز تھے تو اسوقت دوسری قومیں ان کے ''اقوال'' کو سند کا درجہ دیتی تھیں اور ان کے اقوال سے استدلال کرنے میں فخر محسوس کرتی تھیں۔ یہ مقام جب تک پھر دوبارہ پیدا نہیں ہوتا امت مسلمہ صحیح معنی میں کوئی معزز مقام حاصل نہیں کر سکتی۔

اس میں شک نہیں کہ قرون وسطیٰ میں مشرق اور یورپ میں اتنا بعد نہ تھا جتنا آج کل ہے یورپی پادری اور راہب جو اس زمانے میں یورپی کلچر کے حامل تھے بعینہٖ اسی فکری دنیا میں رہتے تھے جس کی بنیاد بندھے ٹکے عقائد اور ایک خاص قسم کی منطق پر تھی۔ جس میں اس زمانے کی مسجدوں میں واقع اسلامی مدارس کے شیوخ رہا کرتے تھے۔ ان پادریوں اور راہبوں نے عربی ذرائع سے اپنا مسیحی علم کلام پڑھا تھا فن حرب، صنعت وحرفت اور زراعت اور تجارت میں دونوں کے ہاں ایک ہی سا نظام رائج تھا۔ قرون وسطیٰ میں مسیحی مغرب اور اسلامی مشرق ایک ہی جیسے اسلحہ سے ایک دوسرے کے خلاف لڑتے تھے۔ بلکہ اس ضمن میں اسلامی علوم کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔

اور اگر مسلمان علماء کے شاندار علمی کارنامے نہ ہوتے تو یورپ ابھی تک جہالت اور تاریکی میں پڑا رہتا۔ کئی طویل صدیوں تک دنیا کی روحانی روشنی اسلامی ممالک ہی سے پھوٹتی رہی۔ اس کے بعد دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ چنانچہ جہاں یورپ مادی اور معنوی دنیا کی تسخیر کے لئے نکل پڑا۔ وہاں مشرق قدیم مذہبی کتابوں کی خشک تاویلات اور اس کی نقلیں کرنے میں لگا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو اسی حد تک ماضی کے

حوالے کر دیا کہ وہ اس کے اندر محدود ہو کر فرسودگی کی نذر ہو گیا۔ یورپ میں صدیوں تک چھاپہ خانوں میں شائقین کے لئے کتابیں چھپتی رہیں اور اس کے بعد کہیں جا کر شیخ الاسلام نے ۱۷۲۹ء میں باقاعدہ فتوے کے ذریعہ کتابوں کے چھاپے خانے کو عمل شیطانی کے الزام سے مبرّا ئی ہونا قرار دیا۔ یورپ میں انجیل مقدس وہ کتاب تھی جسے سب سے پہلے چھاپا گیا اور انجیل کے جو ترجمے ہوئے وہ مختلف زبانوں کی نشو ونما اور ان کے ادب کی ترقی کا باعث بنے۔ اس کے برعکس اسلام' قرآن مجید کے دوسری زبانوں میں ترجمے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان عوام سے الگ تھلگ رہا۔

سب سے پہلا اور بنیادی سبب یہی ہے کہ مسلمانوں نے عرصہ دراز سے اسلام کی واضح تعلیمات کو بالکل پس پشت ڈال رکھا تھا۔ وہ سالہا سال سے یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہمیں مغربی سامراج اور اس کے حاشیہ نشینوں سے نفرت ہے۔ لیکن ان کی زندگی کی ہر نقل وحرکت اس دعویٰ کو جھٹلاتی ہے۔ ان کے افکار، ان کی تہذیب، ان کی معاشرت، ان کا لباس، غرض سر سے لے کر پاؤں تک ہر چیز پکار پکار کر یہ کہتی ہے کہ ہم زبان سے مغربی سامراج کو کتنا برا بھلا کہتے رہیں۔ لیکن ہمارے دل اسی کی محبت وعظمت سے آباد ہیں۔ ہمیں تہذیب ان ہی کی پسند آتی ہے۔ افکار ان ہی کے اچھے لگتے ہیں اور معاشرت ان ہی کی محبوب ہے۔

اسی طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ بعض عرب ملکوں میں جا کر دیکھیے تو یہ پہچاننا مشکل ہوگا کہ یہ مسلمانوں کا ملک ہے وہی عریانی، وہی فحاشی، وہی عیش پرستی اور وہی خدا اور رسولؐ کے احکام سے دوری۔

انتہا یہ ہے کہ ایک طرف اسرائیل کے یہودی علماء عرب ممالک کے خلاف اپنے عوام میں مذہبی جوش پیدا کر رہے تھے مگر دوسری طرف مصر اور شام کے علماء کو تہ خانوں میں قید کر کے اسلام پسندی کی سزا دی جارہی تھی۔

اسلام کی تعلیمات سے دور نکلنے کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ عرب ممالک اسرائیل کا مقابلہ کرنے کے لئے اسلام کے بجائے ''عرب قومیت'' کا نعرہ لگا رہے تھے۔ انہوں نے برسوں سے وطنی قومیت کے اس بت کو اپنی آستینوں میں جگہ دے رکھی تھی۔ جسے توڑنے کے لئے سرکار دوعالم ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں صاف اعلان فرمادیا تھا کہ:

لا فضل لعربی علی العجمی ''کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں''

اسرائیل میں مختلف نسلوں اور مختلف خطوں کے یہودی یک دل اور یک جان ہو کر اپنی فوجی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ان میں کوئی بات یہودی مذہب کے سوا مشترک نہیں تھی ان کی نسلیں مختلف، وطن جدا، زبانیں الگ، مگر مذہب کے نام پر وہ ایک ہو رہے تھے۔ اس مذہبی اتحاد نے ان میں مذہبی جنگ کی روح بیدار کر دی تھی۔ اس لئے ان کا مقابلہ وطنی قومیت کی بنیاد پر کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ ان کا موثر مقابلہ کرنے کے لئے ضرورت اس بات کی تھی کہ مسئلہ فلسطین کو صرف عربوں کا نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا مسئلہ بنا کر پیش کیا جاتا۔ اور انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک کے تمام مسلمانوں کو اس مہم میں شریک کیا جاتا، پاکستان، ترکی اور ایران نے اپنی سابقہ تلخیوں کو بھلا کر عربوں کی حمایت میں جو مثالی کردار ادا کیا وہ یہ ثابت کرنے کے لئے بالکل کافی ہے کہ اگر اہل عرب فلسطین کے مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ تمام مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوشش کرتے تو یہ بات کچھ مشکل نہیں تھی اور اگر یہ عظیم الشان اتحاد قائم ہو جاتا تو نہ صرف دنیا کے نقشہ پر سے اسرائیل کا وجود مٹ چکا ہوتا بلکہ کشمیر سے لے کر قبرص تک کے تمام مسلم مسئلے خود بخود حل ہو جاتے اور یہ اسلامی ممالک جو اپنے مسائل حل کرنے کے لئے امریکہ، کبھی روس اور کبھی چین کی طرف دیکھنے پر مجبور ہیں، ہر بیرونی احتیاج سے آزاد ہو جاتے۔ دنیا کے نقشے پر نظر ڈال کر دیکھئے قدرت نے عالم اسلام کو جغرافیائی اعتبار سے کس طرح ایک لڑی میں پرو رکھا ہے، دنیا کی کیسی کیسی اہم شاہراہیں ان کے قبضہ میں ہیں۔ کیسے کیسے قدرتی وسائل انہیں میسر ہیں، انسانی

وسائل کے اعتبار سے بھی وہ کتنے مالا مال ہیں۔ کرہ زمین کے بالکل بیچوں بیچ واقع ہونے کے سبب پوری دنیا کا دل کس طرح ان کے ہاتھ میں ہے۔ اگر یہ قدرتی انعامات اتحاد اور تنظیم کے ساتھ کام میں لائے جائیں تو کیا وجہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنا جائز مقام حاصل نہ کر سکیں؟

ہم نے تعلیمات اسلام سے منہ موڑا، اور مغربی معاشرت وافکار کو بھی صرف آزادانہ عیش وعشرت کی حد تک اختیار کیا۔ دشمنوں کی مدافعت کے لئے جدید اسلحہ اور جدید طریق جنگ جو اسلام سے حاصل کرنے کی چیز تھی ہم نے اس کی طرف کوئی التفات نہ کیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم دشمن کے مقابلہ کے لئے مادی اعتبار سے بھی کوئی موثر تیاری نہیں کر سکے، اسرائیل کا خطرہ عربوں کے سروں پر گزشتہ سالہا سال سے منڈلا رہا ہے۔ اس کے جارحانہ عزائم بھی کبھی پردے میں نہیں رہے اس کی جنگی تیاریاں بھی ان کے سامنے تھیں، لیکن انہوں نے اس کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش نہیں کی، قدرت نے انہیں بہترین قدرتی اور انسانی وسائل سے مالا مال کیا ہے، تیل پر موجودہ دنیا کی روح قائم ہے اور اس علاقے میں انہیں اس ''زرسیال'' پر تقریباً اجارہ داری حاصل ہے۔ لیکن انہوں نے قدرت کی اس گراں بہا نعمت کو تمام وکمال ان غیر مسلموں کے رحم وکرم پر چھوڑ رکھا ہے جن کی اسلام دشمنی کبھی راز نہیں رہی اور خود اس تیل کی رائلٹی پر قناعت کر کے اس طرح بیٹھے ہوئے ہیں گویا اس نعمت کا اس سے بہتر کوئی مصرف نہیں ہوسکتا۔ سہل نگاری اور عیش کوشی کے سوا اس تلخ حقیقت کی اور کیا تاویل کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے گزشتہ بیس سال میں اپنے یہاں ایسی ایک جماعت بھی پیدا نہیں کی جو تیل کے کنوؤں سے استفادے کا ہنر جانتی ہو اور اپنی اس دولت کو غیر ملکیوں کے تسلط سے آزاد کرا سکے۔

پھر انہیں ان قدرتی وسائل کی صرف رائلٹی سے جو رقم حاصل ہوتی ہے وہ تناسب کے اعتبار سے دنیا کے امیر ترین ملکوں کی مجموعی آمدنی سے بھی زیادہ ہے، ایک اندازے کے مطابق بینک آف انگلینڈ جیسے دولت مند بینک کی دو تہائی دولت صرف کویت کی جمع کرائی ہوئی رقم سے حاصل ہوتی ہے۔ اور دوسرے دولت مند عرب ممالک یورپ اور امریکہ کے بینکوں میں جو رقمیں جمع کراتے ہیں وہ اس کے علاوہ اس کے یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اتنی خطیر رقم جس کے بل پر یورپ نے پوری دنیا میں اپنی ساکھ کا لوہا منوا رکھا ہے کیا اس سے تجارتی منافع حاصل کرنے کا حق بھی اسی مغربی دنیا کو پہنچتا ہے جس کی دولت کا ایک بہت بڑا مصرف عالم اسلام کی تخریب ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ رقم خود اپنے ملکوں میں جمع رکھ کر اس سے عالم اسلام کی تعمیر وترقی کا کام لینے کا انتظام کیوں نہیں کیا جاتا؟ موجودہ حالات میں تو ان کے پاس یہ دولت جمع کرانے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں نکلتا، مغربی ممالک عربوں کا تیل استعمال کرنے کا جو معاوضہ انہیں دیتے ہیں یہ پھر اسے انہیں کی جیب میں ڈال دیتے ہیں کہ تم ہی اس سے نفع اٹھاؤ، اس سے اپنی تجارت وصنعت کو فروغ دو، اسی کے ذریعہ اسرائیل کو طاقت ور بنانے کے لیے اسے جدید ترین اسلحہ مہیا کرو۔ اور اسی کے ذریعہ ہم پر بمباری کرنے والے طیارے بناتے رہو، اور جس وقت ہمیں اپنے کسی ترقیاتی کام کے لئے کوئی ضرورت پیش آئے تو اسی کا کچھ حصہ ''امداد'' کا نام رکھ کر ہمیں واپس کردو، تاکہ دنیا کے گوشے گوشے میں تمہاری سخاوت اور فیاضی کے قصیدے پڑھے جائیں اور ہماری گردنیں ہمیشہ تمارے احسانات کے آگے جھکی رہیں۔ جو بچی کھچی رقم یہ ممالک اپنے پاس رکھتے ہیں وہ بھی تھوڑی نہیں ہے لیکن اس کا مصرف کیا ہے؟ ائیر کنڈیشنڈ گاڑی، آرائش وزیبائش کا جدید ترین سامان، خودکار فلمیں، شراب، بچوں کے قیمتی کھلونے، ہوابند ڈبوں کی غذائیں، اور قصیدہ گو شاعر۔ عرب ممالک میں بیشتر کا حال یہ ہے کہ وہاں آپ کو گھر گھر ٹیلیویژن اور خودکار فلمیں ملیں گی۔ سڑکوں پر لاتعداد کیڈی لک کاریں دوڑتی نظر آئیں گی۔ لیکن ان کی چھاؤنیوں میں فوجیوں کی تعداد ان کاروں سے کئی گنا کم نظر آئے گی۔ اسلحہ تھوڑا اور وہ بھی پرانے طرز کا ملے گا، انتہا یہ ہے کہ کویت جیسے دولت مند ملک میں فوج کی تعداد کل چند ہزار اور طیاروں کی تعداد بھی بہت تھوڑی ہے۔

نصف صدی سے اسرائیل کا عالم یہ ہے کہ وہاں بچہ بچہ سپاہی بن رہا ہے مگر اہل عرب کی باقاعدہ افواج بھی جدید مشینی جنگ کے ترقی یافتہ طریقوں کی تربیت نہیں رکھتیں۔ وہاں ملک کی دولت کا بیشتر حصہ دفاعی مقاصد پر صرف ہوتا ہے اور یہاں ہر فرد اپنی رقم کا بہترین مصرف تفریح تعیش اور آسائش کو سمجھتا ہے، وہاں جدید ترین اسلحہ کی بھر مار ہو رہی ہے اور یہاں گھر گھر ٹیلی ویژن نصب ہیں، وہاں ٹینکوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا جارہا ہے۔ اور یہاں کاروں میں ایئر کنڈیشنز لگانے کا شوق بڑھ رہا ہے وہاں صنعتی اور تکنیکی میدان میں ترقی کے لئے شب و روز کوششیں ہو رہی ہیں اور یہاں ترقی و خوش حالی کا معیار رقص و سرود کو سمجھ لیا گیا ہے۔ وہاں مختلف اور متحارب جماعتیں اسلام کو مٹانے کے لئے متحد ہو رہی ہیں اور یہاں ابھی تک یہی طے نہیں ہو سکا کہ اتحاد کی بنیاد کیا ہو۔

ہم نے اتحاد عالم اسلامی کی کوشش کرنے کے بجائے دوسروں پر بھروسہ کرنے کو ضروری خیال کر لیا ہے۔ بجائے اس کے انڈونیشیا سے مراکش تک پورا عالم اسلام متحد ہو کر اپنے مسائل خود حل کرنے کی کوشش کرتا، آج اس کی نگاہیں کبھی روس، اور کبھی امریکہ کی طرف مرکوز رہتی ہیں حالاں کہ قدم قدم پر ان طاقتوں کی بے وفائی مشاہدے میں آچکی ہے۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جو شخص دنیا میں جنگل کا قانون نافذ کرنا چاہتا ہو اس کا علاج تقریروں سے نہیں، شمشیروں سے ہوا کرتا ہے، جارحیت کی مذمت زبان سے نہیں، سنگینوں کی نوک سے کی جاتی ہے۔ اور مظلوم کی فریاد رسی گول میزوں سے نہیں جنگ کے میدان میں ہوا کرتی ہے۔

اغیار کی جارحیت کا سیلاب از خود کسی حد پر رکنے والا نہیں، جب تک کہ عالم اسلام اس پر یہ ثابت نہ کر دے کہ مسلمان ایک ایسی چٹان ہے جس سے ٹکرانا اپنے آپ کو پاش پاش کر ڈالنے کے مترادف ہے، زبانی دعوؤں کا وقت گزر چکا ہے اب عمل کا وقت ہے۔ اور اگر اب بھی ہمیں ہوش نہ آیا تو ہمارا انجام بڑا ہولناک ہوگا۔ آج اسرائیل نے بیت المقدس اور صحرائے سینا پر قبضہ جمایا ہے کل وہ قاہرہ، دمشق، اور بغداد کا رخ کرے گا اور پھر عالم اسلام کا کوئی گوشہ اس قہر الٰہی سے محفوظ نہ رہ سکے گا۔

امریکہ اور اس کے اتحادی مختلف حیلے بہانوں سے مسلمان ممالک کے وسائل پر قبضہ جمانے کے لئے عراق اور افغانستان میں اپنی فوج کشی کر چکے ہیں اور بعض دوسرے ممالک پر نظریں جمائے بیٹھے ہیں۔

عالم اسلام کو قدرت نے وسائل سے مالا مال کر رکھا ہے۔ اگر ان وسائل کو عیش پرستی اور سہل پسندی کے بجائے تعمیری اور اصلاحی کاموں کے لئے بروئے کار نہ لایا گیا تو نتائج سنگین ہو سکتے ہیں۔

فصل دوم

اثرات

سیاسی و جغرافیائی اثرات

نبی آخر الزمان ﷺ نے ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں جغرافیائی لحاظ سے حجاز کی سرزمین سے اس روشنی کو پوری دنیا کے لئے پھیلانا شروع کیا اور مدینہ منورہ میں دس سال کی کاوش سے تقریباً ۱۵ لاکھ مربع کلومیٹر کی اسلامی ریاست قائم کر دی آپؐ کی وفات کے بعد آپؐ کے براہِ راست تربیت سے تیار شدہ افراد نے آپؐ کے اختیار کردہ طریق کار کے مطابق، خلافت راشدہ کی صورت میں، اسلامی ریاست کا نظام چلایا جو تقریباً تیس سال پر محیط ہے۔ خلافت راشدہ کے تیس سال نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ تاریخ عالم میں ایک سنہری دور کے طور پر ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، یہ اسلامی فلاحی ریاست، بعد میں ایک ہزار سال پر محیط نظام تمدن کی بنیاد بنی۔ جو آج تک درخشندہ تہذیب کے طور پر بے مثال ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کا طویل اور وسیع نظم مملکت اگرچہ مثالی نہیں رہا مگر اسلامی ریاست کے بنیادی خدوخال کو جب بھی کسی مسلمان حکمران نے، خلافت کے اصول و نظم کے مطابق قائم کیا تو عروج کا سفر طے کیا اور جب انحراف ہوا تو اسلامی ریاست بکھرتی چلی گئی۔

مسلمانوں کے عروج و زوال کے سلسلے میں یہ تاریخی حقیقت ذہن نشین رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کو ابھی پورے سو سال بھی نہ گزرے تھے کہ مشرق میں سندھ سے لے کر مغرب میں فرانس کی حدود تک کے یہ سارے ممالک آپؐ کے نام لیواؤں کے زیرنگیں آ گئے۔ اس عالمی سلطنت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے ایک عالمی کلچر اور تہذیب کو بھی جنم دیا۔ جسے پروان چڑھانے میں اس وقت کی معلوم دنیا کی سب قوموں اور سب تہذیبوں نے کم و بیش حصہ لیا، اس عالمی اسلامی کلچر کا مرکز بغداد تھا۔ جس کے سرچشمے سے وقتاً فوقتاً کلچر کی سوتیں پھوٹتیں اور صدیوں تک دنیائے اسلام کے دور دراز حصوں کو سیراب کرتی رہیں۔ بغداد کا سنگ بنیاد ۷۶۰ء میں رکھا گیا اور اس کے فوراً بعد ہی اسے مسلمانوں کے عالمی کلچر کی مرکزیت حاصل ہو گئی۔ ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد بالکل تباہ ہو گیا اور عالمی کلچر کی وہ شمع جو وہاں تقریباً ۵۰۰ سال تک کبھی بڑی تابانی سے اور کبھی دھیمی روشن رہی ہمیشہ کے لئے بجھ گئی لیکن اس شمع سے جو شعاعیں پھوٹ کر دوسرے اسلامی ملکوں میں پہنچ چکی تھیں وہ اس کے بعد بھی ایک حد تک روشن رہیں۔ چنانچہ آٹھویں صدی سے لے کر سولھویں صدی کے آخر تک پورے آٹھ سو سال مسلمانوں کی یہ عالمی تہذیب بلا خوف و تردید دنیا کی باقی تہذیبوں سے آگے رہی۔ اور دوسری قومیں اسی سے خوشہ چینی کرتی رہیں۔ اس تمام عرصے میں مسلمان قومیں تجارت، صنعت علم و ادب، معاشرت قواعد جنگ اور فنونِ لطیفہ میں دنیا کی باقی قوموں سے پیش پیش تھیں یہاں تک کہ جب سولھویں صدی کے شروع میں پرتگالی جہاز ران پہلی دفعہ افریقہ کے گرد گھوم کر جنوبی ہندوستان کے ساحلوں پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ انڈونیشیا، ملایا، بحر ہند اور بحیرۂ عرب کی ساری تجارت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ انہی کے جہاز ان سمندروں میں آتے جاتے ہیں۔ انہی کی تجارتی کوٹھیاں ان سمندروں کے ساحلوں پر موجود ہیں۔ مسلمان ہی بڑے بڑے تاجر ہیں اور انہیں کے اپنے جہازوں کے بیڑے ہیں۔ اور وہی ان کے امیر البحر ہیں۔ چنانچہ پرتگالی بیڑوں کی بحر ہند میں جو بھی لڑائیاں ہوئیں مسلمانوں کے بیڑوں سے ہوئیں۔ الغرض اس وقت تک مشرق اور مغرب کی تجارت کلیۃً مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ سنگاپور کی آبنائے سے گزر کر چین تک تجارتی جہاز لاتے اور لے جاتے تھے۔ اور پورا بحر ہند عملاً مسلمانوں کا سمندر تھا۔[1]

---

[1] عبدالکریم، جرمانوس (مترجم محمد سرور) مسلمان اقوام کے زوال کے اسباب، ص: ۱۲

برِاعظم ہند اور مشرق قریب میں مغل اور ترکوں کی سلطنتیں عروج کے بعد روبہ زوال ہو گئیں۔ چنانچہ وہ سلطنت جو کبھی افریقہ، ایشیا اور یورپ تین برِاعظم پر حاوی تھی سمٹنے لگی اور روز بروز کمزور ہوتی چلی گئی۔ اور ان کے قدم روز بروز پیچھے کو ہٹے اور دوسری طرف یورپی قوموں نے ہندوستان تک پہنچنے کا نیا سمندری راستہ دریافت کر لیا۔ جس کی وجہ سے مشرق کی ساری تجارت ان کے ہاتھ میں آ گئی تجارتی قبضہ کے بعد اگلا مرحلہ علاقائی قبضہ تھا جو بتدریج جاری رہا۔ اور مختلف حیلے بہانوں سے حملہ کر کے مغربی قومیں اپنا تسلط جماتی گئیں۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ یورپی قوموں کے ان حملوں کی شدت اور وسعت بڑھتی گئی اور مسلمان قوموں کی حالت اسی نسبت سے کمزور تر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ جب ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی ہے تو روئے زمین پر کوئی بھی ایسا اسلامی علاقہ نہ رہا تھا۔ جس پر کسی نہ کسی یورپی طاقت کا بالواسطہ یا براہ راست قبضہ نہ ہو چکا ہو۔ اسلامی دنیا کے زوال کا شاید یہ آخری نقطہ تھا۔

مسلمان قیادت سیاسی لحاظ سے کمزور ہو گئی۔ اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کیونکہ ہر سیاسی طاقت کی اساس اخلاقی و معنوی تہذیب ہوتی ہے۔ اور جب کسی قوم کی اخلاقی اور معنوی تہذیب کو زوال آ جائے تو اس کی سیاسی طاقت کا روبہ زوال ہونا یقینی ہو جاتا ہے۔

بعض مفکرین رسول اکرم ﷺ کے یوم وفات سے ہی مسلمانوں کے زوال کا آغاز کر لیتے ہیں بعض خلافت کے اختتام سے اس زوال کی ابتدا مانتے ہیں اور بعض جن کے نزدیک اسلام اور عرب مترادف ہیں، وہ عربوں کے سیاسی زوال سے مسلمانوں کا زوال شروع کرتے ہیں۔

دنیا میں اس وقت بے شمار ممالک ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت بھی ہے اور جو آزادی کی نعمت سے بہرہ ور بھی ہیں اگر ان میں فلسطین کو اور اشتراکی دنیا کے ان علاقوں کو بھی شامل کر لیا جائے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے تو مسلم اکثریت رکھنے والے ملکوں کی تعداد اور بڑھ جاتی ہے۔ یہی وہ ملک ہیں جن کو عام اصطلاح میں اسلامی ممالک کہا جاتا ہے۔

لیکن دنیائے اسلام صرف مسلمان اکثریت رکھنے والے ملکوں تک محدود نہیں اسلام ایک عالمگیر اور بڑھتا اور پھیلتا ہوا دین ہے اس کے پیروکار دنیا کے تقریباً ہر حصے میں موجود ہیں۔ کہیں کم ہیں اور کہیں زیادہ اور بعض ملکوں میں ان کی حیثیت ایک اہم اقلیت کی ہے ان ملکوں کی مجموعی تعداد ایک سو سے زیادہ ہے۔ اس ضمن میں گستاؤلی بان کہتا ہے۔

> ''جس حیرت انگیز آسانی کے ساتھ اسلام عالم میں پھیلتا جاتا ہے وہ بالکل اس مذہب کے ساتھ مخصوص ہے۔ جس جگہ کسی مسلمان کا گزر ہو گیا وہاں مذہب اسلام قائم ہو گیا''۔[1]

مسلمان ریاستیں لسانی اور وطنی لحاظ سے مختلف نسلوں اور قوموں پر مشتمل ہیں ان میں کچھ ملک ایسے ہیں جن کے مسلمان باشندے اس ملک کے اصل اور قدیم باشندے ہیں۔ یہ ملک ایشیا اور افریقہ کے ہیں۔ ان ملکوں میں سے کوریا اور جاپان میں اسلام پچھلی صدی میں بلکہ اس کے نصف آخر میں پہنچا، لیکن یہاں بھی مسلمان اقلیت کی اکثریت مقامی باشندوں پر مشتمل ہے ایشیا اور افریقہ کے ان ملکوں کے مسلم معاشرے کی اصل روح رواں غیر ملکی مسلمان نہیں بلکہ مقامی مسلمان ہیں۔

مسلمانوں کا تقریباً نوے فیصد حصہ برصغیر پاکستان و ہند کے مسلمانوں، عربوں اور ترکوں پر مشتمل ہے۔ عرب اور ترک دوسرے نمبر پر ہیں۔ پاکستان و ہند کے مسلمان حسبِ ذیل ملکوں میں پائے جاتے ہیں۔

ہانگ کانگ، تھائی لینڈ، سنگاپور، برما، نیپال، سری لنکا، ماری شس، آسٹریلیا، فجی، نیوزی لینڈ، کینیا، یوگنڈا، تنزانیہ، جنوبی افریقہ، ملاوی، زیمبیا، زمبابوے، برطانیہ، ہالینڈ، پرتگال، ڈنمارک، ناروے، سوئٹزرلینڈ، کنیڈا، ریاست ہائے متحدہ امریکہ، بارباڈوس، گریناڈا اور سرینام وغیرہ۔

---

[1] گستاؤلی بان (مترجم علی بلگرامی) تمدن عرب، ص: ۷۵۴

برصغیر کے مسلمانوں کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ جہاں بھی گئے وہاں انہوں نے نہ صرف اپنے دین کا تحفظ کیا بلکہ مسجدیں اور مدرسے قائم کئے، اسلامی تنظیمیں بنائیں بلکہ اسلام کی تعلیمات کو تبلیغ اور مطبوعات کے ذریعے غیر مسلموں تک پہنچایا۔ خواہ ان کی تعداد زیادہ ہو یا کم وہ اپنے دینی فریضہ سے بہت کم غافل رہے۔[۱]

یہ بات افسوس ناک ہے کہ عرب جو اسلام کے اولین علمبردار تھے ان کی اکثریت یورپ اور امریکہ میں اپنے اسلامی کردار کو فراموش کر چکی ہے۔ ایک زمانہ تھا مسلمان جہاں جاتے تھے وہاں اسلام کی شمع روشن ہو جاتی تھی لیکن اب ایسی مثالوں کی کمی نہیں کہ یورپ اور امریکہ پہنچ کر ان کی ایک تعداد نے اسلام کی شمع بجھانا شروع کر دی۔ اور ان کی نسلوں کی نسلیں مرتد ہو گئیں اور مسیحی مذہب اختیار کر لیا۔ خاص طور پر جنوبی امریکہ میں دینی لحاظ سے سب سے بری حالت شمالی افریقہ (لیبیا، تیونس، الجزائر اور مراکش) کے عربوں کی ہے اور سب سے اچھی حالت شام اور لبنان کے مسلمانوں کی ہے۔ ایک مراکشی مفکر لکھتے ہیں۔

> ''فرانس میں اتنی بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود مسلمانوں کی دینی حالت خراب ہے چند مدرسوں کے علاوہ کوئی دینی مدرسہ بھی نہیں اور مسجدیں بھی بہت کم ہیں۔ شمالی افریقہ کی حکومتیں بھی ان کے دینی معاملات میں دلچسپی نہیں لیتیں''
>
> ''عرب مالی لحاظ سے خوش حال ہیں لیکن دینی لحاظ سے شمالی اور جنوبی امریکہ میں سب سے بری حالت ان ہی عربوں کی ہے۔ برازیل میں عرب مذہب سے بیگانہ ہیں اور دو لاکھ کی آبادی کے باوجود دو چار سے زیادہ مسجدیں نہیں اور دینی مدرسہ کوئی نہیں''[۲]

دو یا تین نسلوں سے یہ مسلمان عرب اسلام سے اس قدر بیگانہ ہو گئے ہیں کہ ان میں بعض اسلام کے بنیادی اصولوں تک سے ناواقف ہیں اور بسم اللہ تک درست نہیں پڑھ سکتے۔ شراب اور عورت مرد کا آزادانہ اختلاط مسلم معاشرے کو تباہ کر رہا ہے اور برازیلی لڑکیوں کے ساتھ شادی کی وجہ سے نئی نسل عیسائی ہوتی جا رہی ہے یہی حالت ارجنٹائن کے عربوں کی ہے جن کی تعداد تین لاکھ ہے لیکن ابھی تک ایک مسجد قائم نہیں کر سکے۔ اور ارتداد کے خطرے میں ہیں۔

چلی کے بارے میں ایک محقق نے لکھا ہے۔

> ''اس صدی کے آخر تک وہاں سے مسلمانوں کا وجود ختم ہو جائے گا پیراگوئے میں عربوں میں نام کے علاوہ ان کا کوئی وجود نہیں۔ پیرو میں شروع میں آنے والے عرب بہت اچھے مسلمان تھے ان کی تبلیغ سے مقامی لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا لیکن اب نئی نسل تشویشناک حد تک مذہب سے بے گانہ ہے''[۳]

عبرت کی بات یہ ہے کہ فرانسیسی گویانا اور نیو کیلے ڈونیا کے عرب ان الجزائری اور مراکشی مجاہدوں کی اولاد ہیں جنہوں نے امیر عبدالقادر الجزائری اور امیر عبدالکریم کی قیادت میں فرانس سے برسوں جہاد کیا۔ ان جنگوں میں فرانس کے ہاتھ جو قیدی آئے ان کو فرانسیسی حکومت نے گویانا اور نیو کیلے ڈونیا کے دور دراز حصوں میں اس طرح جلاوطن کر دیا تھا جس طرح برصغیر کے مسلمان مجاہدین اور علماء کو برطانوی حکومت جزائر انڈیمان میں جلاوطن کر دیتی تھی۔

۱　ثروت صولت؛ دنیا میں مسلم اقلیتیں، ص:۱۸　　۲　ثروت صولت؛ دنیا میں مسلم اقلیتیں، ص:۱۹

۳　ایضاً، ص:۱۹

آج ان مجاہدین کی اولاد دین سے بے گانہ ہوتی چلی جارہی ہے۔ دین سے غفلت کا ذمہ دار عرب قوم پرستی کو قرار دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے عرب قومی سرگرمیوں میں تو حصہ لیتے ہیں لیکن دینی سرگرمیوں سے دلچسپی نہیں رہی۔ برطانیہ، ریاست ہائے متحدہ اور کینیڈا میں اب عرب کچھ عرصہ سے برصغیر کے مسلمانوں کو دیکھ کر اور سعودی عرب، رابطہ عالم اسلامی اور اس کے ملحقہ اداروں کی امداد اور تحریک سے دینی معاملات میں کافی سرگرم ہو گئے ہیں۔ ترک سب سے زیادہ تعداد میں حسب ذیل ملکوں میں ہیں۔

آسٹریلیا، بلغاریا، رومانیا، یونان، یوگوسلاویا، فن لینڈ، ناروے، سویڈن، ڈنمارک، ہالینڈ، بلجیم، جرمنی کینڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ۔ بلغاریا' یونان اور رومانیا کے تُرک دینی حمیت رکھتے ہیں، لیکن اشتراکی حکومتوں کی جابرانہ پالیسیوں نے ان کو بے بس کر دیا ہے۔ یوگوسلاویا میں ان کی حالت نسبتاً بہتر ہے۔ یونان کے تُرک دین کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں، اگرچہ یونانی حکومت کی معاشی اور سیاسی پالیسیوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں لیکن دینی معاملات میں ان کو مکمل آزادی ہے فن لینڈ کے ترک بہت کم تعداد میں ہیں لیکن بہت منظم ہیں۔

یورپ کے بعض ملکوں خصوصاً آسٹریا، جرمنی، ڈنمارک اور سویڈن میں اور ریاستہائے متحدہ میں اور آسٹریلیا میں یوگوسلاوی اور البانوی مسلمان بھی کافی تعداد میں ہیں اور انہوں نے ہرجگہ اپنی مسجدیں قائم کر رکھی ہیں۔ انڈونیشی مسلمان صرف ہالینڈ، سرنیام اور نیو کیلے ڈونیا میں موثر گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں بھی دینی جذبہ موجود ہے۔

جاپان، کوریا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں مسلمانوں کا سب سے فعال گروہ نومسلموں پر مشتمل ہے نومسلموں کی ایک بہت بڑی تعداد خاص طور پر یورپ اور امریکہ میں ان خواتین پر مشتمل ہے جو مسلمان مردوں سے شادی کر کے مسلمان ہو جاتی ہیں۔ نومسلموں کی باقی تعداد سوچ سمجھ کر اور اسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد اسلام لائی ہے اور یہ نومسلم اپنے عمل اور کردار کے لحاظ سے روایتی اور خاندانی مسلمانوں سے بہتر ہیں شروع شروع میں مسلمانوں کی عام سرگرمیوں سے الگ رہتے تھے لیکن انہوں نے کچھ عرصہ سے زیادہ فعال کردار ادا کرنا شروع کر دیا ہے۔

ان نومسلموں کی تعداد، ریاستہائے متحدہ کے افریقی باشندوں کے علاوہ کسی بھی ملک میں بہت زیادہ نہیں۔ ایشیا میں جاپان، کوریا اور سنگاپور میں گزشتہ ۲۵ تا پچاس سال کی مدت میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔

یورپ میں بھی جاپان اور کوریا کی طرح تعلیم یافتہ طبقہ ذاتی مطالعہ کے نتیجے میں مسلمان ہو رہا ہے۔

فرانس اور سوئٹزرلینڈ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ تصوف کے مطالعہ سے اسلام کی طرف آیا ہے اور ان میں 'رینے گینو' جن کا اسلامی نام عبدالواحد یحییٰ ہے اور 'راجر جرودی' فلسفی اور مصنف کی حیثیت سے ممتاز درجہ رکھتے ہیں آسٹریا کے نومسلموں میں محمد اسد، ہنگری کے نومسلموں میں عبدالکریم جرمانوس انگلستان کے نومسلموں میں محمد مارماڈیوک پکھتال اور امریکی سفید فاموں میں ٹائن بی۔ اروِنگ کی علمی اور دینی خدمات بہت اہم ہیں۔ نومسلم خواتین میں شاید سب سے ممتاز نام جرمن خاتون فاطمہ ہیرن کا ہے جنہوں نے مولانا مودودیؒ کے رسالہ دینیات کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا ہے۔

افریقہ یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں کی آبادی چونکہ مختلف ملکوں سے آئے ہوئے لوگوں پر مشتمل ہے جن کی زبانیں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس لئے ان کے درمیان رابطہ وتعاون کی کمی ہے ان کی علیحدہ علیحدہ تنظیمیں ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں۔ تمام مسلمانوں کی مشترکہ اور متحدہ آواز نہ ہونے کی وجہ سے وہ حکومتوں پر زیادہ اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی یہ تنظیمیں چونکہ اپنے حلقوں میں اور اپنی اپنی زبانوں میں کام کرتی ہیں۔ اس لئے ان کے ذریعے مقامی باشندوں تک اسلام کی آواز نہیں پہنچتی۔

رابطہ عالم اسلامی، مکہ اور اس کی علاقائی شاخیں اور اس کے زیر اہتمام ہر ملک اور مختلف جغرافیائی خطوں میں مساجد برائے مجالس کا

قیام بھی مسلمانوں کے مختلف گروہوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

مشرقی افریقہ کے ہندوستانی اور پاکستانی مسلمان یا تو تجارت پیشہ ہیں یا اعلیٰ ملازمتوں پر فائز ہیں جرمنی، فرانس، برطانیہ، ہالینڈ، بلجیم، آسٹریا، ناروے، ڈنمارک، اسپین، اور اٹلی میں کام کرنے والوں کی اکثریت مزدور پیشہ ہے لیکن برطانیہ اور بعض ملکوں میں ایک خاص تعداد اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں پر بھی مشتمل ہے۔ کنیڈا اور ریاستہائے متحدہ میں عام طور پر مسلمان آبادکار ملازمت پیشہ ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اور پیشہ ورانہ مہارت رکھتے ہیں۔ لیکن وہ مغربی تہذیب کا حصہ ہے۔

اس سلسلے میں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ بیشتر ملکوں میں یہودی' مسلمانوں سے تعداد میں بہت کم ہیں لیکن تقریباً ہر ملک کی اقتصادی زندگی پر چھائے ہوئے ہیں اور بعض ملکوں میں صحافت اور ذرائع ابلاغ بھی ان ہی کے ہاتھ میں ہے اس طرح جنوبی امریکہ کے ہر ملک میں لبنانی اور شامی عیسائی مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوش حال ہیں اور تعداد میں بھی بہت زیادہ ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے مسلمانوں کو، اشترا کی مما لک کو مستثنیٰ کر کے، مکمل مذہبی آزادی ہے لیکن وہاں ان کو ایک ایسے معاشرے کا سامنا ہے جو دین، زبان اور رسم و رواج سب میں ان سے مختلف ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک ترقی یافتہ معاشرہ ہے جو ترقی پذیر معاشروں پر اثر انداز تو ہو سکتا ہے لیکن خود بہت کم اثر قبول کرتا ہے۔

جاپان میں اسلامی طریقہ پر تدفین و تکفین ایک بہت پیچیدہ مسئلہ ہے اور وہاں کے قانون اور رواج اور مسلمانوں کے لئے قبرستان کی عدم موجودگی کی وجہ سے بہت سے مسلمانوں کی لاشوں کو اسلامی طریقہ پر دفن کرنے کی بجائے جلا دیا جاتا ہے۔ لیکن وہاں کے مسلمانوں کی کمزوری ہے کہ وہ اپنا حق مانگنے سے قاصر ہیں۔

عربوں کے قبول اسلام کے بعد عرب نو آبادیوں نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی۔ قبول اسلام کے بعد عربوں میں جو تعمیری روح پیدا ہوئی اس کے اثرات ہر طرف پھیل گئے اور ان کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں کی تجارت بھی وسعت اختیار کر گئی۔ مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں عربوں کی فتوحات نے انہیں بہت سی تجارتی قوموں کا وارث بنا دیا اور اب ان کی بحری تجارت جنوبی بحر روم کے کناروں سے چین کے ساحل تک وسیع ہوگئی۔ عرب کی سرزمین ریگستان ہونے کے باعث اچھی لکڑی سے محروم تھی، اس لئے عربوں نے ہندوستان کے گھنے جنگلوں سے فائدہ اٹھایا اور ہندوستانی ساحل کی صنعتِ جہاز سازی کو وسعت دے دی۔

جنوب مشرقی ایشیا کے ان جزائر سے جن میں مسالوں کی بہتات تھی اور چین کے ان مراکز سے جہاں ریشمی کپڑے تیار کئے جاتے تھے، عربوں کی تجارت نے ہندوستانی ساحل پر ایسی نو آبادیوں کو ناگریز بنا دیا، جن میں ہر قسم کا ساز و سامان مہیا ہو۔ جنوبی ہند کے ساحل کرومنڈل کا جو نام عربوں نے رکھا تھا وہ معنی خیز ہے۔ عرب اس ساحل کو معبر کہتے تھے جس کے معنی عربی زبان میں گزرگاہ کے ہیں۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سے بنگال اور برما کے زرخیز میدانوں، جنوب مشرقی ایشیا کے مجمع الجزائر کے رومانی جزیروں، اور ایک طرف بحرین اور دوسری طرف ہندوستان کے مغربی ساحلوں سندھ، خلیج فارس، عرب افریقہ کو جانے والے بحری جہاز گزرتے تھے۔ عربوں کی بحری تجارت کے لئے ان ہندوستانی نو آبادیوں کی اہمیت ظاہر تھی۔

ہندوستان اور عربوں کا یہ مفاد باہمی، مقامی حکمرانوں اور عرب نو آبادکاروں کے درمیان دوستانہ روابط کی ترقی کا باعث ہوا۔ ہندوستان اس قدر وسیع و بے کراں نظر آتا تھا کہ اس پر اپنی سیاسی بالا دستی قائم کرنے کا شوق عربوں کے دلوں میں پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ عربوں کے وسائل اس طرح کی اولوالعزمی کے لئے قطعاً ناکافی تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے حکمرانوں کا طرز عمل اس قدر دوستانہ تھا کہ کسی جارحانہ

اقدام کے لئے کوئی جواز نہیں تھا۔ ان اسباب کی بنا پر جنوبی ہند کے فرماں رواؤں اور عوام کے ساتھ عربوں کے تعلقات زیادہ تر پر امن اور دوستانہ ہی رہے۔

گستاؤلی بان لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں مسلمانوں نے ویسا گہرا اثر نہیں ڈالا جیسا کہ مصر میں۔ یہاں مفتوحین کا اثر فاتحین پر زیادہ پڑا جس کی مثال اسلامی دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ اس جدید تمدن نے جس کو افغان اور ترک اور مغل ہندوستان میں لائے، بہت کچھ انقلاب پیدا کر دیا لیکن آخر میں مفتوح قوم کے تمدن سے مغلوب ہو گیا'' [۱]

''ہندوستان میں مسلمان حکمران اپنا اسلامی تشخص برقرار نہ رکھ سکے اسلام کی خالص توحید کو ہند کے بہت سے دیوتا ماننے والی قوم کے لیے موزوں بنانے کی غرض سے اس قدر تغیرات کرنے پڑے کہ دین کی اصل ہئیت تبدیل کر کے رکھ دی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا زیادہ تر اثر صرف عمارات اور صنعتوں میں نظر آتا ہے'' [۲]

جن مبلغین اسلام نے ابتداً جنوبی ہند میں کام کیا تھا ان کے متعلق ہماری معلومات بہت محدود ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ صوفیہ کے مختلف سلسلوں کی تنظیم سے قبل تبلیغی کام ان تاجروں اور دوسرے عام لوگوں کے ذریعے ہوتا رہا جو زندگی کے گونا گوں مشاغل میں منہمک ہوتے تھے اور جن کا اصلی کام اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت نہیں ہوتا تھا۔ صوفیہ کے سلسلوں کی ایک روایت یہ ضرور تھی کہ وہ اپنے اکابر کے تذکرے قلم بند کر لیا کرتے تھے۔ مگر یہ تذکرے تبلیغی جدوجہد کی تاریخ کے اعتبار سے غیر اطمینان بخش ہیں، کیوں کہ وہ صرف ان کی مذہبی سرگرمیوں کی یاداشتیں ہیں۔ [۳]

تبلیغ اسلام کے سلسلے میں، مسلم نو آبادیوں کو جو اہمیت حاصل ہے اسے کم نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہر نو آبادی میں کم سے کم ایک مسجد ہوتی تھی۔ اور عموماً کم سے کم ایک تربیت یافتہ عالم اس سے وابستہ ہوتا تھا۔ اگر چہ اسلام میں نماز با جماعت کی قیادت کے لئے کسی پروہت نما شخصیت کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم محض آسانی کے لیے ہر مسجد کے ساتھ ایک چھوٹا سا عملہ رکھنے کا عام رواج ہو گیا تھا تا کہ نمازیوں کی ضروریات کا بندوبست کیا جاسکے۔ اس عملے کا سربراہ امام ہوتا تھا۔ جس کا خاص کام یہ تھا کہ نماز کے مقررہ اوقات میں نمازیوں کی قیادت کرے۔ اس کے علاوہ مسجد کے گردو پیش کی آبادی میں رہنے والے مسلمان اس سے دینیات کے متعلق اور احکام شریعت کے بارے میں بھی وقتاً فوقتاً استصواب کرتے رہتے ہیں۔

ان تمام مساعی کے نتائج اتنے خوش منظر نہیں تھے جتنے کہ بعد میں، دوسرے علاقوں کے اندر، مبلغین اسلام نے اپنی کوششوں سے حاصل کیے۔ جنوبی ہند میں مسلمانوں کی منتشر آبادیاں تعداد میں کم ہیں اور ان کا وہ اثر زائل ہو چکا ہے۔ جو بحری تجارت میں اپنی نمایاں برتری کے باعث انہیں کبھی حاصل تھا

یہ صحیح ہے کہ جنوبی ہند میں خالص مسلم آبادیوں کے خریطے کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ مگر جو کامیابی بنگال، کشمیر یا سندھ میں میسر آئی، جہاں آبادیوں کی اکثریت نے آہستہ آہستہ اسلام قبول کیا، وہ جنوبی ہند میں مسلمانوں کی سعی و جہد کا صلہ نہ بن سکی۔

---

[۱] تمدنِ ہند (مترجم علی بلگرامی)، ص:۳۵۴ [۲] گستاؤلی بان، تمدن ہند، (مترجم علی بلگرامی) ص:۳۵۶

[۳] اکرام، آب کوثر، ص:۴۱۲

معاشرتی وتہذیبی اثرات

نظریۂ اسلام کا بنیادی مقصد ایک ایسی قوم وجود میں لانا تھا جسے پوری انسانیت کی قیادت سونپی جا سکے اور اسے جہالت کی گمراہی کے گھٹاٹوپ اندھیروں سے نکالا جا سکے۔ آج اس کے برعکس یہ قوم اللہ کی طرف سے تفویض کردہ منصب قیادت کا بلند مقام چھوڑتی جا رہی ہے اور قیادت کا فریضہ ادا کرنا بھول کر گمراہی کے صحراؤں اور منحوس اندھیروں میں بھٹکتی چلی جا رہی ہے۔

اقوام عالم پر صدیوں سے تہذیبی، ثقافتی اور تمدنی طور پر حکومت کرنے والی قوم آخر کار مغلوب ہو کر رہ گئی۔ مسلم تہذیب نے یورپ کے تمام ممالک میں اپنے اثرات چھوڑے اور اسلام کے اعلیٰ وارفع پیغام کو پوری کائنات میں پہنچا کر اسکی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ انسانی زندگی کا کوئی پہلو، سیاسی ہو یا مذہبی، معاشرتی ہو یا معاشی، تعلیمی ہو یا تہذیبی اسلام کی برکات سے محروم نہ رہا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی گرفت مذہب پر اتنی مضبوط نہ رہی ایمان اور عمل صالح سے ان کا ناطہ کمزور ہونے لگا تو خالق کائنات نے اس قوم کے مادی اور روحانی زوال کا فیصلہ صادر فرمایا۔ وہ اقدار جن کی بدولت مسلم قوم نے ترقی کی تھی آج ان اقدار اور روایات کو ان لوگوں نے اپنا لیا تھا جن کا اسلام سے دور کا ناطہ بھی نہ تھا۔ انہوں نے ان اقدار کی بدولت اپنی مادی ترقی کو چار چاند لگا دئے۔ غیر مسلم اقوام کو انہیں اقدار کے صدقے سے علمی وسیاسی غلبہ حاصل ہوا۔ اصول یہ ہے کہ جس قوم کے ہاتھ میں سیاسی باگ ڈور ہو اس کی مالا جپی جاتی ہے اس کے فرمان کو قانون اس کی سوچ کو عقل اور اس کی تقلید کو راہ ترقی ونجات سمجھا جاتا ہے۔

اس معاشرتی انتشار کے اثرات جو صلیبی حملوں سے پہلے کے دور میں اسلامی معاشرہ کو اپنی زد میں لے آئے وہ اس معاشرہ کے پورے وجود میں منعکس ہونے لگے۔ وہ ان اصولوں اور اقدار میں بھی آگئے جو فرد اور جماعت کے تعلق، ان کے رویوں اور سرگرمیوں کا تعین کرتی ہیں چنانچہ معاشرہ درست سوچ، سمجھ اور بالغ النظر قیادت سے محروم ہو گیا۔ لوگوں کی زندگی صحیح راہنمائی کے بغیر بسر ہونے لگی۔ اسلامی معیار نظروں سے غالب ہو گئے اور حرص وشہوات کا غلبہ ہو گیا۔ اس چیز نے انسانی زندگی کے ہر میدان کو متاثر کیا اور اس میں خرابی پیدا کی۔ اس نے معاشرہ کے عناصر اور اس کی قوتِ مزاحمت کو اندر سے کمزور کر دیا اور اسے شکست وریخت کا نشانہ بنا دیا۔

یہ کہنا درست نہیں کہ معاشرتی زندگی کے عروج وزوال کا انحصار دولت کے ماخذوں میں زیادتی یا کمی پر ہے یا پیداواری مسائل کے بڑھنے یا گھٹنے پر ہے۔ ان دونوں کا انحصار اس تصور پر ہے کہ جو کمائی اور خرچ کے طریقے منضبط کرتا ہے۔ اگر اس تصور کی بنیاد شرعی کمائی اور شرعی خرچ پر ہو تو معاشرتی زندگی میں ترقی آتی ہے۔ اور خوش حالی پھیلتی ہے اگر یہ تصور شرعی طریقوں کے برعکس تشکیل پائے تو معاشرتی زندگی تباہی سے دوچار ہو جاتی ہے۔ اور مشکلات عام ہو جاتی ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ پہلا تصور کمائی اور خرچ کے ایسے طریقے وضع کرتا ہے جس میں سب کی بہتری ہوتی ہے جہاں تک دوسرے تصور کا تعلق ہے وہ کمائی اور خرچ کو فرد کی مصلحت کے پیش نظر منضبط کرتا ہے اور اقتصادیات کے کارپردازوں کا یہ دور لٹیروں اور اجارہ داروں کا دور بن جاتا ہے لوگوں کے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے یہ لوگ اسے دھوکہ اور فریب، ٹیکسوں اور قیمتوں میں اضافہ کے ذریعے لوٹ لیتے ہیں۔[1]

اسی لئے قرآن کریم نے رزق کے ماخذوں سے صرفِ نظر کیا ہے لیکن اس نے حلال کمائی اور حلال خرچ کا خیال رکھنے اور اللہ نے جس چیز کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے اسے ادا کرنے پر تفصیل سے توجہ دلائی۔ ان دو امور کے خلط ملط سے وہ انتشار پیدا ہوا جس سے مسلمان دورِ انحطاط سے دوچار ہوئے۔ اسی انتشار نے صلیبی حملوں سے پہلے اور ساتھ کے دور کی اقتصادی زندگی پر اپنی مہر ثبت کی۔

---

[1] ڈاکٹر ماجد عرسان الکیلانی، عہد ایوبی کی نسلِ نو اور القدس کی بازیابی، مترجم صاحبزادہ عبدالرسول، ص: ۶۵

اس دور میں کمائی کے وسائل غیر شرعی بنیادوں پر قائم تھے۔حکومت نے کئی اقسام کے محاصل کی جبری وصولی کے مختلف طریقے ایجاد کر لئے تھے حتیٰ کہ حاجیوں کو بھی ان شہروں میں کثیر ٹیکس دینا پڑتے تھے جن سے وہ گزرتے تھے۔جیسا کہ سلوک مصر کی فاطمی حکومت مغرب سے آنے والے حاجیوں سے کرتی تھی۔''جو اسے ادا نہیں کرسکتا تھا، اسے قید کر دیا جاتا تھا اور کبھی تو اس کا وقوف عرفات (حج) بھی ضائع ہو جاتا''[1]
ان سرگرمیوں کے دوران حکومت کے کارپرداز اس قدر دولت مند ہو گئے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔اس کی مثال ابن خلکان کا وہ بیان ہے جو اس نے فاطمی وزیر بدر الجمالی کی وفات (۵۱۵ھ) کے بعد پائی جانے والی اس کی دولت کے بارے میں دیا ہے وہ کہتا ہے۔

''اس نے جو ترکہ چھوڑا، اس میں ساٹھ کروڑ دینار نقد، دو سو پچاس بوری درہم، پچھتر ہزار اطلس کے کپڑے، تیس اونٹوں کا بار عراقی سونے کے صندوق، سونے کی دوات جس میں بارہ ہزار دینار قیمت کے جواہر تھے، دس نشست گاہوں میں سونے کی سو کنڈیاں اور ہر کنڈی کا وزن سو مثقال، ہر نشست گاہ میں دس کنڈیاں جن پر رومال سونے سے باندھے گئے تھے۔یہ مختلف رنگوں میں تھے جو کسی کو پسند ہوتا پہن لیتا اور نفیس کپڑوں کے پانچ سو صندوق شامل تھے۔اس کے ترکہ میں گھوڑوں، غلاموں، خچروں، کشتیوں، عطر اور سامان زینت وآرائش کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔گائیں، بھینیس اور بکریاں اتنی تھیں کہ انسان ان کی تعداد کے ذکر سے شرم محسوس کرتا ہے۔جس سال اس نے وفات پائی ان کے دودھ کا ٹھیکہ تیس ہزار دینار کا ہوا۔اس کے ترکہ میں دو بڑے صندوق پائے گئے۔جن میں لڑکیوں اور عورتوں کے سونے کے مجسمے تھے''[2]

فوج نے امراء ووزراء کے نقش قدم پر چلنا شروع کر دیا۔جب ان کے امراء اور سلاطین کے درمیان فتنہ کھڑا ہوتا تو وہ اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے اور شہروں، تجارتی مرکزوں اور گھروں کو لوٹتے۔

اسی طرح تاجروں نے قیمتوں میں اضافے کے طریقے ایجاد کر رکھے تھے بالخصوص جب غذائی اشیاء اور ضروریات زندگی کی کمی ہو جاتی۔
جہاں تک اخراجات کے وسائل کا تعلق ہے، وہ امیروں اور عیاش لوگوں تک محدود تھے۔ان لوگوں کے لئے موسم گرما میں بیروت کے پہاڑوں سے صوف اور سن میں لپیٹ کر برف کے بلاک لائے جاتے تھے۔وہ اپنی مسرتوں میں اس طرح لگے رہتے کہ بیان سے باہر ہے۔
ابن کثیر نے ابو نصر احمد بن مروان الکروی والی بلادِ بکر (م 453ھ) کی زندگی کے ایک پہلو کو بیان کیا ہے وہ کہتا ہے۔

''اس کے پانچ سو مستقل دستے، پانچ سو خدام اور گویوں کی بڑی تعداد تھی جن میں سے ایک ایک پانچ ہزار دینار یا زیادہ میں خریدا گیا تھا۔اس کی مجلس میں لہو ولعب کے جو آلات آتے وہ قیمت میں دو لاکھ دینار کے قریب تھے''[3]

اسی طرح ابن کثیر 480ھ میں سلطان ملک شاہ کی بیٹی کے جہیز کا بیان یوں کرتا ہے۔

''ماہ محرم میں سلطان ملک کی شاہ کی بیٹی کا جہیز خلیفہ کے محل کی طرف ایک سو تیس اونٹوں اور چھہتر خچروں پر روانہ ہوا جن پر رومی اور ملکی ریشم کی جھولیں ڈالی گئی تھیں۔اور ان پر سونے چاندی کا جڑاؤ تھا۔ان کے گلے کی گھنٹیاں اور پٹے سونے چاندی کے تھے۔ان میں چھ خچر ایسے تھے جن پر

---

[1] ابن کثیر: البدایہ والنہایہ، ۱۲/ ۲۹۹ [2] ابن خلکان، وفیات الاعیان، ۲/ ۱۶۰۔۱۶۲ [3] البدایہ والنہایہ، ۱۲/ ۸۷

چاندی کے بارہ صندوق تھے جن میں قسم قسم کے زیورات اور جواہرات تھے۔ خچروں کے آگے تینتیس گھوڑے تھے جن کی طلائی زینیں جواہرات سے مرصع تھیں۔ ایک بڑا گھوارہ تھا جو ملکی ریشم سے ڈھانپا گیا تھا جس پر جواہرات سے مرصع سونے کے پترے تھے'' [۱]

اسی طرح دولت مند افراد نے سلاطین، والیوں اور اعلیٰ حکام کی تقلید کی۔ مذہبی واعظین نے بھی اس کی مشابہت اختیار کی۔ یہ لوگ وعظ میں ایک اسلوب کی تبلیغ کرتے تھے اور اپنے گھروں میں دوسرے اسلوب کی زندگی گزارتے تھے۔ ابن جوزی اور ابن کثیر نے ایسے مذہبی شیوخ کے نمونے پیش کئے ہیں جو عدلیہ اور اوقاف کے مناصب پر فائز ہوتے ہوئے رشوتیں لیتے تھے۔ اور لڑکیاں، آلاتِ موسیقی اور ریشمی قالین جمع کرتے تھے۔

جہاں تک عام لوگوں کی بہتری کا تعلق ہے انہیں قومی اخراجات میں سے کچھ نہیں ملتا تھا۔ ان میں زراعت اور آبپاشی سے لاپرواہی بھی تھی۔ دجلہ وفرات وغیرہ میں طغیانیاں آتیں جس سے مفادات عامہ کو نقصان پہنچتا۔ اسی طرح شاہراہوں اور قیام امن کے کاموں سے چشم پوشی کی جاتی جس کے نتیجہ میں عیار لوگوں اور ڈاکوؤں کو کھلی چھٹی ملی اور وہ تجارتی مراکز اور گھروں کو لوٹتے تھے [۲]

اس تمام صورت حال کا یہ نتیجہ تھا کہ عوام بھوک سے تباہ حال ہو گئے۔ عالم اسلام کے تمام اطراف میں قحط پھیل گیا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جب بھوک بعض گھرانوں میں اپنے پنجے گاڑ دیتی تو اس کا مقابلہ کرنے کا کوئی راستہ نہ آتا سوائے اس کے کہ کسی عزیز یا بچے یا کسی مردے کو پکڑ کر کھا لیا جائے۔ یہ کسی ایک اکیلے مورخ کی روایت نہیں ہے بلکہ یہ اس دور کے تمام مورخین کی متواتر خبر ہے۔ ان میں ابن جوزی، ابن کثیر، ابن تغری بردی وغیرہ جیسے مؤرخ شامل ہیں۔

سن 440ھ میں موصل، جزیزہ اور عراق میں طاعون پھوٹ پڑا اور مرنے والوں کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ گئی۔ بعض دفعہ چارسو اشخاص پر اکٹھی ہی نماز جنازہ پڑھی گئی۔

سن 448ھ اور 449ھ کے درمیان مصر، عراق، شام اور عالم اسلام کی تمام اطراف میں وبا اور قحط پھوٹ پڑے۔ لوگوں نے مردہ حیوانات کا گوشت کھایا اور انسانی مردوں کی قبریں کھود ڈالیں۔ تاہم دولت مند لوگ ایک انار اور بہی ایک ایک دینار میں خریدتے رہے۔

سن 480ھ میں عراق کے دیہی علاقوں اور شام کے شہروں میں وبائیں پھوٹ پڑیں۔ [۳]

سن 511ھ میں قیمتیں بڑھ گئیں اور غذائی اشیاء ناپید ہو گئیں حتیٰ کہ گندم یا آٹے کو بوری کی قیمت تین سو دینار تک پہنچ گئی بلکہ وہ اصلاً ناپید ہو گئی۔ لوگ بھوک سے مرنے لگے اور انہوں نے کتے اور بلیاں کھائیں [۴]

غربت عام ہوئی اور سال بسال امراض اور مصائب نازل ہوتے رہے اور وہ اسلامی معاشرہ کی امتیازی علامت بن گئے امیر امیر تر اور غریب غریب تر، معاشرہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔

امت مسلمہ کی وحدت کا مفہوم مفقود ہو گیا۔ اس کی جگہ عصبیت، قبائلیت، علاقائیت اور فرقہ بندی نے لے لی۔ یہاں تک کہ شہر کے محلوں کے مابین بھی عصبیت آ گئی۔ تاریخ کی اصل کتابیں اس دور کے جھگڑوں اور فتنوں کے واقعات سے بھری پڑی ہیں۔ انہی میں سے وہ فتنے ہیں جن کا ذکر ابن الاثیر نے کیا ہے۔ یہ فتنے بغداد کے محلوں، باب بصرہ، اہل کرخ، سوق مدرسہ وغیرہ کے درمیان اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔

---

[۱] البدایہ والنہایہ، ۱۲/۱۳۲　[۲] ڈاکٹر ماجد عرسان الکیلانی، عہد ایوبی کی نسل نو اور القدس کی بازیابی، مترجم صاحبزادہ عبد الرسول، ص: ۶۸

[۳] البدایہ والنہایہ، ۱۲/۱۱۷　[۴] ابن تغری بردی، النجوم الزاہرہ، ۵/۲۱۳

وہ اس میں اضافہ کرتا ہے کہ یہ فتنے ان محلوں میں بار بار پیدا ہوتے رہے۔ اور یہ کہ 470ھ میں بہت سے لوگ قتل ہوئے اور مکانات جلا دئے گئے۔ ''عوام نے لوہے کے ڈنڈے اٹھا لیے اور وزیر پر اس کے دفتر میں حملہ کر دیا اور برے الفاظ کہے۔۔۔ قتل وغارت اور فساد سے بڑے مسائل پیدا ہوئے''۔ [۱]

ابن الاثیر سن 461ھ میں دمشق میں پیدا ہونے والے فتنہ کا ذکر کرتا ہے جو بالآخر مسجد اموی کو جلانے پر منتج ہوا۔ وہ کہتا ہے۔

> ''دمشق میں اہل مغرب یعنی فاطمیہ مصر کے حامیوں اور اہل مشرق یعنی خلافت عباسیہ کے حامیوں کے درمیان لڑائی واقع ہوئی۔ انہوں نے جامع مسجد کے پڑوس میں ایک گھر کو آگ لگا دی جو بھڑک اٹھی اور مسجد کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ عام لوگ اہل مشرق کی مدد کر رہے تھے۔ اب وہ لڑائی کو چھوڑ کر مسجد کی آگ بجھانے میں لگ گئے۔ اس واقعہ سے مشکلات بڑھیں اور مسائل میں شدت پیدا ہوئی۔ آگ نے جامع مسجد کے حسن کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اس کے نفیس کام کو مٹا ڈالا''۔ [۲]

اس طرح معاشرہ اپنے روز مرہ کے معمولی کاموں مثلاً خوراک، لباس، مساکن، تجارتی مسابقت، لہو اور حصول شہوت کی طرف متوجہ رہا۔ نفاق عام ہوا اور اقدار و اخلاق زوال پذیر ہو گئے۔

ہم عصر سیاح ابن جبیر نے اس دور کے فکری احوال کے بارے میں لکھا ہے اور اس کا مقابلہ مغرب میں مرابطین کے معاشرہ سے کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

> ''ہر محقق کی تحقیق اور صحیح العقیدہ شخص کے اعتقاد کے مطابق اسلام صرف بلادِ مغرب میں ہے کیونکہ وہ لوگ واضح راستہ پر ہیں۔ دوسری طرف مشرق میں صرف خواہشات، بدعات اور گمراہ فرقے ہیں۔ سوائے اس کے جسے اللہ تعالیٰ اس سے بچالے''۔ [۳]

ان خرابیوں میں لہو ولعب اور اخلاقی انحطاط شامل ہو گئے۔ حماموں کیلئے دوڑ دھوپ کی شرمناک صورت حال سامنے آئی۔ زنا اور شراب نوشی عام ہوئی۔ تفریح گاہوں، لڑکیوں اور گانے والیوں کا اس قدر پھیلاؤ ہوا کہ اس بارے میں شکایات ختم ہو گئیں۔ جہاں تک دینی سرگرمیوں کا تعلق ہے وہ شعائر اور عبادات کی ادائیگی تک محدود ہو گئیں اور تعلقات ومعاملات میں دینی توجیہہ کے آثار معدوم ہو گئے۔ [۴]

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب کوئی قوم معاشی طور پر مضبوط ہوتی ہے اس وقت سیاسی اور تعلیمی میدانوں میں بھی اس کے نظریات دوسری اقوام کے لئے قابل قبول ہوتے ہیں۔ معاشی انحطاط کے ساتھ سیاسی، تعلیمی اور سماجی انحطاط کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اس وقت جب اسلامی معاشرہ زندگی کے مختلف میدانوں میں خرابی اور کمزوری میں مبتلا تھا، عالم اسلام کے حکمران انتشار اور نزاع کے حال میں مست تھے صلیبی داخل ہوئے۔ انہوں نے سلاجقہ کے ملک ایشائے کوچک کو تہہ وبالا کیا اور ان کے دارالحکومت نیقہ پر قبضہ کر لیا۔ صلیبیوں کے حملے بڑھتے گئے اور وہ وسیع علاقوں پر مسلط ہو گئے۔ وہ جس شہر یا گاؤں میں داخل ہوئے، وحشیانہ قتل کا ارتکاب کیا۔ مساکن ان کی تلواروں کی نظر ہو گئے، ان کے گھوڑے مردوں عورتوں اور بچوں کے خون میں دھنسے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور مسلمان حکمران اپنے تنازعات اور عداوتوں میں مگن تھے۔ امت کی جماعتیں اپنے معمول کے کام، احمقانہ مسائل، باہمی مقابلوں اور لڑائیوں میں مصروف رہیں۔ [۵]

---

۱ ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، ۱۰/۷۷　　۲ الکامل فی التاریخ، ۱۰/۵۹　　۳ الرحلۃ، ص: ۵۵، ۵۶

۴ البدایہ والنھایہ، ۱۲/۱۰۵　　۵ البدایہ والنھایہ، ۱۲/۱۶۰

معاشرہ میں قائم رجحانات کو تبدیل کرنے کے ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ عالم اسلام کے سامنے اب دو ہی راستے تھے یا وہ اپنے اندر کے حالات میں بنیادی تبدیلی لائے۔ یا ان چیلنجوں کے سامنے ہتھیار ڈال دے جو اسے تباہی و بربادی کی نوید سنا رہے تھے۔

عالمِ اسلام غفلت کی نیند سے بیدار ہونے لگا اور امت کی یک جہتی کے لئے مختلف تحریکیں ابھرنے لگیں۔ خاطر خواہ نتائج کی منزل بے شک دور سہی لیکن یہ جدوجہد بلا شبہ قابلِ ستائش ہے۔ عصر حاضر میں بھی بعض انقلابی تحریکیں فکری ابلاغ کو بنیادی اہمیت دے رہی ہیں اس کی تاثیر شعوری اور غیر شعوری سطح پر یکساں بھی ہے اور پائیدار بھی۔ مختلف ممالک کے اندر افکار کی سرد جنگ لڑی جا رہی ہے۔ تعلیم کے ذریعے اپنے افکار و تعلیمات کو دوسری اقوام کے نظریات وافکار پر حاوی کرنے کی سازش اہل یورپ کا شیوہ بن چکا ہے جس کا مقابلہ ضروری ہے۔

ہر دور میں دنیا کی اقوام کی معاشرت اور زندگی پر اس دور کی غالب اور ترقی یافتہ حکمران قوم کی تہذیبی اور فکری روح مسلط ہو جاتی ہے اسلام کے دور عروج ہی میں تمام اقوام عالم ارادی یا غیر ارادی طور پر اسلامی تہذیب و مزاج کو آئیڈیل سمجھتی تھیں اور آج یورپ کی ترقی یافتہ اقوام کو تمام تہذیبیں اپنا آئیڈیل قرار دیتی ہیں اور ان کے اثرات کو قبول کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں کرتیں۔

معاشرتی رویے بھی عادات کی تعمیر و ترشح میں اہم کردار ادا کرتے ہیں ترقی یافتہ اقوام کے فیشن، ان کا انداز نشست و برخاست، ان کی معاشرت بھی دوسری اقوام کو متاثر کرنے کا باعث بنتی ہیں دوسروں کی عادات واطوار کو اپنا کر آج ہم خوشی محسوس کرتے ہیں اور اس پر فخر بھی ہے اس کی وجہ ہماری فکری و ذہنی غلامی ہے۔ معاشرے کا غالب طبقہ تہذیب جدید کے اعمال اور رویوں کو اپنا رہا ہے۔

حکومت و فرمانروائی اور غلبہ و استیلاء کی دو قسمیں ہیں ایک ذہنی اور اخلاقی غلبہ دوسرا سیاسی اور مادی غلبہ، پہلی قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی فکری قوتوں میں اتنی ترقی کر جائے کہ دوسری قومیں اس کے افکار پر ایمان لے آئیں اسی کے تخیلات اسی کے معتقدات اسی کے نظریات دماغوں پر چھا جائیں اس کے سانچے میں ڈھلیں تہذیب اس کی تہذیب ہو علم اس کا علم ہو اس کی تحقیق کو تحقیق سمجھا جائے اور ہر وہ چیز باطل ٹھہرائی جائے جس کو وہ باطل ٹھہرائے دوسری قسم کا غلبہ یہ ہے کہ ایک قوم اپنی مادی طاقتوں کے اعتبار سے اتنی قوی ہو جائے کہ دوسری قومیں اپنی سیاسی و معاشی آزادی کو برقرار نہ رکھ سکیں اور کلی طور پر یا کسی نہ کسی حد تک وہ غیر قوموں کے وسائل ثروت پر قابض اور ان کے نظم مملکت پر حاوی ہو جائے اس کے مقابلے میں مغلوبیت اور مملوکیت کی بھی دو قسمیں ہیں ایک ذہنی مغلوبیت اور دوسری سیاسی مغلوبیت، ان دونوں قسموں کی صفات کو اس کا عکس سمجھ لیجئے جو اوپر بیان کی گئی ہیں۔

مولانا مودودی لکھتے ہیں

''لازم نہیں کہ جہاں ذہنی غلبہ ہو وہاں سیاسی غلبہ بھی ہو اور نہ یہ لازم ہے کہ جہاں سیاسی غلبہ ہو وہاں ذہنی غلبہ بھی ہو لیکن فطری قانون یہی ہے کہ جو قوم عقل و فکر سے کام لیتی ہے اور تحقیق و اکتشاف کی راہ میں پیش قدمی کرتی ہے اس کو ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ مادی ترقی بھی نصیب ہوتی ہے اور جو قوم تفکر و تدبر کے میدان میں مسابقت کرنا چھوڑ دیتی ہے وہ ذہنی انحطاط کے ساتھ ساتھ مادی تنزل میں بھی مبتلا ہو جاتی ہے۔ پھر چونکہ غلبہ کا نتیجہ قوت ہے اور مغلوبیت کا نتیجہ کمزوری ہے اس لیے ذہنی و مادی حیثیت سے درماندہ اور ضعیف قومیں اپنی درماندگی اور ضعف میں جس قدر ترقی کر جاتی ہیں اسی قدر وہ غلامی اور محکومیت کے لئے مستعد ہوتی چلی جاتی ہیں اور ذہنی اور مادی دونوں حیثیتوں سے طاقتور قومیں ان کے دماغ اور جسم دونوں پر حکمران ہو جاتی ہیں'' [1]

اسلامی معاشرتی اقدار کے مغلوب ہونے کے بعد جدید تہذیب زندگی پر اس طرح چھائی کہ معاشرتی زندگی کا کوئی شعبہ اس سے محفوظ

---

[1] تنقیحات، ص: ۶، ۷

نہ رہ سکا۔ یہ ایک ایسا زہر تھا جو معاشرتی زندگی کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ مغرب سے مرعوبیت کے باعث اسے قبول کرنے میں اس کے مفید اور مضرت رساں اثرات پر غور تک نہیں کیا ان کے فلسفوں کو بلا چوں چراں قبول کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی معاشرت اختیار کرنے میں بھی واضح کامیابی محسوس کی۔ ان کے طرزِ معاشرت کو اپنا آئیڈیل سمجھا اور خدا اور رسولؐ کے بتائے ہوئے طرز معاشرت کو کم تر دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ اس زہر کا اثر ہے کہ آج مسلمان اسلامی رسوم کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس طرز معاشرت کے اختیار کرنے والے کو قدامت پسند کا نام دیا جاتا ہے۔

مولانا مودودی ان اثرات کا تذکرہ یوں کرتے ہیں

''انہوں نے اخلاقی مفاسد اور معاشرتی طور طریقے ہم پر مسلط کئے اور اس طرح مسلط کئے کہ ان کے ہاں تقرب کا مقام اور تقدم کا شرف ان لوگوں کے لئے مخصوص رہا جو اخلاق میں ان کے قریب ہیں اور معاشرت میں ان کے ہم رنگ ہوں یہی چیز اثر و رسوخ اور معاشی خوشحالی اور مادی ترقی کی ضامن تھی۔ اس لیے رفتہ رفتہ ہمارے اونچے طبقے، اور ان کے پیچھے متوسط طبقے اس رنگ میں رنگتے چلے گئے اور آخر میں تصاویر، سینما، ریڈیو اور سر برآوردہ لوگوں کی زندہ مثالوں نے یہ وبا عوام تک پھیلائی'' [۱]

اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک صدی کے اندر اندر ہم پھسلتے پھسلتے اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ ہمارے ہاں مخلوط تعلیم کا رواج گوارا کیا جا رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے اندر بھی وہی خامیاں پیدا ہو رہی ہیں جو مغرب میں خوبیوں کے نام سے یاد کی جاتی ہیں جس چیز پر ولائتی لیبل لگا ہوا ہو چاہے وہ چیز کتنی ہی نکمی اور انتہائی مضرت رساں ہو سوچے سمجھے اسے قبول کرتے ہیں جیسا کہ ہمارے ہاں ان کی طرف دیکھ کر ہماری قوم کے متوسط اور نچلے درجے کے لوگ بھی اسی اندھی تقلید کا شکار ہو رہے ہیں۔

مسلمانوں نے یورپ کے نظریات کو اسی طرح قبول کرنا شروع کر دیا کہ گویا ان کے اپنے نظریات کا وجود دنیا سے مفقود ہو گیا ہے مسلمانوں کے زوال کا اولین سبب یہ ہے کہ انہوں نے اس قرآن سے کنارہ کیا جو ان کے لئے راہ ہدایت ہے ان تعلیمات سے روگردانی کی جو ان کی فلاح و کامیابی کا راستہ متعین کرتی تھیں۔ احساس کمتری میں مبتلا مسلم قوم نے اپنے افکار و نظریات صرف اس لئے خیر باد کہہ دیئے کہ یہ رفتار زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اس پر عمل پیرا ہونے والے افراد ماضی میں بھی کامران رہے۔ اور فی زمانہ بھی کامیابی ان کے قدم چوم رہی ہے۔ حالانکہ دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے لئے ہدایت و رہنمائی ہے

ہمارے آداب معاشرت آداب طعام و قیام کے اندر مغربی رنگ صاف نظر آتا ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر کھڑے ہو کر کھانا مغرب کا طریق کار ہے اسراف و تبذیر کا پہلو ان تقریبات میں نمایاں ہوتا ہے۔ ویڈیو کیمرے، مخلوط ماحول، شادی شدہ جوڑوں کی آپس میں حد سے زیادہ Mixing سب مغرب کے زیر اثر ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں کہ ''دنیا بھر میں تہذیبی افراد اور تہذیبی روایات کے علمبردار اور مصلح، تعلیم یافتہ لوگ ہوتے ہیں مگر مسلمانوں کا یہ طبقہ اپنی اقدار سے نفرت کرتا ہے وہ یا تو علاقائی قدامت پرستی میں مبتلا ہے یا مغرب سے آئے ہوئے اطوار پر فریفتہ ہے''۔

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں۔

کلچر کے یہ رخ عبارت ہیں چند مظاہر حیات سے، اول نوجوانوں خصوصاً طالب علموں میں کج روی، قاعدے اور ضابطے کے خلاف

---

[۱] مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل: ص:۳۹، ۴۰

ان کی بغاوت، آزادی بے ترتیبی اور بے ڈھنگا پن کا میلان سنجیدگی اور مقصد کا فقدان۔ اور بڑی حد تک نشہ سے دلچسپی، یہ نوجوانوں کے عمومی میلانات ہیں۔ دوم خواتین میں صنفی بنیادوں پر مردوں کے خلاف بیزاری کا احساس۔ اپنی صنف کے بارے میں غیر معتدل شعور، نئی آرزوؤں اور امنگوں کا ظہور جن میں آزادئ بے قید کا عنصر غالب ہے۔ مغربی خواتین کی پیروی کا جنون شوق، سوم خواہشات نفس کا ہر چیز پر فائق ہونا اور ان کی تسکین کے لئے استحصال، بددیانتی لوٹ کھسوٹ کا دور دورہ اخلاقی اور روحانی اقدار کی پامالی اور احتساب کے ہر رنگ سے آزادی کا اعلان اہم رخ یہی ہیں باقی کچھ باتیں ہیں وہ بھی انہیں کے زیر اثر اور تابع ہیں'' [1]

مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں

''فحش اور بے حیائی کی جن باتوں کے خیال سے بھی چند سال پہلے تک آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے وہ اب اسقدر عام ہو چکی ہے آپ انہیں روزمرہ کے معمولات سمجھ رہے ہیں۔ آپ کے بچے تک اخباروں۔ رسالوں اور اشتہاروں میں فحش تصویریں روز دیکھتے ہیں اور بے حیائی کے عادی ہوتے جاتے ہیں آپ کے بوڑھے اور جوان اور بچے سب کے سب سینما دیکھ رہے ہیں۔ جہاں عریانی اور بے حیائی اور شہوانی محبت سے زیادہ دلچسپ چیز اور کوئی نہیں باپ اور بیٹے بھائی اور بہنیں، مائیں اور بیٹیاں سب ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھ کر اعلانیہ بوس وکنار اور اختلاط وملاعبت کے مناظر دیکھتے ہیں اور کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔ انتہا درجہ کے گندے اور ہیجان انگیز گیت، گھر گھر اور دکان دکان بج رہے ہیں ان کے کان ان آوازوں سے محفوظ نہیں'' [2]

جدید مغربی تہذیب نے اسلامی معاشرتی زندگی کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ صاف ستھری معاشرتی زندگی کا دارومدار گھریلو زندگی ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عائلی زندگی کو اسلامی تہذیب کا معیار قرار دیا ہے۔ آج عائلی زندگی کا نظام درہم برہم ہو گیا ہے۔ عورتوں مردوں بچوں اور بچیوں میں شہوانی آوارگی اور عیش پرستی کے رجحانات تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے گھریلو زندگی جہنم بن گئی ہے۔ خاندان کے جملہ افراد کے باہمی تعلقات انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر آ گئے ہیں نکاح کا مقصد بقائے نسل نہیں بلکہ حیوانی جذبات کی تسکین ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کے تحت ضبط تولید اور اسقاط حمل پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی جاتی ہے۔ باپ جذبات پدرانہ سے عاری ہیں اور مائیں جذبات محبت سے خالی ہیں اس وجہ سے والدین بچوں کی پرورش اچھی تربیت اور تعلیم دینے کو اپنے پر بوجھ سمجھتے ہیں آزادئ نسواں کے نعرے کے تحت اسلامی پردہ کو رجعت پسند فعل قرار دیا جاتا ہے۔ یہ سب تلخ اثرات تہذیب جدید کے اثرات ہی ہیں۔

جدید تہذیب نے معاشرتی سطح پر بھی بہت سے مضر اثرات ڈالے ہیں اخلاق کو بھی متاثر کیا ہے۔ کیونکہ اس لادینی تہذیب کی سنگ بنیاد ہی اس نظریہ پر ہے کہ خدا اور مذہب کا تعلق صرف آدمی کی انفرادی زندگی سے ہے اور یہ سراسر ایک مہمل نظریہ ہے جسے عقل وخرد سے کوئی سروکار نہیں۔ ظاہر بات یہ ہے کہ خدا کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ یا تو خدا انسان اور اس ساری کائنات کا جس میں انسان رہتا ہے خالق اور مالک اور حاکم ہے یا نہیں۔ نہایت لغو بات ہے کہ ایک ایسی غیر متعلق ہستی کو خواہ مخواہ پرستش کی جائے جس کا ہم سے کوئی واسطہ نہیں ہے اگر وہ فی الواقع ہمارا اور اس تمام جہان ہست وبود کا خالق مالک اور حاکم ہے تو اس کے کوئی معنی نہیں کہ اس کی علمبرداری محض ایک شخص کی پرائیویٹ زندگی تک محدود ہو اور جہاں سے ایک اور ایک دو آدمیوں کا اجتماعی تعلق شروع ہوتا ہے۔ وہیں سے اس کے اختیارات ختم ہو جائیں۔ یہ حد بندی اگر خدا نے خود کی ہے تو اس کی کوئی سند ہونی چاہیے اور اگر اپنی اجتماعی زندگی میں خدا سے بے نیاز ہو کر خود ہی خود مختاری اختیار کی ہے تو یہ اپنے حاکم، خالق اور مالک سے اس کی کھلی بغاوت ہے اس بغاوت کے ساتھ یہ دعویٰ کہ ہم اپنی انفرادی زندگی میں خدا اور اس کے دین کو مانتے ہیں انتہائی کم فہمی وکم عقلی کا ثبوت ہے۔

---

[1] پاکستانی کلچر، ص: ۸۷

[2] پردہ، ص: ۳۵۶۔۳۵۷

دینی ومذہبی اثرات

امتِ مسلمہ جسے اللہ تعالیٰ نے امتِ وسط قرار دیا ہے اور قرآن مجید میں اسے خیر الامت کا طرۂ امتیاز عطا فرمایا ہے یہ امت اپنے عقائد وتصورات میں اپنے شعائر وعبادات میں امت واحدہ ہے۔ اخلاق وکرادر میں امت واحدہ ہے، آداب ورسوم میں امتِ واحدہ ہے۔ جذبات واحساسات، قانون ودستور حتیٰ کہ اپنی دینی وسیاسی اور روحانی ومادی قیادت میں بھی امت واحدہ ہے۔

لیکن یہ نظریات امت کے مختلف گروہوں کے درمیان ربط وتعلق پیدا کرنے اور ان کو وحدت اسلامیہ کے قریب لانے میں ناکام رہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وطنیت اور آخر کار قومیت کے رجحانات مسلمانوں کے دینی اشتراک پر غالب آ گئے۔ ان رجحانات نے ہمہ گیر اخوتِ اسلامیہ پر یلغار کر دی۔ جس کا لامحالہ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی آہنی دیوار میں کئی در کھل گئے جن سے مسلسل فتنے اور معائب نفوذ کرتے رہے۔ دین وسیاست میں عملی تفریق ہو گئی۔ کیونکہ خلفائے راشدین کے بعد زمام اختیار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آ گئی تھی جنہوں نے اعلیٰ دینی واخلاقی تربیت نہیں پائی تھی۔ ان کا دینی، روحانی اور اخلاقی معیار اتنا بلند نہ تھا، جو ملت اسلامیہ کے رہنماؤں کے شایان شان ہوتا ہے۔ ان کے خیالات اور مزاج پر عرب کی قدیم تربیت وماحول کا اثر نمایاں تھا۔ خلفاء علم اور دین میں ایسا ادراک نہیں رکھتے تھے کہ ان کو علماء اور اہل دین کی ضرورت نہ پڑے۔ انہوں نے حکومت وسیاست کو تنہا اپنے ہاتھ میں رکھا اور جب چاہا یا جب ان کے مصالح کا تقاضا ہوا علماء اور اہل دین سے مدد لی اور جتنی بات انہوں نے چاہی قبول کیا اور جب چاہا ان کے مشورے پر عمل نہ کیا۔ اس طرح سیاست دین کی نگرانی سے آزاد ہو گئی۔ جہاں تک عوام کا تعلق تھا تو انہیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہی نہ تھا۔ اور وہ محض قیادت پر بھروسہ کرتے تھے چاہے یہ سیاسی قیادت ہو یا دینی قیادت، پورا عالم اسلام مشرق سے مغرب تک ایک علمی انحطاط کا شکار تھا، تھکے تھکے دماغ اور بجھی بجھی طبیعتیں۔ علماء میں اختلاف ونزاع کے مسائل بڑھ گئے۔ فرقہ بندیوں اور گروہ بندیوں نے دین ومذہب پر بہت اثر ڈالا۔ جس کا اثر امت مسلمہ پر پڑا۔

اہل دین اور اہل علم کی صورت یہ تھی کہ یا تو وہ حکومت کے مخالف تھے اور اس کے خلاف وقتاً فوقتاً خروج کرتے تھے یا سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو کر صرف افراد کی اصلاح وتربیت کے کام میں مشغول تھے۔ بعض اپنے ماحول کی خرابی کو دیکھ کر کڑھتے رہتے تھے یا اس پر دینی و اخلاقی حیثیت سے سخت تنقید کرتے تھے لیکن مجبور تھے، بعض کسی دینی مصلحت کی بنا پر حکومت کے ساتھ تعاون کر رہے تھے اور اس کے نظام میں شریک ہو کر جتنی اصلاح ان کے امکان میں تھی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور کچھ افراد ایسے بھی تھے جو اپنی ذاتی مصلحت اور کامیابی کے لئے حکومت کے ساتھ اشتراک اور موالات کر رہے تھے۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ نظری اور اعتقادی طور پر تو نہیں لیکن عملاً دین وسیاست میں علیحدگی ہو گئی اور اس طرح خلافت راشدہ سے پہلے دنیا کے نظام سلطنت کا جو حال تھا وہی رنگ ایک بار پھر پیدا ہو گیا، دین روز بروز بے زور اور بے دست وپا ہوتا گیا اور سیاست کے ہاتھ کھلتے گئے اور اس کی بے قائدگی اور خود اختیاری بڑھتی گئی۔ یوں اہل علم ودین اور اہل دنیا کے دو علیحدہ علیحدہ گروہ بن گئے اور ان کے درمیان اختلاف کی خلیج روز بروز وسیع ہوتی چلی گئی اور بعض اوقات بیگانگی سے بڑھ کر مخالفت کی نوبت آ گئی۔ ارکان حکومت، یہاں تک کہ بذات خود خلفاء، دین اور اخلاق کا کامل نمونہ نہ رہے بلکہ ان میں سے بعض اشخاص میں جاہلی جراثیم اور میلانات کی بہتات ہو گئی۔ قدرتی طور پر ان کی روح اور نفسیات کا اثر قومی زندگی پر پڑا اور لوگ عموماً ان ہی کے اخلاق وعادات ورجحانات کی تقلید کرنے لگے، دین کی نگرانی ختم ہو گئی احتساب اٹھ گیا۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا زور ختم ہو گیا۔ اس لئے کہ اس کی پشت پر کوئی طاقت اور حکومت کی حمایت نہیں تھی وہ محض چند دیندار اشخاص کا رضا کارانہ عمل تھا جن کے پاس کوئی قوت اور تعزیر نہیں تھی۔ اس کے برخلاف بے قید اور آزاد زندگی

کی ترغیبات بہت تھیں اس لئے جاہلیت کو اسلامی مملکت کے اندر سانس لینے کا موقع ملا اور اس نے سر اٹھایا، عیش وعشرت، ترفع وتنعم کی زندگی عام ہوگئی۔ تفریحات اور لہو ولعب کی گرم بازاری ہوئی۔ لذت اندوزی اور نفس پروری کا غلبہ ہوا اور دنیا کی زندگی اور اس کی لذتوں کی ہوس بڑھ گئی، اس اخلاقی تنزل اور اس تفریحی انہماک کے ساتھ کسی قوم کے لئے اسلام کی دعوت وتبلیغ کا فرض انجام دینا، انبیاءؑ کی جانشینی کرنا، اللہ اور روز آخرت کو یاد دلاتے رہنا، تقویٰ اور دین داری کی ترغیب دینا اور لوگوں کے لئے اعلیٰ اخلاقی نمونہ قائم کرنا بہت مشکل ہوگیا۔ بلکہ ان حالات کے ساتھ اپنے وجود، عزت اور آزادی کو برقرار رکھنا بھی دشوار ٹھہرا۔ اور اللہ کی سنت پوری ہوئی۔

سنة الله فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنة الله تبدیلا[1]

''اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں میں بھی اپنا یہی دستور جاری رکھا ہے جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور آپ خدا کے دستور میں کسی طرف سے ردوبدل نہ پائیں گے''

یہ لوگ اپنے اعمال واخلاق اور اعمال ومعاملات میں اسلام کی شرعی سیاست اس کے جنگی قانون، اس کے تمدنی اور اس کی اخلاقی تعلیمات کی بہت کم نمائندگی کرتے تھے اس طرح غیر مسلموں کے دلوں سے اسلام کے پیغام کا احترام اور اثر جاتا رہا اور ان کا اعتماد ان لوگوں سے زائل ہوگیا۔

اس دور انحطاط میں مسلمانوں میں شرک وجہالت، قدیم جاہلی قوموں کے عقائد وخیالات اور دینی گمراہی نے بھی نفوذ کر شروع کر دیا اور مسلمانوں کی زندگی میں اور ان کے مزاج میں ایسی بدعات نے اثر ڈال لیا، جنہوں نے مذہبی زندگی کی ایک بڑی جگہ کو گھیر لیا اور مسلمانوں کو صحیح دین اور کارآمد دنیا سے بے نیاز کر دیا، ظاہر ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں کے درمیان مسلمانوں کو جو کچھ امتیاز وخصوصیت حاصل ہے وہ اس دین کی بدولت ہے جو رسول اللہ ﷺ اللہ کے پاس سے لے کر آئے اور اس دین کا امتیاز واعجاز اس کی اصلیت میں ہے وہ اسی بارہ میں ممتاز ہے کہ وہ اللہ کی وحی وشریعت اس کی معجزانہ ساخت اور اس کی حکیمانہ صنعت ہے۔

صنع الله الذی اتقن کل شیئ[2]

''اس اللہ کی کاریگری جس نے ہر چیز کو مضبوط بنایا''۔

جہاں تک اصل دین کا تعلق ہے وہ اس پوری مدت میں ہر قسم کی تحریف وتبدیل سے محفوظ رہا۔ مسلمانوں نے راہ راست سے جہاں جہاں انحراف کیا تھا، کتاب وسنت سے مقابلہ کر کے اس کا علم اور احساس ہو جاتا تھا۔ دین وشریعت نے مسلمانوں کی غلطی میں کبھی ساتھ نہیں دیا، بلکہ ان کے مطالعہ سے غیر اسلامی ماحول' مشرکانہ اور مبتدعانہ اعمال ورسوم اور جاہلی اخلاق وعادات کے خلاف نیز طبقۂ امرا اور گروہ سلاطین کے تعیش اور استبداد کے خلاف ایک سخت احتجاج اور جذبہ' جہاد پیدا ہوتا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی تاریخ کے ہر دور اور اسلامی دنیا کے ہر گوشہ میں ایسے عالی ہمت اور اولوالعزم اشخاص پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اس امت میں انبیاء کی جانشینی کا حق ادا کیا، مسلمانوں کے تن مردہ میں روح جہاد پھونکی اور برسوں کی ساکن سطح میں حرکت وتموج پیدا کیا، اور مسائل اور علوم میں اپنی فکر تازہ اور مجتہدانہ قابلیت سے کام لے کر مسلمانوں میں نئی علمی روح اور ذہنی بیداری پیدا کر دی۔

صلیبی جنگ کا ہم عصر اسلامی معاشرہ اگرچہ مخلص اور فعال علماء سے خالی نہ تھا اور علماء، دین کی خدمت میں ہمہ تن مصروف تھے لیکن فروعی مسائل پر مختلف فرقوں میں بٹ گئے تھے۔ خصوصاً اس دور میں حنابلہ، اشاعرہ اور شافعیہ اثر پکڑ رہے تھے۔ اس دور کی عظمت اس لئے

---

[1] الاحزاب، ۳۳/۶۲　　[2] النمل، ۲۷/۸۸

خاک آلود ہوئی کہ حنابلہ اور اشاعرہ نے اسے کھیل بنا دیا۔ یہ دونوں فرقے اسلامی طریق کار کی غلطیوں میں شریک تھے اور یہ خطا کاری اس بنیاد پر تھی کہ ان جماعتوں کی وفاداری کا تعلق اپنے فرقہ سے تھا اور وہ نظریہ اسلامی کی وفاداری سے بڑھ کر تھی جو اصل بنیاد تھا اور اس امت کی وفاداری سے بھی زیادہ تھی جس سے وہ منسوب تھا۔ ان جماعتوں کی نشوونما مختلف مکاتب فکر پر مبنی تھی جیسے مکتب سفیان ثوری، مکتب ابوحنیفہ، مکتب شافعی اور مکتب احمد بن حنبل۔ اگر چہ یہ مکاتب ایک ہی اسلامی پیغام کی حدود میں تخصصات تھے۔

پانچویں صدی کے نصف آخر سے مذہبی نزاع کے سلسلہ میں ان مذاہب میں ایسے گروہ شامل ہو گئے جو لا حاصل میدانوں میں اپنی کوششوں کو ضائع کرنے لگے اور ثقافتی واجتماعی زندگی منفی صفات، تقلید اور جمود کا شکار ہو گئی امت باہمی لڑائی اور منافرت رکھنے والے فرقوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی اور اس کے بڑے فیصلے ان مذاہب اور فرقوں کی دلچسپیوں کی نذر ہونے لگے۔

بڑی مشکل جو اس صورت حال سے پیدا ہوئی، وہ ان مذاہب کی منفی سوچ تھی جس کے تحت یہ تمام جماعتیں صرف اپنے آپ کو اسلامی زندگی میں حق پر خیال کرتی تھیں اور اس خیال کی بنیاد اپنے بزرگ اسلاف کی تاریخ پر رکھتی تھیں۔ جہاں تک حنابلہ کا تعلق ہے، وہ امام احمد بن حنبلؒ کے زمانہ سے اپنے جہاد کی بنا پر اور ان تکالیف کی بنا پر جو انہیں پہنچیں، تکبر میں پڑ گئے۔ وہ اپنے آپ کو اسلامی معاشرہ میں برگزیدہ خیال کرتے تھے اور یہ کہ وہ اکیلے ہی صحیح عقیدہ وفہم رکھتے ہیں۔ صرف انہیں باقی رہنے، اسلام کی دعوت دینے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حق حاصل ہے۔ اس عقیدہ کی بنا پر یہ حالت ہو گئی کہ جب ان کے علاوہ کوئی اور اللہ کی طرف دعوت دینے کی کوشش کرتا تو اس پر اعتراض کرتے، اس سے لڑتے اور اس کے خلاف مساجد کے اندر اور باہر شور وفساد پیدا کرتے۔ اسی لئے جب اشاعرہ نے اسلامی دعوت کا کام اپنے ہاتھ میں لیا تو حنابلہ نے انہیں اپنا حاسد اور اپنی جدوجہد کو خراب کرنے والا خیال کیا۔ چنانچہ وہ اشعری مبلغین پر اعتراضات میں تیزی دکھانے لگے ان پر کئی قسم کی تہمتیں لگانے لگے اور ہر جگہ ان کے خلاف فساد برپا کرنے لگے۔

اسی طرح اشاعرہ تھے جو امام ابوالحسن اشعریؒ کے دور میں معتزلہ عقائد کی تردید کے سبب، ثقافتی سربلندی کے کام میں مدد بنے۔ وہ اپنے آپ کو اہل ثقافت وفکر خیال کرتے تھے اور حنابلہ کو سطحیت اور تنگ نظری کا طعنہ دیتے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ تمام ادوار کے دوران جم غفیر اور تمام شہروں کی عوام کی اکثریت اشاعرہ کی اقتداء اور تقلید نہیں کرتی تھی اور نہ ہی لوگ ان کے مذہب واعتقاد کو تسلیم کرتے تھے اس کے برعکس یہ لوگ (حنابلہ) جنہیں سوادِ اعظم کہتے ہیں، ان کے مسلک کو زیادہ صحیح سمجھتے تھے تو اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ عوام کی اکثریت کا کوئی اعتبار نہیں۔ جاہل اور بکریاں توجہ کے لائق نہیں البتہ اہل علم پر اعتبار اور اصحاب بصیرت وفہم کی اقتدا کرنی چاہیے۔ یہ لوگ امام اشعری کے اصحاب میں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ہیں اور انہیں اپنے مخالفین پر فضیلت حاصل ہے۔

مذہبی گروہوں میں فکری اثرات نے جو خطرہ پیدا کیا، وہ تھا کہ مذہبی تقلید کا کتاب وسنت سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ انہوں نے اپنی عقل، کان اور آنکھ کو اپنے مذہبی اکابر کی تالیفات پر متوجہ کیا۔ اس اعتبار پر کہ ان کا فہم قرآن وسنت کے بارے میں مطلقاً صحیح ہے۔ اس مفروضہ کی بنا پر انہوں نے قرآن وسنت کے بارے میں مذہبی اکابر کے فہم کو خود قرآن وسنت کے برابر کر دیا۔ اور ان کے مکتب فکر کو عملاً خالق ومخلوق کے درمیان واسطہ بنا دیا۔

اس صوت حال کا یہ نقصان ہوا کہ فکرِ اسلامی، جدت واجتہاد کے عمل سے منقطع ہو گئی۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ تاریخ اسلام میں اجتہاد اس لیے رک گیا کہ علماء نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا بلکہ اجتہاد اس لئے معطل ہوا کیونکہ ماہرین نے کتاب وسنت سے براہِ راست رابطہ رکھنے کی بجائے آئمہ مذاہب کی کتابوں کو لازم کر لیا اور موخر الذکر سے متعلق باہمی مشارکت کے دروازے بند کر لئے۔

مذہبی تعصب کے اثرات تعلیم اور اس کے اداروں پر منعکس ہونے لگے۔ مختلف مذاہب کے شیوخ، مدارس اور درس گاہوں میں گھس گئے اور ان کے انداز، اہداف اور رجحانات پر اثر انداز ہونے لگے۔

ان اہداف کی وجہ سے تدریس کا مفہوم تنگ ہو کر رہ گیا۔ وہ مخصوص فقہ کی عبادات اور معاملات کے مباحث تک محدود ہو گیا جن کا مقصد اپنے فرقہ کی توصیف کرنا تھا۔

فرقہ بندی طلبہ کی صفوں میں داخل ہو گئی۔ اس نے ان کے رویہ و تعلقات میں فساد پیدا کیا۔ مختلف مذاہب کے اساتذہ، طلبہ کو اپنی طرف لانے کی کوشش کرنے لگے اور ان کی عقل اور رجحان میں فرقہ کی سوچ کا بیج بونے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ درس و تدریس اور مدارس کی مجالس، مختلف مذاہب کی آراء کی تائید اور مخالفین کی آراء کی تردید کے میدان بن گئیں جہاں مخالفوں پر بیانات اور اشاروں کے حملے ہوتے تھے طلبہ مختلف گروہوں میں بٹ گئے ہر گروہ کسی مذہبی مکتب فکر کے شیخ کے گرد جمع رہتا، اس کی تعظیم و تکریم کرتا، بغیر سوچے سمجھے اس کی ہر بات ذہن نشین کرتا اور اس کے احکام کی تعمیل کرتا۔ اس کے نتیجہ میں مدارس میں طلبہ کے گروہوں کے درمیان تصادم کے واقعات ظاہر ہونے لگے۔ اکثر ایک مذہب کے پیرو اپنے مذہب کے کسی شیخ کو اپنے شہر یا کسی دوسرے شہر سے درس یا وعظ کی غرض سے دعوت دیتے۔ ان مواعظ کے دوران دوسرے مذاہب پر اعتراضات کئے جاتے۔ مذہبی تعصب کے اثرات اجتماعی زندگی پر بھی منعکس ہونے لگے اور انہوں نے معاشرتی انتشار پھیلانے میں حصہ لیا۔ ان اثرات کی مثالیں مندرجہ ذیل ہیں۔

مذاہب نے ایسے اجتماعی گروہوں کی صورت اختیار کر لی جو باہمی منافرت و غضب رکھنے والے گروہوں سے مشابہت رکھتے تھے۔ مذاہب کی تشکیل مکمل طور پر ان مکاتب فکر سے مختلف ہو گئی جن سے ان کی ابتداء ہوئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ آپس میں منقسم ہو گئے۔ انہوں نے ان چیلنجوں سے منہ موڑ لیا جو اندر اور باہر سے ان کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کی قوتیں، مذہبی تنازعات اور لڑائیوں میں صرف ہونے لگیں۔

ابن الاثیر ایک واقعہ کی مثال دیتا ہے جو 477ھ میں پیش آیا جب بابِ بصرہ کے اہالیان نے اہالیان کرخ پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے ایک شخص کو قتل کر دیا اور دوسرا زخمی کیا۔ اہل کرخ نے بازار بند کر دیے، قرآن پاک کو اور دو اشخاص کے خون سے لت پت کپڑوں کو اوپر اٹھایا۔
جب حکومت فتنہ کا سد باب نہ کر سکی تو وہ دوسری بار اٹھ کھڑا ہوا۔ پس لوگ اس فتنے کی طرف لوٹ آئے جس میں وہ پہلے مبتلا تھے اور کوئی دن ایسا نہ گزرتا جب کوئی قتل یا زخمی نہ ہوتا۔[1]

یہ رقابت و انتشار مختلف مذاہب کے باہمی مقابلہ تک محدود نہ رہا بلکہ ہر مکتبہ فکر کی صفوں میں بھی آ گیا۔ قائدین کے درمیان اپنے اپنے پیروکاروں میں اضافہ اور حکومتی مناصب میں نمائندگی کے معاملہ میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ ان کے باہمی تعلقات کا انحصار اس بات پر تھا کہ عہدوں اور مالی فوائد میں ان کے گروہ کا حصہ کتنا ہے۔ یہ رجحانات ان کے پیروکاروں میں بھی آ گئے اور وہ گروہوں میں بٹ گئے۔ ہر گروہ کسی ایک قائد کا پیرو تھا اور اس کی سیاست کی تشہیر کرتا تھا۔

ان اسلامی مذاہب اور حکومتِ وقت کے درمیان تعلقات کا انحصار اس بات پر تھا کہ یہ مذاہب حکومت کے موقف کی تائید کرتے ہیں یا نہیں۔ جب حکومت کسی مذہب کے افراد کو حکومتی مناصب پر متمکن کرتی جس کے وہ متمنی ہوتے تو وہ مذہب اور اس کے پیرو راضی ہو جاتے اور حکومت کے عدل اور اس کی اسلامی خدمات کی تعریف کرتے۔ اور جب انہیں وہ چیز نہ ملتی جس پر ان کی نظر ہوتی تو حکومت کو ضرر پہنچانے کی

---

[1] الکامل، ۱۰/ ۱۰۷، ۱۶۴

کوشش کرتے۔ خطیب اور واعظ، مساجد اور علمی مقامات پر عوام میں ہیجان پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور مدارس کے طلبہ کو اس میں شریک کرتے۔ بہت سے ناراض مذہب کے علماء کی قیادت میں مظاہرے کرتے کیونکہ حکومت نے ان کے اعلان کے مطابق، ظالم وزیر یا رعائتیں دینے والے قاضی کا تقرر کر کے نا اہلی کا ثبوت دیا اور ایسا قاضی وہی ہوتا جس کا تعلق دوسرے مذہب سے ہوتا۔ اگر حکومت کسی ایک مذہب کی مدد کرتی تو دوسرے مذاہب اس بات کو حکومت کی جانبداری پر محمول کرتے اور اس کی مخالفت کرتے۔

مذہب کی آڑ میں حصول دنیا کے لئے مذاہب کے درمیان اس رقابت کی بنا پر حکومت نے مشائخ اور علماء کی توہین شروع کی۔ سلاطین نے علمی وعدالتی اداروں کا کنٹرول حاصل کرلیا۔ وہ قاضیوں اور مدرسین کی مدد کرتے تھے یا انہیں معزول کرتے تھے۔ اور ان پر عذاب نازل کرتے تھے۔ وہ تعلیمی طریق کار وضع کرنے کے کام میں مداخلت کرتے تھے اور حکومت کے لیے سرکاری مذہب کا تعین کرتے تھے۔ دوسری طرف مذہبی تنازعات بھڑک اٹھے جنہیں مورخین نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور مذہبی لوگوں کی ایک دوسرے کے خلاف نفرت کو بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔

فرقہ بندی کے یہ رجحانات اس دور کے مورخ کی تحریر پر بھی اثر انداز ہوئے انہوں نے مذہب کے گروہ تو بنائے۔ لیکن ان مشکلات کا ذکر نہ کیا جو ان مذاہب کے سبب سے آنے والی تھیں۔ ان میں سر فہرست صلیبی حملے تھے کہ جب سیلاب کا بند کمزور ہو تو طاقت ور دریا کا بہاؤ سب کچھ خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ صحیح دین کے گہرے اثرات اور اخلاقی تربیت کے بغیر قوت، علم اور صنعت ترقی کرتی ہے تو اس کے طبعی نتائج یہی ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کے زوال کی اہم وجوہات میں سے ان کے علماء اور حکمرانوں کی کمزوری ہے۔ ان ظالم اور نا عاقبت اندیش حکمرانوں کو ایسے منافق علماء مل جاتے ہیں جو انہیں سیدھا راستہ دکھانے کی بجائے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں قدیم حکومتوں میں علماء وفقہا کا کام وہ تھا جو آج کل پارلیمنٹ کا کام ہے وہ قوم اور بادشاہ پر نظر رکھتے تھے۔ خلاف شرع یا خلاف دین کوئی بات دیکھتے تو فوراً تنبیہ کرتے تھے یہ علماء پرہیز گار تھے دنیا کے ساز وسامان سے بے پرواہ تھے۔ جب تک ایسی جماعت موجود رہی کسی خلیفہ یا بادشاہ یا حکمران کو علی الاعلان ظلم کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ علماء حق پرست تھے وہ ان سے ڈرتے تھے۔ ان اچھے اور مصلح عالموں کے بعد ایسے علماء پیدا ہوئے جنہوں نے علم کو روٹی کمانے کا ذریعہ بنا لیا۔ ایسے علماء نے فاسق اور بدکار بادشاہوں کی ناجائز باتوں کو بھی جائز قرار دیا اور ان کی رضا جوئی کے لئے دین کے احکام کو دین کے نام پر توڑ ڈالا۔ عوام الناس اور رعایا ان علماء کے بڑے بڑے ناموں اور عماموں کو دیکھ کر دھوکہ کھا جاتے ہیں ان کی پیروی کرنا ثواب اور ان کی حکم عدولی گناہ تصور کرتے ہیں اس گمراہی اور غلطی سے مسلمانوں کے عقائد میں خرابی بڑھ گئی ہے اور مسلمان روز بروز تنزل کا شکار ہو رہے ہیں۔ ان کے دشمن ترقی کرتے جاتے ہیں۔ یقیناً اس کی جوابدہی علماء پر ہے۔ آپ کا فرمان ہے

عن ابن عباس: قال النبی ﷺ صنفان من امتی اذا صلحا صلحت الامة واذا فسدت افسدت الامة السلطان والعلماء[۱]

''میری امت کے دو قسم کے لوگوں کی حالت جب تک درست ہو گی تو امت کی حالت بھی درست اور بہتر ہو گی اور جب ان کی حالت خراب ہو جائے گی تو امت میں بھی بگاڑ اور خرابی پیدا ہو جائے گی۔ ان سے مراد حکمران اور علما ہیں''۔

---

۱ ابن عبد البر، جامع، بیان العلم، ۱/۱۸۴

خلاصۂ بحث

خلاصۂ بحث

ابتدائی معاشرہ کی بنیاد عرصہٗ ازل سے ایک ایسے تخلیقی ماحول میں قائم ہوئی ہے۔ جو منشائے الٰہی کے عین مطابق تھا۔ انسانی معاشرہ کی تخلیق کا اولین رابطہ خداوند تعالیٰ کے ارادہ سے ہے۔ بالفاظ دیگر یہ کہنا چاہیے کہ انسانی معاشرہ پہلے پہل تخلیقی ارادہ میں ظاہر ہوا اس کے بعد اس معاشرہ نے ربانی معاہدہ کے اثر کو قبول کیا۔ پھر اس معاشرہ میں تخلیق کے عمل کو دخل ہوا۔ جب یہ عمل مکمل ہو گیا تو اس کی حیثیت تخلیقی معاشرہ کی ہو گئی۔ حضرت آدمؑ اس فطری، خاندانی اور اسلامی معاشرہ کے سردار اور ان کی اولاد اولین ارکان تھے۔

یہ زمین کی وراثت وخلافت یکے بعد دیگرے مختلف قوموں کے سپرد ہوتی رہی۔ اور وہ دنیا میں اللہ کی طرف سے دین حق کے خدمت گزار رہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وهو الذی جعلكم خلائف الارض[1]

''اور وہی پرودگار عالم ہے جس نے تمہیں زمین میں خلافت دی''

پھر فرمایا:

ثم جعلنكم خلائف فی الارض من بعد هم لننظر كيف تعملون[2]

''پھر ان قوموں کے بعد ہم نے تم کو ان کی جگہ دی تاکہ دیکھیں تمہارے کام کیسے ہوتے ہیں''

حضرت نوحؑ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

واذكروا اذ جعلكم خلفاء من بعد قوم نوح[3]

''اور یاد کرو جب تم کو قوم نوح کے بعد ان کا جانشین بنایا''

اسی چیز کو زمین کی وراثت سے بھی تعبیر کیا گیا۔

ولقد كتبنا فی الزبور من بعد الذكر ان الارض يرثها عبادی الصالحون[4]

''اور زبور میں بھی ہمارا اعلان یہی تھا کہ یقیناً زمین کی وراثت ہمارے صالح بندوں ہی کی وراثت ہوگی''

یہی چیز زمین کی ''تمکین وتمکن'' یعنی طاقت وعظمت کا قیام ہے جس کا مسلمانوں سے وعدہ کیا گیا

الذين ان مكناهم فی الارض اقاموا الصلوٰة واٰتو الزكوٰة وامروا بالمعروف و نهوا عن المنكر ، ولله عاقبة الامور[5]

''وہ لوگ کہ اگر ہم ان کی طاقت زمین میں قائم کر دیں تو ان کا کام یہ ہوگا کہ نماز قائم کریں گے، زکواۃ ادا کریں گے نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے''

تو گویا اس آیت کریمہ سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ تمکین فی الارض یا حکومت کا اصلی مقصد خدا کی بندگی، نیکی کا فروغ اور برائی کا انسداد ہے۔

سورہ نور کی آیت نمبر ۵۵ میں اس کو لفظ خلافت سے تعبیر کیا گیا۔

---

1. الانعام،۶/۱۶۵ 2. یونس،۱۰/۱۴ 3. الاعراف،۷/۶۸ 4. الانبیاء،۲۱/۱۰۵
5. الحج،۲۲/۴۱

وعد الله الذين اٰمنوا منكم وعملوا الصلحات ليستخلفنهم فى الارض كما استخلف الذين من قبلهم[1]

''جولوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے۔ اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ انہیں زمین کی خلافت دے گا۔ ایسے ہی جس طرح وہ پچھلی قوموں کو دی جا چکی ہے''

اس آیت سے ضمناً یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرآن حکیم کے نزدیک جو چیز خلافت ہے وہ خلافت فی الارض ہے۔ اور جو بنیادی بات ظہور میں آئی وہ ربانی طاقت اور انسان کی اجتماعی ھیئت کے درمیان معاہدہ اطاعت تھا۔

قیادت کی قدیم ترین نوعیت گروہی اور قبائلی تھی جو غیر مہذب اور ابتدائی معاشروں میں پائی جاتی تھی قیادت کی یہ قسم بحر الکاہل کے جزائر اور افریقہ وامریکہ کے نیم وحشی قبائل میں آج بھی موجود ہے۔

قدیم انسانی سماج کی ہیئتِ حاکمہ قبیلے کے سردار پر تھی جسے افرادِ قبیلہ کی تائید حاصل ہوا کرتی تھی۔ سربراہ قبیلہ اپنی شہری ریاست کے معاملات مشاورت سے چلاتا تھا۔ دنیا کے متمدن حصوں میں ایسی سینکڑوں ریاستوں کا تذکرہ تاریخ میں موجود ہے۔

شہری ریاستوں کے مخصوص معاملات اشرافیہ کے ہاتھوں میں تھے تاہم شہریوں کی نمائندگی اور مشاورت کو وسیع کرنے کے لئے جمہوری ادارے ترتیب دیئے گئے تھے۔

یونان کے زوال کے بعد رومی سلطنت کی صورت میں زمین کا یہ خطہ جمہوریت کی آبیاری میں سرگرم رہا اس سیاسی لیبارٹری میں بادشاہت سے اشرافیہ اور اشرافیہ سے جمہوریت کا گردشی سفر آہستہ آہستہ جاری رہا۔

سلطنت روم نے جمہوریت کی ترقی میں بنیادی کردار ادا کیا۔ ایک طرف تو آئین ودستور کے ارتقاء کی صورت میں دوسری طرف ریاست وتمدن کے انتظامی سدھار کی شکل میں، جس سے قانون، مملکت کا حسن انتظام اور خوش گوار شہری زندگی ترویج پاگئی۔

امور سلطنت میں عوامی شمولیت کا یہ ابتدائی سفر ملوکیت سے بار بار متاثر ہوتا رہا۔ بہر حال سیاسی دنیا اس تجربے کی بدولت ان بنیادی اقدار سے آگاہ ہوئی۔ جو بعد میں ایک نئے نظامِ حکومت میں ڈھل گئی۔

یونان وروما سے جمہوری اور دستوری روایات وراثت میں پانے کے باوجود یورپ کے قرون وسطیٰ سیاسی وسماجی سطح پر جمہوریت کی ترویج سے محروم رہے۔ مذہب عیسائیت اگر چہ اس خطہ میں تہذیب وتمدن کے ایسے اصولوں کی روشنی میں پروان چڑھا، جو انسانی مساوات اور حقوق انسانی کی بنیاد بن سکتے تھے مگر بادشاہوں کی خودمختاری اور کلیسا کے اختیارات میں برتری، یعنی پاپائیت کا فروغ، جمہوریت کے فروغ میں رکاوٹ بنا رہا۔

ابتدائی قرون وسطیٰ میں عیسائیت کے عروج نے اگر چہ یورپ کے انسان کو مہذب ہمدرد اور معاشرے کا خادم بنانے کی بھرپور کوشش کی مگر وہ اس کی آزادی کو تحفظ یا نشو ونما دینے والا نظام مہیا نہ کرسکی۔ البتہ خدائی حاکمیت اور عالمگیر ریاست کے خواب، افراد معاشرہ کو آفاقی نصب العین دینے میں موثر رہے۔

پانچویں صدی عیسوی کے بعد مذہب کی سرکاری سرپرستی نے، اس ادارے کو غیر معمولی قوت سے نوازا جس نے اسے اخلاقی بدحالی اور سماجی ظلم کی طرف گامزن کردیا۔ شاہی ایوانوں میں مذہب اور مذہبی اداروں میں شاہانہ طرزِ زندگی سرایت کرگیا۔ جہالت، غربت اور اخلاقی بے راہ روی کا شکار عوام الناس کی زندگی مذہب وسیاست کے گٹھ جوڑ نے اجیرن کردی۔

کلیسائی افکار نے خدائی حاکمیت اور قانون فطرت کی تشریح کرتے ہوئے خدائی ریاست کا تصور پیش کیا۔ مطلق العنان بادشاہت

---

1. النور، ۲۴/۵۵

نے خدائی نمائندگی کا دعویٰ لے کر اسے اپنے حق میں استعمال کرنا شروع کر دیا، جبکہ پاپائیت اسی کی بدولت حکومت پر اپنی برتری ثابت کرنے میں لگی رہی۔ عہد ازمنہ وسطیٰ میں سیاسی و مذہبی اجارہ داری کے خلاف ردعمل پیدا ہوا جس سے ان دونوں معاشرتی اداروں میں اصلاح کی ضرورت، ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی۔ سیاسی مفکرین دو طبقوں میں منقسم تھے۔ ایک گروہ حکومت پر مذہب کی اجارہ داری، جبکہ دوسرا مذہب کو حکومت کے زیر نگین کرنے کا مدعی تھا۔

عہد وسطیٰ میں یہ معاشرتی ارتقاء، معاشرتی نظم و نسق اور دفاعی ضروریات کے لئے ایسا سیاسی ڈھانچہ بن گیا تھا۔ کہ شہنشاہیت کے دور میں بھی کئی شعبوں میں ترقی ہوئی لیکن اس پورے نظام میں جو بنیادی نقص معاشرے کے استحصال سے متعلق تھا اس پر قابو نہ پایا جا سکا۔ اس میں معاشرے کا ایک طبقہ اپنے مفادات کے لئے، دوسرے معاشرتی طبقے کو استعمال کرتا تھا۔ اس میں ایک طبقہ وہ تھا کہ جو کسی جنگ مغلوبہ میں غلام/کنیز کی حیثیت سے آیا یا جسے کسی صاحب حیثیت نے خرید لیا اور اسے اپنے ذاتی مفاد یا ضروریات کے لئے استعمال کیا، دوسرا طبقہ وہ تھا جو وسائل کی کمی کے باعث صاحبانِ ثروت کے لئے اجرت پر کام کرتا تھا اور جاگیرداران کی معاشی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان کا استحصال کرتے تھے۔

انسان جب اپنے پیدا کرنے والے کی غلامی اور اس کے رسولوں کی اطاعت سے روگردانی کر لیتا ہے تو پھر اپنے جیسے بندوں کی غلامی سے اسے کوئی چیز نہیں روک سکتی اور وہ اپنے لئے نئے آقا اور مالک تلاش کرتا رہتا ہے۔

ملوکیت اور بادشاہت کی بھیانک تصویر فرعون مصر تھا جس کے پاس حضرت موسیٰؑ توحید کی دعوت لے کر گئے تھے۔ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کا قصہ دراصل اسلامی نظام و فرعونی نظام اور توحید و شرک کی باہمی کشمکش کا سبق آموز قصہ ہے۔

چنگیزیت بھی ملوکیت اور سرداری نظریہ سیاست کی ہی ایک شکل ہے۔ جس طرح بھیڑیا خون پیئے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح چنگیز خان انسانی خون بہائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

لوگ ہٹلر اور مسولینی کے فاشزم اور آمریت کی فنی تعریفیں کرتے رہتے ہیں جب کہ چنگیزی آئین فاشزم اور آمریت کی صحیح تعریف ہے۔ پاپائیت بھی حکومت اور آمریت ہی کی دوسری شکل ہے۔ جس میں پوپ یعنی مذہبی پیشوا کو مطلق العنان اختیارات حاصل ہوتے ہیں

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اتخذوا احبارهم و رهبانهم ارباباً من دون الله[1]

''انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے علاوہ اپنا رب بنا لیا''

پاپائیت کو لوگ مذہبی حکومت کہتے ہیں حالانکہ یہ مذہب کی نہیں پوپ کی حکومت ہوتی ہے۔

یورپ کے پاپائی نظام کا سینٹ پال ہیرو تھا جس نے موسوی شریعت کو لعنت قرار دے کر مسیحیت کی بنیاد صرف ان اخلاقی تعلیمات پر رکھی تھی جو نئے عہد نامے میں پائی جاتی ہے۔ ان اخلاقی تعلیمات میں کوئی ایسا قانون نہیں۔ جس پر ایک تمدن اور ریاست کا نظام چلایا جا سکے۔ اس لئے جب انہیں نظام حکومت قائم کرنا پڑا تو ان کے سامنے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشاتِ نفس کے مطابق قوانین وضع کر کے نافذ کریں۔

تحریک احیائے العلوم سے قبل قیادت کا تصور انفرادی قوت اور صلاحیت کا پر اثر استعمال تھا۔ جو فرد اپنی قوت کے ذریعہ اور اپنے ساتھیوں کے ذریعہ دوسروں پر غالب آنے کی قوت اور صلاحیت رکھتا تھا معاشرتی قیادت کا حق رکھتا تھا اور اس کے حق کو تسلیم بھی کیا جاتا تھا۔

---

[1] التوبہ،۹/۳۱

تحریک احیائے العلوم نے معاشرتی قیادت کو زندگی کے مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا اور کمال فن یا علمی استعداد یا ئی ایجاد یا نیا فکری نظریہ جسے معاشرتی مقبولیت حاصل ہوئی ہو مخصوص علم وفن میں قیادت کے حوالے سے پہچانا جانے لگا۔

اس طرح فنون لطیفہ کے قائد اور تھے۔ سائنسی ایجادات کے قائد اور لیکن ان تمام قائدین میں جن لوگوں کی قیادت کے اثرات فی زمانہ بھی نظر آتے ہیں اور جن قائدین نے حقیقتاً فکری اور معاشرتی انقلاب کو انسانی حقوق کی پاسداری اور ایک دوسرے کی احتیاج پر باہمی مفادات کی بنیاد پر قائم کیا جو یورپ میں پانچ سو سال تک اپنے افکار کی انفرادی طور پر روشنی پھیلاتے رہے۔ وہ سیاسی مفکر تھے جنہیں فکری قیادت کا شرف حاصل ہے یا جن کے افکار سے دوسرے مفکرین نے استفادہ کیا ہے ان میں کچھ نام جنہوں نے سیاسی فکر کو مخصوص حوالے سے پرکھا ہے۔ والٹیر روسو اور مونٹیسکو ہیں۔ جنہوں نے شہنشاہیت کے خلاف انقلاب فرانس کی فکری بنیاد رکھی اور تمام عالم انسانیت کو انسانی معاشرتی اہمیت مساوات اور اس کے سیاسی حقوق سے روشناس کرایا۔

والٹیر نے فرانس میں اس وقت آنکھ کھولی جب فرانس مذہبی انتہا پسندی میں فرقہ واریت کا شکار تھا۔ والٹر نے اس ماحول سے نکل کر 1726ء میں انگلستان میں قدم رکھا۔ فرانس کے ماحول نے والٹیر کو صرف تیس سال کی عمر میں ذہنی پختگی نصیب کی۔ اس نے Locke (لاک) اور Newton (نیوٹن) کی تصانیف کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ ان سے نظریاتی طور پر متاثر ہوا۔

والٹیر جمہوریت کا دلدادہ نہ تھا اور نہ اسے عوام سے کوئی لگاؤ تھا اس نے عوام کو انفرادی اور سیاسی حقوق سے متعلق بھی کوئی نظریہ پیش نہیں کیا۔ لیکن اس نے جو فکر دیا وہی ان کی بنیاد بنا۔ جن مقاصد اور آئیڈیلز کو سامنے رکھ کے جدید جمہوریت کو فروغ دیا گیا تھا۔ دراصل وہ ایسے میکنزم کا منطقی نتیجہ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ گویا یہ ان مقاصد کے حصول کا موزوں ذریعہ ہی ثابت نہیں ہوئی۔ ڈیماکریسی جو کچھ پیدا کر سکتی تھی وہ کر چکی اور جو کچھ اس کے ذریعے حاصل ہوا ہے وہ ان آئیڈیلز کے ساتھ میل نہیں کھاتا جو عوام کی حکومت کے دلکش نعرے میں مضمر تھے۔ اس پر ستم یہ کہ آج مشرق و مغرب میں جمہوریت کو ایک مقدس گائے کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ اس کی خامیاں تلاش کرنا غیر ضروری اور ناجائز سمجھا جاتا ہے اور اس کی خوبیوں کے بارے میں سوال کرنے کو غیر جمہوری رویہ گردانا جاتا ہے۔

جمہوریت کی اس دلکشی اور پسندیدگی کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ تأثر قائم کرنے میں کامیاب ٹھہری ہے کہ اس نے ایک مخصوص مراعات یافتہ طبقے کی حکومت میں، عوام الناس کی قابل ذکر تعداد کو کسی حد تک شامل کر لیا ہے۔

گویا جمہوریت کے ہوتے ہوئے عوام الناس اس حقیقی مغالطے میں رضا کارانہ طور پر گرفتار رہتے ہیں کہ وہ بھی حکومت میں شامل ہیں۔ جمہوریت کا یہ ادھورا پن، ایسا مستقل نقص ہے جو اس کی بنیادوں کے ساتھ وابستہ ہے وہ مقاصد جو بذریعہ جمہوریت حاصل ہونے چاہیں وہ دراصل خود جمہوریت کے ارتقاء کے لئے بطور خام مال درکار ہوتے ہیں۔

آمریت کا نظام ریاست میں عوام کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے پر بہت زور دیتا ہے روحانی ضرورتوں سے تعلق نہیں رکھتا۔ اس نظام حکومت میں اونچے طبقے اور اعلیٰ نسل کے لوگ حاکم ہوتے ہیں اور عوام محکوم۔

چونکہ آمریت عقل و فطرت کے خلاف چیز ہے اس لئے یہ کبھی معمولی حالت میں نہیں پیدا ہوتی۔ بلکہ ان غیر معمولی حالات میں پیدا ہوتی ہے جب کہ مصائب کے کسی شدید حملہ نے کسی قوم کے دماغی توازن کو بگاڑ دیا ہو۔ ایسے موقع پر اگر کوئی ہوشیار آدمی موجود ہوتا ہے تو وہ قوم کی بدحواسی سے فائدہ اٹھا کر عام جذبات میں اشتعال پیدا کرتا ہے۔ امیدوں کے سبز باغ دکھاتا ہے اور اس طرح ان کی توجہات کو اپنے اوپر مرکوز کر کے آمرانہ اقتدار حاصل کر لیتا ہے اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر قوم کے حواس بجا ہو گئے اور اسے سوچنے کی مہلت مل گئی تو اس کی

امارت ختم ہو جائے گی یہی وجہ ہے کہ ہر آمر اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے پیہم ہیجان انگیز کاروائیاں کرتا رہتا ہے تا کہ اس کی قوم کو کبھی سکون قلب کے ساتھ غور وفکر کا موقع نہ ملے۔ اسی وجہ سے دنیا کے کل ڈکٹیٹروں کی تاریخ خونریزیوں اور جنگ آزمائیوں سے بھری نظر آتی ہے۔

کارل مارکس، لینن، سٹالن اور دوسرے اشترا کی قائدین کی تحریروں اور تقریروں سے عیاں ہے کہ ان کا نصب العین بزورِ شمشیر محنت کشوں کی آمریت قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ایک ایسی آمریت کا قیام جو سرمایہ دار طبقے کو روند ڈالے اور مزدوروں کو ان پر مسلط کر دے۔ لینن کے قول کے مطابق:

''مارکس کے یہ الفاظ ہمیں کیا بتاتے ہیں یہی کہ ایک انقلابی حکومت کو آمرانہ اقدامات کرنے چاہیں اور اس آمریت کا کام یہ ہے کہ پرانی روایات کی یادوں کو نیست و نابود کر دے''[۱]

سوشلزم کا سیاسی نظام تمام تر پرولتاریہ کی آمریت پر قائم ہے۔ جس کی نمائندگی سوشلسٹ پارٹی کرتی ہے۔ اور سوشلسٹ پارٹی کا لیڈر ایسا آمر مطلق ہوتا ہے۔ جس کے ہاتھ میں ملک کا سیاہ و سفید ہوتا ہے۔ ساری ملکیتیں اس کے قبضے میں سارے کارخانے اس کے ہاتھ میں اور سارے اقتدار کی تمام تر کنجیاں اس کی جیب میں ہوتی ہیں۔ پارٹی اس کے چشم ابرو کے اشارے پر حرکت کرتی ہے۔

یہ نظام انسان کو بگڑا ہوا اور تنازع البقاء کا مارا ہوا حیوان قرار دیتا ہے جسے شدید شکنجے میں کسے بغیر کوئی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ کہ اگر وہ آزاد ہو تو پھر کوئی اصلاح کامیابی کے دروازے تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہی وہ تصور ہے کہ جس کے تحت دنیا کی تمام سوشلسٹ ریاستوں میں نہایت آہنی قسم کی آمریتیں قائم ہیں۔ اور سوشلسٹ نظام کی کامیابی کے لئے جو پارٹی وجود میں آتی ہے اس سے اختلاف ایک شخص کو عمر بھر کے لئے جبری محنت کے لئے کیمپ میں جھونک سکتا ہے۔

قرآنی نظریات سیاست نہایت واضح اور قابل عمل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قیام امن و امان اور عدل و انصاف کا واحد ذریعہ بھی ہیں۔ عصرِ حاضر میں انسانیت مختلف ازم میں بٹ کر رہ گئی ہے۔ اور ہر گروہ دوسرے سے سبقت لے جانے کا خواہشمند ہے۔ اس سیاسی تفوق کی خواہش نے انسان کو بالکل درندہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ قانون سازی کے اختیارات خود سنبھال کر انسان نے اپنے ہم جنسوں کیلئے عرصہ حیات تنگ کر کے رکھ دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن حکیم ان سیاسی مسائل کا کیا حل تجویز کرتا ہے جنہوں نے انسانیت کو ہلاکت کے گڑھے کے کنارے لا کھڑا کیا ہے۔ نزول قرآن کے وقت بھی انسانیت ان سے ملتے جلتے مسائل سے دوچار تھی۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وكنتم على شفاحفرة من النار فانقذ كم منها[۲]

"اور تم آگ کے گڑھے کے بالکل کنارے پر پہنچ چکے تھے تم کو اللہ تعالیٰ نے اس سے نکالا"

اسلام اپنے نظام کی بنیاد ایک ایسے جامع تصور زندگی پر رکھتا ہے جو مادی طرز فکر کی یکسر نفی کر دیتا ہے۔ وہ عمل کی بنیاد روحانی اور اخلاقی عنصر پر رکھتا ہے اور فوری منفعت کے نظریہ کو باطل قرار دیتا ہے۔ جہاں تک روحانی رہنمائی کا تعلق ہے وہ بظاہر انسانی روح اور اس کے لوازمات کا خیال رکھنے کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتی ہے جیسے جسم انسانی، روح اور جسم دونوں سے مرکب ہے اسی طرح معاشرہ کی فلاح یا ریاست کی تہذیب و ترقی کے لئے اس کے مادی و روحانی دونوں عناصر کا لحاظ ضروری ہے چنانچہ قیادت میں مادی ہنر مندیوں کے خصائص بھی بدرجہ اتم موجود ہونا ضروری ہیں۔

آج مغرب پر جو مادی طرز فکر چھایا ہوا ہے وہ اخلاق کی بنا منفعت کو قرار دیتا ہے اور اپنے مفادات کے لئے دوسرے کا گلا کاٹنا

۱۔ V.I. Lenin, Selected works, Vol,I.P.558

۲۔ ال عمران، ۳/ ۱۰۲

واجب سمجھتا ہے یہ فکر زندگی سے روحانی عنصر کو یکسر ختم کر دیتا ہے۔اور تجربہ گاہوں سے نہ دریافت کیے جاسکنے والے ایمان کا منکر ہے۔

اسلامی سربراہ مملکت مطلق العنان بادشاہ یا آمر نہیں ہوتا بلکہ خالصتاً سید القوم خادمھم یعنی قوم کا سردار اس کا خادم ہوتا ہے کا عملی نمونہ ہوتا ہے اسی تصور کے تحت آپ ﷺ نے فرمایا:

''من ولاۃ الله عزوجل شیئاً من امر مسلمین فاحتجب دون حاجتهم و خلتهم و فقرهم احتجب الله تعالیٰ عنه دون حاجته و خلته وفقره ''۱؎

''جسے اللہ عزوجل نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنایا ہے اور وہ ان کی ضروریات اور فقر سے بے پرواہ ہو کر بیٹھ رہا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہو جائے گا''

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

''خلیفہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے اور رعایا پر اس طرح شفقت کرے جس طرح آدمی اپنے اہل وعیال پر شفقت کرتا ہے''۲؎

اسلامی ریاست کی قیادت، محنت، خدمت اور مشقت کا کام ہے اس کی حیثیت رعایا کے باپ کی سی ہوتی ہے جیسے وہ سب کا غمخوار، ہمدرد، مشفق، مہربان، مدد و معاون، معلم اور قائد ثابت ہو وہ سب کی بھلائی چاہتا ہو اس سے کسی کو جانبداری اور انتقام کا خطرہ نہ ہو وہ بے لوث اور مسلمانوں کے لیے مخلص ہو۔ اپنے مزاج اور فرائض کے اعتبار سے اسلامی قیادت کمزوروں، ضعیفوں، مظلوموں اور پسماندہ لوگوں کی پشت پناہ ہوتی ہے۔

اسلامی ریاست میں قیادت اور مناصب کی طلب کی سخت حوصلہ شکنی کی گئی ہے کیونکہ اسی سے اغراض کی وہ کشمکش پیدا ہوتی ہے جو کسی نظام کو تباہی سے دوچار کر دیتی ہے اور یہی طلب منصب ادائے فرض کے احساس کو کند اور مفاد پرستی کے ذوق کو تیز کر دیتی ہے اس لئے حکومت کے ذمہ دارانہ مناصب کے لئے عموماً اور قیادت (امارت) کے لئے خصوصاً وہ لوگ سب سے زیادہ غیر موزوں ہیں جو خود عہدہ حاصل کرنے کے طالب ہوں اور اس کے لئے کوشش کریں۔قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

تلك الدار الاخرة نجعلها للذين لا يريدون علوا فی الارض ولا فساداً ۳؎

''وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ اپنی بڑائی کے طالب ہوتے ہیں اور نہ فساد برپا کرنا چاہتے ہیں''

نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے۔

انا والله لا نولی علیٰ عملنا هذا احداً سأله او حرص علیه ۴؎

''بخدا ہم اپنی اس حکومت کا منصب کسی ایسے شخص کو نہیں دیتے جو اس کا طالب ہو یا اس کا حریص ہو''

آپ ﷺ نے فرمایا:

ان اخونکم عند نا من طلبه ۵؎

''تم میں سب سے بڑھ کر خائن ہمارے نزدیک وہ ہے جو اسے خود طلب کرے''

۱؎ ابوداؤد، سلمان بن اشعث، سنن ابی داؤد، ۲/ ۴۶۵ حدیث رقم: ۲۹۴۸ ۲؎ ابوعبید، کتاب الاموال، ۱/۱۱۴ ۳؎ القصص، ۲۸/۸۳

۴؎ مسلم، کتاب الامارہ، باب ۳، حدیث رقم: ۳۴۰۲ ۵؎ ابوداؤد، کتاب الامارہ، باب ۲، حدیث رقم: ۲۹۳۰

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا:

انا لا نستعمل علی عملنا من ارادہ۱

''ہم اپنی حکومت میں کسی ایسے شخص کو عامل نہیں بناتے جو اس کی خواہش کرے''

اسلامی مملکت اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اکرمؐ کے منشا کو پورا کرنے کے لئے منصۂ شہود پر نمودار ہوتی ہے۔اس کی ہر طرح کی قانون سازی کی اساس قرآن وسنت ہیں جو کہ نا قابل تنسیخ وتبدل ہیں۔اس کے باوجود ایسی مملکت وحکومت پر پاپائیت یا مذہبی حکومت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا اسلام مذہب و دین کے نام پر کسی فرد یا گروہ یا ادارہ کو اجارہ داری کا پرمٹ جاری نہیں کرتا۔اسلامی مملکت میں دین کے نام پر کوئی مراعات یافتہ یا اجارہ دار طبقہ نہیں جو دینی احکامات کے بارے میں سیاہ وسفید کا مالک ہو۔ہر مسلمان جو کہ بالغ ہو یہ حق رکھتا ہے کہ وہ مذہبی رسم ادا کرے۔کوئی آدمی قانونی طور پر یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لئے کسی خاص تقدس کا درجہ ومقام رکھتا ہے۔اسلام میں نہ تو پاپاؤں کا گروہ ہے اور نہ برہمنوں کی جماعت۔دین ومذہب کے نام پر کسی فرد یا گروہ کی اسلامی مملکت میں اجارہ داری قائم ہونے کا کوئی خطرہ نہیں اس لئے کہ اسلام کسی فرد یا گروہ کو دین ومذہب کے نام پر لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہونے کا موقع فراہم نہیں کرتا۔

یہ بات کتنی ہی تلخ اور ناخوش گوار محسوس ہو لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ موجودہ عالم اسلامی مجموعی طور پر خود شناس،اور خود اعتمادی کی دولت سے محروم ہے۔اس وسیع اسلامی دنیا میں جو ملک آزاد ہیں خواہ وہ صدیوں سے آزاد چلے آرہے ہوں یا انہوں نے ماضی قریب میں آزادی حاصل کی ہو وہ بھی ذہنی اور علمی حیثیت سے مغرب کے اسی طرح سے غلام ہیں جس طرح ایک ایسا پسماندہ ملک جس نے غلامی ہی کے ماحول میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا ہو،بعض اوقات ان ملکوں کے سربراہ سیاسی میدان میں قابل تعریف اور بعض اوقات خطرناک حد تک جرأت و ہمت کی بات کرتے ہیں اور بسا اوقات مہم جوئی اور اپنے ملک کی بازی تک لگا دینے سے باز نہیں آتے۔لیکن فکری،تہذیبی اور تعلیمی میدان میں ان سے اتنی بھی خود اعتمادی،انتخاب کی آزادی،اور تنقیدی صلاحیت کا اظہار نہیں ہوتا۔جتنا کہ کسی ایک عاقل بالغ انسان سے توقع کی جا سکتی ہے۔ حالانکہ فلسفۂ تاریخ کا یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ فکری،تہذیبی اور تعلیمی غلامی،سیاسی غلامی سے زیادہ خطرناک،عمیق اور مستحکم ہوتی ہے۔

بیسویں صدی عیسوی میں جب کہ دنیا دو عظیم عالمگیر جنگوں سے گزر چکی ہے اور تیسری جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں کسی ملک کا کسی ملک کو غلام بنانا اس کی مرضی کے خلاف اس پر قبضہ رکھنا ایک نا قابل فہم اور ناممکن العمل بات سمجھی جانے لگی ہے۔دنیا کی بڑی طاقتیں اب دن بدن سیاسی اقتدار کی بجائے ذہنی وتہذیبی اقتدار اور یکسانیت وہم رنگی پر قانع ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

مغرب کے اس ذہنی وتہذیبی اقتدار اور اصولی ونظریاتی وحدت کو دنیا میں اگر کوئی طاقت و دعوت چیلنج کرسکتی ہے اور اس کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے تو صرف عالم اسلام کی جداگانہ شخصیت،اس کی دینی واخلاقی دعوت،اور اس کا فلسفہ زندگی لیکن اس کے لئے ایک تربیت،ایک تعلیم کی ضرورت ہے۔جب ہم غیر مسلم حکومتوں کو دیکھتے ہیں تو ان کے ہاں ذہین افراد کو وہ تمام مراعات دی جاتی ہیں جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں اور قابل افراد کو ایسی تعلیم دیتی ہیں جو انہیں مستقبل میں مختلف شعبوں میں قومی قیادت کا اہل بنا دیتی ہیں۔ان کے بارے میں ایسی فائلیں تیار کی جاتی ہیں جن میں عقل واخلاق کے میدان میں ان کے تخلیقی کام کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔اس کی روشنی میں قومی قیادت کے لیے ان کی ذمہ داریوں کا تعین کیا جاتا ہے۔اس معاملہ میں جب ہم عالم اسلام کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہر نسل کے ذہین اور قابل افراد کو فکری،سیاسی،

---

۱ شیخ علی المتقی،کنز العمال،۶/۱۹،حدیث رقم:۱۴۷۸۱

قومی اور اقتصادی قیادت کے اداروں سے دور رکھا گیا۔ پھر ان کو دو طریقے سے منتشر کر دیا گیا۔ داخلی طور پر اس طرح کہ ثقافت اور قومی ورثہ میں خاندانی و گروہی عصبیت مل گئی۔ جس سے ذہین افراد قیادت کی ذمہ داریوں سے الگ کر دیئے گئے۔ اور ان کی جگہ غبی افراد نے لے لی۔ جو اصلاح کی بجائے فساد کا موجب بنے۔ خارجی طور پر اس طرح کی ثقافتی امداد کے تحت چلنے والے غیر ملکی ادارے ہر نسل و قوم سے ذہین طلبہ اس طرح الگ کر لیتے ہیں جس طرح دودھ سے مکھن نکال لیا جاتا ہے۔ پھر انہیں غیر ممالک کے ترقی یافتہ صنعتی علاقوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں غیر ملکی کمپنیاں اپنے ترقیاتی مقاصد کے مطابق انہیں صنعتی و تکنیکی تربیت دیتی ہیں یہ ذہین افراد یہی خیال کرتے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک میں ان کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ وہ اپنی اقدار اپنے مذہب اپنی ثقافت سے بے نیاز ہو جاتے ہیں قیادت کی جو رہنمائی انہوں نے اپنے ممالک کو دینا تھی وہ کسی اور کی نظر ہو جاتی ہے۔ عصرِ حاضر میں عالم اسلام کا یہی المیہ ہے۔

قوموں کی حالت اسی وقت بدل سکتی ہے جب ان کے افکار میں تبدیلی پیدا ہو، لوگوں کے سوچنے کا انداز بدلے۔ قوموں کے عروج و زوال کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں۔ سیاسی، جغرافیائی اور معاشی وغیرہ، لیکن یہ سب بیرونی مظاہر ہیں یہ اسباب اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتے جب تک فکر میں تبدیلیاں پیدا نہ ہوں۔ ہر اہم فعل کی بنیاد فکر پر ہوتی ہے اس لئے اگر ظاہری اسباب پیدا ہوتے رہیں تو بیرونی عوامل اثر انداز ہوتے رہیں گے لیکن فکر میں تبدیلی نہ آئے گی تو ان اسباب کے صحیح نتائج پیدا نہیں ہوں گے۔ مثلاً کسی قوم میں انسانوں کا ایک طبقہ دوسرے طبقے پر ظلم کرتا رہے، استحصال کرتا رہے، لیکن مظلوم طبقے کو یہ یقین ہو جائے کہ اس کی قسمت یہی ہے جو نہیں بدل سکتی یا یہ کہ اس کی مظلومی دیوتاؤں کی خوشی کا باعث ہے تو مظلوم طبقے کے انداز فکر میں تبدیلی نہیں آئے گی۔ اور اس لئے استحصال جاری رہے گا اس طرح تاریخ کی خالص مادی تفسیر کا نظریہ اور دیگر وہ تمام نظریات مشکوک ہو جاتے ہیں جو فکر کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہیں۔

عموماً یہ خیال کیا جاتا ہے کہ قوم کے حکمران یا سیاست دان عروج و زوال کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ بات بہت حد تک صحیح ہے۔ ظاہر ہے کہ قوم کے حال اور مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار جن افراد کے ہاتھوں میں ہوگا۔ وہی ان فیصلوں کے نتائج کے ذمہ دار ہوں گے۔ جمہوری معاشروں میں اہم فیصلے عوام کی مرضی سے کئے جاتے ہیں۔ لیکن عوام کی رائے کی تشکیل میں سیاست دان اور حکمران بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ عوام کی رائے کو بدل بھی سکتے ہیں (کبھی عوام کی بہبود کے لئے اور کبھی اپنی بہبود کے لئے) لیکن جوں جوں معاشرے میں تعلیم اور سیاسی شعور بڑھتا ہے اس کے ساتھ ساتھ خود عوام میں ایک ایسا طبقہ ابھرتا ہے جو قوم کے مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرتا ہے اور اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے یہ طبقہ اہل فکر کا ہوتا ہے۔ اس طبقے میں قوم کے دانشور شامل ہوتے ہیں

اگر کسی قوم کے دانشور یا اہل فکر خاموش ہو جائیں یا ان کو خاموش کر دیا جائے تو وہ قوم فکری گھٹن کا شکار ہو کر رہ جائے گی اس کی فکر مسخ ہو جائے گی اور اس کا عمل بھی۔ ایسی قوم کو شکست و زوال سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ اہلِ فکر قوم یا معاشرے میں اقلیت ہی میں ہوتے ہیں لیکن یہ وہ اقلیت ہوتی ہے جو قوم کو افکار تازہ فراہم کرتی ہے۔ فکری جمود پیدا نہیں ہونے دیتی۔ افکار میں جدلیت کے عمل کو جاری رکھتی ہے۔ فرسودہ افکار میں نقص کا عنصر دریافت کرتی ہے اس طرح ان افکار کی نفی ہوتی ہے نئے افکار پیدا ہوتے ہیں اور پھر افکار کی جدلیت سے مزید نئے افکار پیدا ہوتے ہیں۔ علوم میں ترقی ہوتی ہے، نئی دریافتیں ہوتی ہیں، معاشرے کے پیچیدہ اور روز افزوں مسائل کے حل تلاش کئے جاتے ہیں۔ موجودہ سیاسی نظام اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ اسے نہ صرف ہر پہلو سے پرکھا و جانچا جائے بلکہ اسے چلانے والی سیاسی و قانونی انتظامیہ کی بھی اصلاح کی جائے۔ جس کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی طریق قیادت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جائے اور عمال حکومت کو ان حدود و قیود میں مقید رکھیں جن پر عمل پیرا ہو کر فلاحِ عامہ کی طرف قدم بڑھایا جا سکے۔

سفارشات

سفارشات

اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے بنی نوع انسان کی شاخیں اور قبیلے تو تسلیم کر لیے تا کہ آپس میں پہچان ہو سکے لیکن یہ کڑی شرط لگا دی کہ زیادہ عزت والا تم میں سے خدا کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ گویا اسلامی ملت کی بنیادی قدریں اس لحاظ سے دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہیں کہ یہ ایمان اور پرہیز گاری پر استوار ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رنگ و نسل، درجہ، دولت و ثروت کو اعزاز و اکرام کا معیار تصور نہیں کیا گیا۔ اسلام کا مقصود اللہ کے دین کی سر بلندی کے لئے ایسی جماعت کی تشکیل ہے جس میں گورے کالے، عجمی و عربی، شرقی و غربی کی تمیز نہ ہو وہ آپس میں بھائی بھائی ہوں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

انما المومنون اخوة[1] ''بے شک مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں''

حضورؐ نے فرمایا ہے۔

''مومن ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوستہ ہیں جس طرح ایک عمارت کے مختلف حصے ہوتے ہیں اور ہر حصہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے''

اس کے برعکس مغربی تہذیب وفکر نے موجودہ دور میں قومیت کا تصور پیش کر کے دنیا کو ایک خطرے میں ڈال دیا ہے۔ جبکہ یہ تصور ملتِ اسلامیہ کے بنیادی عقائد کے سراسر خلاف ہے۔ ان مغربی افکار کی یلغار نے دنیائے اسلام کی وحدت پارہ پارہ کرنے میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا جس کی وجہ سے مسلمان نہ صرف اپنے اتحاد کو بھول گئے بلکہ اپنے اسلامی اصولوں کو بھی چھوڑ بیٹھے جن پر ان کی حکومت کا دار و مدار تھا۔ اسلام قومیت، رنگ و نسل، لسانی اور جغرافیائی حدود و قیود سے بالاتر ہو کر وحدتِ انسانی کا علمبردار ہے۔ یہی وحدت امتِ مسلمہ کی پہچان تھی۔ اس انفرادیت کو بحال کرنے کے لئے اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ جملہ افرادی قوت کو یوں منظم و متحد کیا جائے کہ یہ مقصد جلد پایہ تکمیل کو پہنچے۔

اس کے لئے ایک ایسی قیادت، ایک ایسے مرد کامل کی ضرورت ہے جو عالم اسلام کے سب سے بڑے خلا کو پر کر سکے۔ ایسا حوصلہ مند انسان جو مغربی تہذیب کا جرأت، اعتماد اور یقین کے ساتھ سامنا کر سکے۔ اور مغربی تہذیب کے مختلف سانچوں، مختلف مکاتب فکر اور راستوں کے درمیان ایک نیا راستہ پیدا کرے، ایسا راستہ جس میں وہ تقلید، نقل، غلو اور انتہا پسندی سے بالاتر نظر آئے اور ظاہری اشکال، مظاہر اور سطحی نقطۂ نظر سے بلند ہو، حقائق اور وسائل، قوت اور مغز کی طرف متوجہ ہو اور اس کے ظاہری خول میں نہ الجھے۔

ایسا مرد کامل اور عبقری (Genius) جو اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے ایک ایسی نئی شاہراہ کھولے جس میں ایک طرف وہ ایمان ہو جو محض نبوت کا فیض ہے، وہ دین ہو جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اس امت کو عطا کیا۔ دوسری طرف وہ علم ہو جو کسی خاص ملک یا قوم یا زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، وہ دین سے نیک خواہشات اور جذبات اخذ کرے جو انسانیت کی خدمت اور تہذیب کی تشکیل و تعمیر کے لئے سب سے بڑا ذخیرہ اور سب سے بڑی دولت ہے، وہ صحیح اور صالح مقاصد حاصل کرے جو صرف آسمانی مذہب اور صحیح دینی تربیت سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مغربی تہذیب کے پیدا کردہ وسائل اور آلات حاصل کرے جو اس کو طویل علمی سفر اور مسلسل اور سخت جدوجہد کے بعد حاصل ہوئے ہیں۔ لیکن ایمان اور ان نیک مقاصد کے فقدان کی وجہ سے ان سے صحیح فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔ بلکہ اس کو انسانیت کشی اور تہذیب دشمنی یا بہت حقیر مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔

ایسا لیڈر، ایسا حاکم، جو مغربی تہذیب اور اس کے تمام نظریات، انکشافات اور قوتوں کے ساتھ خام مال (Raw material) کا

---

[1] الحجرات، ۱۰/۴۹

سا معاملہ کرے اور اس سے ایک نئی اور طاقت ور تہذیب کی عمارت تعمیر کرے جو ایک طرف ایمان، اخلاق، تقویٰ، رحم دلی اور انصاف پر قائم ہو، دوسری طرف اس میں اس کی مخصوص ذہانت، قوت ایجاد اور جدتِ فکر جلوہ گر ہو، وہ مغربی تہذیب کو اس نظر سے نہ دیکھے کہ وہ تکمیل و ترقی کے آخری مراحل سے گزر چکی ہے اور اس پر آخری مہر لگ چکی ہے لہٰذا اب اس میں کسی ترمیم واضافہ کی گنجائش نہیں ہے بلکہ وہ اس پر علیحدہ علیحدہ اجزاء کی حیثیت سے نظر ڈالے۔ جس چیز کو چاہے رد کرے اور جس چیز کو چاہے اختیار کرے اور پھر اس سے زندگی کا ایک ایسا ڈھانچہ تیار کرے جو اس کے مقاصد، اس کے عقیدہ، اس کے مبادی اور اصولِ اخلاق کے ساتھ ہم آہنگ ہو، اسلام نے اس کو زندگی کا جو ضابطہ، دنیا کا جو مخصوص نقطۂ نظر اس کی جدوجہد اور جہاد کا جو جذبہ عطا کیا ہے اس پر مبنی ہو۔ جس سے وہ زندگی وجود میں آئے جس کے متعلق قرآن نے شہادت دی ہے۔

من عمل صالحاً من ذکر أوأنثیٰ وهو مؤمن فلنحيينه حيٰوة طيبةً ولنجزينهم اجرهم باحسن ما كانوا يعملون[1]

''جو شخص نیک عمل کرے گا مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان بھی رکھتا ہو تو ہم دنیا میں بھی اس کی زندگی اچھی طرح بسر کرائیں گے اور ان کو آخرت میں بھی ان کے بہترین اعمال کا صلہ ضرور عطا فرمائیں گے''۔

وہ شخص جو مغرب کو اپنا امام اور رہنما اور خود کو اس کا مقلد اور شاگرد اور خوشہ چین تسلیم نہ کرتا ہو، بلکہ یہ سمجھے کہ وہ اس کا ایک رفیق سفر اور معاصر ہے جو مخصوص حالات کی وجہ سے بعض مادی اور اقتصادی علوم میں اس سے سبقت لے گیا ہے وہ کوشش کرے کہ اپنی ذہانت، اور مشرق و مغرب اور مادی و روحانی قوتوں کے اس حسین امتزاج سے ایک ایسی شاہراہ اور ایک ایسا مسلک زندگی پیدا کرے، جس کا احترام اور اس کی تقلید کرنے پر مغرب بھی مجبور ہو۔

سابق مسلم ریاستوں کے علاوہ گزشتہ جنگ عظیم کے بعد ایشیا اور افریقہ میں بہت سی نئی ریاستیں قائم ہوئیں۔ سویٹ یونین کے حصے بخرے ہونے پر مسلم ممالک میں مزید اضافہ ہوا۔ لیکن اسلامی نظام پورے طور پر کہیں نافذ نہیں ہے۔ بعض سربراہان مملکت اس کی تمنا رکھتے ہیں کہ اپنے یہاں اسلامی قوانین جاری کریں اور وقتاً فوقتاً اپنی اس آرزو کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں مگر نہ پورے طور پر اسلامی دستور بن پاتا ہے نہ شریعت پر خاطر خواہ عمل ہو پاتا ہے۔

بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

> ''یہ اس نصاب تعلیم کا نتیجہ تھا جس نے نئے اندازِ فکر کو نظر انداز کیا اور ان علماء کا قصور تھا جو ہنوز افلاطون و ارسطو کے در کی جاروب کشی میں مصروف ہیں۔ دنیا بدل گئی ہے علوم وفنون کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں فکر ونظر کا معیار کچھ سے کچھ ہو گیا ہے ذہنوں کے سانچے یکسر بدل گئے ہیں لیکن ہمارے علماء ہنوز یونانیوں کے پس خوردہ پر قناعت کئے ہوئے ہیں۔ وہ عصر حاضر کے مسائل فرسودہ کتابوں سے حل کرنا چاہتے ہیں اور نئے سوالوں کے جواب پرانی کتابوں میں تلاش کر رہے ہیں اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ ہم کسی کو برا بھلا کہیں اور بڑھتی ہوئی لادینیت پر صف ماتم بچھائیں بلکہ اصل خرابی کو سمجھیں۔ زمانے کے تقاضوں سے آشنا ہوں۔ نئے انداز نظر سے واقفیت حاصل کریں جدید علوم وفنون کو نصاب میں شامل کریں مذہب، کے اصل سرچشموں تک رسائی حاصل کریں۔ تقلید جامد کے شیوہ قدیم کو ترک کریں اور کتاب وسنت کے اصل نصوص کو غور وفکر کا مرکز بنائیں نظر میں وسعت اور فکر میں گہرائی پیدا کریں۔ خود ساختہ رسم ورواج کی بندشوں سے آزاد ہوں۔ اگر ہم

---

[1] النحل، ۱۶/ ۹۷

نے ایسا کر لیا تو عصر حاضر کی مشکلات کو حل کر سکیں گے۔ اور لادینیت کے سیلاب کو روک سکیں گے۔
ورنہ ہماری کہنہ دیواروں میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ وقت کے اس تیز و تند دھارے کو روک سکیں''۔[۱]

ہم جس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں، اس میں زیادہ تر قومی تصورات کو غلبہ حاصل ہے۔ ان کی حیثیت یا تو نسلی ہے یا زیادہ سے زیادہ خالص ثقافتی۔ ایسے حالات میں حقیقی اسلامی نظام سیاست کا قیام آسان کام نہیں۔ مسلمانوں نے سیاسی انحطاط کے دوران ثقافتی خود اعتمادی کا بھی بڑا حصہ زائل کر دیا۔ بہت سے مسلمانوں کو یہ مشکل بھی درپیش ہے کہ وہ آج غور و فکر کرتے وقت ''مملکت'' اور ''قومیت'' کی مغربی اصطلاحات سے الگ نہیں رہ سکتے اور اسلامی اصطلاحات سے کام نہیں لے سکتے۔ ان کے برعکس بہت سے قدامت پسند مسلمان ایسے ہیں جو قولاً اور عملاً روایتی وضع قائم رکھنے پر اصرار کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے قوم کے مغربی اندازِ فکر کے مخالف ہیں۔ ہمارے ثقافتی انحطاط اور اسلامی فکر میں صدیوں کے جمود سے جو مشکلات پیدا ہوئیں، انہیں ایک طرف رکھیے۔ اگر کسی نے مسلمانوں کو صحیح اسلامی اصول پر منظم کرنے کا ارادہ بھی کیا ہے۔ تو غیر مسلم دنیا خوفزدہ ہو جاتی ہے اور بلاواسطہ یا بالواسطہ ہر قسم کی مشکلات پیدا کی جاتی ہیں۔

اہل مغرب ہمیشہ سے اسلام کو سیاسی خطرہ سمجھتے ہیں کیونکہ اسلامی دنیا اور یورپ کے درمیان صدیوں تک شدید رزم و پیکار کا سلسلہ جاری رہا۔ ان تاریخی یادوں کے زیر اثر وہ اسلام پر یہ تہمت لگاتے ہیں کہ اس مذہب میں تمام غیر مسلموں سے عداوت مضمر ہے۔ اور انہیں یہ خوف دامن گیر ہے کہ اسلامی مملکت کے قیام کے خیال میں اسلامی روح کا احیاء شامل ہے اور ممکن ہے کہ مسلمانوں کی خوابیدہ قوتیں بیدار ہو جائیں اور وہ دوبارہ مغرب کی طرف نئے جارحانہ اقدامات شروع کر دیں اس خوف کی بنیاد پر اہل مغرب وہ سب کچھ کر رہے ہیں، جو اسلامی ملکوں کی سیاسی قوت کے احیاء کی روک تھام کے لئے ضروری ہے۔ ان کے اس ممکنہ رجحان کے سدباب کیلئے چند تجاویز ہیں۔

۱۔ اسلامی مملکت کا اولین فرض یہ ہے کہ اپنے زیر اقتدار علاقوں میں شریعت کے احکام نافذ کرے اور اس غرض سے قوانین شریعت کے ایک ایسے مجموعے کی ضرورت ہے، جو مختصر اور واضح طور پر جامع ہو۔ اسلام صرف چند عبادات و رسومات کا نام نہیں ہے بلکہ مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں ترتیب دیا جانے والا یہ مجموعۂ قوانین عام فہم اور قابل عمل بنایا جائے۔

۲۔ ہر اسلامی ملک میں وہ فقہی تعلیمات استعمال کی جائیں، جن کی پابند آبادی کی اکثریت ہے، یعنی جہاں حنفیوں کی اکثریت ہے، حنفی فقہ قانون عامہ کی بنیاد ہو، جس ملک میں شیعوں کی اکثریت ہے، وہاں جعفری فقہ کو بنیاد مانا جائے۔

۳۔ اسلامی مملکت کے پاس شرعی احکام کا ایک ایسا مجموعہ ہونا چاہیے۔

ا۔ جو تمام مسلمان شہریوں کے نزدیک فی الجملہ قابل قبول ہو اور دیگر فقہی مکاتب سے ان کے تعلق کا کوئی امتیاز پیش نظر نہ رکھا جائے۔

ب۔ جس سے الٰہی قانون کی دائمی اور غیر متبدل خصوصیت واضح ہو اس کا اطلاق تمام زمانوں اور انسانوں کے اجتماعی و ذہنی نشو و ارتقاء کے مطابق ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ نے قانون اسلام کو دائمی اور ابدی قرار دیا ہے۔ اس لئے حوصلے اور ہمت سے کام لیتے ہوئے ذاتی وابستگیوں کو پس پشت ڈالتے ہوئے خدا کی اصل شریعت کو انسان کے خود ساختہ فقہی قوانین سے الگ نہ کر دیں۔ یعنی اسلامی قانون کو ابتدائی حدود و دائرۂ عمل کے اندر لے آئیں۔ قرآن و سنت کے سادہ، واضح اور غیر مشتبہ احکام سامنے رکھ لیں۔ اسلامی نظریے کو از سر نو سمجھنے کی یہی ایک صورت ہے۔ اسی طرح مسلمان ثقافتی جمود و انحطاط پر قابو پا سکتے ہیں، جو اب مذہبی فکر پر غالب ہے اسی طرح شریعت ایک اسلامی مملکت میں ایک زندہ شے بن سکتی ہے۔

---

[۱] عبدالسلام قدوائی، مولانا آزاد کی ایک آرزو، (رسالہ جامعۂ دہلی؛ اپریل، ۱۹۶۳)

۴۔ نصوص قرآن وسنت کا یہ مجموعہ ایسا ہو جس میں عوام سے تعلق رکھنے والے مسائل کے متعلق واضح اور روشن قوانین موجود ہوں۔اس کے لئے طریق عمل مندرجہ ذیل خطوط کے مطابق ہونا چاہیے۔

ا۔ مجلس شوریٰ، علماء کی ایک مختصر سی جماعت منتخب کرے جس میں مختلف مکاتب فقہ کی نمائندگی کا انتظام ہو۔اس کے ارکان قرآن کی تاریخ اور طریق ومنہاج نیز علم حدیث سے پوری طرح واقف ہوں اور مجموعے کی ترتیب کا کام انہیں سونپ دیا جائے۔ان کا فرض ہوگا،قرآن وسنت کے صرف ایسے احکام پر متوجہ ہوں، جو۔

i۔ قرآن کی تعریف کے عین مطابق ہوں یعنی ایسے احکام وبیانات، جو ظاہر الفاظ کی بنا پر ایک مخصوص مفہوم کے حامل ہوں اور ان کی ایک سے زیادہ تعبیر نہ ہو سکے۔

ii۔ ان کی حیثیت واضح طور پر امر یا نہی کی ہو۔

iii۔ انکا تعلق براہ راست انسان کے اجتماعی چلن اور عمل سے ہو۔

ب۔ علماء کی جماعت میں ایسے مخلص حضرات کا چناؤ کیا جائے جو فرقہ بندی کے خول سے نکل کر اسلامی فکر کی بلندیوں سے آشنا ہوں۔

۵۔ قرآن وسنت سے جو فقہی احکام واضح ہوں، انہیں خاص عنوانوں کے تحت مرتب کر لینا چاہیے، جن کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی و سیاسی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے ہو۔پھر اس مجموعے کو دنیائے اسلام کے مستند فضلاء کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہ بھی ان پر تبصرہ کریں اور کوئی چیز رہ گئی ہو تو تجویز کر دیں۔

۶۔ جن علماء کے پاس شرعی قوانین کا یہ مجموعہ بھیجا جائے اس پر نقد وتبصرہ اور تجاویز کو ان کی حقیقی حیثیت کے اعتبار سے سوچا جائے اور آخری نظر ثانی میں ان سے کام لیا جائے پھر اس ملک کے بنیادی قوانین کی حیثیت میں اختیار کر لینے کی تجویز کے ساتھ مجلس شوریٰ کے حوالے کر دیا جائے۔

۷۔ اجتہادی فکر ونظر کے مختلف نتائج میں اختلاف ضرور ہوگا۔جب ایک مرتبہ اجتماعی وسیاسی قوانین شریعت' مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی بنیاد کے طور پر قائم ہو جائیں تو تمام غیر شرعی معاملات کے متعلق آراء کا اختلاف رسول اللہ ﷺ کے اس غیر فانی ارشاد کے تابع چلا جائے گا۔**اختلاف علماء امتی رحمة** ''میری امت کے علماء کا اختلاف خدا کی رحمت کا نشان ہے''

۸۔ مسلمانوں کے مابین اختلافات فروعی ہیں تفریقی نہیں۔فروعی اختلافات کو زیر بحث نہ لایا جائے دینی ودنیوی مصالح کو مدنظر رکھتے ہوئے قوانین بنائے جائیں۔

۹۔ آج کی دنیائے اسلام پر بہت سے فرائض عائد ہیں جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ تمام ممالک اسلامیہ باہمی اشتراک سے سرمایہ داری کریں۔اسلامی بینک بنائے جائیں یورپی اور امریکی بینکوں سے سرمایہ واپس لایا جائے اور اس سرمائے سے اسلامی ممالک میں صنعتیں لگائی جائیں۔

۱۰۔ مشترکہ سرمایہ سے سائنسی تحقیقی ادارے قائم کئے جائیں اور اس مقصد کے لئے عالم اسلام سے بالخصوص اور دنیا بھر سے بالعموم سائنس دانوں کی خدمات سے استفادہ کیا جائے۔اس مقصد کے لئے (O.I.C) کے ذیلی ادارہ اسلامک فاؤنڈیشن فار سائنس، ٹیکنالوجی اینڈ ڈیویلپمنٹ (IFSTAD) کو موثر بنایا جائے۔

۱۱۔ صنعت وحرفت کے ساتھ ساتھ زراعت کو جدید خطوط پر استوار کیا جائے۔اور خوراک کے مسئلہ میں اسلامی دنیا کو خود کفیل بنایا جائے۔

۱۲۔ اس دور میں مسلمانوں کو ایسے زبردست وسائل میسر ہیں کہ شاید پوری تاریخ اسلام میں ان کی نظیر نہ ہو۔قدرت نے اسلامی ملکوں کو ایک طرح کی جغرافیائی زنجیر میں پرو دیا ہے۔دنیا کی اہم ترین شاہراہیں ان کے قبضے میں ہیں۔معدنی وسائل کے اعتبار سے ساری دنیا میں ایک ممتاز مقام ہے۔انسانی وسائل کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو بھی عالم اسلام مالا مال ہے۔لیکن اس کے باوجود دنیا بھر میں مسلمانوں سے زیادہ مجبور و بے وزن قوم کوئی نہیں۔اس کی بنیادی وجہ اتحاد و یک جہتی کا فقدان ہے۔عالم اسلام کو مغرب کے بنائے گئے قومیت کے حصار سے نکلنا ہوگا۔**انما المومنون اخوة** کو عملی طور پر ثابت کر کے ہی مسلمان اپنا تشخص برقرار رکھ سکتے ہیں۔

۱۳۔ اسلامی تعلیمات پر عمل کر کے دوسروں کے لئے ایسا نمونہ پیش کیا جائے کہ غیر اسلامی تحریکوں کا موثر تدارک ہو سکے۔مساجد میں علماء حضرات کی فرقہ وارانہ تقاریر پر پابندی ہو صرف امر بالمعروف اور نھی عن المنکر کے موضوعات پر خطبات پیش کیے جائیں۔علاقائی مسائل سے کلی طور پر آگہی ہو اور ان کے تدارک کے لئے علاقائی کمیٹی مقرر ہو جو علاقے کے لوگوں کے مسائل حل کرے۔

۱۴۔ نظریہ اسلام کو عملی یا غیر عملی ثابت کرنا مسلمانوں کا کام ہے۔اگر ہم دور ماضی کے فقہی قیاسات تک اسلامی تصور کا دائرہ محدود رکھیں تو یہ بالکل غیر عملی رہے گا۔اگر ہم حوصلے اور فکر و نظر سے کام لیتے ہوئے اس پر متوجہ ہوں،تازہ اور بے میل نقطۂ نگاہ اختیار کرتے ہوئے رسمی فقہی قیاسات کے دائرے سے اسے باہر نکال لیں تو اس کی عملیت معاً روز روشن کی طرح نمایاں ہو جائے گی۔جب معاشرہ اسلامی افکار و اقدار سے آگاہ ہو کر قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزارے گا۔تو انہیں میں سے اسلامی قیادت ابھر کر سامنے آئے گی۔اور یہی قیادت نہ صرف عالم اسلام بلکہ دنیا بھر کے لئے بہترین رہنما ہوگی۔

۱۵۔ او۔آئی۔سی (O.I.C) جیسے ادارے کو صحیح معنوں میں فعال بنایا جائے اور عالمِ اسلام میں یہ احساس قولاً وفعلاً اجاگر کیا جائے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی شناخت اسلام ہے اور مسلمانوں کی بقا نظریہ قومیت سے نہیں بلکہ تصور امت سے وابستہ ہے۔قومیت کا جذبہ محدود ہے جبکہ امت کا تصور عالمگیر ہے۔جیسا کہ ڈاکٹر عبداللہ الاحسن نے اپنی تصنیف "Ummah or Nation?" میں لکھا ہے

> "Only a stronger philosophical and ideological foundation of an identity will be able to claim the supreme loyalty of an individual". 1

''ایک قوی اور مضبوط تر مذہبی اور فکری شناخت ہی کسی فرد سے اعلیٰ تریں وفاداری حاصل کر سکتی ہے''

۱۶۔ تمام اسلامی ممالک کے قائدین کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ قومیت کے حصار میں رہتے ہوئے وہ کبھی بھی اتنے مضبوط نہیں ہو سکتے کہ طاغوتی قوتوں کا مقابلہ کر سکیں۔انہیں بہر حال ایسی اجتماعی قیادت کی ضرورت ہے جو اسلام کا بول بالا کر سکے۔صدیوں سے یک جہتیِ امت کے کھوکھلے نعرے تو گونج رہے ہیں لیکن عملاً اس ضمن میں پیش رفت نہیں ہوئی جو بلاشبہ باعثِ تشویش ہے۔

''اتحاد امہ کے بے عمل نعرے اور وعدے اسلامی معاشرہ کے لئے انتہائی خطرناک نتائج کا سبب بن سکتے ہیں'' ۲

۱۷۔ ہم سب کو اپنے رب کے حضور خشوع وخضوع سے دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں قرآن وسنت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ایسی قیادت عطا کرے جو اسلام کی عظمتِ رفتہ کو بحال کر سکے۔اور سب اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں۔

---

۱ Ummah or Nation?,P.146

۲ Dr. Abdullah Al Ahsan, Ummah or Nation?,P.140

اشاریہ

قرآنی آیات

☆☆☆☆☆☆☆☆

احادیث نبویةٌ

☆☆☆☆☆☆

فہرست شخصیات

آ

ا

ب

ت

ج

چ

ح

خ

د

ڈ

ر

ز

ژ

س

گ

م

فہرست اماکن

آ

ا

ب

پ

ت

ٹ

ج

چ

ح

خ

ڈ

ر

ز

س

ش

ط

ع

ف

ن

و

ہ

ی

مصادر و مراجع

مصادرومراجع

☆ اللہ جل شانہ	القرآن الحکیم	تاج کمپنی لمیٹڈ	
☆ آزاد، ابوالکلام مولانا	ترجمان القرآن	مکتبہ اشاعتِ ادب لاہور	س۔ن
☆ آلوسی، ابوالفضل شہاب الدین سید محمود آلوسی	روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم	دارالفکر، بیروت	۱۹۹۷ء
☆ ابن الاثیر، عزالدین ابی الحسن ابن محمد عبدالکریم	اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ	الشعب، القاہرہ	۱۳۸۶ھ
☆ ایضاً	الکامل فی التاریخ	دارصادر، بیروت	۱۹۹۷ء
☆ ابن الجوزی، عبدالرحمٰن بن علی	المنتظم فی تاریخ الملوک والامم	مطبعہ دائرۃ المعارف النظامیہ حیدرآباد،	۱۳۵۷ھ
☆ ابن حزم علی بن احمد بن سعید بن حزم	الفصل فی الملل والاھواء والنحل	المطبعۃ الادبیہ، مصر	۱۳۱۷ھ
☆ ابن رشد، محمد بن احمد بن محمد بن احمد بن رشد	بدایۃ المجتھد ونھایۃ المقتصد	مصر	۱۳۷۱ھ
☆ ابن کثیر، ابوالفدا ءعمادالدین دمشقی	البدایہ والنھایہ	مکتبہ معارف، بیروت	۱۹۶۶ء
☆ ابن قیتبہ، عبداللہ بن مسلم بن قیتبہ الدینوری	الامامۃ والسیاسۃ	مکتبہ مصطفیٰ البابی مصر	۱۹۶۹ء
☆ ابن منظور ابوالفضل جمال الدین محمد بن مکرم ابن منظور الافریقی	لسان العرب	داراحیاء التراث العربی بیروت	۱۹۸۸ء
☆ ابن ھشام عبدالملک بن ھشام بن ایوب الحمیری	السیرۃ النبویۃ	مکتبہ مصطفیٰ البابی مصر	۱۹۶۶ء
☆ ابن الطقطقی محمد بن علی بن طباطبا	الفخری فی الاٰداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ (مترجم محمد جعفر)	ادارہ ثقافتِ اسلامیہ لاہور	۱۹۶۲ء
☆ ابن سعد منیع الزہری	الطبقات الکبریٰ	دارصادر	۱۹۶۰ء
☆ احمد بن حنبل	المسند	دارالمعارف، مصر	۱۹۵۳ء
☆ ابن خلکان، شمس الدین احمد بن محمد ابن خلکان	وفیات الاعیان	دارصادر، بیروت	۱۹۷۲ء
☆ اسعد گیلانی سید،	اسلامی تہذیب واقدار	فیروزسنز، لاہور	۱۹۹۱ء
☆ اصلاحی صدرالدین	اسلام اوراجتماعیت	اسلامی پبلیکیشنز لاہور	۱۹۷۸ء
☆ اصلاحی امین احسن	اسلامی ریاست	انجمن خدام القرآن، لاہور	۱۹۷۷ء

☆	اسرارالحق	اسلام اور مغرب کا تصادم	میٹرو پرنٹرز، لاہور	۲۰۰۷ء
☆	اقبال محمد علامہ	کلیاتِ اقبال	الفیصل۔اردو بازار لاہور	۱۹۹۵ء
☆	اقبال محمد علامہ	تشکیل جدید الہیات اسلامیہ	بزم اقبال، لاہور	۱۹۵۸ء
☆	ایضاً	بانگِ درا، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز	پبلشرز یونائٹڈ۔لاہور	۱۹۴۹ء
☆	ابن تیمیہ، تقی الدین احمد عبدالحلیم بن عبدالسلام بن عبداللہ بن ابی قاسم حافظ	الحسبۃ فی الاسلام	القاہرہ مطبع المؤید	۱۹۷۰ء
☆	ابن تیمیہ	السیاسۃ الشرعیۃ فی اصلاح الراعی والرعیۃ	دارالکتب بیروت	س ن
☆	ایضاً	سیاسۃ شرعیہ (مترجم محمد اسماعیل گودھروی)	قرآن محل کراچی	س۔ن
☆	ابن عبدالبر قرطبی	الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب	القاہرہ	۱۴۱۳ھ
☆	ابن خلدون	مقدمہ، کتاب العبر	نفیس اکیڈمی، کراچی	۱۹۸۰ء
☆	ابوحیان الاندلسی محمد بن یوسف بن علی بن یوسف بن حیان	بحرالمحیط	قاہرہ مطبعۃ السعادۃ	۱۳۲۸ھ
☆	ابو یوسف قاضی	کتاب الخراج	المطبعۃ السلفیہ مصر	۱۳۵۲ھ
☆	البغوی الحسین بن مسعود الفراء	شرح السنہ	مکتب الاسلامی بیروت	۱۴۰۰ھ
☆	ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری (مترجم محمد عادل خان)	صحیح بخاری	دینی کتب خانہ، لاہور	۱۹۷۷ء
☆	ابوداؤد، سلیمان بن اشعث السجستانی	سنن ابوداؤد	حمص (سوریہ)	۱۹۷۳ء
☆	ابی جعفر محمد بن جریر الطبری	تاریخ الامم والملوک	مطبع الحسینیۃ المصریہ	س۔ن
☆	امام مسلم بن حجاج نیشاپوری	صحیح مسلم مع شرح الکامل للنووی	رشیدیہ، دہلی	۱۳۷۶ھ
☆	اصلاحی امین احسن	مقالات اصلاحی	مکتبہ جدید پریس لاہور	۲۰۰۰ء
☆	ایضاً	اسلامی ریاست	انجمن خدام القرآن، لاہور	۱۹۷۷ء
☆	امام غزالی	احیاء العلوم (مترجم مولانا محمد احسن صدیقی)	دارالاشاعت، کراچی	س۔ن
☆	ایضاً	نصیحۃ الملوک	تہران	س۔ن
☆	الماوردی	الاحکام السلطانیہ	مطبعہ الحلبی قاہرہ	۱۹۵۱ء
☆	المسعودی	مروج الذھب	مطبع السعادہ مصر	۱۹۴۸ء
☆	انور شاہ کشمیری	فیض الباری	مطبعہ حجازی، القاہرہ	۱۹۳۸
☆	الہامی	بائبل کتاب مقدس	بائبل سوسائٹی، لاہور	۱۹۸۴ء
☆	پانی پتی، ثناء اللہ	تفسیر مظہری	ندوۃ المصنفین، دہلی	۱۹۶۳ء

☆ ترمذی، ابوعیسیٰ بن محمد عیسیٰ	جامع ترمذی	قرآن محل کراچی	۱۹۶۹ء
☆ ثروت صولت	دنیا میں مسلم اقلیتیں	ادارہ معارف اسلامی کراچی	۱۹۹۰ء
☆ جمیل جالبی ڈاکٹر	پاکستانی کلچر	مشتاق بک ڈپو۔ کراچی	۱۹۶۴ء
☆ جصاص، ابی بکر احمد بن علی الحنفی	احکام القرآن	المطبعۃ البھیۃ مصر	۱۳۴۷ء
☆ جرمانوس، عبدالکریم	مسلمان اقوام کے زوال کے اسباب (مترجم محمد سرور)	استقلال پریس لاہور	۱۹۵۵ء
☆ چشتی محمد عبدالحلیم بن عبدالرحیم شیخ	المرقاۃ المصابیح شرح المشکوٰۃ المصابیح	مکتبہ امدادیہ، ملتان	۱۹۷۲ء
☆ حسن صعب	علم السیاسۃ	بیروت	۱۹۶۶ء
☆ حمیداللہ، ڈاکٹر	اسلامی ریاست	ناشران قرآن لاہور	س۔ن
☆ ایضاً	عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی	باب الاسلام پرنٹنگ پریس کراچی	۱۹۸۱ء
☆ ایضاً	رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی	کراچی	۱۹۸۴ء
☆ خطیب تبریزی، ولی الدین محمد بن عبداللہ	مشکوٰۃ المصابیح	دمشق	۱۹۶۱ء
☆ الرازی، فخر الدین محمد بن عمر	التفسیر الکبیر	دارالکتب العربیہ، مصر	۱۹۶۷ء
☆ رشید احمد پروفیسر	مسلمانوں کے سیاسی افکار	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور	۱۹۸۸ء
☆ ساجد الرحمٰن صاحبزادہ ڈاکٹر	اسلامی معاشرہ کی تاسیس وتشکیل	ادارہ تحقیقات اسلامی	۱۹۹۷ء
☆ سعید احمد مولانا	مسلمانوں کا عروج وزوال	مکتبہ رشیدیہ کراچی	۱۹۸۲ء
☆ سیوطی، حافظ جلال الدین	تاریخ الخلفاء	نفیس اکیڈمی، کراچی	۱۹۸۳ء
☆ سلیمان ندوی سید	ارض القرآن	اعظم گڑھ	۱۳۵۵ھ
☆ سی، ڈبلیو، ٹرول	سرسید احمد خان (مترجم قاضی محمد حسین، محمد اکرام چغتائی)	القمر انٹر پرائزرز، لاہور	۱۹۹۸ء
☆ شمیم حسین قادری سید	اسلامی ریاست قرآن وسنت کی روشنی میں	علماء اکیڈمی لاہور	۱۹۸۴ء
☆ الشھرستانی، ابوالفتح محمد بن عبدالکریم	الملل والنحل	دارالمکتبہ المتنبی، بیروت	۱۹۹۲ء
☆ شاکر عبدالجبار	اقبال کا تصورِ قیادت	بزمِ اقبال، لاہور	۱۹۹۷ء
☆ شبلی نعمانی علامہ	الفاروق	سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور	۱۹۷۲
☆ ایضاً	سیرت النبیؐ	دارالاشاعت، کراچی	۱۹۸۴ء
☆ شاہ ولی اللہ	حجۃ اللہ البالغہ	غلام علی اینڈ سنز، لاہور	۱۹۶۲ء
☆ ایضاً	ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء	قدیمی کتب خانہ، کراچی	س ن
☆ شہاب الدین ندوی	اسلام کی نشاۃ ثانیہ قرآن کی نظر میں	مجلس نشریات اسلام، کراچی	۱۹۸۳ء
☆ شیخ محمد اکرم	موج کوثر	ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور	۱۹۹۲ء
☆ ایضاً	آب کوثر	ایضاً	//

☆ شاہ معین الدین	تاریخ اسلام	ناشرانِ قرآن لمیٹڈ اردو بازار لاہور	۱۹۵۴ء
☆ شاہد رزاقی	تاریخ جمہوریت	ادارہ ثقافتِ اسلامیہ	۱۹۵۷ء
☆ شیرازی سید معروف شاہ	مقالات علمی	ظلال القرآن فاؤنڈیشن، راولپنڈی	۲۰۰۳ء
☆ صباح الدین عبدالرحمٰن سید	مسلمانوں کے عروج وزوال کے اسباب	مجلس نشریاتِ اسلام کراچی	۱۹۹۴ء
☆ صادق محمد احسن	اسلام اور اشتراکیت	اسلامک پبلیکشنز، لاہور	۱۹۷۸ء
☆ ضیاء الحسن فاروقی	فکر اسلامی کی تشکیل جدید	مکتبہ رحمانیہ لاہور	۱۹۷۸ء
☆ ضیاء الدین الریس	النظریات السیاسۃ الاسلامیہ	مطبوعہ دار التراث، قاہرہ	۱۹۷۶ء
☆ طبری، محمد بن جریر ابو جعفر	تاریخ الامم والملوک	مطبوعات مکتبہ خیاط بیروت	س ن
☆ طوسی نظام الملک خواجہ،	سیاست نامہ (مترجم، شاہ حسن عطاء)	نفیس اکیڈیمی کراچی	۱۹۷۶ء
☆ ظفر محمد سید	ڈکٹیٹر کون	مکتبہ ادارہ ڈائجسٹ	۱۹۷۶ء
☆ علوی مستفیض احمد	مغربی جمہوریت' حقیقت اور سراب	بیت الحکمۃ لاہور	۲۰۰۳ء
☆ علی ابراہیم حسن	النظم الاسلامیہ	القاہرہ	۱۹۵۶ء
☆ عبداللہ ڈاکٹر سید	پاکستان تعبیر وتعمیر	مکتبہ خیابان ادب، لاہور	۱۹۷۷ء
☆ علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین	کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال	ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان	۲۰۰۳ء
☆ علاء الدین کاشانی	بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع	کراچی	۱۴۰۰ھ
☆ عبدالحمید صدیقی	اسلام اور تھیا کریسی	لاہور	۱۹۵۵ء
☆ عثمانی، محمد تقی مولانا	اسلام اور سیاست حاضرہ	مکتبہ دار العلوم، لاہور	۱۹۹۸ء
☆ عثمان محمد پروفیسر	فکر اسلامی کی تشکیل نو	سنگ میل پبلیکیشنز لاہور	۱۹۸۷ء
☆ غازی حامد الانصاری مولانا	اسلام کا نظام حکومت	لاہور	۱۹۹۹ء
☆ غلام رسول مہر مولانا	تاریخ تہذیب	شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور	۱۹۶۵ء
☆ فارابی، ابونصر محمد	آراء اہل المدینۃ الفاضلہ	بیروت	۱۹۵۹ء
☆ فرشتہ محمد قاسم	تاریخ فرشتہ، ترجمہ عبدالحی خواجہ	ایضاً	س ن
☆ قطب شہید سید	اسلام میں عدلِ اجتماعی (مترجم) نجات اللہ صدیقی	اسلامک پبلیکشنز لاہور	۱۹۸۹ء
☆ ایضاً	اسلامی نظریہ کی خصوصیات اور اصول (مترجم شبیر احمد)	اسلامک بک پبلشر	۱۹۷۲ء
☆ گوہر رحمٰن	اسلامی سیاست	المنارک سنٹر، لاہور	۱۹۸۶ء
☆ گستاؤلی بان ڈاکٹر	تمدن عرب (مترجم علی بلگرامی سید)	مقبول اکیڈمی، لاہور	۱۹۳۶ء
☆ ایضاً	تمدن ہند (مترجم علی بلگرامی سید)	ایضاً	۱۹۶۲ء
☆ منصور پوری سلمان سید	رحمۃ اللعالمین	الفیصل ناشران، لاہور	۱۹۹۱ء

☆ الماوردی، علی بن محمد بن حبیب ابوالحسن	احکام السلطانیہ	مطبعۃ الحلبی، قاہرہ	۱۳۸۶ء
☆ محمود شیث خطاب	الرسول القائد	دار المکتبہ، بغداد	۱۹۶۰ء
☆ محمد حنیف ندوی مولانا	افکار ابن خلدون	ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور	۱۹۸۷ء
☆ مودودی ابوالاعلیٰ سید	اسلامی ریاست	اسلامی پبلیکیشنز، لاہور	۱۹۶۴ء
☆ ایضاً	تفہیم القرآن	ادارہ ترجمان القرآن، لاہور	۱۹۹۱ء
☆ ایضاً	خلافت وملوکیت	ایچ فاروقی ایسوسی ایٹس لاہور	۱۹۸۶ء
☆ ایضاً	پردہ	اسلامک پبلیکیشنز لاہور	۱۹۶۲ء
☆ محمد اسد، علامہ	اسلام میں ریاست اور حکومت کے بنیادی اصول	آگہی پبلیکیشنز، لاہور	۲۰۰۰ء
☆ محمد مارماڈیوک پکتھال	اسلامی کلچر، (مترجم محمد ایوب منیر)	مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور	س۔ن
☆ ماجد عرسان الکیلانی ڈاکٹر	عہد ایوبی کی نسل نو اور القدس کی بازیابی (مترجم صاحبزادہ محمد عبدالرسول)	اردو سائنس بورڈ، لاہور	۲۰۰۴ء
☆ ندوی ابوالحسن علی سید مولانا	مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش	مجلس نشریات اسلام کراچی	۱۹۸۱ء
☆ ایضاً	انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر	ایضاً	۱۹۷۸ء
☆ ناسک صلاح الدین	افکار سیاسی مشرق ومغرب	عزیز پبلیکیشنز، لاہور	۱۹۷۳ء
☆ نصیر احمد ناصر ڈاکٹر	اسلامی معاشرے کی تشکیل نو	فیروز سنز، لاہور	۱۹۸۹ء
☆ وثیق احمد پروفیسر	مشرق ومغرب کے سیاسی افکار	شیخ محمد بشیر اینڈ سنز، لاہور	۲۰۰۰ء
☆ ھیثمی نورالدین علی بن ابی بکر	مجمع الزوائد ومنبع الفوائد	دار الکتاب، بیروت	۱۹۷۷ء
☆ ھیکل محمد حسین	ابوبکر صدیقؓ (مترجم محمد احمد پانی پتی)	پاکستان ٹائمز پریس، لاہور	۱۹۷۳ء
☆ ھٹی، فلپ۔کے	تاریخ عرب	ندوۃ المصنفین، دہلی	۱۹۵۱ء
☆ یوسف القرضاوی ڈاکٹر	اسلامی نظام ایک فریضہ ایک ضرورت	البدر پبلیکیشنز، لاہور	۱۹۹۳ء
☆ یعقوبی احمد بن ابی یعقوب ابن واضع	تاریخ الیعقوبی	ادارہ احیاء التراث العربی بیروت	۱۳۷۹ء
☆ یوسف کوکن عمری	امام ابن تیمیہ	ذوالنورین اکادمی بھیرہ سرگودھا	۱۹۸۲ء

لغات ودائرۃ المعارف

ابن منظور، جمال الدین	''لسان العرب''	بیروت	۱۹۵۶ء
راغب اصفہانی ابی القاسم حسین بن محمد	''المفردات فی غریب القرآن''	داراحیاء التراث العربی، بیروت	۲۰۰۲ء
فیروزآبادی، محمد بن یعقوب	''القاموس المحیط''	مصطفیٰ البابی، مصر	۱۹۵۲ء
لوئس معلوف	''المنجد''	بیروت	۱۹۵۱ء
مولانا وحید الزمان	''القاموس الوحید''	ادارہ اسلامیات، لاہور	۲۰۰۱ء
الزبیدی، محمد مرتضیٰ الحسینی محبّ الدین	''تاج العروس من جواہر القاموس''	دارالفکر، بیروت	۱۹۹۴ء
وارث سرہندی	''قاموس مترادفات''	اردو سائنس بورڈ، لاہور	۱۹۸۶ء
محمد فواد الباقی	''المعجم المفہرس لالفاظ القرآن''	خیابانِ فخر رازی، تہران	۱۳۷۲ء
ڈاکٹر اے۔ جے۔ ونسنک	''المعجم المفہرس لالفاظ الاحادیث النبویؐ''	ای۔ جے۔ بریل لیدن	۱۹۳۶ء
اردو جامع انسائیکلوپیڈیا		کراچی	۱۹۸۸ء
اردو دائرہ معارف اسلامی		دانش گاہ پنجاب لاہور	۱۹۷۱ء
دائرۃ المعارف اسلامیہ		پنجاب یونیورسٹی، لاہور	۱۹۶۷ء
دائرہ معارف القرن العشرین (عربی) محمد فرید وجدی		دارالمعرفۃ۔ بیروت لبنان	۱۹۷۱ء

LIST OF ENGLISH BOOKS

Abdullah-al-Ahsan	Ummah or Nation?	The Islamic Foundation	1992/1413A.H.
Asad Muhammad	The Principles of State and Government in Islam	Services Book Club	1986
Aristotle	Politics	Oxford New York	1999
Aziz Ahmad	Islamic Modernism in India & Pakistan	London	1967
Amir Ali, Syed	Spirit of Islam	London	1953
Bhadari D.R.	History of European Political Philosophy	Oxford University Press	2002
Devendrakaushik	Central Asia in Modern Times	Progress Publishers MosCow.	1970
Donald Kagan	The Great Dialogue History of Greek, Political Thoughts	The free press New York Collier Macmillan Ltd. London	1965
Dan Nimmo Thomas Ungs	Political Pattern in American Conflict Representation and Resolution	W. H. free man and company San Franciso.	1979
Devid Held	Models of Democracy	Cambridge University Press	1987
Eddy Asirva Tham Edited K. K. Misra	Political Theory	S. Chand & Company (Pvt) Ltd. Ramnagar New Dehli	1988
Ernest Barker	Political Thoughts in England, 1848 to 1914	Thornton, Butterworth Ltd. London	1995
E.E. Kellet.	The Story of Dictatorship	Ivor Nicholson & Walson Ltd. London	1937
Franz Rosenthal	A History of Muslim Historiography	L Eiden. E. J. Brill	1968
Fredrick Pollok Bart,	History of the Science of Politics	Macmillan and Co. Ltd.	1916
Greame Duncan	Democratic Theory and Practice	Cambridge University Press	1983
Harold J. Laski	An Introduction to Politics	George Allen and Unwin, London	1958
Hameed A. K. Rai	History of Political Philosophy	Aziz Publishers Urdu Bazar Lahore	1981
Hugh Thomas	An Unfinished History of the World	Pan books London and Sydney.	1981
Iqbal, Allama Muhammad	Reconstructions of Religions in Islam	Lahore	1977
John Locke	Two Treatises on Civil Government	George Rout Liedge and Sons. London	1884

John Strachey	The Menace of Fascism	London Victor Gollancz (Ltd.)	1933
John Burn Kein	Is Democracy Possible	Basil Blackwell Oxford	1985
J.C. Johari	Contemporary Political Theory	Sterling Publishers (Pvt.) Ltd.	1987
James Harway Robinson	Mediel and Modern Times	James & Company London	1995
Jack Lively,	Democracy	Oxford	1975
John William Draper,	Intellectual Development of Europe	Lahore	1956
Mohammad Marmaduke Pickthal	Islamic Culture,	Lahore	1950
Nikki. R. Keddie.	A political Biography, Syed Jamal-ud-Din Afghani	Los Angels.	1972
Nickolson P.A.	A Literary History of the Arabs	The Cambridge University	1956
Noberto Bobio	Democracy and Dictatorship	Tr. Peter Kennealy, Polity Press	1997
Plato	'The Republic'	Oxford University Press	1993
R.N. Gilchrist	Principles of Political Science	Orient Long mans Bombay	1964
Robert Brifault	The Making of Humanity	London	1928
Raymond Garfield Gettel	Political Science	The World Press (Pvt.) Ltd. Calcutta	1959
Riaz Hussain	The Politics of Iqbal	Islamic Book Service, Lahore	1977
Thomas Carlyle	On Heroes, Hero Worship and the Heroic in History	London	1921
Thomas Arnold	The Preaching of Islam	Lahore	1950
V.D. Muhajan	Recent Political Thoughts	Premier Publishing Co. Delhi New Dehli-Bombay Jullundur Lucknow	1963
Will Durant	The Story of the Civilization	New York	1955

ENCYCLOPEDIA

The Encyclopedia Britanica	Chicago U.S.A	1985
The Encyclopedia of Islam	Leiden & E.J. Brill	1960
Encyclopedia of Seerah	London, the Muslim School Trust	1981
The Encyclopedia of Religion	Macmillan Publishing Co. New York	
Encyclopedia of Religion & Ethics	By James Hastings New York	1980
Encyclopedia American International Edition	American Corporation, New York	1973
Shorter Encyclopedia of Islam	Gibb, H.A.R.& J. H. Leiden	1953